[محرم الحرام ۱۳۸۸ھ]

APRIL 1968

مرتب
عتیق الرحمٰن سنبھلی

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۷/۵۰
پاکستان سے ۷/۵۰
ششماہی
ہندوستان سے ۴/-
پاکستان سے ۴/-

ماہنامہ
الفرقان
لکھنؤ

فی کاپی ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک سے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

جلد ۳۶ | بابتہ ماہ محرم الحرام ۱۳۸۸ھ مطابق اپریل ۱۹۶۸ء | شمارہ ۱

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لئے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی اطلاع ۲۰ اپریل تک آ جانی چاہئے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں۔ نئے خریدار بھی اسی طریقہ سے چندہ ارسال فرمائیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۱۵ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اسکی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آ جانی چاہئے۔ اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

پتہ نہیں عالم اسلام میں صرف خوشی ہی منائی گئی یا شکر بھی ادا کیا گیا کہ خدا نے بے سان و گمان یہود کو ایک ذلت اور اردنی مسلمانوں کو ایک عزت سے ہمکنار کیا! یہ دراصل خوشی منانے سے زیادہ شکر ادا کرنے کی بات ہے۔ کوئی سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ ۲۱ مارچ کے اسرائیلی حملے کا نتیجہ اس شکل میں رونما ہوگا۔ حملے کے دن کی شاہ حسین کی عرب ملکوں سے اپیل ایک ایسے آدمی کے الفاظ اور لب و لہجہ میں ہے جو تمام جرأت و شجاعت کے باوجود اپنے آگے موت دیکھ رہا ہو۔ لیکن وہ خدا تھا جس نے اسرائیل کی لائی ہوئی اس "موت" کو اسی پر اُلٹ دیا۔ اور اردن کو فتح و ظفر کی اس معراج سے سرفراز کیا جس کی تحسین و آفرین میں دنیا ایک زبان ہے۔ اور اسرائیل منھ تو رہا ہے کہ یہ ایک پل میں کیا ہوگا!

عربوں نے اسرائیل کے مقابلے میں جس طرح بازی ہاری تھی اس کے بعد اردن کے ہاتھوں اسرائیل کی یہ شکست، بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ واقعہ یاد دلاتی ہے جس کے ذکر میں قرآن نے کہا ہے۔

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ پھر لوٹا دی ہم نے ان کے اوپر تمھاری باری

یہ دشمن بنی اسرائیل شاہ جالوت تھا جس کی فلسطین پر قبضہ گیری کے بعد ایک وقت میں پانسہ پلٹ دیا گیا اور بنی اسرائیل کو ایک شاندار فتح سے ہمکنار کیا گیا ـــــــ کیا اسرائیل اور عربوں کے معاملے میں خدا کی قدرت اتنی جلد پانسہ پلٹ دینے کا فیصلہ کر چکی ہے؟ اس کا علم خدا ہی کو ہے۔ مگر ہم اس واقعہ سے نیک فال ضرور لے سکتے ہیں۔ اور اس کا تقاضہ ہے کہ عرب مسلمان ہوں یا دوسرے کہیں کے مسلمان، انھیں اگر جون ۱۹۶۷ء کی شکست میں خدا کی قدرت نظر نہیں آئی تھی

تو تاریخ معاصرہ کی اس فتح میں بہرحال اس کے اقتدارِ اعلیٰ کا جلوہ دیکھیں۔ اور اظہارِ مسرت کے ساتھ ساتھ اس جلوہ کو شکر و امتنان کی نذر بھی دیں۔ کیونکہ اگر یہ جا تو صرف ایک امتحان ہو کہ اب بھی ہمارے دل خدا ہی کو سب کچھ ماننے کے لئے نرم ہوئے یا نہیں، تو اسے تکمیلِ نوازش تک لانے کے لئے یہ ثبوت دینا ناگزیر ہو کہ ہاں ہم بدل گئے ہیں! اور اگر یہ نوازش و کرم ہی کا آغاز ہو تو اس کی تکمیل ہی نہیں تکمیل کے بعد بقاء و استقرار کی ضمانت دینے والی چیز بھی یہی ہو کہ ہم شکر و پاس کا حق پہچانیں۔

ورنہ بنی اسرائیل نے جب اس حق شناسی سے منھ پھیر لیا تو مذکورہ بالا آیت ہی کے سلسلۂ کلام میں سنایا گیا ہو کہ بازی پھر پلٹ دی گئی اور طالوت کے بجائے بخت نصر بنی اسرائیل پر آدھمکا۔

قرآن بنی اسرائیل کو ان کی تاریخ کا یہ اتار چڑھاؤ سنانے کے بعد کہتا ہو کہ:۔

عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ	(اگر تم قرآن پر ایمان لے آؤ تو) خدا
وَ اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا	پھر تیار ہو کہ تم پر نوازش کرے۔ لیکن
	اگر تم پھر وہی سرکشی دکھاؤ تو ہم پھر وہی
(بنی اسرائیل ع ۱)	گرفت کریں گے۔

یہ قانون صرف بنی اسرائیل کے لئے نہ تھا، نزول قرآن کے بعد جنھیں ان کی جگہ انتخاب کیا گیا ان کے لئے بھی یہی قانون ہو۔ اور ساری سعادت اسی میں مضمر ہو کہ اس قانون کو سمجھا جائے۔

اس شمارہ میں "خاندانی منصوبہ بندی" کی دوسری قسط نے نگاہ اولیں میں کسی مفصل گفتگو کی گنجائش نہیں چھوڑی، بلکہ ۸ صفحے بڑھا کر یہ ۴ صفحے ضروری باتوں کے لئے نکالے گئے ہیں —— معارف الحدیث کی قسط بھی اس مضمون کی وجہ سے روکنا پڑی۔ اولاً تو خیال بھی نہ تھا کہ اس سلسلہ میں اور کچھ لکھنا ہو۔ پھر خیال پیدا ہوا تو بات اتنی پھیلتی چلی گئی —— اور یہ پھیلاؤ ضروری معلوم ہوا —— کہ اس دوسری قسط کے صفحات پہلی سے بھی بڑھ گئے۔ امید ہو کہ یہ تطویل ناظرین کو بھی مفید اور ضروری معلوم ہو گی، اور مسئلہ کا ایک اہم پہلو اتنی وضاحت سے سامنے آجائے گا جو شاید ابھی تک نہ آیا ہو —— ناظرین اگر مطالعہ کے بعد یہی رائے قائم کریں تو پھر ان سے درخواست ہو کہ اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو پڑھوائیں۔

گزشتہ اشاعت سے حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی بھوپالی دامت برکاتہم کے مجلسی ارشادات کا ایک دوسرا دور شروع کیا گیا ہے۔ ان ارشادات کا حق ہے کہ اپنے ناظرین کو بطور خاص ان کی طرف بھی متوجہ کیا جائے۔ بہت سے لوگوں کیلئے "خانقاہ" اور "شاہ صاحب" جیسے الفاظ حجاب بن جاتے ہیں۔ ایسے حضرات سے کہنا ہے کہ وہ اگر ان ارشادات کو پڑھیں گے تو ان میں نہ انھیں اپنے تصور کے "شاہ صاحب" نظر آئیں گے نہ اپنے تصور کی "خانقاہ"! خانقاہ کے لئے زمانہ کی تبدیلیوں اور امت کے حالات کے لحاظ سے اگر کوئی جدید ترین معیار ٹھیرایا جا سکتا ہے تو اس خانقاہ ہی مجلس کے آئینہ میں اسی معیار کی ایک خانقاہ دیکھنے کو ملتی ہے اور اسی معیار کے صاحب سجادہ! نئے حالات کی ڈالی ہوئی وہ کونسی گرہ ہے جو اس میخانہ میں نہ کھولی جاتی ہو — ہم اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتے ہیں کہ ان فیوض کو کچھ دور تک پہنچانے کی سعادت ہمیں ملی۔

مولانا نسیم احمد صاحب فریدی کے قلم سے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے ملفوظات کا ایک سلسلہ کافی دن سے چل رہا تھا۔ اس اشاعت سے مکتوبات شروع ہو رہے ہیں۔ اور اسکے بعد "غیر مطبوعہ علمی و ادبی تبرکات" کا دور چلے گا۔ مکتوبات کی زیر نظر قسط بتاتی ہے کہ یہ سلسلہ اس سیاسی اعتبار سے بحرانی دور کی تاریخ کے بارے میں بھی کچھ اشارے اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ بالخصوص یہ جاننے کے لئے کہ ان حالات سے خانوادہ ولی اللٰہی کس طرح متاثر ہو رہا تھا (جو مسلمانان ہند کے لئے مرکز ثقل کی حیثیت رکھتا تھا) یہ مکتوبات نہایت قیمتی ماخذ ثابت ہو سکتے ہیں — مولانا فریدی دامت فیوضہم نے اپنے طرز پر صرف ترجمہ و تلخیص کا ارادہ فرمایا تھا۔ اور زیر نظر قسط اسی نوعیت کی ہے۔ لیکن مکتوبات کی اس اہمیت کے پیش نظر ان سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ ایسے ارشادات کی کچھ وضاحت بھی حاشیہ میں فرمائیں۔ مولانا نے لکھا ہے کہ اگرچہ یہ کام بعض پہلوؤں سے بہت دقت طلب ہے، مگر وہ اپنی صحت اور دوسرے عوائق کی اجازت کے بقدر آئندہ قسطوں میں اس کا التزام فرمائیں گے۔

گزشتہ شمارہ میں ذکر آسکتا تھا مگر اس کی ضرورت نہیں سمجھی گئی کہ والد ماجد (حضرت مولانا نعمانی مدظلہم) امسال سفر حج میں تشریف لے گئے ہیں۔ بعد میں ان کے نام آنے والی ڈاک ایک

(باقی ص۳۷ پر)

یک ساعت صحبت با اہل دل

مجلس حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی مدظلہ العالی

مرتبہ:- مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

۱۲ شوال ۱۳۸۷ھ مطابق ۲۲ جنوری ۱۹۶۸ء (مابین ۱۱ و ۱۲ بجے دن)

خانقاہ شریف، حاضرین بدستور

راقم السطور ذرا تاخیر سے حاضر ہوا، عرض کیا ہم لوگ قصداً تاخیر سے حاضر ہوتے ہیں، تاکہ حضرت وظائف و معمولات سے باطمینان فارغ ہو جائیں، اور کچھ آرام فرمالیں، ارشاد ہوا کہ میرے وظائف کیا، اَتَمّ الوظائف تو یہ ہے، کہ اعمال ریا سے خالی ہوں، خالق سے نظر ہٹ کر مخلوق پر جم جانا، بلکہ مخلوق کا وجود ہی تسلیم کرنا شرک ہے، اور یہی وہ شرک ہے جس کو رات کی تاریکیوں میں چیونٹیوں کے رینگنے سے زیادہ دقیق اور نازک بتایا گیا ہے، بزرگوں کی خدمت میں مجھکو یہی معلوم ہوا کہ سب سے بڑی بات یہی ہے کہ اپنے سے بھی بے نشان ہو جائے اور دوسروں سے بھی، جہاں یہ خیال آیا کہ میری تقریر کا حاضرین پر کیا اثر پڑا، بس ریا آیا، تخیل کے بال برابر سرک جانے سے سیکڑوں میل راستے کا فرق پڑ جاتا ہے، تخیل بہت لطیف اور نازک ہوتا ہے، لیکن ساری زندگی کے جہاز کو وہی چلاتا ہے، ایک بچہ ریل گاڑی کے بھاری بھاری پہیوں کو دیکھتا ہے، اپنے باپ سے پوچھتا ہے کہ ان بڑے بڑے پہیوں کو کون سی طاقت

چلاتی ہے، وہ کہتا ہے، بیٹا! کبھی سردی میں لحاف میں منہ ڈھانپ کر دیکھا ہے؟ دیکھا ہو کہ منہ سے کوئی گرم گرم شے نکلتی ہے؟ بیٹا کہتا ہے کہ ہاں، باپ کہتا ہے کہ یہی بھاپ یا اسٹیم پورے جہاز یا پوری ریل گاڑی کے پہیوں کو حرکت دیتی ہے، کپتان، یا ڈرائیور اس لطیف اور نازک بھاپ کی بڑی نگہداشت رکھتا ہے، یہ ہلکی ہو جائے تو نقصان پہونچے، تیز ہو جائے تو خرابی پیدا کرے، بس ہر وقت اس کو اعتدال اور نظم میں رکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

فرمایا، جو چیز مفت مل جاتی ہے، اس کی قدر نہیں ہوتی، بڑے بڑے معارف اور حقائق بے محنت و مشقت مل جائیں تو ان کی وقعت نہیں رہتی، اور محنت کر کے یہی پانی جو بہا پھرتا ہے حاصل ہو تو اسکی بھی قدر اور حفاظت ہوتی ہے۔ منے میاں (صاحبزادہ) بڑی محنت اور اہتمام سے کنواں کھدوا رہے تھے، کئی بار اس میں مٹی آچکی تھی، صاف اور میٹھا پانی نکلا، اس کو شیشی میں رکھ کر بڑے تحفہ کے طور پر لائے، اور مجھے دیا، قرآن مجید میں کیسے کیسے علوم و معارف بیان کیے گئے ہیں، کوئی ان کے لئے مشقت نہیں اٹھاتا، اور قدر نہیں کرتا، ابھی کوئی کہدے کہ فلاں مکان میں جو کھنڈر ہو گیا ہے، خزانہ گڑا ہوا ہے، تو لوگ اس زمین کو خرید لیں گے اور دفینہ برآمد کریں گے، اس پر آپ نے حضرت ابن سیرین کے تعبیر کے واقعات سنائے، قرآن مجید میں بالکل ابتدا ہی میں کتنی بڑی حقیقت بیان کی گئی ہو "ذلک الکتاب لاریب فیہ"، آپکے پاس کسی خوشی یا غمی کا تار آتا ہے، اگر خوشی کا تار ہے تو سارے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے، اگر غم کی کوئی اطلاع ہوتی ہے تو سارے گھر پر اُداسی چھا جاتی ہے، حالانکہ "تار" اطلاع ہے، واقعہ نہیں، لیکن آثار و قرائن سے اس خبر پر یقین پیدا ہو جاتا ہے، یہ اسی کا کرشمہ ہو، پھر اللہ کی دی ہوئی اطلاعات اور قرآن کے علوم و معارف میں کیا شک ہے؟

فرمایا، ہماری عبادتیں بھی عادتیں بن گئی ہیں، نماز کا وقت آیا نماز پڑھ لی، روزہ کا زمانہ آیا روزہ رکھ لیا، عبادت یہ ہے کہ نفع کا یقین اور اجر کا اشتیاق ہو، دیکھئے منی آرڈر لانے والے ڈاکیہ کا کس طرح استقبال کیا جاتا ہے، اور کس طرح اسکے لئے راحت و آرام کو قربان کیا جاتا ہے، میں نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ تہجد کے لئے بیدار ہوئے تو کہا جائے لاؤ، میں نے کہا یہ بھی ایک طرح کا انجکشن ہے، نماز کے لئے نشاط اور تازگی پیدا کرنے کے لئے کسی

خارجی مدد کی ضرورت نہیں، فرمایا نماز کبھی پرانی نہیں ہوتی، ہردن کی نماز نئی نماز ہے۔ جو نماز کل تھی وہ آج نہیں، اسی طرح ہر نماز نئی ہے، اور ہر ذکر نیا، اگر محبت اور نفع کی امید ہو تو ہر روز نئی بات، ہر روز نیا چہرہ، فضل الرب (صاحبزادہ) بیمار تھا، میں نے اس کو دیکھا بالکل نیا چہرہ معلوم ہوا، برسوں سے میرے پاس منی آرڈر آتے ہیں، لیکن منی آرڈر لانے والا ڈاکیہ ہر روز نیا معلوم ہوتا ہے، اُنس و محبت وہ چیز ہے کہ مانوس اور محبوب کا نام آتے ہی نبض تیز ہو جاتی، مولانا روم نے مثنوی میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک بادشاہ ایک عورت پر عاشق ہوا، اس نے اس سے شادی کر لی، اور محل میں لے آیا، کچھ دنوں کے بعد وہ عورت بیمار ہوئی، اور کوئی دوا کارگر نہ ہوئی، شاہی حکماء نے ہزار تدبیریں کیں، کوئی راس نہ آئی، مرض بڑھتا ہی گیا، آخر بادشاہ نے درباری طبیبوں کو دھمکایا، اور کہا کہ اگر علاج سے فائدہ نہ ہوا تو میں سب کے منصب اور تنخواہیں بند کر دونگا، جب تمھاری حذاقت کام نہ آئی تو وہ کس دن، اور کس کے لئے ہے؟ حکماء بہت گھبرائے ایک تجربہ کار حکیم نے بادشاہ سے کہا کہ میں تخلیہ میں مریضہ کی نبض دیکھنا اور اس سے باتیں کرنا چاہتا ہوں، بادشاہ نے اجازت دیدی، حکیم نے باتوں باتوں میں اس کا وطن، شہر، خاندان وغیرہ پوچھا، پھر مختلف محلوں اور وہاں کے رہنے والوں کے نام لینا شروع کئے، اور نبض پر ہاتھ رکھے رہا، آخر جب ایک زرگر کا نام آیا، تو عورت کی نبض تیز ہو گئی، اور زور زور سے چلنے لگی، حکیم نے بادشاہ سے کہدیا کہ یہ عورت فلاں زرگر پر عاشق ہے، قصہ تو اس کے بعد بھی چلتا ہے، لیکن میرا مدعا اسی سے حاصل ہے، قرآن مجید نے یہی تھرما میٹر ہم کو دیا ہے، فرمایا:۔

اِنما المومنون الذین اِذا ذکر اللّٰہ وجلت قلوبھم
واذا تلیت علیھم اٰیاتہ زادتھم ایمانا وعلی ربھم یتوکلون۔[1]

"وجلت قلوبھم" یعنی ان کی نبض تیز ہو جاتی ہے، اور دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے، کہ ان کو اس نام کی لذت حاصل ہے' اور اس ذات سے عشق ہے "اِذا تلیت

---

[1] اس آیت میں اہل ایمان کا حال بیان کیا گیا ہے کہ جب خدا کا ذکر ہو اور کلام الٰہی پڑھا جائے تو انکی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ (الفرقان)

علیھم آیاتہ زادتھم ایمانا" یعنی ان کو ایک نیا لطف اور نیا ذوق حاصل ہوتا ہے، اسی لئے کہتا ہوں کہ ہر نماز نئی ہوتی ہے، اور ہر بار کا ذکر نیا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور صفات ایسے دل فریب اور دلربا ہیں کہ ان کا ذکر کرنے سے نبض کی حرکت تیز نہیں ہوتی، بلکہ عجب نہیں کہ نبض پھٹ جائے اور جگر شق ہو جائے، اگر قبرستان میں پڑھی جائے تو مُردے کفن پھاڑ کر باہر آجائیں،

دیکھیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

ھو الذی لا الٰہ إلا ھو	وہ اللہ ہے جس کے سوا بندگی نہیں کسی
عالم الغیب والشہادۃ	کی، جانتا ہے چھپا اور کھلا، وہ ہے
ھو الرحمٰن الرحیم، ھو اللہ	بڑا مہربان رحم والا۔ وہ اللہ ہے جس
الذی لا الٰہ الا ھو،	کے سوا کوئی معبود نہیں، صاحب اقتدار
الملک القدوس السلام	پاک ذات، مجسم سلامتی، امان دیتا،
المؤمن المھیمن العزیز الجبار	پناہ میں لیتا، زبردست دباؤ والا،
المتکبر سبحان اللہ عما یشرکون	صاحب عظمت۔ پاک ہے اللہ اس سے
ھو اللہ الخالق البارئ المصور	جو شریک بتاتے ہیں۔ وہ اللہ ہے
لہ الأسماء الحسنیٰ یسبح لہ	بنانے والا، نکال کھڑا کرتا، صورت
ما فی السمٰوات والأرض	کھینچتا، اسی کے پاس سب نام خاصے
وھو العزیز الحکیم ؕ	اس کی پاکی بولتا ہے جو کچھ ہے آسمانوں اور
	زمینوں میں۔ وہی ہے زبردست حکمت والا۔

کوئی ٹھکانا ہے ان کے حسن و جمال، اور لطف و اثر کا، میں قبرستان میں قرآن شریف پڑھتے ہوئے گھبراتا ہوں، (خصوصاً وہ ان آیات کے جن کی تعلیم دی گئی ہے) کہ معلوم نہیں مردوں پر کیا گزرے، ان کو کیسی کیسی حسرتیں ہوں گی، کہ ہماری سلطنت پر اغیار کا قبضہ ہے جو چیزیں ہماری ملکیت میں تھیں، وہ دوسروں کی ملکیت میں ہیں، ہم خدا کا نام لے سکتے تھے، ہم ذکر کر سکتے تھے، ہم قرآن شریف پڑھ سکتے تھے، آج بالکل مجبور و معذور ہیں، ان کو کیسی

تڑپ اور بے چینی ہوتی ہوگی، آج وہ ایک بار کلمہ پڑھنے سے بھی عاجز ہیں، اور ترستے ہیں کہ ایک بار کلمہ کا، یا ایک آیت کی تلاوت کا ثواب کوئی ان کو پہونچا دیتا، قصہ ہے کہ ایک بادشاہ خاصۂ شاہی تناول فرما رہے تھے، ایک پہرہ دار کھڑا تھا، اس میں ایک دم سے ایک اضطراری کیفیت پیدا ہوئی، اور وہ اس طرح تڑپ گیا، جیسے بجلی کوندے، بادشاہ نے اسکی تڑپ دیکھی، اور کہا کیا بات ہے؟ اس نے بہت سی باتیں بنائیں، اور کہا کہ مجھ پر کبھی کبھی ایک بیماری کا دورہ پڑتا ہے، بادشاہ نے کہا نہیں، سچ سچ کہو، ہم لوگ قیافہ شناس اور تجربہ کار ہوتے ہیں، یہ بیماری نہیں، کچھ اور بات ہے، زیادہ اصرار کرنے سے اس نے بتایا کہ میں بھی کسی وقت میں بادشاہ تھا، اور میں بھی کبھی اسی طریقہ سے خاصہ تناول کرتا تھا، اور چوبدار و غلام اسی طرح کھڑے رہتے تھے، وہ منظر یاد کرکے میرے اندر بجلی سی کوند گئی، بادشاہ نے اس کا امتحان لیا، جس سے معلوم ہوا، کہ وہ شاہی کھانوں کا ذائقہ شناس ہے، اور ان کی باریکیوں کو جانتا ہے، جب بادشاہ کو اس کی تصدیق ہوگئی، تو اس نے اس کو اپنے ساتھ شاہی دسترخوان پر بٹھایا، اور شریک طعام کیا، ایک دوسرا پہرہ دار یہ منظر دیکھ رہا تھا، اس نے کچھ عرصہ کے بعد یہی سوانگ بھرا اور ایسی ہی اضطراری کیفیت اس نے اپنے اندر تکلفاً پیدا کی، بادشاہ نے اس کا بھی امتحان لیا، جب معلوم ہوا کہ مدعی اور جعل ساز ہے، تو اس کو ذلیل کرکے نکال دیا، بس جس طرح سے اس پہرہ دار کے اندر جو کبھی بادشاہت کرتا تھا، یہ شاہانہ منظر دیکھ کر حسرت و بے قراری پیدا ہوئی، اور اس کو اپنا پرانا زمانہ یاد آگیا، اسی طرح ان اہل قبور کو اپنا وہ پرانا زمانہ یاد آجاتا ہے، جب وہ بھی اللہ کا نام لینے، قرآن شریف کی تلاوت کرنے، اور ذکر و عبادت کے قابل تھے، وہ بے چین ہو جاتے ہیں۔

فرمایا میں نے بھوپال میں تین دور دیکھے ہیں، ایک دور تھا جب یہاں شاہجہاں بیگم صاحبہ کی حکومت تھی، اس وقت جب کوئی کہتا تھا کہ ہم شاہجہاں آباد[1] جا رہے ہیں تو

---

[1] بھوپال کا وہ محلہ جہاں شاہجہاں بیگم صاحبہ کے زمانہ میں حکومت کے دفاتر تھے اور جہاں دربار ہوتا تھا۔

چہرہ خوشی سے چمک جاتا تھا، پھر سلطان جہاں بیگم صاحبہ کا ذکر آیا، اس وقت جب کوئی کہتا تھا کہ ہم احمد آباد[1] جا رہے ہیں تو آنکھوں میں چمک محسوس ہوتی تھی، پھر یہ دیکھا کہ محمود علی خاں، محفوظ علی خاں خانقاہ میں عید ملنے آتے اور کہتے کہ ہم شملہ کوٹھی[2] جا رہے ہیں تو چہرہ پر بشاشت ظاہر ہوتی، ان کے نام اور اس سے نسبت رکھنے والی چیزوں کا یہ اثر ہوتا ہے، تو پھر خدا کے نام اور اس سے نسبت رکھنے والی چیزوں کا مومن پر کیا اثر ہونا چاہیئے۔

فرمایا، قرآن مجید مشیخت اور بزرگی کی نفی کرتا ہے، وہ سب کو بندہ، اور خدا کا محتاج ثابت کرتا ہے، وہ صاف اعلان کرتا ہے:۔

یا ایها الناس انتم الفقراء الی اللہ واللہ هو الغنی الحمید۔ اے لوگو تم محتاج ہو اللہ کی طرف۔ اور اللہ وہ بے نیاز ستودہ صفات ہے۔

اسی لئے خانقاہوں میں قرآن مجید کے بجائے تصوف کی کتابیں پڑھی جاتی ہیں، وہاں کسی کو قدوۃ السالکین کسی کو زبدۃ العارفین کا لقب دیا جاتا ہے اور کوئی مرشد کے قدم لیتا ہے، وہاں جب یہ شعر پڑھے جاتے ہیں، تو ساری مجلس جھوم جاتی ہے، ؎

اے کہ کردی ذات مرشد را قبول
ہم خدا در ذاتش آمد ہم رسول
در بشر روپوش آمد آفتاب
فہم کن واللہ اعلم بالصواب

---

[1] سلطان جہاں بیگم صاحبہ کے زمانہ کا دارالحکومت، یہ محلہ بیگم صاحبہ کے شوہر نواب احمد علی خاں معروف بہ سلطان دولہا کے نام پر موسوم تھا۔ [2] شملہ کوٹھی سلطان جہاں بیگم صاحبہ کے منجھلے صاحبزادہ جنرل عبیداللہ خاں صاحب کی رہائش گاہ جہاں ان کے دونوں بیٹے سعید میاں اور رشید میاں رہتے تھے یہ جگہ بھوپال میں شملہ پہاڑی پر واقع تھی۔

فرمایا، ایک دن حاجی فضل الرحمٰن صاحب جامع مسجد میں جمعۃ الوداع کی نماز پڑھ کر آئے، اور کہنے لگے کہ آج جامع مسجد میں بہت آدمی تھا، میں نے کہا کہ ریت کے ذرّوں کی طرح تھے، یا پتھر کی طرح؟ ریت کے ذرّے تو ہوا کے جھونکوں سے ایک سمت سے دوسری سمت کی طرف اڑتے رہتے ہیں، میں نے ۱۳۲۲ھ میں پہلا حج کیا، میں جدہ اور مکہ کے راستہ میں دیکھتا تھا، کہ کبھی ریت کا پہاڑ راستہ کے دائیں طرف کھڑا ہے، کبھی بائیں طرف، جدھر کی ہوا ہوئی ریت اسی طرف چل دیتی، لیکن جب یہ ذرے ایک دوسرے سے پیوست ہو جاتے ہیں تو پتھر کا ایک ٹکڑا ہو جاتا ہے، جو اگر کسی کے منہ پر مار دیا جائے، تو کام تمام کردے، اسی کو کہا گیا ہے :-

کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ	کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو غالب
کثیرۃ باذن اللّٰہ ، واللّٰہ	آئیں بڑی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے،
مع الصابرین ؕ	اور اللہ صبر والوں کے ساتھ ہے۔

فرمایا، مجھ پر کئی مرتبہ موت کی سی کیفیت طاری ہوئی، کئی مرتبہ مرمرکر بچا، بعض مرتبہ گھر والے بالکل مایوس ہو گئے، میں نے کہہ دیا تھا کہ ذہول کی حالت میں زور زور سے کلمہ پڑھا جائے، تاکہ اس غفلت اور بے ہوشی میں بھی سنا جائے، ایک مرتبہ ایسی ہی حالت تھی، تیماردار مایوس ہو رہے تھے، حکیم ضیاء الحسن[۱] صاحب آئے، انھوں نے نبض دیکھی تو کہا گھبرانے کی کوئی بات نہیں، میں نے کہا کہ موت بھی کوئی گھبرانے کی چیز ہے، جو موت سے گھبرایا اس نے لکھا پڑھا سب غارت کیا، اور ساری عمر کی محنت پر پانی پھیر دیا، گھبرانے کی چیز معصیتیں اور گناہ ہیں، گھبرانے کی چیز تو یہ شادیاں ہیں جن میں خدا اور رسول کو گھر سے رخصت کر دیا جاتا ہے، اور قرآن و حدیث کو طاق پر بٹھا دیا جاتا ہے، من مانی کی جاتی ہے۔

فرمایا کہ دو چیزیں بڑی عبادت تھیں، ایک نکاح، ایک کھانا، اب دونوں

---

[۱] بھوپال کے مشہور طبیب افسر الاطباء حکیم ضیاء الحسن صاحب مرحوم۔

میں سے دین و شریعت کے احکام، اور ایمان و احتساب کی روح نکل گئی، کھانے کی یہ اہمیت و عظمت، اور اس کا عمل و عبادت ہونے کا تصور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کے یہاں دیکھا، میں ایک دن دوپہر کے کھانے میں شریک تھا، ایک صاحب آئے ہوئے تھے جن سے ان کے سلسلہ اور مشائخ کے تعلقات تھے، انھوں نے کھانے میں کسی مقدمہ یا عدالتی قصہ کا ذکر چھیڑا، فرمایا، ابھی کھانا کھائیے، پھر سنیں گے۔

فرمایا، ایک بڑی بی والد صاحب کے پاس اکثر آتی تھیں اور اپنا دکھڑا روتی تھیں، ہمیشہ رام کہانی سناتی تھیں، ایک دن ایسی ہی رام کہانی سنانے لگیں۔ وہ بہت سی تکلیفیں اور پریشانیاں بیان کر کے کہنے لگیں، یہ نہیں ہے، وہ نہیں ہے، کہنے لگیں میرا تو اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے، میں نے کہا کہ آپ نے خوب کہا، مجھے بادشاہ اپنی گود میں بٹھالے، اور میں ہزاروں شکایتیں کر کے کہوں کہ میرا تو بادشاہ کے سوا کوئی نہیں، یہ بادشاہ کی تعریف ہوئی کہ ہجو؟۔

قسط (۹)

سراج الہند حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ

مکتوبات، علمی و ادبی تبرکات (۱)

مرتبہ ——— مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

اس مضمون کے شروع میں صرف بیاضِ رشیدی کے اہم مندرجات کو ترجمے کے ساتھ ناظرینِ الفرقان کی خدمت میں پیش کرنے کا ارادہ تھا۔ پھر خیال آیا کہ اس سے پہلے حضرت شاہ صاحب کا مختصر تذکرہ ہو جائے۔ تذکرہ کے بعد ملفوظاتِ عزیزیہ کا سلسلہ چلا، وہ اگرچہ مطبوعہ ہیں لیکن نسخۂ مخطوطہ سے مقابلہ کرنے اور اُس کے تراجم دیکھنے کے بعد ضروری سمجھا گیا کہ اس کی تلخیص بھی اس طرح کر دی جائے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مجلسی ارشادات کے صحیح مطلب و مفہوم سمجھنے میں کوئی اُلجھن پیدا نہ ہو، اور اسکے خاص اور اہم نمونے دیکھ کر مجالس مبارک کی تصویر نظروں کے سامنے آجائے، صاحب ملفوظات سے رابطہ قائم ہو اور جس مقصد کے ماتحت بزرگوں کے اقوال جمع کئے جاتے تھے وہ مقصد بھی حاصل ہو۔ ملفوظات کی تلخیص سے فارغ ہونے کے بعد اب بیاضِ رشیدی کا نمبر آیا ہے۔

بیاضِ رشیدی کا مطالعہ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں میں نے دار العلوم دیوبند کی طالب علمی کے زمانے ۱۳۵۵ھ، ۵۶ھ میں کیا تھا ——— اسکے کچھ عرصہ بعد بریلی کے زمانۂ قیام میں جب الفرقان کا شاہ ولی اللہ نمبر نکل رہا تھا مجھے دوبارہ اس کے مطالعہ کی اہمیت محسوس ہوئی۔ اس مرتبہ

میں نے اس بیاض کے کچھ حصے کو نقل کر لیا تھا اور اس میں جو مکتوبات، علمی تحریرات اور سوالات کے جوابات ہیں اُن کی ایک فہرست بنالی تھی ـــــ درمیان میں توفیق نہ ہوئی کہ اس بیاض پر کوئی مقالہ لکھتا اب تقریباً تیس سال کا زمانہ گزرنے پر یہ کام کر رہا ہوں ـــــ خود اصل بیاض ہی میں بعض مقامات کرم خوردہ تھے اور بعض مشکل پڑھے جاتے تھے۔ یادوصدی کے اندر میری نقل کردہ عبارات میں بھی کہیں کہیں تغیر آگیا اور کاغذ کی دریدگی نے بھی دو ایک جگہ اہم معلومات کو نظروں سے غائب کر دیا ہے ـــــ یہ بیاض، جو اب کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کے کثیر التعداد قلمی نسخوں کے ذخیرے میں مل نہیں رہی ہے (خدا کرے مل جائے) ـــــ مشہور مناظر و محقق مولانا رشید الدین خاں دہلویؒ کے آثار قلمیہ میں سے ہے۔ اس پر جمعیۃ الانصار کی مہر بھی ثبت ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دلدادۂ خاندانِ ولی اللّٰہی حضرت مولانا سندھیؒ کو کہیں سے دستیاب ہوئی ہوگی۔ انھوں نے ہی جمعیۃ الانصار کے دفتر سے دارالعلوم کے کتب خانے میں داخل کیا ہوگا۔ مکرمی مولانا سلطان الحق صاحب قاسمی ناظم کتب خانہ اور محترمی سید محبوب رضوی کی مہربانی اور رہنمائی سے میں نے اس بیاض کا مطالعہ کیا تھا۔

بیاض کے شروع میں دو ورق پر ایک اہم سوال کا جواب ہے ـــــ یہ دراصل شاہ صاحب کی ایک علمی تقریر ہے جس کو مولانا رشید الدین دہلویؒ نے ضبط کیا ہے۔

اس کے بعد چوالیس ورق پر مکتوبات ہیں ـــــ جن کی مجموعی تعداد (۸۰) ہے تفصیل حسب ذیل ہے:۔

مکتوبات حضرت شیخ جمال الدین ابوالطاہر محمد بن ابراہیم الکُردی المدنی ـــــ ۲

مکتوبات حضرت شاہ ابوالرضا محمد عمری ہندیؒ ـــــ ۲

مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ـــــ ۹

مکتوباتِ شاہ اہل اللہؒ فاروقی دہلویؒ بنام شاہ عبدالعزیزؒ ـــــ ۵

مکتوبات و مراسلات شاہ عبدالعزیزؒ ـــــ ۵۴

مکتوبات شیخ احمد الجبار وبابا عثمان ابن فاروق الکشمیری۔ بنام شاہ عبدالعزیز،

ایک مکتوب کے متعلق پتہ نہ چل سکا کہ کس کا ہے؟ مجموعہ اسّی ہوا۔

ان میں حضرت شاہ ابوالرضا محمدؒ کے دونوں مکتوب صاحبزادہ رفیع الدین فاروقی مرادآبادیؒ کے پردادا ملا عصمت اللہ مرادآبادیؒ (قاضی مرادآباد) کے نام ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے مکتوبات ان حضرات کے نام ہیں۔

(۱) الفاضل العلامہ المخدوم معین الملۃ والدین السندھیؒ ــــ ۱

(۲) شارح معارفِ ولی اللہی شیخ محمد عاشق پھلتیؒ ــــ ۱

(۳) شیخ عبدالقادر جونپوری ــــ ۱

(۴) قدوۃ المحدثین شیخ ابوالطاہر کردی المدنی استاذ حضرت شاہ ولی اللہؒ ــــ ۳

(۵) استاذ حرمین شیخ وفد اللہ المالکی المکی استاذ حضرت شاہ ولی اللہؒ ــــ ۱

(۶) شیخ ابراہیم ابن شیخ ابوطاہر مدنیؒ ــ استاذ کے صاحبزادے ــــ ۱

ایک مکتوب ولی اللہی کے متعلق بیاض سے یہ معلوم نہ ہوا کہ کس کے نام ہے؟

قدوۃ المحدثین حضرت شیخ ابوطاہر مدنیؒ نے جو دو مکتوب حضرت شاہ ولی اللہؒ کے نام اُن کے حجاز کے زمانۂ قیام میں مکہ معظمہ روانہ کئے ہیں ان میں سے ایک مکتوب کی تاریخ تحریر ۱۶ شوال ۱۱۴۴ھ ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے مکتوبات جن حضرات کے نام ہیں اُن کے ناموں کی فہرست یہ ہے:۔

شاہ اہل اللہ دہلوی، شاہ نوراللہ پھلتی (خسر شاہ عبدالعزیز)، بابا عثمان

لہ علامہ محمد معین ابن محمد امین سندھی علم حدیث و کلام اور علم ادب میں بڑے پائے کے عالم تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ سے نسبت تلمذ حاصل تھی شیخ ابوالقاسم نقشبندیؒ سے سلسلہ نقشبندیہ کی تعلیم حاصل کی۔ شاعر بھی تھے۔ کئی کتابوں کے مؤلف و مصنف تھے ۱۱۶۱ھ میں وفات پائی۔ (نزہۃ الخواطر جلد ۶) ٢ہ مولانا عبدالقادر ابن خیرالدین العمادی الجونپوری۔ شیخ حقانی امیٹھویؒ سے غالباً ٹانڈہ ضلع فیض آباد میں پڑھا۔ شیخ وحیدالحق پھلواریؒ سے سلوک طے کیا نیز شیخ باسط علی الہ آبادی سے بھی فیض حاصل کیا۔ قریہ سوگھرپور میں ۱۲۰۳ھ میں انتقال فرمایا۔ (نزہۃ الخواطر جلد ۷)۔

ابن فاروق الکشمیری ، محمد جواد پھلتی ، صاحب الحقائق والمعارف شیخ محمد عاشق پھلتی،
جامع الفضائل مولانا حفضور اللہ الکشمیری ، صدر الافاضل مولانا محمد مغربی مفتی دہلی،
فرید الدین بن عبد السلام الکشمیری ، رشید الملۃ مولانا رشید الدین دہلوی ، سید طٰہٰ بغدادی،
(ان کے نام کے بعد بیاض میں یہ عبارت ہے :- من وُلدِ غوث الثقلین ورد فی الدھلی سنہ ۱۲۱۴ھ ـــ یعنی یہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہٗ کی اولاد سے ہیں ۱۲۱۴ھ میں دہلی تشریف لائے تھے)

حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے مکتوبات ان حضرات میں سے بعض کے نام کئی کئی ہیں، بہت سے مکتوبات کے شروع میں اس طرح لکھا ہوا ہے۔

مکتوب الشیخ عبد العزیز الیٰ بعض خلّانہ
" " " الیٰ بعض الافاضل
" " " الیٰ بعض الاکابر
" " " الیٰ بعض اصحابہ
" " " الیٰ بعض اصحابہ من فضلاء الافاغنۃ
" " " الیٰ بعض احبابہ
" " " الیٰ بعض اصدقائہ
" " " الیٰ بعض الشعراء

ان ۵۴۳ تحریرات میں دو تین تحریریں بھی شامل ہیں جن میں ایک کا عنوان ہے فصل۔ دوسری کا عنوان ہے من رقعات اقلاہ قدوۃ الادباء الشیخ عبد العزیز مد ظلہ ـــ تیسری کے شروع میں ہے من عبارات الشیخ الاجل عبد العزیز مد ظلہ، فی تعریف الدھلی ـــ

تقریباً ۲۰ صفحات پر حصہ نظم ہے جو حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے عربی کلام پر مشتمل ہے۔ شاہ صاحب کا کلام بڑا کیف آور اور وجد انگیز ہے افسوس کہ میں کل اشعار نقل نہ کر سکا۔ چند اشعار نقل کئے ہیں جو اپنے موقع پر پیش کئے جائیں گے۔

چار ورق پر سوالات وجوابات ہیں جو استفتاء اور فتویٰ کی شکل میں ہیں۔
۴۲ صفحات پر تحقیقات و تدقیقاتِ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا سلسلہ ہے۔
تفصیل حسب ذیل ہے:۔

(۱) ایک سوال کا جواب جو بعض اعزاء نے کول (علی گڑھ) سے بھیجا تھا۔
(۲) قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کے سوال کا جواب (مدّت سلطنت بنی اُمیہ کے بارے میں)
(۳) جواب سوال قاضی صاحب مذکورہ (ہندوستان کی زمین کس قسم کی ہے؟)
(۴) سجدہ سہو کے بارے میں ایک تحقیق۔
(۵) جوابِ سوال حاجی رفیع الدین خاں فاروقی مرادآبادیؒ (وضع میزان در محشر سے متعلق)
(۶) سید صاحب عالی مرتبت کے مرسلہ ایک استفتاء کا جواب (سید صاحب کا نام درج نہیں ہے)
(۷) ایک مسئلہ (محرم کے انتقال کے بعد اس کے ساتھ محرم کا معاملہ کیا جائے یا نہیں؟)
(۸) ایک سوال کا جواب جو قطع ید سے متعلق ہے اور جس میں روایت عالمگیری کے تعارض کو رفع کیا گیا ہے۔
(۹) مولانا رشید الدین دہلویؒ کے ایک سوال کا جواب۔
(سوال کا خلاصہ یہ ہے کہ حنفیہ بعض مسائل میں صاحبین کا تو اقتداء کرتے ہیں اور تقلید امام شافعیؒ نہیں کرتے اس کی کیا وجہ ہے؟)
(۱۰) ایک صفحہ پر توریت کی ایک عبارت اور اس کی تشریح و توضیح اس کے شروع میں شاہ صاحب کی یہ عبارت ہے۔ قد نزل علینا رجلٌ کان اسمہٗ ملا فیض اللہ بن ...... وکان من فضلاء کابل ــــ عالمٌ بالتوراۃ ــــ فسالتہ، عن بعض قواعد العبرانیۃ فاجابنی فحفظتُھا فاذا ھی اوفق بلسان العرب۔
(یعنی ہمارے پاس ایک عالم مہمان کی حیثیت سے آئے جو توریت سے اور عبرانی زبان سے واقف تھے اُن کا نام ملا فیض اللہ تھا وہ فضلاء کابل سے تھے۔ میں نے اُن سے کچھ قواعد عبرانی زبان کے معلوم کئے انھوں نے مجھے بتائے میں نے ان کو یاد کرلیا۔ عبرانی زبان عربی زبان سے بہت قریب ہے)

(۱۱) بعض علماء رام پور کے سوال کا جواب — یہ سوال بوساطت حاجی رفیع الدین فاروقی مرادآبادیؒ آیا تھا۔
(۱۲) ایک کتاب کے بعض مقامات کا رد (تقریباً چار ورق پر)
(۱۳) جواب سوال قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ (عبارت صواعق سے متعلق)
(۱۴) غلام حیدر خاں کاکوروی[1] کے سوالات کے جوابات۔
(۱۵) مولانا عبد الحیٔ بڈھانویؒ کے ایک سوال کا جواب۔
(۱۶) خواجہ حسن[2] مودودی لکھنویؒ کا استفسار اور اس کا مفصل جواب اس سوال و جواب پر بیاض ختم ہو گئی ہے۔

اس بیاض میں ایک تحریر حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ہے اس کے آخر میں ہے من افادات الشیخ الاجل ولی اللہ قدس سرہٗ نقلتها من خطہ الشریف — یعنی یہ شیخ اعظم حضرت شاہ ولی اللہؒ کے افادات میں سے ہے جس کو میں نے اُن کی دستخطی تحریر سے نقل کیا ہے۔

بیاض کے دو صفحوں میں تفسیری و تجویدی مضامین و تحقیقات ہیں — ایک مراسلہ قاضی محمد اعلیٰ تھانویؒ (مؤلف کشاف اصطلاحات الفنون) کے نام ہے جس میں قرأت سے متعلق ایک تحقیقی جواب تحریر فرمایا ہے اس کے آخر میں ہے:۔

هٰذا ما قال بفمہ وکتب بقلمہ الفقیر الی اللہ عبد العزیز الدهلوی العمری عفی اللہ عنہ —

---

[1] اعتماد الدولہ غلام حیدر خاں ابن رفعت الدولہ بخشی رفعت اللہ خاں بہادر نصرت جنگ عباسی کاکوروی مولانا محمد فاخر الہ آبادی سے علم حاصل کیا۔ سرکار اودھ میں بڑے منصب پر فائز تھے ۱۲۵۲ھ میں وفات پائی۔ (تذکرۂ مشاہیر کاکوری)

[2] شیخ حسن بن ابراہیم الحسینی المودودی اللکھنوی طریقۂ قادریہ کے مجاز اور کئی کتابوں کے مصنف تھے ۱۲۴۱ھ میں لکھنؤ میں انتقال ہوا (نزہۃ الخواطر جلد ۷)

اس کے بعد مولانا رشید الدین دہلویؒ کی یہ عبارت ہے۔

هٰذہٖ من اسئلۃ کتبها الشیخ الاجل الاجلیل الشیخ عبد العزیز

الی قاضی محمد اعلیٰ۔

اس بیاض کا جتنا حصہ میں نے نقل کیا ہے اس میں انتخاب و تلخیص کرتے ہوئے اصل فارسی یا عربی عبارت کو درج کرکے اُس کا ترجمہ پیش کروں گا ــــــــ یہ بھی عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس بیاض کی جتنی تحریریں ہیں وہ نادر و غیر مطبوعہ ہیں سوائے چند کے جو فتاوی عبد العزیز، حیاتِ ولی اور آثار الصنادید میں موجود ہیں اگر ایسے ایک دو مضمون نظم و نثر آئیں گے تو یا تو مطبوعہ کی غلطی کا اظہار کرنے کے لئے یا اسکی افادیت اور اہمیت کو پیشِ نظر رکھ کر ناظرین کو اسکے مفہوم سے واقف کرنے کے لئے ـــــ

اب میں بیاض کے مندرجہ مکاتیب شاہ عبد العزیزؒ میں سے اُن مکاتیب کو سامنے لا رہا ہوں جو شاہ اہل اللہؒ (عم شاہ عبد العزیزؒ) و شاہ نور اللہؒ (خسر شاہ عبد العزیزؒ) کے نام ہیں ــــــ ان کے بعد شاہ اہل اللہؒ کے مکتوبات بنام شاہ عبد العزیزؒ کا اندراج ہوگا۔ ان خطوط سے تاریخ کے بہت سے گوشے واضح ہوں گے۔

مکتوب شاہ عبد العزیزؒ اپنے چچا شاہ اہل اللہؒ کے نام

(بزبان عربی منظوم)

الی المجلس المحفوف بالمکارم
والمعالی اعنی بہ سیدنا
وسندنا ومعتمدنا مکان الروح
فی جسدنا و ذخیرۃ یومنا،
ولغدنا سیدنا العم سلمہ
اللّٰہ تعالیٰ ظلالہ عن الافول

سیدنا و سندنا عم محترم حضرت شاہ اہل اللہ مد ظلہ، کی خدمت میں ـــــ

وأحلّه محال القبول۔ آمین

بعد رفع السلام والاکرام	بعد سلام مسنون یہ گنہگار فقیر
یقول الفقیر ذو الآثام	عرض کرتا ہے۔
انّ ھٰذا الفقیر محفوظٌ	کہ میں بحمد اللہ زمانے کے
عن شرور الزمان الاسفاءَ	شرور سے محفوظ ہوں
یسئل اللہَ بعد کلِّ صلوٰۃٍ	ہر نماز کے بعد میں اللہ تعالےٰ
ان یعافیہ فائضُ الانعام	سے عافیت کا سوال کرتا ہوں
ویعافی جمیعَ رفقہٖ	نیز یہ دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ
من ذُکورٍ ونسوۃٍ وغُلاءَ	تمام رفقاء ومتعلقین کو عافیت سے رکھے
خصوصاً جناب حضرتکم	خصوصاً جناب عالی کو تمام بلاؤں
من جمیع البلاء والآلام	اور مصیبتوں سے محفوظ رکھے
ثمّ انّ البلادَ فاسدۃٌ	اس کے بعد عرض ہو کہ ہماری طرف کے علاقے
من ایادی الغشوم والظلاءَ	ظلم وستم کے ہاتھوں برباد ہو رہے ہیں
غیر خافٍ علیک ماصنعت[1]	آپ پر یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ ایک
قومُ سکّہٖ بجانب التونساءَ	قوم نے تونشام کی جانب کیا کچھ کیا ہے

---

[1] حیات ولی صفحہ ۳۳۵ و ۳۳۶ پر یہ منظوم مکتوب پورا درج ہے مگر اس میں کاتب کے قلم سے اور غالباً کچھ مؤلف کے تصرفات سے اغلاط ہیں چنانچہ اس شعر کے دوسرے مصرعے کو یوں لکھا ہے:۔

ع قوم سکہ کا یت التوشام ــــ بجانب کا کا یت بنا دیا گیا ــــ تونشام مغربی پنجاب کا ایک شہر ہے ملاحظہ ہو معیار الاوقات مؤلفہ پروفیسر عبد الواسع مرحوم شعر کے غلط چھپنے اور تونشام کے معنی معلوم نہ ہونے کی وجہ سے اس کا سمجھنا مشکل تھا حضرت مولانا گیلانیؒ کو بھی اس شعر کا مطلب سمجھنے میں اسی بنا پر دقت پیش آئی۔ مولانا گیلانیؒ نے اپنی ذہانت کی مدد سے اسکا مطلب بیان کرنے کے بعد یہ نوٹ دیا ہے "جہاں تک تصحیح عقلاً ممکن تھی کی گئی...... اس لفظ کا صحیح مطلب سمجھ میں نہیں آیا" الخ (الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر صفحہ ۱۰) حضرت گیلانیؒ کی زندگی میں یہ تصحیح سامنے آجاتی تو وہ کس قدر مسرور ہوتے؟

خفضوا کلّ قریۃٍ ومضوا	اُس نے آبادیوں کو پست
یفتحون الحصون والآطامِ	کر دیا اور قلعے فتح کر لئے
نھبوا عُدّۃً من الاموال	کتنا کچھ مال لوٹ لیا اور
اوثقوا عِدّۃً من الایامِ	کتنے ہی نفوس قید کر لئے

مکتوب شاہ عبد العزیزؒ ـــــ بنام شاہ اہل اللہ (کچھ حصّہ)

..... وبعد فانی احمد اللہ	بعد سلام مسنون عرض ہے کہ میں
علی ما کسانی من سرابیل الصحۃ	اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اس
وقُمصِ العافیۃ واطعمنی	احسان پر کہ اُس نے مجھے صحت و عافیت
اقوات الامن والرزق	کا لباس پہنایا اور امن و رفاہیت
الرفاھیۃ وانّھا نعمۃٌ	سے نوازا ـــ دراصل یہ ایک بڑی نعمت
عظیمۃٌ ومنحۃٌ جسیمۃٌ	ہے جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے نصیب
کما قیل ؎	ہو۔ ایک شاعر کہتا ہے :-
وما العیش الّا فی الخمول مع الغنی	اصل زندگی تو یہ ہے کہ گوشۂ گمنامی
وعافیۃٍ یغدو بھا ویروح	ہو اور غنیٰ و عافیت صبح و شام نصیب ہو
بید ان قرۃ العین عائشۃ	نورِ چشمی عائشہ سلمہا اللہ تعالیٰ
سلمہا اللہ تعالیٰ کانت	بیمار تھی اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا کہ
ذات علۃٍ فتفضل اللہ تعالیٰ	بیماری کا بڑا حصہ زائل ہو گیا اور جو کچھ
بازالۃ اکثرھا وھو المرجو	بیماری کا اُثر باقی رہ گیا ہے اللہ ہی سے
لازالۃ غُبرِھا الخ	امید ہے کہ وہ اس کو بھی زائل فرمادے گا۔

مکتوب شاہ عبد العزیزؒ ـــــ بنام شاہ نور اللہ

(بعد السّلام) بعد سلام ـــــ ......

قد ورد علینا مکتوبکم المکرم۔

(سات سطروں کے بعد)

ان الاکابر قد استقرت
آراؤہم ... متوکّلاً علی اللہ
إلی البدھانہ بعد ان
کانت طائفۃٌ منھم
لا یطمع للاقامۃ ھنالک
لانھا مدعی البغضا والشحنا
إلی اھالی تلک الاطراف
والاملاک وطائفۃ
رجح تلک المواضع علی کل
مکان سواھا وتغمض
عن مفاسدھا ومنافع
غیرھا واما الفقیر فالبلدان
عندہ ھُما ماھما الخ

بڑوں کی رائیں متوکلاً علی اللہ
بڈھانہ رہنے کی ہو رہی ہیں۔
البتہ ان کا ایک طبقہ وہاں
کی اقامت کو اس لئے پسند
نہیں کرتا کہ کہیں وہاں کی
سکونت وہاں کے رہنے والوں
کے بغض و حسد کا باعث نہ
بن جائے۔ ایک گروہ ہر
حال میں انھیں مقامات
(بڈھانہ وغیرہ) کو ترجیح
دیتا ہے نفیر کے نزدیک
دو شہر ہیں اور وہ ذہن
میں ہیں۔

مکتوب شاہ عبدالعزیزؒ ——— بنام شاہ نوراللہ صدیقی پھلتیؒ

...... من الفقیر عبدالعزیز
بعد رفع السلام والغرام
..... انّ ھذا الفقیر مع
جمیع توابعہ ولواحقہ
داخلٌ فی حوزۃ العافیۃ
نائمٌ فی مھد الرفاھیۃ
بیدان قرۃ العین فلان

فقیر عبدالعزیز بعد سلام و اظہار
اشتیاق عرض پرداز ہے کہ میں
تمام متعلقین و لاحقین کے ساتھ
امن و عافیت سے ہوں۔ البتہ
برخوردار ...... سلمہ اللہ الصمد
کے دونوں ہاتھوں پر سرخی
اور کھجلی ہو گئی ہے۔ اور

سلمہ اللہ الصمد قد مدّ	اسی کے باعث اُن کو بخار ہوگیا۔
علیٰ یدیہ الحمرۃ والجرب	نورچشمی ..... سلمہا اللہ تعالےٰ کو
وعرضت لہ بذلک الحمّیٰ	بہت سے امراض نے چاروں
وماتبعہامن الاذیٰ	طرف سے گھیر لیا تھا ان میں سے
والتعب واَمّا قرۃ العین	چند یہ ہیں ـــ اسہال ،
فلانتہ سلمہا اللہ تعالیٰ	سوء القنیہ[1]، کھانا کھانے کے
فقد کان احاطت بہا	بعد نفخ ، بدہضمی ـــ اللہ تعالیٰ
الامراض من کلّ جانب	نے اپنے فضل سے ان میں سے
منہا الاسہال وسوءُ القنیۃ	بہت سے امراض کو زائل
والنفخ عند تناول الغذاء	کردیا جو باقی رہ گئے ہیں
وسوءُ الہضم فازال اللہ	ان کو بھی امید قوی ہے کہ
بفضلہ اکثرھا وھوالمرجو	وہی رفع فرمائے گا ـــ
لازالۃ غیرھا ـــ فالملتمس	آپ سے یہ التماس ہو کہ
من مجلسکم السامی لازال	آپ ان دونوں کی شفاء
سامیا ان یدعو اللہ	کے لئے دعا فرمئیں ـــ
لشفائہما ـــ ومن	ان دونوں اللہ تعالےٰ کے
اجلّ نعم اللہ فی ھذہ	بڑے انعامات میں سے
الایام مارد اللہ کید الکفرۃ	ایک انعام یہ ہے کہ اس
فی نحورھم وحفظنا من	نے دشمنان دین کے حیلوں
شرورھم ذلک ان	کو انھیں کی طرف پلٹ دیا
جماعۃ من السکہہ قصدوا	اور ہم کو ان کے شر سے

[1] فساد خون کی وہ نوعیت جو مرض استسقاء کا مقدمہ ہوتی ہے۔ اصطلاحِ طب میں سوء القنیہ کہلاتی ہے۔

اوطانهم بعد ما قضوا
من بلاد جات اوطارهم
فوردوا في اثناء السبيل
على هذا البلد الذي
ليس له سوى الله حافظ
ولا كفيل فارادوا منه
ما يريدون من غيره
من البلاد فحال الله
تعالى بينهم وبين
ما يشتهونه من النهب
والفساد ونهض
افضل خان وغيره
من رؤساء البلد لمقابلتهم
ودفعهم فلم يتعرضوهم ومضوا
بسبيلهم وكفى الله المؤمنين
القتال وكان الله قويا عزيزا.
ولكن مرورهم في تلك الاطراف
وعبورهم على بلاد المسلمين الضعاف
يشوّشنا ويدفعه ما شاهدناه
من لطيف صنع الله وعسى
ان لا يكون لهم سلطان
عليهم ان شاء الله تعالى.

محفوظ رکھا ــــ ایک جماعت سکھ
نے جاٹوں کے علاقے پر کامیاب
چھاپہ مارنے کے بعد جب اپنے
وطنوں کا قصد کیا تو اثنائے راہ
میں ہمارے اس شہر سے ہو کر گذرے
جس کا حافظ و والی سوائے اللہ تعالیٰ
کے کوئی نہیں۔ اس شہر میں پہونچ کر
انھوں نے حسب عادت غارتگری
کا ارادہ کیا اللہ تعالیٰ نے اُن
کا ارادہ پورا نہ ہونے دیا،
افضل خاں وغیرہ رؤسائے شہر
اُن کے مقابلے کے لئے کھڑے
ہو گئے پھر تو ان کو مجالِ مقاومت
نہ ہوئی اور اپنا راستہ اختیار کیا۔
"اللہ تعالیٰ نے مومنین سے قتال کی نوبت
نہ آنے دی۔ اللہ تعالیٰ زبردست اور غالب
ہے اگرچہ دشمنان دین کا ان اطراف سے
گزرنا اور ضعیف مسلمانوں کے شہروں سے عبور
کرنا اور تشویش پیدا کرتا ہو مگر اللہ تعالیٰ کی
اس طرح کی نصرت دیکھ کر تشویش ختم ہوجاتی ہے۔
اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے توقع یہی ہو
کہ ان لوگوں کو اہل اسلام پر غلبہ نہیں ہوگا
انشاء اللہ تعالیٰ۔

(حضرت مولانا محمد شفیع مدظلہٗ، مفتی اعظم پاکستان)

(یہ مقالہ ۱۲ فروری کو راولپنڈی کی بین الاقوامی اسلامی کانفرنس میں پڑھا گیا تھا ———)

الحمد للّٰہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔

"تقسیم دولت" کی بحث معاشی زندگی کے ان اہم ترین مباحث میں سے ایک ہے جنھوں نے آج کی دنیا میں عالمگیر انقلابات کو جنم دیا ہے، اور عالمی سیاست سے لے کر ایک فرد کی نجی زندگی تک ہر شعبہ اس سے متاثر ہوا ہے۔ صدیوں سے اس موضوع پر زبانی قلمی اور حربی معرکے گرم ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ "وحی الٰہی" کی رہنمائی کے بغیر نری عقل کے بل پر اس موضوع کے سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس نے اس الجھی ہوئی ڈور کے خم و پیچ میں کچھ اور اضافہ کر دیا ہے۔

زیرِ قلم مقالے میں پیش نظر یہ ہے کہ قرآن و سنت اور مفکرین اسلام کی کاوشوں سے اس معاملے میں "اسلام" کا جو نقطۂ نظر سمجھ میں آتا ہے اسے واضح کیا جائے۔ وقت کی تنگی اور صفحات کے محدود ہونے کی وجہ سے یہ تو ممکن نہیں ہے کہ اس موضوع کو پورے بسط اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ البتہ اس کے اہم نکات کو اختصار مگر جامعیت کے ساتھ عرض کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

قرآن و سنت اور اسلامی فقہ سے "تقسیم دولت" کے بارے میں اسلام کا جو موقف احقر نے سمجھا ہے اسے بیان کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کچھ بنیادی باتیں واضح کر دی جائیں جو اسلامی معاشیات کے تقریباً ہر مسئلے میں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں، انھیں آپ "نظریہ"

تقسیم دولت کے اصول" کہہ لیجئے اس کا "فلسفہ" سمجھ لیجئے یا اس نظریئے کے تقاضے قرار دیجئے بہرحال یہ چند وہ باتیں ہیں جو قرآن کریم سے اصولی طور پر سمجھ میں آتی ہیں اور اسلام کے معاشی طرزِ فکر کو غیر اسلامی معاشیات سے ممتاز کرتی ہیں۔

معاشی مسئلہ کا مقام | اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام رہبانیت کا مخالف ہے اور انسان کی معاشی سرگرمیوں کو جائز، مستحسن، بلکہ بسا اوقات واجب اور ضروری قرار دیتا ہے۔ انسان کی معاشی ترقی اس کی نگاہ میں پسندیدہ ہے اور "کسب حلال" اس کے نزدیک "فریضۃ بعد الفریضۃ" یعنی دوسرے درجہ کا فرض قرار دیتا ہے لیکن ان تمام باتوں کے ساتھ یہ حقیقت بھی اتنی ہی صداقت رکھتی ہے کہ اس کی نظر میں انسان کا بنیادی مسئلہ "معاش" نہیں ہے اور نہ معاشی ترقی اس کے نزدیک انسان کا مقصدِ زندگی ہے۔

معمولی سوجھ بوجھ سے یہ حقیقت سمجھ میں آسکتی ہے کہ کسی کام کا جائز، مستحسن یا ضروری ہونا ایک الگ بات ہوتی ہے۔ اور اس کا مقصد زندگی اور محور فکر و عمل ہونا بالکل جدا چیز ——

اسلامی معاشیات کے معاملے میں بہت سی غلط فہمیاں ان ہی دو چیزوں کو خلط ملط کرنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے پہلے قدم پر اس بات کا صاف ہو جانا ضروری ہے۔ درحقیقت اسلامی معاشیات اور مادی معاشیات کے درمیان ایک بڑا گہرا بنیادی اور دور رس فرق یہی ہے کہ مادہ پرستانہ معاشیات میں "معاش انسان کا بنیادی مسئلہ" اور معاشی ترقیات اس کی زندگی کا منتہائے مقصود ہیں۔ اور اسلامی معاشیات میں یہ چیزیں ضروری اور ناگزیر سہی لیکن انسان کی زندگی کا اصل مقصد نہیں ہیں۔ اس لیے جہاں ہمیں قرآن کریم میں "رہبانیت" کی مذمت اور "وابتغوا من فضل اللہ" کے احکام ملتے ہیں۔ جہاں ہمیں تجارت کے لیے "فضل اللہ" اموال کے لیے "خیر" اور "التی جعل اللہ لکم قیاماً" خوراک کے لیے "الطیبات من الرزق" لباس کے لیے "زینۃ اللہ" رہائش کے لیے "سکن" کے احترامی القاب ملتے ہیں۔ وہاں دنیوی زندگی کے لیے "متاع الغرور" کے الفاظ بھی نظر آتے ہیں اور ان سب چیزوں کے لیے "الدنیا" کا لفظ ملتا ہے جو اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے کچھ اچھا تاثر نہیں دیتا اور قرآن کریم کے مجموعی اسلوب سے بھی اس کی ذلت اور حقارت سمجھ میں آتی ہے۔

کوتاہ نظری اس موقع پر تضاد کا شبہ پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن درحقیقت اس کے پیچھے اصل راز یہی ہے کہ قرآن کریم کی نظر میں تمام وسائل معاش انسان کی رہگذر کے مرحلے ہیں۔ اس کی اصل منزل درحقیقت ان سے آگے ہے، اور وہ ہے کردار کی بلندی اور اس کے نتیجے میں آخرت کی بہبود۔ انسان کا اصل مسئلہ اور اس کی زندگی کا بنیادی مقصد ان ہی دو منزلوں کی تحصیل ہے لیکن چونکہ ان دو منزلوں کو دنیا کی شاہراہ سے گزرے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے وہ تمام چیزیں بھی انسان کے لیے ضروری ہو جاتی ہیں جو اس کی دینوی زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ چنانچہ جب تک وسائل معاش انسان کی اصلی منزل کے لیے رہگذر کا کام دیں وہ "فضل اللہ" "خیر" "زینۃ اللہ" اور "سکن" ہیں۔ لیکن جہاں انسان اسی رہگذر کی بھول بھلیوں میں الجھ کر رہ جائے اور اس پر اپنی اصل منزل مقصود کو قربان کر ڈالے یا بالفاظ دیگر وسائل معاش کو "رہگذر" بنانے کے بجائے اپنی منزل مقصود کے راستے میں رکاوٹ بنا دے تو پھر یہی وسائل معاش ــــ "متاع الغرور" "فتنہ" اور "عدو" بن جاتے ہیں۔

قرآن کریم نے ایک مختصر جملے "وابتغ فی ما آتاک اللہ الدار الآخرۃ" میں اس بنیادی حقیقت کو بیان فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ اس مضمون کی بہت سی آیات ہیں۔ اہل علم کے سامنے تمام آیات کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ احقر کی رائے میں "انسانی معاش" کے متعلق قرآن کریم کی یہ روش اور اس کے دو مختلف پہلو نظر میں رہیں تو اسلامی معاشیات کے بہت سے مسائل حل کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

دولت اور ملکیت کی حقیقت دوسری بنیادی بات جو خاص طور سے "تقسیم دولت" کے مسئلے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے یہ ہے کہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق "دولت" خواہ کسی شکل میں ہو، اللہ کی پیدا کردہ اور اصلاً اسی کی ملکیت ہے۔ انسان کو کسی چیز پر ملکیت کا جو حق حاصل ہوتا ہے وہ اللہ ہی کی عطا سے ہوتا ہے۔ سورہ نور میں قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

وآتوھم من مال اللہ الذی آتاکم۔	اور انھیں اللہ کے اس مال میں سے دو جو اس نے تم کو عطا کیا ہے۔

اس کی وجہ بھی قرآن کریم نے ایک دوسری جگہ بتلا دی ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ یہی

نہ کر سکتا ہے کہ عمل پیدائش میں اپنی کوشش صرف کرے لیکن اس کوشش کو بار آور کرنا اور اس سے پیداوار کا مہیا کرنا خدا کے سوا کون کر سکتا ہے۔ انسان کے بس میں اتنا ہی تو ہے کہ وہ زمین میں بیج ڈال دے لیکن اس میں بیج کو کونپل اور کونپل کو درخت بنانا تو کسی اور ہی کا کام ہے ارشاد ہے:۔

أفرأيتم ما تحرثونه أأنتم تزرعونه	دیکھو تو جو کچھ تم کاشت کرتے ہو، کیا تم اسے
أم نحن الزارعون	اگاتے ہو یا ہم ہیں اگانے والے۔

نیز ارشاد ہے:۔

اولم یروا انا خلقنا لھم مما	کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کیلئے
عملت ایدینا انعاما فھم لھا	جانوروں کو اپنے ہاتھ سے بنا کر پیدا کیا پھر
مالکون۔	وہ ان کے مالک بن گئے۔

یہ تمام آیات اس بنیادی نکتے پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالتی ہیں کہ دولت خواہ کسی شکل میں ہو، اصلاً اللہ کی ملکیت ہے، اور اسی کی عطا سے انسان کو ملی ہے۔ پھر اسلام کی نظر میں چونکہ "دولت" پر اصل ملکیت اللہ کی ہے اور اس نے انسان کو اس میں تصرف کرنے کا حق عطا کیا ہے اس لیے اسی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس دولت پر انسان کے تصرفات کو اپنی مرضی اور مصالح عالم کا پابند بنائے۔ چنانچہ انسان کو اپنی زیر تصرف اشیاء پر "ملکیت" تو حاصل ہے مگر یہ ملکیت آزاد خود مختار اور بے لگام نہیں ہے۔ اس پر "دولت" کے اصل مالک کی طرف سے کچھ حدود وقیود اور پابندیاں عائد ہیں۔ جس جگہ وہ اس دولت کو خرچ کرنے کا حکم دیدے وہاں اس کے لیے خرچ کرنا ضروری ہے اور جہاں خرچ کی ممانعت کر دے، وہاں رک جانا لازم ہے۔ اسی بات کو سورۂ قصص میں زیادہ وضاحت کے ساتھ کھول دیا گیا ہے۔

وابتغ فیما آتاک اللہ الدار الآخرۃ	جو تجھ کو اللہ نے دیا ہے اس سے پچھلے گھر
ولا تنس نصیبک من الدنیا و	(آخرت) کا توشہ کمالے اور دنیا سے اپنا
احسن کما احسن اللہ الیک ولا	حصہ نہ بھول اور بھلائی کر جیسے اللہ نے
تبغ الفساد فی الارض۔	تجھ سے بھلائی کی اور ملک میں خرابی ڈالنی مت چاہ۔

ان آیات نے اسلام کے فلسفۂ ملکیت کو خوب کھول کر بیان فرما دیا ہے۔ ان سے مندرجہ ذیل ہدایات واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

۱۔ انسان کے پاس جو کچھ دولت ہے وہ اللہ کی دی ہوئی ہے (آتاک اللہ)

۲۔ انسان کو اس کا استعمال اس طرح کرنا ہے کہ اس کی منزلِ مقصود دار آخرت ہو۔ (وابتغ .... الدار الآخرة)

۳۔ چونکہ دولت اللہ کی دی ہوئی ہے۔ لہٰذا اس پر انسان کا تصرف حکمِ خداوندی کے تابع ہوگا۔ اب حکمِ خداوندی کی دو شکلیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ انسان کو اس بات کا حکم دیتے کہ یہ مال کسی دوسرے کو دیدو۔ اس کی تعمیل اس لیے ضروری ہے کہ اللہ نے تم پر احسان کیا ہے تو وہ تمہیں دوسرے پر احسان کا حکم دے سکتا ہے (واحسن کما احسن اللہ الیک)

۴۔ دوسری شکل یہ ہے کہ وہ تم کو اس دولت کے کسی تصرف سے منع کرے۔ اس کا بھی اس کو اختیار ہے کیونکہ وہ تمہیں دولت کے کسی ایسے استعمال کی اجازت نہیں دے سکتا جس سے اجتماعی خرابیاں پیدا ہوں اور زمین میں شر و فساد پھیلے (ولا تبغ الفساد فی الارض)

یہی وہ چیز ہے جو اسلام کو سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے نظریۂ ملکیت سے ممتاز کرتی ہے۔ سرمایہ داری کا ذہنی پس منظر چونکہ نظری یا عملی طور پر مادیت ہے اس لیے اس کے نزدیک انسان کو اپنی دولت پر آزاد اور خود مختار ملکیت حاصل ہے۔ وہ اس کو جس طرح چاہے رکھ سکتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے قوم شعیب علیہ السلام کا ایک مقولہ نقل فرماتے ہوئے اس نظریے کی مذمت کے پیرائے میں ذکر کیا ہے۔ وہ لوگ کہا کرتے تھے۔

اصلاتک تامرک ان نترک	کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات کا حکم دیتی ہے
ما یعبد آباءنا او ان نفعل	کہ ہم اپنے باپ دادوں کے معبودوں کو چھوڑ
فی اموالنا ما نشاء	دیں یا اپنے اموال میں اپنی مرضی کے مطابق
(سورۂ ہود)	تصرف کرنا ترک کر دیں۔

وہ لوگ چونکہ "اموال" کو حقیقۃً اپنا (اموالنا) سمجھتے تھے اس لیے نفعل ما نشاء (جو چاہیں کریں) کا دعویٰ اس کا لازمی نتیجہ تھا۔ یہی فکر سرمایہ داری کی روح ہے۔ اور قرآن کریم نے

سورۂ نور میں "اموالنا" (اپنے اموال) کے لفظ کو "مال اللہ" (اللہ کا مال) سے بدل کر سرمایہ دارانہ فکر کی اس بنیاد پر ضرب لگائی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی "الذی آتاکم" (جو تمہیں دیا ہے) کی قید لگا کر اشتراکیت کی بھی جڑ کاٹ دی ہے۔ جو سرے سے انسان کی انفرادی ملکیت ہی کا انکار کرتی ہے۔ اسی طرح سورۂ یٰسین کی آیت "فہم لہا مالکون" نے بذریعہ عطا رحق تعالیٰ انفرادی ملکیت کو واضح کر دیا ہے۔

اب اسلام، سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان واضح خط امتیاز اس طرح کھینچا جا سکتا ہے کہ:

سرمایہ داری —— آزاد اور خود مختار انفرادی ملکیت کی قائل ہے۔
اشتراکیت —— انفرادی ملکیت کا سرے سے انکار کرتی ہے۔

اور حق ان دو انتہاؤں کے درمیان ہے یعنی:

اسلام —— انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے۔ مگر یہ ملکیت آزاد اور خود مختار نہیں جس سے "فساد فی الارض" پھیل سکے۔

تقسیم دولت کے اسلامی مقاصد | اسلام نے تقسیم دولت کا جو نظام مقرر کیا ہے اور جس کا خاکہ ان شاء اللہ آگے پیش کیا جائے گا۔ قرآن کریم پر غور کرنے سے اس کے تین مقاصد معلوم ہوتے ہیں۔

(الف)۔ ایک قابل عمل نظام معیشت کا قیام —— تقسیم دولت کا سب سے پہلا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ دنیا میں معیشت کا ایک ایسا نظام نافذ کیا جائے جو فطری اور قابل عمل ہو اور جس میں ہر انسان، جبر و تشدد کی بجائے قدرتی طور پر اپنی لیاقت، اپنی استعداد، اپنے انتخاب اور اپنی پسند کے مطابق خدمات انجام دے تاکہ اس کی خدمات زیادہ موثر، مفید اور صحت مند ہوں۔ اور یہ بات مستاجر (جسے مروجہ معاشی اصطلاح میں آجر کہا جاتا ہے) اور "آجر" کے صحت مند رشتے اور "رسد" و "طلب" کی فطری قوتوں کے صحیح استعمال[1] کے بغیر

[1] صحیح استعمال کی قید اس لیے لگائی گئی ہے کہ ان قوتوں کا غلط استعمال بھی ممکن ہے اور سرمایہ داری میں ہوتا رہا ہے۔ اسلام نے انفرادی ملکیت کی بے لگامی کو ختم کر کے اس غلط استعمال کی بیخ کنی کی ہے۔

ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اسلام نے انہیں تسلیم کیا ہے۔

ا۔ اس بات کی طرف مندرجہ ذیل آیات میں جامع اشارہ فرمایا گیا ہے۔

نحن قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیوۃ	ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت کو دنیوی
الدنیا ورفعنا بعضھم فوق	زندگی میں تقسیم کیا ہے اور ان میں سے بعض
بعض درجات لیتخذ بعضھم	کو بعض پر درجات کے اعتبار سے فوقیت
بعضا سخریا۔	دی ہے تاکہ ان میں سے ایک دوسرے سے
......	کام لے سکے۔

ب۔ حق کا حقدار کو پہونچانا ــــــ اسلام کے نظام تقسیم دولت کا دوسرا مقصد حق کا حقدار کو پہونچانا ہے لیکن اسلام میں استحقاق کا معیار دوسرے نظام ہائے معیشت سے قدرے مختلف ہے۔ مادی معاشیات میں دولت کے استحقاق کا صرف ایک راستہ ہوتا ہے اور وہ ہے عمل پیدائش میں شرکت، جتنے عوامل دولت کی پیدادار میں شریک ہوتے ہیں انھیں کو دولت کا مستحق سمجھا جاتا ہے، اور بس! اس کے برخلاف اسلام کا بنیادی اصول، چونکہ یہ ہے کہ دولت اصلاً اللہ کی ملکیت ہے اور وہی اس کے استعمال کے قوانین مقرر فرماتا ہے اس لیے اسلام میں دولت کے حقدار صرف عاملین پیدائش ہی نہیں ہوتے بلکہ ہر وہ شخص بھی دولت کا مستحق ہے جس تک دولت کا پہونچانا اللہ نے ضروری قرار دیا ہے ــــ لہٰذا فقراء و مساکین اور معاشرے کے نادار اور بےکس افراد بھی دولت کے حقدار ہیں، اس لیے کہ جن عوامل پیدائش پر اولاً دولت تقسیم ہوتی ہے ان کے ذمے اللہ نے لازم کیا ہے کہ وہ ان تک اپنی دولت کا کچھ حصہ پہونچائیں اور قرآنی تصریحات کے مطابق یہ مفلسوں اور ناداروں پر ان کا کوئی احسان نہیں ہے، بلکہ وہ فی الواقع دولت کے مستحق ہیں۔ ارشاد ہے:

فی اموالھم حق معلوم	اور ان کے اموال میں سائل اور محروم کا ایک
للسائل والمحروم۔	متعین حق ہے۔

اس حق کو بعض مقامات پر اللہ کا حق قرار دیا گیا ہے کھیتوں کے بارے میں فرمایا جاتا ہے:

وآتوا حقہ یوم حصادہ	اور اس (کھیتی) کے کٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو۔

ان دونوں آیتوں میں "حق" کا لفظ ظاہر کر رہا ہے کہ استحقاق دولت کا ماخذ صرف عمل پیدائش ہی نہیں ہے بلکہ مفلس و نادار افراد بھی دولت کے ٹھیک اس طرح مستحق ہیں جس طرح اس کے اوّلیں مالک ۔۔۔ لہٰذا اسلام دولت کو اس طرح تقسیم کرنا چاہتا ہے کہ اس سے تمام عوامل پیدائش کو ان کے عمل کا حصّہ بھی پہونچ جائے اور اس کے بعد ان لوگوں کو بھی ان کا حصّہ مل جائے جنھیں اللہ نے مستحق دولت قرار دیا ہے (ان دونوں قسم کے حقداروں کی تفصیل آگے انشاء اللہ آئے گی)

ج: ارتکازِ دولت کی بیخ کنی ۔۔۔ تقسیم دولت کا تیسرا مقصد جس کو اسلام نے بہت اہمیت دی ہے یہ ہے کہ دولت کا ذخیرہ چند ہاتھوں میں سمٹنے کی بجائے معاشرے میں زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر گردش کرے۔ اور اس طرح امیر و غریب کا تفاوت جس حد تک فطری اور قابلِ عمل ہو کم کیا جائے۔ اس سلسلے میں اسلام کا طرزِ عمل یہ ہو کہ دولت کے جو اوّلیں ماخذ اور دہانے ہیں ان پر اس نے کسی فرد یا جماعت کا پہرا نہیں بیٹھنے دیا بلکہ معاشرے کے ہر فرد کو ان سے استفادے کا مساوی حق دیا ہے، کانیں، جنگل اور غیر مملوکہ بنجر زمینیں، جنگل اور پانی کا شکار، خودرو گھاس، دریا اور سمندر، مال غنیمت وغیرہ یہ تمام پیدائشِ دولت کے اوّلیں ماخذ ہیں، اور ان میں ہر فرد کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ان سے اپنے کسب و عمل کے مطابق فائدہ اٹھائے اور اس پر کسی کی اجارہ داری قائم نہ ہو۔

کیلا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم ۱	تاکہ (یہ دولت) تم میں سے صرف مالداروں کے درمیان دائر ہو کر نہ رہ جائے۔

اس کے بعد جہاں انسانی عمل کی ضرورت پیش آتی ہے اور کوئی شخص اپنے کسب و عمل سے کوئی دولت حاصل کرتا ہے تو وہاں اس کے کسب و عمل کا احترام کر کے اس کی ملکیت

---

۱ واضح رہے کہ یہ آیت مال غنیمت کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جو حصولِ دولت کے اوّلین ماخذ میں سے ہے۔

کو تسلیم کیا گیا ہے اور اس میں ہر ایک کو اس کے کسب و عمل کے مطابق حصّہ دیا گیا ہے اور اس سلسلے میں ارشاد یہ ہے کہ:

نحن قسمنا بینهم معیشتهم ورفعنا	ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت کو تقسیم
بعضهم فوق بعضٍ درجات	کیا ہے اور ان میں سے بعض کو بعض پر
لیتخذ بعضهم بعضاً سخریا۔	درجات کی فوقیت دی ہے تاکہ ایک
....	دوسرے سے کام لے سکے۔

لیکن درجات کے اس فرق کے باوجود کچھ ایسے احکام دیدیے گئے ہیں کہ یہ فرق اس قدر رہے جتنا ایک قابل عمل نظم معیشت کے قیام کے لیے ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ دولت کا ذخیرہ صرف چند ہاتھوں میں سمٹ آرہے۔

تقسیم دولت کے ان تین مقاصد میں سے پہلا مقصد اسلامی معیشت کو اشتراکیت سے ممتاز کرتا ہے۔ تیسرا مقصد سرمایہ دارانہ نظام سے اور دوسرا دونوں سے جس کی تفصیل عنقریب عرض کی جائے گی۔

اسلامی نظمِ معیشت کے ان چند بنیادی اصولوں کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اب میں مختصراً تقسیم دولت کا وہ نظام بیان کرنے کی کوشش کروں گا جو قرآن و سنت اور فقہاء امت کی کاوشوں سے سمجھ میں آتا ہے۔

تقسیم دولت کا سرمایہ دارانہ نظریہ اسے پوری طرح سمجھنے کے لیے سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں "تقسیم دولت" کا جو نظام مقرر کیا گیا ہے۔ پہلے اس پر ایک نظر ڈال لینا مناسب ہوگا۔ مختصر لفظوں میں اس نظریے کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ دولت ان ہی لوگوں پر تقسیم ہونی چاہیے جنہوں نے اس کی پیداوار میں حصہ لیا ہے اور جنہیں معاشی اصطلاح کے مطابق "عاملین پیداوار" کہا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشیات میں یہ کل چار عوامل ہیں۔

۱۔ سرمایہ ـــــ جس کی تعریف "پیدا کردہ ذریعہ پیدائش" سے کی گئی ہے۔ یعنی وہ شے جس پر ایک مرتبہ انسانی عمل پیدائش ہو چکا ہو۔ اور اسے ایک دوسرے عمل

پیدائش کے لیے ذریعہ بنایا جا رہا ہو۔

۲. محنت ــــــ یعنی انسانی عمل۔

۳. زمین ــــــ جس کی تعریف "قدرتی وسائل" سے کی گئی ہے۔ یعنی وہ اشیاء جو انسان کے کسی سابقہ عمل پیدائش کے بغیر پیدائش کا وسیلہ بن رہی ہوں۔

۴. آجر یا منتظم، یعنی وہ چوتھا عامل جو مذکورہ بالا تینوں عوامل کو جوڑ کر انہیں کام میں لگاتا اور نفع و نقصان کا خطرہ مول لیتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں ان چار عاملین پیداوار کے مشترک عمل سے جو پیداوار ہوتی ہے، اس کو ان ہی چاروں پر اس طرح تقسیم کیا جاتا ہے کہ ایک حصہ سرمایہ کو سود کی شکل میں دیا جاتا ہے، دوسرا حصہ محنت کو اُجرت کی شکل میں دیا جاتا ہے، تیسرا حصہ زمین کو لگان یا کرایہ کی صورت میں ملتا ہے۔ اور چوتھا حصہ آجر کے لیے منافع کی صورت میں باقی رکھا جاتا ہے۔

تقسیم دولت کا اشتراکی نظریہ اس کے برخلاف اشتراکی معیشت میں چونکہ سرمایہ اور زمین کسی کی انفرادی ملکیت ہونے کی بجائے قومی ملکیت ہوتے ہیں۔ اس لیے سود اور لگان کا اس نظام کے فلسفے میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔[1] آجر بھی اشتراکی نظام میں کوئی فرد واحد ہونے کی بجائے خود حکومت ہوتی ہے۔ اس لیے منافع بھی اس کے یہاں نظری طور پر خارج از بحث ہے۔ اب صرف "محنت" رہ جاتی ہے۔ اور اشتراکی نظام میں دولت کی وہی مستحق ہے جو اُسے "اجرت" کی شکل میں ملتی ہے۔

تقسیم دولت کا اسلامی نظریہ اسلام کا نظام تقسیم دولت ان دونوں سے مختلف ہے۔ اس کے نزدیک دولت کے مستحقین دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک اوّلین مستحق، یعنی وہ لوگ جو کسی عمل پیدائش کے بعد بلا واسطہ اس کے مستحق ہوتے ہیں۔ یہ مستحقین وہی عوامل

---

[1] یہاں یہ واضح رہے کہ اس وقت گفتگو اشتراکیت کے اصل فلسفے سے ہو رہی ہے اس کے موجودہ عمل سے نہیں۔ اشتراکی ممالک کا موجودہ طرز عمل اس فلسفے سے بہت مختلف ہے۔

پیداوار ہیں جنھوں نے کسی پیداوار کے عمل پیدائش میں حصہ لیا۔ دوسرے ثانوی مستحقین یعنی وہ لوگ جو براہ راست عمل پیدائش میں شریک نہیں تھے لیکن عاملین پیدائش کے ذمے لازم کیا گیا ہے کہ وہ اپنی دولت میں ان کو بھی شریک کریں۔ یہاں مستحقین دولت کی ان دونوں قسموں کو ہم قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

دولت کا اوّلیں مستحق | جیسا کہ عرض کیا گیا۔ دولت کے اولین مستحق عوامل پیداوار ہوتے ہیں لیکن عوامل پیداوار کی تعیین ان کی اصطلاحات اور ان پر تقسیم دولت کے طریقے اسلام میں بعینہ وہ نہیں ہیں جو سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں مقرر کئے گئے ہیں۔ بلکہ بہت مختلف ہیں۔ اسلامی نظریے کے مطابق پیدائش کے حقیقی عوامل چار کے بجائے تین ہیں۔

۱۔ سرمایہ ـــــ یعنی وہ وسائل پیداوار جن کا عمل پیدائش میں استعمال اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ انھیں خرچ نہ کیا جائے یا ان کی شکل وصورت میں تبدیلی نہ کی جائے۔ اور اس لیے ان کا کرایہ پر چلانا ممکن نہیں ہے۔ مثلاً نقد روپیہ یا اشیائے خوردنی وغیرہ

۲۔ زمین ـــــ یعنی وہ وسائل پیداوار جن کا عمل پیدائش میں اس طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ ان کی اصلی شکل وصورت برقرار رہتی ہے اور اس لیے انھیں کرایہ پر دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً زمین۔ مکان۔ مشینری وغیرہ۔

۳۔ محنت ـــــ یعنی انسانی فعل، خواہ وہ اعضاء و جوارح کا ہو، یا ذہن اور قلب کا۔ لہٰذا اس میں تنظیم اور منصوبہ بندی بھی داخل ہے۔

ان تین عوامل کے مشترکہ عمل سے جو پیداوار ہوگی وہ اوّلاً انہی تینوں پر اس طرح تقسیم کی جائے گی کہ اس کا ایک حصہ سرمایہ کو بشکل منافع (نہ کہ بشکل سود) ملے گا۔ دوسرا حصہ بشکل کرایہ دیا جائے گا۔ اور تیسرا حصہ محنت کو بشکل اُجرت۔

اشتراکیت اور اسلام | تقسیم دولت کا یہ نظام اشتراکیت سے بھی مختلف ہے اور سرمایہ داری سے بھی۔ اشتراکیت سے تو اس کا فرق بالکل ظاہر ہے کہ اشتراکیت

میں چونکہ انفرادی ملکیت کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ اس لیے اس میں تقسیم دولت صرف اُجرت کی شکل میں ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی نظریۂ تقسیم دولت کے جو اصول ہم نے شروع میں بیان کیے ہیں، ان کی روشنی میں کائنات کی تمام اشیاء اصلاً اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں۔ پھر ان اشیاء میں سے ایک کثیر حصہ تو وہ ہے جسے اس نے وقف عام کے طور پر تمام انسانوں کو مساوی طور پر دے دیا ہے۔ آگ، پانی، مٹی، ہوا، روشنی، خودرو گھاس، جنگل اور پانی کا شکار، معادن اور غیر مملوک بنجر زمین وغیرہ اس قسم میں داخل ہیں، جن پر کسی کی انفرادی ملکیت نہیں، بلکہ وہ وقف عام ہیں۔ ہر انسان ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اور ان کا مساوی طور پر حقدار ہے۔

دوسری طرف بعض اشیاء وہ ہیں جن میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کیے بغیر وہ قابل عمل اور فطری نظم معیشت قائم نہیں ہو سکتا، جس کی طرف ہم نے تقسیم دولت کے پہلے مقصد میں اشارہ کیا ہے۔ اشتراکی نظام کو اختیار کرتے ہوئے تمام سرمایہ اور زمین کو کلیتہً حکومت کے حوالے کر دینے کا نتیجہ مآل کار اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ چھوٹے چھوٹے بے شمار سرمایہ داروں کو ختم کر کے ملک کی دولت کے نظام اور انسان کی تقدیر کو ایک بڑے سرمایہ دار کے حوالہ کر دیا جاتا ہے جو من مانے طریقے پر دولت کے اس تالاب سے کھیلتا ہے۔ اور اس طرح اشتراکیت کا نتیجہ بدترین ارتکاز دولت کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اس کے علاوہ اس سے دوسری بڑی خرابی یہ پیدا ہوتی ہے کہ انسانی محنت چونکہ اپنے اختیار اور مرضی کے فطری حق سے محروم ہو جاتی ہے، اس لیے اس کے استعمال کے لیے جبر و تشدد ناگزیر ہے۔ جس کا برا اثر محنت کی کارکردگی پر بھی پڑتا ہے۔ اور اس کی ذہنی صحت پر بھی، اس سے واضح ہو گیا کہ اشتراکی نظام میں اسلامی نظریۂ تقسیم دولت کے دو مقاصد مجروح ہوتے ہیں، ایک فطری نظم معیشت کا قیام اور دوسرے حقدار کو حق پہونچانا۔

غرض اشتراکیت کے غیر فطری نظام کی ان چند در چند خرابیوں کی وجہ سے اسلام نے انفرادی ملکیت کو سرے سے ختم کر ڈالنا پسند نہیں کیا۔ بلکہ کائنات کی جو اشیاء وقف عام نہیں ہیں، ان میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کر کے اس نے سرمایہ اور زمین کی جداگانہ

حیثیت بھی برقرار رکھی ہے اور ان میں "رسد و طلب" کے فطری نظام کو بھی صحت مند بنا کر استعمال کیا ہے چنانچہ اس کے یہاں اشتراکیت کی طرح تقسیم دولت صرف اجرت کی شکل میں نہیں ہوتی، بلکہ منافع اور کرایہ کی صورت میں بھی ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی اس نے "سود" کی مد کو ختم کر کے اور دولت کے ثانوی مستحقین کی ایک طویل فہرست بنا کر ارتکاز دولت کی اس زبردست خرابی کو بھی ختم کر دیا ہے جو سرمایہ داری کا خاصہ لازمہ ہے اور جسے دور کرنے کا دعویٰ اشتراکیت کرتی ہے۔

سرمایہ داری اور اسلام | یہ تھا اسلامی نظریہ تقسیم دولت کا وہ بنیادی فرق جو اسے اشتراکیت سے ممتاز کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس فرق کو بھی اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے جو سرمایہ داری اور اسلام کے نظام تقسیم دولت میں پایا جاتا ہے۔ یہ فرق چونکہ قدرے دقیق اور پیچیدہ ہے۔ اس لیے اسے نسبتاً زیادہ تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت ہوگی۔

(باقی آئندہ)

بقیہ صـ ۴

متعلق مسئلہ بن گئی۔ جہاں تک ہو سکا رفع انتظار کے لئے جواب دیدیا گیا۔ کچھ حضرات کے خطوط پھر بھی باقی ہیں اس لئے اب یہ اطلاع دینا ضروری ہوئی کہ مولانا کی واپسی ان شاء اللہ وسط اپریل میں ہوگی۔ لہٰذا اب اس سے پہلے نہ جواب کا انتظار فرمایا جائے اور نہ مزید خط لکھا جائے۔

الفرقان کو پسند کرتے ہیں؟

تو اس کی اشاعت بڑھانے میں ہماری مدد کیجیے

آپ کی یہ کوشش الفرقان کو استحکام بخشے گی

الفرقان کو پسند کرنے کا مطلب ہے

اس کی دینی افادیت کو ماننا

دینی فائدہ پہونچانے والی کسی چیز کو آپ تک محدود نہیں رہنا چاہیے

الفرقان کی اشاعت میں جس قدر زیادہ ترقی ہوگی

ہم اس کی افادیت کے معیار کو بھی اتنا ہی اور بلند کر سکیں گے!

آپ کی اس کوشش کے سلسلے میں دفتر کا کیا تعاون آپ کیلئے مفید ہو سکتا ہے

ہمیں لکھیے ہم منتظر رہیں گے!

ادارۂ الفرقان
کچہری روڈ، لکھنؤ

خاندانی منصوبہ بندی

از عتیق الرحمٰن سنبھلی

(۲)

گزشتہ شمارہ میں نس بندی پر بحث کے ضمن میں خاندانی منصوبہ بندی پر بھی گفتگو آ گئی تھی۔ مگر وقت کی تنگی سے اور کچھ اس خیال سے کہ مسئلہ صرف نس بندی کا ہے، نفس خاندانی منصوبہ بندی پر اس سے پہلے بھی لکھنے والے کافی تفصیل سے لکھ چکے ہیں، اجمالی اشارات ہی پر اکتفا کر لیا گیا تھا، لیکن بعد میں احساس ہوا کہ ایک اہم ترین پہلو پر لکھنے والوں نے اتنا زور نہیں دیا ہے جس کا وہ مستحق تھا، اس لیے مضمون کی ایک دوسری قسط کا فیصلہ کیا گیا تاکہ دینی نقطۂ نظر سے وہ تمام ضروری پہلوؤں پر حاوی ہو جائے۔

خاندانی منصوبہ بندی کی خاص ضرورت یہ بتائی جاتی ہے کہ آبادی کی شرح جتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے غذائی پیداوار اس کا ساتھ دینے سے عاجز ہے، زرعی منصوبوں سے اس پیداوار میں جو اضافہ کیا جاتا ہے وہ اضافۂ آبادی کے اثر سے صفر بن جاتا ہے، لہذا اس مسئلہ پر قابو پانے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں کہ انسانی آبادی کو ایک حد کے اندر رکھا جائے۔

ہمارے پیش نظر مسئلہ کے دینی پہلو سے بحث ہے، معاشی اور اقتصادی پہلو سے نہیں۔

اس لیے اس جائزہ کی یہاں کوئی ضرورت نہیں کہ آیا فی الواقع زمین کی صلاحیت کا خزانہ اضافۂ آبادی کی موجودہ شرح کی ضرورتیں پوری کرنے سے قاصر ہے، یا زرعی منصوبے، منصوبہ بندی کی خامی، عملدرآمد میں بدعنوانی اور یا درمیانی لوگوں کی منافع خوری اور ذخیرہ اندوزی کی وجہ سے کارگر نہیں ہو رہے ہیں۔! لیکن یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ زمین کی صلاحیت کے بارے میں، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ بس یہ اس کی حد ہے۔ ہم صرف ابتک کے تجربے کی بنا پر کسی زمین کا اوسط پیداوار بتا سکتے ہیں۔ لیکن صلاحیت پیداوار کی حد بتانے والا کوئی علم اور کوئی آلہ انسان نے دریافت نہیں کیا ہے۔ کل تک جو زمینیں ۱۵ من فی بیگہ گندم پیدا کر رہی تھیں آج وہ نئے تخم کے تجربے سے ۳۰ من فی بیگہ کا اوسط دے رہی ہیں اور کل کسی نئے تجربے سے یہ اوسط کیا ہو جائے گا؟ اس کی خبر خدا ہی کو ہے۔ اس لیے انسانی آبادی کے متعلق کسی بھی حد پر یہ کہنا کہ اس سے زیادہ کا بار زمین کی صلاحیت پیداوار نہیں اٹھا سکتی، ایک بے بنیاد بات ہوگی۔

پس اب اگر یہ صورت ہمارے سامنے آتی ہے کہ انسان زیادہ ہیں اور غلہ کم اور ہم اس بارے میں بھی مطمئن ہیں کہ یہ عدم توازن کچھ لوگوں کی ذخیرہ اندوزی اور منافع خوری کی وجہ سے نہیں ہو رہا ہے، بلکہ پیداوار خود ہی کم پڑ رہی ہے، نیز یہ اطمینان بھی ہم نے کر لیا ہے کہ انسانی محنت اور دوسرے ضروری شرائط کا جو اعلیٰ سے اعلیٰ معیار ہم فراہم کر سکتے تھے وہ ہم نے پیداوار بڑھانے کے لیے پورا کر دیا ہے، تو پھر ایک غیر مومن کا راستہ تو وہ ہے جسے قرآن کہتا ہے۔

مَنْ كَانَ يَظُنُّ أَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَاۗءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ۔ (الحج۔ ع ۲)	جو سمجھتا ہو کہ اللہ نہیں اس کی مدد کرے گا دنیا اور آخرت میں، تو اسے چاہیے کہ ایک رسی تانے آسمان میں (جس میں لٹکائے اپنے آپ کو) پھر اسے کاٹ دے اور تب دیکھے کہ کیا اس تدبیر سے اس کی گھٹن کا سبب دور ہو گیا؟

ایک خدا نا آشنا قوم جب رزق کے معاملے میں اپنی تدبیروں سے قابو نہ پا سکے تو اُس کیلئے واقعۃً اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ بچوں کی پیدائش کو گھٹانے (یعنی قومی خودکشی) کا راستہ ڈھونڈھنے لگے اور اس راستہ کی کوششیں بھی کامیاب نہ ہوں تو پھر قدیم جاہلیت کی تقلید کرکے سیدھے سیدھے قتل اولاد ہی میں نجات سمجھی جائے۔

اس کے برعکس اہلِ ایمان کا راستہ وہ ہے جس کی تلقین اللہ کا ایک پیغمبر اپنی قوم کو ان الفاظ میں کرتا ہے۔

اِسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا، يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا، وَيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا، مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا، وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ٥

(نوح۔ ع ۱)

معافی چاہو اپنے رب سے، بے شک وہ بہت معاف کرنے والا ہے، کھول دے گا وہ تم پر آسمان کا دہانہ اور بڑھائے گا تم کو مال واولاد سے، بنائے گا تمہارے لیے باغ اور بنا دے گا تمہارے لیے نہریں ــ کیا ہوا ہے تم کو کہ نہیں امید کرتے اللہ سے بڑائی (اور کرم فرمائی) کی حالانکہ اس نے بنایا ہے تم کو کتنے اتار چڑھاؤ سے۔

یہ اپنی قوم کو نوح علیہ السلام کی تلقین ہے، زمانۂ نوح ماقبل تاریخ کا زمانہ ہے، ہمیں تاریخی شہادت سے نہیں معلوم کہ قوم کے کس حال میں آپ نے اس سے یہ خطاب فرمایا تھا۔ مگر ان الفاظ کے اندر تقریباً صاف ہی نظر آتا ہے کہ قوم قحط وافلاس سے دوچار تھی۔ اللہ کا کوئی طویل عتاب تھا کہ کھیتوں اور باغوں سے لے کر گھروں اور بازاروں تک میں خاک اڑ رہی تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے "استغفروا" سے اس طرف توجہ دلائی کہ یہ اللہ کا عتاب اور اس کی گرفت ہے۔ اور اس سے خلاصی کی راہ یہ بتائی کہ اسے راضی کرو، یہ ساری مصیبت ٹل جائے گی[ع۵] ــــ خدا سے ناآشنا یہ قوم

ع۵ آیت میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اللہ نے اپنے نبی کی زبان سے غذائی قلت کو (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بھی نہیں سمجھتی تھی کہ اس معاملہ میں اللہ کی مدد بھی کوئی معنیٰ رکھتی ہے۔ حضرت نوحؑ نے فرمایا کہ آخر تم کیوں اس معاملے میں اس کی کارسازی کا خیال نہیں لاتے ہو؟ کیا اُسی نے تم کو رحم مادر میں ہستی کے کتنے ہی نشیب و فراز طے نہیں کرائے!

ایمان کا مطلب ہی یہ ہے کہ کائنات کی باگیں اللہ کے ہاتھ میں سمجھی جائیں۔ اور "بِاِذْنِ اللہ" کے بغیر یہاں کچھ گھٹنے اور کچھ بڑھنے، کچھ رونما ہونے اور کچھ فنا ہو جانے کا تصور بھی نہ کیا جائے، کسی مؤمن سے بھی پوچھئے تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ رزق کا گھٹانا اور بڑھانا خدا کے ہاتھ میں ہے، پھر ایک مؤمن یہ بھی سمجھتا ہے کہ زمین سے لیکر آسمان تک ہر قدرتی چیز انسان کی خدمت کے لیے مسخر ہے، اس کی غرض و غایت ہی یہ ہے کہ انسان کی ضرورت پوری کرے۔ اور کوئی چیز اگر انسان کی صحیح کوشش کے باوجود اپنا یہ وظیفہ ادا نہیں کرتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی طرف سے روک لگادی گئی ہے، ان عقائد کے ساتھ اگر ہم دیکھ رہے ہوں کہ ہماری بہترین کوششوں کے باوجود رزق نہیں بڑھتا، ہماری زمینوں کی پیداوار بقدر کفایت نہیں ہوتی ـــ حالانکہ وہ ہوسکتی ہے ـــ تو کیا ہم خدا کی لگائی ہوئی روک کا توڑ اس طرح کرسکتے ہیں کہ بچوں کی پیدائش گھٹا دیں، یا خدا نخواستہ کسی تدبیر سے موجودہ آبادی کو بھی گھٹا دیں؟ کیا خدا اس بات پر قادر نہیں کہ وہ اسی نسبت سے ہمارا رزق اور گھٹا دے یا اس میں بے برکتی کا تناسب کچھ اور بڑھا دے؟

کہیں سے کہیں تک بھی سوچئے تو ایمان اور اسلام کے دعوے کے ساتھ، رزق کے خیال سے تحدید نسل اور خاندانی منصوبہ بندی اپنے عقیدوں کے ساتھ ایک بے جوڑ مذاق سے کم نہیں ہے۔ افزائش رزق کی کوششیں اگر صحیح نہیں ہیں تو ان کو صحیح کیجئے۔ اگر صحیح ہیں اور پھر بھی پوری نہیں پڑتی تو اللہ کی کتاب اور اس کے پیغمبروں کے صاف

(حاشیہ بر صفحہ گزشتہ) دور کرنے کی جو یقین دہانی کرائی ہو اسی کے ساتھ ساتھ اولاد میں برکت کا بھی مژدہ سنایا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہی ہوا کہ خدا اگر رزق دینے پر آئے تو اولاد کی کثرت اس کی اس عطا کو کالعدم نہیں کرسکتی بلکہ یہ کیفیت ہوسکتی ہے کہ انسان اس دوسری عطا کو کرم بالائے کرم سمجھے۔

صاف اعلان پر نظر رکھتے ہوئے یقین کیجئے کہ رزق کی کمی آبادی کی زیادتی سے نہیں،
گناہوں اور نافرمانیوں کی زیادتی سے ہے۔ یہ ایک تنبیہ اور یاددہانی ہے کہ باز آجاؤ اور
اس ذات کی طرف رجوع ہو جو رزق کا حقیقی سرچشمہ ہے۔ جہاں تک مسلم ممالک کا سوال ہے
وہاں ایسی حالت پیدا ہو جانے کی عمومی توجیہ قرآن و حدیث کی رو سے یہی ہوتی ہے۔
رہے غیر مسلم ممالک تو ان کے لیے اللہ کی طرف سے عمومی قانون ڈھیل کا ہے۔ انھیں رزق
کی مار صرف کچھ خاص قسم کے جرائم ہی پر دی جاتی ہے۔ اور اس کی نوعیت تنبیہ کی نہیں
ہوتی، سزا اور گرفت کی ہوتی ہے، کہ ان کے شر و فساد کا تدارک کیا جائے۔

بہرحال ہم ایسی (پیداواری) حالت والے کسی مسلم ملک میں رہتے ہوں تب اور غیر مسلم
کے باشندے ہوں 'تب'، دونوں ہی صورتوں میں اس حالت کا علاج یہ ہے کہ قوم کی جس عملی
حالت پر یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے اسے درست کرنے کی کوشش کی جائے نہ یہ کہ خدا کی تنبیہی یا تعزیری
تدبیر کو ناکام کرنے کی کوئی تدبیر سوچی جائے! قرآن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے اس
عالم میں رزق رسانی کا نظام صرف طبیعی قانون پر ہی استوار نہیں کیا ہے، بلکہ ایک
اخلاقی قانون بھی اس نظام کا جزو ہے۔ طبیعی قانون یہ ضرور ہے کہ زمین پر صحیح طریقے
سے محنت کی جائے تو وہ اپنے خزانے اُگلے اور انسان کو نہال کر دے۔ مگر اس سے بالاتر
ایک اخلاقی قانون بھی ہے جس کے ماتحت کسی قوم کے حق میں کسی مدت کے لیے طبیعاتی
قانون کا عمل کمزور یا معطل کر دیا جاتا ہے۔ زمین کی بارآوری کا طبیعی قانون خدا کی طرف
سے پرورش کا انتظام ہے۔ مگر خدا صرف پروردگار اور روزی رساں ہی نہیں ہے وہ
ان اخلاقی حدود کا نگراں اور نگہبان بھی ہے جن کے تحفظ پر اس عالم کی بقا اور اس کی
تخلیق سے پیش نظر مقاصد کی تکمیل موقوف ہے، چنانچہ وہ رزق کے اتھاہ خزانے
یوں ہی اندھادھند نہیں لٹاتا، بلکہ عمومی طور پر تو اس پیمانے سے دیتا ہے جو نوع انسانی
کو مجموعی طور پر اس کی حد میں رکھ سکے اور خصوصی طور پر ان قوموں اور گروہوں کے رزق
کو جن کا عملی رویہ انسانیت کے لیے شر و فساد کی کچھ خاص نوعیتوں کا موجب بننے لگے،
ایک غیر معمولی اور تکلیف دہ حد تک بھی کھینچ لیتا ہے! شر و فساد ایک خاص حد پر پہونچ

جاتا ہے تو اس کا تدارک کی یہ کون کون سی صورتیں ہیں اور کس کس درجہ پر یہ قابل گرفت ہو جاتی ہیں اس کا تفصیلی علم ہمیں نہیں دیا گیا ہے ۔ البتہ امم سابقہ سے حالات کے ضمن میں قدرت کے اس قانون سے اصولی واقفیت کا موقع ہمیں دے دیا گیا ہے ۔ بہرحال رزق کے معاملہ میں اللہ کی یہ عمومی اور خصوصی سنت اخلاقی قانون کے ماتحت ہے جو عالم انسانیت کے کچھ ناگزیر مصالح کی حفاظت کے لیے طبیعی قوانین سے اوپر ٹھہرا دیا گیا ہے ۔ قرآن میں اس کے جو شواہد ہمیں ملتے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں :-

ہم میں سے ہر شخص کا مشاہدہ ہے کہ حصول رزق کی یکساں کوششوں کے نتائج لازماً یکساں نہیں ہوتے بلکہ اکثر فرق ہوتا ہے ، حالانکہ جہاں تک طبیعی ذرائع سے حصولِ رزق کا تعلق ہے ، اس میں تو دو مساوی اور یکساں کوششوں کے نتائج اسی طرح مساوی ہونے چاہئیں جس طرح قانون ریاضی کے ماتحت دو اور دو کے ملانے سے ہر وقت اور ہر حال میں چار ہی کا مجموعہ حاصل ہوتا ہے ۔ قرآن بتاتا ہے کہ اس فرق کا باعث وہ اخلاقی مصلحت کا قانون ہے جو طبیعاتی قوانین سے اوپر حکمراں ہے ۔ فرمایا گیا ۔

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَاءُ۔ (الشوریٰ ۔ رع ۳)	اگر اللہ پھیلا دے روزی اپنے بندوں کے لیے تو وہ اُدھم مچائیں زمین میں (چنانچہ وہ ایسا نہیں کرتا) بلکہ اُتارتا ہے ناپ کر جتنی چاہتا ہے ۔

یہ " بسط رزق " اور فراخیٔ رزق جس کی نفی کی جا رہی ہے ، غور کیجیے تو اس کے معنیٰ صرف یہی نہیں گے کہ یکساں قدرتی ذرائع اور یکساں محنت و تدابیر کے ملنے سے جو یکساں نتائج طبیعی قانون کے تحت حاصل ہونے چاہئیں وہ لازماً اس لیے نہیں حاصل ہونے دیئے جاتے کہ اگر ایسا ہوا تو دنیا کے اس حمام میں تقریباً سب ہی ننگے ہو جائیں گے اور رزق کا مسئلہ جو خدا کو یاد دلانے یعنی انسان کو اپنے حدود میں رکھنے والی سب سے بڑی چیز ہے اس کی طرف سے عمومی بے فکری کے بعد خدا کی یاد اس زمین پر مشکل ہی سے کی جائے گی اور شر و فساد کی وہ تمام حدیں ٹوٹ جائیں گی جن کے بعد انسانوں کی اس سرزمین پر انسان

ہی دیکھنے کو نہیں ملے گا۔

یہ آیت رزق کے معاملہ میں اللہ کی عمومی سنت کو بتاتی تھی، کہ ایک خاص پیمانے سے دیا جاتا ہے۔ بعض شریر اور مفسد قوموں کے ساتھ خصوصی معاملہ کی مثالیں بھی قرآن میں موجود ہیں۔ بغیر نام لیے ایک آبادی کے بارے میں فرمایا گیا۔ جس کا اشارہ مفسرین نے اہلِ مکہ کی طرف قرار دیا ہے:۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً	اور بیان کرتا ہے اللہ بطور مثال ایک
كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا	بستی کا کہ تھی چین امن سے، چلی آتی تھی
رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ	اس کی روزی فراغت کے ساتھ ہر طرف
فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا	سے، پس ناشکری کی اس نے اللہ کے
اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ	احسانوں کی تو چکھایا اس کو اللہ نے مزا
بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۔	بھوک اور خوف کے لباس (لپٹ جانے)
(النحل ع ۱۵)	کا، اُن کی حرکتوں کے بدلے میں۔

دوسری جگہ قوم فرعون کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

وَلَقَدْ اَخَذْنَا اٰلَ فِرْعَوْنَ	اور پکڑ لی ہم نے آل فرعون کی قحط
بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ	سالیوں اور پھلوں کی قلت میں، کہ شاید
لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ۔ (الاعراف ع ۱۶)	وہ دھیان دیں۔

یہاں یہ شبہ درست نہ ہوگا کہ قحط جیسے حالات تو طبیعی قانون ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ وہ تمام طبیعی اسباب جن کے اجتماع سے طبیعی قانون کا عمل رونما ہوتا ہو جمع نہ ہوں یا اُن کے اثر کو باطل کر دینے والا کوئی طبیعی سبب ہی حائل ہو جائے تو اس کے جو نتائج نکلیں گے وہ بھی ایک طبیعی قانون ہی کے نتائج کہلائیں گے! اور قحط سالی میں یہی صورت ہوتی ہے! یہ شبہ اس لیے غلط ہے کہ قرآن تو دراصل یہ حقیقت ہی اس آیت میں (اور اس جیسی دوسری آیتوں میں) کھولنا چاہتا ہے کہ وہ قحط جیسی صورتوں کے اسباب آپ سے آپ نہیں پیدا ہو جاتے ہیں بلکہ خدا اپنے اخلاقی قانون کے ماتحت اور اس کی مصلحتوں کے تحفظ کے لیے کسی قوم پر ایسے اسباب مسلّط کرتا ہے۔

پس جس طرح کچھ طبیعی اسباب رونما کر کے قحط اور سوکھے جیسی صورتوں سے کسی ملک اور قوم کو دوچار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ہوتا ہے اور ہوتا رہا ہے کہ زمین کی بار آوری میں منتظم سبب کوئی نہیں اور اُسے تجربہ کی شہادت اور وعدہ الٰہی کے مطابق صحیح کوششوں کی صورت میں اپنے اوپر بسنے والے، تمام جانداروں کی روزی کا کفیل ہونا چاہیے، مگر وہ نہیں ہوتی تو اب ایک کافر کا راستہ تو یہ ہو کہ وہ ملک کی آبادی گھٹانے یا اُس میں اضافہ کو محدود کرنے کی تدبیر یا سوچے۔ لیکن مومن کا راستہ یہ نہیں ہو سکتا۔ اُس کا راستہ ہو خدا کو راضی کرنے کی کوشش اور اس کی نافرمانیوں سے اجتناب۔ وہ خدا جو ایک حقیر قطرے سے انسان بنا کر نکالتا اور ایک دانے سے سیکڑوں دانے اٹھاتا ہے، وہ بلاشبہ اس بات پر قادر ہے اور تجربہ اس پر شاہد ہو کہ سیکڑوں کی جگہ ہزاروں دانے اٹھائے" وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللهِ رِزْقُهَا" کی ضمانت کا راز اسکی اسی قدرت اور زمین کو بخشی ہوئی صلاحیت میں پوشیدہ ہے۔

بہت سے علماء کا کہنا ہے کہ "ضبطِ ولادت ایک طرح سے قتلِ اولاد ہی ہے اور قرآن کی نہی "لَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ" ___ (معاشی خوف سے اپنے بچوں کو قتل نہ کرو) اس پر بھی عائد ہوتی۔" اس رائے کو مانیے یا مت مانیے۔ لیکن اس آیت میں صرف قتل اولاد ہی کی ممانعت نہیں ہے بلکہ یہ اصولی حکم بھی اس سے نکلتا ہے کہ معاشی خوف سے کوئی غلط کام کرنا نہیں چاہیے اور اتنی بات عام اسلامی شعور کے تحت بھی مسلّم ہے کہ ضبط ولادت کی مصنوعی تدبیروں میں کچھ کراہت ضرور ہے،[1] اسلامی مزاج ان سے اِبا بہر حال کرتا ہے۔ پس جب یہ کسی درجہ میں بھی ایک نامناسب اور غیر اسلامی فعل ٹھہرا تو معاشی خوف کے تحت اس کا ارتکاب اس آیت کی نہی کے ذیل میں ضرور آجائے گا اور اس صورت میں خاندانی منصوبہ

---

[1] ہم نے تو صرف اسلامی شعور کی بات لکھی ہے لیکن دراصل یہ ہر مذہبی انسان کا شعور ہے۔ چنانچہ ہر مذہبی سوسائٹی اول وہلہ میں ان تدبیروں کو اپنانے سے ابا کرتی ہے۔ کافی معتبر ذرائع سے سننے میں آیا کہ ہمارے ایک صوبہ کے وزیر اعلیٰ کے سامنے جب صوبہ میں خاندانی منصوبہ بندی کی مرکزی اسکیم کے نفاذ کا مسئلہ آیا تو انھوں نے نفاذ کا حکم تو تحریر کیا مگر اپنے اس احساس کا بھی اظہار کیا کہ فی نفسہ وہ اسے ایک غیر انسانی فعل سمجھتے ہیں۔

بندی کی تدبیر صرف ایک مکروہ کام نہیں رہ گی بلکہ ایک صریح حکم کی خلاف ورزی بھی ٹھہرے گی!۔
اسی آیت میں آگے فرمایا گیا ہے "نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ" (رزق تو انھیں ہم دیتے ہیں اور تمہیں بھی) "إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً كَبِيرًا" (ان کا قتل بڑی ہی غلطی ہے) قتل اولاد میں جس قدر شناعت ہے اُسے کس استدلال کی حاجت ؟ اور اس کے سامنے اس سوال کی کیا وقعت کہ محرکِ قتل کیا اور کیسا ہے ؟ مگر قرآن پھر بھی یہ کہنے پر اکتفا نہیں کرتا کہ کیسی بہیمانہ حرکت کر رہے ہو۔ روزی کے خوف سے بچوں کو مار ڈال رہے ہو! وہ روزی کے خوف کی حماقت پر بھی برابر کا زور دیتا ہے اور کہنا چاہتا ہے کہ اولاد کا قتل تو جیسی بے رحمانہ حرکت ہے وہ ہے ہی یہ ذہن بھی کچھ کم قابل اصلاح نہیں ہے کہ انسان خدا کو درمیان میں سے نکال کر اپنے معاشی مسئلہ پر سوچے۔ خدا کے بغیر تو رزق کا تصور ہی غلط ہے رزق تو اُتارنے والا بھی وہی ہے اور تقسیم کرنے والا بھی وہی نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ (ہم نے تقسیم کی ہے لوگوں کے درمیان ان کی گزران)۔

ہمارے اس مضمون کا نشانہ بھی دراصل یہی ذہنیت ہے کہ انسان رزق کے معاملے میں خدا کو درمیان سے ہٹا کر سوچے۔ خاندانی منصوبہ بندی یعنی تحدید نسل کے نظریہ میں فی ذاتہٖ جو قباحت دینی اور ایمانی نقطۂ نظر سے ہے اس کی وضاحت مضمون کے پہلے حصے میں کی جا چکی ہے۔ اس طرح تحدید نسل کا جو خاص طریقہ "نس بندی" نکالا گیا ہے اُس کی ذاتی قباحتیں بھی حتی الامکان شرح و بسط کے ساتھ ظاہر کر دی گئی ہیں۔ ان نکتوں کی روشنی میں نس بندی جیسے کسی فعل کی نوعیت ایک سخت مجرمانہ عمل کی ٹھہرتی ہے، خاندانی منصوبہ بندی کا تخیل ایک ایسا تخیل قرار پاتا ہے جس کا اسلامی عقیدے کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں لگتا۔ لیکن جب اس منصوبہ سازی اور اس کے خاص طریقہ کار کو اس کے خاص محرک 'معاشی خوف' کے ساتھ رکھ کر دیکھا جائے تو بات صرف ایک سخت قسم کے عملی گناہ کی اور ایک منصوبہ سازی کی نہیں رہتی جسے اسلامی عقیدے کا کوئی جز درد کرتا ہو۔ بلکہ مسئلہ ایک ملحدانہ ذہنیت کا ہو جاتا ہے کہ گویا انسانی کوششوں سے اوپر۔ رزق کا ناظم و منتظم کوئی اور نہیں ہے۔ ہمیں جو کچھ پانا ہے اپنی محنت و تدبیر سے پانا ہے اور جہاں یہ تدبیر و محنت جواب دے جائے وہاں گویا راستہ بند ہے۔ عملی کجروی اور فکر و نظر کی وہ چندی غلط کاری

جو براہ راست کسی عقیدے سے نہیں بلکہ اس کے لوازم اور تقاضوں سے ٹکراتی ہو وہ بھی بری ہے اور بہت قابل فکر و اصلاح ہے۔ مگر وہ شکل کہ براہ راست ایک معلوم و معروف عقیدے سے ٹکراؤ ہو اور بہ زبان حال گویا اس کی نفی کا انداز پیدا ہو رہا ہو، اس کا فاصلہ اول تو بہ زبان قال انکار سے بہت ہی کم رہ جاتا ہے۔ لیکن یہ نوبت نہ آئے تب بھی ایک ملحدانہ ذہنیت جڑ پکڑ لیتی ہے اور دین و ایمان کی بات واقعی معنیٰ میں محض زبان پر رہ جاتی ہے۔

قلت رزق کی بنا پر مسلمانوں میں بھی خاندانی منصوبہ بندی کا خیال پیدا ہو جائے تو یہ اُن کے دین و ایمان کے لیے وہ آفت ہے جس کے سامنے تمام معاشی اور اقتصادی آفتیں ہیچ ہیں۔ سارے دین کی بنیاد اللہ کو "رب العالمین" ماننے پر ہے۔ قرآن کا آغاز ہی "حمد رب العالمین" سے ہوتا ہے۔ یعنی اللہ کی ربوبیت کا تخیل ہی وہ بیج ہے جس سے فطرت انسانی میں اللہ کی رضاجوئی کی وہ طلب رونما ہوتی ہے جس کا جواب دینی ہدایت کی شکل میں اُترتا ہے اور فطرت انسانی اُسے قبول کر کے پورے معنیٰ میں حمدِ رب العالمین کا حق ادا کرتی ہے۔ رب العالمین کے مفہوم کا پہلا بنیادی جزو رزاقیت ہی ہے۔ وہ اتھاہ اور ہمہ گیر رزاقیت جس کا اظہار کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا۔ (ہود ع ۱)

کوئی جاندار روئے زمین کا نہیں ہے مگر یہ کہ اللہ پر ہے اس کی روزی۔

قرآن اور پیغمبر قرآن نے ان اعلانات سے اس غلط فہمی کی تو کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو، رزق خوان میں لگ کر آسمان سے آئے گا۔ لیکن ایسے خدا پرستی کی اوّلین بنیاد ٹھہرایا ہے کہ رزق دینے والا خدا ہی کو سمجھا جائے اور کسی بھی مخلوق کی رزق رسانی سے اس کی عاجزی کا خیال دل میں نہ لایا جائے۔ کیونکہ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا، جس ذہن میں خدا "رزاق" نہیں رہے گا، اس ذہن میں اس کی پرستش کا داعیہ ہی باقی نہیں رہ سکتا۔ —— اسی طرح قرآن اور پیغمبر قرآن نے یہ سمجھنے کی گنجائش بھی نہیں دی ہے کہ سعی و تدبیر کا حق ادا کر دیا جائے تو رزق کا ٹوٹا کبھی نہیں ہوگا، بلکہ صفائی سے جتا دیا ہے کہ بعض وقت ہر سعی و تدبیر کے باوجود رزق کے لالے پڑ جائیں گے اور کچھ جانے

انسان سے نہ بنے گا۔ لیکن اس باب میں بھی عقلِ ایمانی کے لیے کامل اطمینان کا سامان یہ بتا کر دیا ہے کہ رب العالمینی کا مفہوم اپنے دوسرے اجزاء کے اعتبار سے بعض حالات میں بالکل یہی چاہتا ہے۔ رزاقیت کے ساتھ ان حدود کی نگہداشت بھی رب العالمین کے لیے لازم ہے جن کے تحفظ پر عالم انسانی کا قیام و استقرار موقوف ہے اور اس شمعِ ہدایت کو فروزاں رکھنا بھی اس پر لازم ہے جس سے انسان کو راہ حق نظر آئے اور زندگی اپنی اصل راہ پر چلے۔ چناں چہ ایک طرف وہ انسانی سرکشی کی اُن صورتوں کو لگام دینے کے لیے، جن سے اس کی نظر میں بقائے انسانی کو خطرہ لاحق ہوتا ہے دوسرے طریقوں کے علاوہ کبھی یہ طریقہ بھی اس کی حکمت اختیار کرتی ہے کہ ایسے مفسد گروہوں کو رزق کی مار دی جائے۔ علیٰ ہٰذا جو انسانی گروہ شمع ہدایت کے درپے ہوتے ہیں یا جو اس شمع ہدایت کو فروزاں رکھنے کی ذمہ داری لینے کے بعد وہ طرزِ حیات اختیار کرتے ہیں جس میں وہ خود سب سے بڑا حجاب باقی انسانیت کے لیے بن جائیں، تو دشمنانِ ہدایت کا حصار توڑنے یا غافل ذمہ داروں کو چونکانے کے لیے بھی یہ ایک طریقہ اس کی حکمت کا ہے۔

بہر حال خدا کی ربوبیت کا تصور اساس دین و ایمان ہے۔ اور اس ربوبیت کا مطلب ہے وہ رزاقیتِ مطلق جس کے فیضان میں رزاق کی حکمت تو کبھی آڑے آتی ہے ورنہ کوئی چیز نہ اسے عاجز رکھنے والی ہے، نہ اُس کے خزانۂ رزق میں قلت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا تحدیدِ نسل کی بات جب قلتِ رزق کے خیال سے سوچی جانے لگے تو یہ صرف ایک جزوی غلط اندیشی نہیں رہتی بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے دین و ایمان کی بنیاد ہی کھود ڈالنے میں لگ گئے۔ خاندانی منصوبہ بندی کی تحریک کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہی ہے۔ جو لوگ جواز کی طرف کوئی رجحان رکھتے ہوں اُنھیں فقہی موشگافیوں کے بجائے اس پہلو سے بھی مسئلہ کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ مسئلہ صرف جواز اور عدم جواز کا نہیں ہے اس سے کہیں زیادہ خدا پرستی کی بقا اور عدم بقا کا ہے اور مستقبل میں اس کے دینی نتائج کا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ اس نقطۂ نظر سے سوچنے کے بعد ایسے تمام سوالات بھی ختم ہو جاتے ہیں جن کی بنیاد فقہی موشگافیوں کے بجائے عقلِ جدید کی وسوسہ اندازیوں پر ہے۔ مثلاً

وہ سوال جس کا ذکر مضمون کے پہلے حصے میں کیا جا چکا ہے کہ انسان اپنی ضرورت کے مطابق جب زرعی منصوبہ بندی کرنے کا مجاز ہے تو پھر انسانی پیدائش کے معاملہ میں کیوں قباحت پیدا ہو جاتی ہے؟ اس سوال کا جہاں ذکر آیا تھا وہاں اس کا جواب بھی دے دیا گیا تھا اور اس جواب کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے تو اس میں اس اشکال کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ قدرت کی پیدا کردہ کتنی ہی اشیاء اور احوال میں انسان اپنی ضرورت کے لیے تغیر و تبدل کر کے ذرا بھی گنہگار نہیں ہوتا تو اپنے جسم میں تصرف کیوں ناجائز ہو سکتا ہے؟ ہم نے مذکورہ جواب میں کہا تھا کہ زمین اللہ نے اسی لیے بنائی ہے کہ اس سے انسان اور دیگر حیوانات کی غذائی ضرورتیں حاصل ہوں اس لیے اس تحصیلی جدوجہد میں اپنی ضرورتوں کے مطابق منصوبہ بندی کا حق بھی انسان کو ہونا چاہیے۔ اسی پر دوسری قدرتی اشیاء اور قدرتی احوال کو بھی قیاس کر لیجئے! یہ سب انسان کی ضرورت کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ان کی حیثیت ایک خام مواد اور ذرائع و وسائل کی ہے۔ جنھیں ضرورت کے مطابق ڈھالنے اور ضرورت کے مطابق استعمال کرنے ہی پر ان سے پورا استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ زمین کو کھودئیے اور پانی نکالیے، اس کو جوتیے اور بیج ڈالیے، اس میں پختہ سڑکیں بنائیے۔ دریاؤں پر بند باندھیے اور اس روک تھام سے بجلی بنائیے۔ خود ساختہ نہروں میں ان کا پانی گرائیے اور اشیاء سے آگے آ کر احوال کے دائرہ میں، مثلاً رات کے اندھیرے کو اجالے میں بدلیے۔ یہ سب اس لیے روا ہے کہ آپ کی ضرورت ہی کے لیے تو ان کی تخلیق عمل میں آئی ہے۔ خدا کو تو ان سے کچھ لینا نہیں! ——— پھر اس سلسلہ میں باقاعدہ اذن (AUTHORITY) بھی آپ کے پاس موجود ہے، کہ سَخَّرَ لَکُمْ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ[ع] فرما دیا گیا ہے۔ یہ تسخیر جہاں تکوینی طور پر ہمیں یہ قدرت دیتی ہے کہ یہ سب کچھ کریں اور اشیاء و احوال کی یہ

ع اور مسخر کیا خدا نے تمہارے لیے وہ سب کچھ جو زمین و آسمان میں ہے (جاثیہ ع ۲) یعنی پوری ہی کائنات، جس میں سے وہ چیزیں جو انسان کی دسترس سے بالاتر ہوں وہ از خود ایسی بنائی گئی ہیں کہ ہماری ضرورتوں میں اپنا حصہ بغیر ہمارے تصرف اور کنٹرول کے ادا کرتی ہیں مثلاً چاند سورج وغیرہ۔

فطرت بنائی ہے کہ ہمیں اپنے اوپر قابو دیں، وہاں صاحب قطرہ سے یہ قانونی اجازت بھی اس میں پائی جاتی ہے کہ ہم اپنی ضرورت کے مطابق ان چیزوں میں تصرفات کریں۔

اس سے بھی زیادہ صاف اذن اور اشارہ یہ ہے کہ انسان کو "فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃ" (زمین پر اللہ کا نائب) قرار دیا گیا ہے۔ (بقرہ ع ۴ ۱) غرض زمین کائنات پر تو ایک طرح کی حکمرانی کا پروانہ انسان لیے ہوئے ہے۔ اس لیے اس میں ہر وہ تصرف جائز جو انسان اپنی ضرورت سمجھے لیکن کوئی چیز خود اپنے لیے نہیں پیدا ہوئی انسان کو ایک جاندار اور صاحب ارادہ مخلوق ہونے کی وجہ سے اس کی تو ضرورت تھی کہ اس کے وجود میں کچھ متحرک قوتیں اور اعضاء و جوارح رکھے جائیں مگر ان سے کام لینے یا ان میں تصرف کرنے کی آزادی کا قانونی دائرہ وہی ہوگا جسے وہ ذات (یعنی ذات الٰہی) پسند کرے جس نے انسان کو اپنے مقاصد سے پیدا کیا ہے یا جس سے انسان کے مقصد تخلیق کو نقصان پہنچے بغیر اس کی ذاتی یا نوعی تجارب میں مدد ملے۔

یہ ہر اس شک و شبہ کا مکمل جواب ہے جو جدید عقلیت اس مسئلہ میں کسی انسان کے دل میں پیدا کرتی ہو۔ مگر جیسا کہ اوپر کہا گیا، ایک مومن کے لیے یہ تمام موشگافیاں اس وقت ختم ہو جانی چاہئیں جب اس کے سامنے مسئلہ کا یہ پہلو آئے کہ رزق کم پڑ جانے کے خوف سے تحدید نسل جیسی (کم از کم مکروہ) منصوبہ بندی کا ارتکاب، اور وہ بھی نس بندی جیسے غیر معمولی طریقہ سے کرنے والی قوم ہرگز خدا پرست نہیں رہ سکتی۔ اس منصوبہ بندی کا خیال ہی جب آ سکتا ہے جب انسانیت کی نظر خدا کی رزاقیت سے ہٹ جائے۔ اور جب یہ خیال عمل کی شکل اختیار کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بیج سرزمین دل سے نکال کر پھینک دیا گیا جس سے خدا پرستی کا پودا اگتا ہے اور اس ملحدانہ ذہنیت کی پہلی اینٹ رکھ دی گئی کہ اس کائنات کا کوئی پالنہار نہیں ہے۔ یہاں انسان ہے اور اس کے اردگرد کی کائنات، اس سے اوپر کوئی ہستی نہیں جو اس کی مددگار ہو، اسے اپنے ہی بل پر اپنی زندگی کا ہفت خواں طے کرنا ہے اور سامان زیست کم ہوتا دکھائی دینے لگے تو پھر اپنا گلا گھونٹ کر مر جانا ہے کہ ایک بے سہارا اور درماندہ انسان کو یہی آخری چارہ کار ہے۔

ممالک اسلامیہ کے وہ ارباب اقتدار جو صاحب ایمان ہیں مگر معاشی مسئلہ کے سلسلہ میں اس رُخ پر چل پڑے ہیں، انھیں سوچنا چاہیے کہ وہ اپنی قوم کے ساتھ کیا کرنے جا رہے ہیں! کیا معاشی مسئلہ کے سلسلہ میں خدا کی کتاب میں کچھ نہیں ہے؟ کیا اس نے بسط و تقدیر رزق۔ (تنگی و فراخی) کے کچھ مافوق الطبیعی اصول بیان نہیں کیے ہیں؟ اور کیا وہ قوموں کے معاشی مسئلہ میں کوئی رہنمائی نہیں کرتے؟ مسلمانوں کی معاشی جدوجہد میں اُن کی رعایت کے بغیر کوئی حقیقی فلاح ممکن ہے؟

یورپ کے ماہرین معاشیات نے کہہ دیا کہ آبادی میں اضافہ کی فلاں شرح کسی قوم کے لیے خطرناک ہے تو ہم برتھ کنٹرول شروع کر دیں۔ لیکن خدا کی کتاب ورق ورق پر سنا رہی ہے کہ فلاں اخلاق و عادات اور فلاں طرزِ زندگی ہی کسی قوم کو بمقدار بھر معاشی جدوجہد کے باوجود معاشی مصیبت میں مبتلا کر سکتے ہیں (ورنہ اللہ کے خزانۂ رزق میں کوئی کمی نہیں اور نہ اس کا جوشِ ربوبیت کسی دم ٹھنڈا ہوتا ہے) مگر ایک دفعہ ہمارے دل میں یہ عزم نہیں انگڑائی لیتا کہ قوم کو "سیلف کنٹرول" (Self Control) کی راہ دکھانا اور اُس طرزِ زندگی کے لیے مہم چلانا ہے جس پر " رِزْقِ لَا یَحْتَسِبُ[1] کے دروازے کھلتے ہیں۔ اپنے ارضی وسائل ناکافی ہوں تو یَأْتِیْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِنْ كُلِّ مَكَانٍ[2]" کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔

زمانہ کی مسموم فضا نے یہ حال کر رکھا ہے کہ آدمی ایمانداری سے مومن و مسلم ہے مگر ذہن غیر ایمانی لائنوں ہی پر دوڑتا ہے۔ اس لیے جہاں تک ہو سختی اور درشتی ٹھیک نہیں مگر آدمی کے لیے اپنے آپ سوچنے کی بات ضرور ہے کہ یہ کیسا ایمان اور اسلام ہے جس نے بالکل بنیادی معاملے میں کتاب اللہ سے آنکھ بند کر رکھی ہے! قرآن میں صرف یہی نہیں ہے کہ رزق کا معاملہ تمام تر خدا کے

---

[1] قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ اور جو کوئی ڈرتا ہے اللہ سے کرتا ہے وہ اس کے لیے راستہ اور روزی دیتا ہے اس کو جہاں سے اس کو خیال نہ ہو (طلاق ع ۱) [2] آتی ہے اس کی روزی فراغت کے ساتھ ہر جگہ سے۔ سورہ نحل کی یہ پوری آیت پیچھے گزر چکی ہے۔

ہاتھ میں بتایا گیا ہے۔ بلکہ وہ ذہن کو اور بھی صاف کرنے کے لیے جگہ جگہ "یَرْزُقُکُمْ مِنَ السَّمٰوٰتِ" اور "رِزْقُکُمْ مِنَ السَّمَاءِ" کہتا ہے۔ یعنی رزق تم ہزار زمین سے نکلتا ہوا دیکھتے ہو۔ مگر حقیقت میں وہ آسمان سے اترتا ہے اور زمین کے پردے سے تمہیں ملتا ہے۔

کہاں تک گن یا جائے اور کتنی آیتیں نقل کی جائیں؟ یہ تو قرآن کا بنیادی مضمون ہے اس سے یہ صرف نظر اور ماہرین یورپ کی تخمینی باتوں پر وہ ایمان! آخر بات کہاں جاتی ہے؟ اور الحادی افکار کے آگے ایمانی دعووں کو کہاں تک بے اثر ہونا ہے! دنیا قلت رزق کے خوف سے تھرا رہی ہے اور بزعم خود تسخیر کائنات کی چوٹیاں سر کر لینے کے باوجود انسان کو اپنے اس خوف کا کوئی مداوا سوائے اس کے نظر نہیں آرہا کہ نسل کشی کی راہ آزمائے۔ یہ تسخیر کائنات کے نشہ سے چور انسان کے منہ پر قدرت کی ایک چپت ہے۔ اور صرف ایک چپت نے اسے زعم کبریائی سے عاجزی کی اس سطح پر اتار پھینکا ہے کہ بہ زبانِ حال اپنی بے بسی کا اعلان کرے!

——— وہ "اُمّتِ وَسط" اور "خیرِ اُمّت" جس کا فریضہ تھا کہ حق نمائی سے انسان کا یہ خود فراموشانہ رُخ بدلے وہ اپنے فریضہ کی ادائیگی سے قاصر رہی اور اب خود کو اس سے بالکل عاجز محسوس کرنے لگی تھی کہ انسان کو اس نشہ سے نکالا جا سکتا ہے، بلکہ اپنا منصب فراموش کرکے اُن تماشائیوں کی شریک بن گئی تھی جو داد و تحسین کے ڈونگرے برسا رہے ہوں کہ زندگی کا مصرف ہے تو یہ ہے اور خود شناسی و کامرانی ہے تو یہ ہے۔ رحمت خداوندی کے قربان، کہ اس نے خود بڑھ کر یہ طلسم توڑ دیا۔ اور ایک بار پھر زمین ہموار ہو گئی کہ شہادت حق بلند ہو تو کان اس پر لگیں۔ اُمّتِ مسلمہ کو وقت کی نبض پہچاننی چاہیئے اور طلسم زدہ صفوں ہی میں شریک رہ کر اب مذبوحی حرکات میں بھی ان مداریوں کی اقتدا کرنے کے بجائے وہ اسوۂ حیات دُنیا کے سامنے پیش کرنا چاہیئے جو رزق کو اس وقت زمینوں سے کھینچ نکالتا ہے جب وہ اُٹھ کے آسمانوں پر جا چکا ہو! — قدرت انسان کو گھیر کر لائی ہے کہ وہ آستانۂ حق پر سر جھکائے۔ اب یہ حاملانِ حق کا کام ہے کہ وہ اسے حق کا آستان بتائیں اور اپنے طرزِ حیات کی برکتوں سے اس یقین کا سامان پیدا کریں کہ اُن کی نشاندہی حق ہے اور اس حق پر سر رکھ دینے کے بعد رزق کی کوئی مشکل نہیں جو فطری تدابیر سے حل نہ ہو۔

بگڑی ہوئی ذہنیت چوٹیں کھا کر بھی اپنے آپ نہیں سنبھلتی، اس کے پاس وہ آنکھ ہی نہیں رہتی جو راہ نجات کو دیکھ سکے۔ اس وقت انسانیت جہاں پہونچ گئی ہے وہ ایک دوراہہ ہے کہ یا تو خدا کے سامنے سر جھکا کر قلت رزق کے چکر سے نکلے اور یا تحدید نسل کے زہراب سے زندگی کا سلسلہ مختصر کرے۔ بگڑے ہوئے مزاج کی تسخیری لت[ع] اُسے دوسرے راستہ ہی کی طرف لیے جا رہی ہے کہ اس میں بھی ایک تسخیری جدوجہد ہے اور طبیعت اسی کی خوگر ہو چکی ہے۔ یہ اب اُمت مسلمہ کا کام ہے کہ اُسے دوسرے راستہ پر روشنی دکھائے۔ اور اُس جنگ مغلوبی میں خدا سے نبرد آزمائی کے غلط انگاہی دے جس کا مطلب خودکشی کے سوا کچھ نہیں۔

ہندوستان جیسے غیر اسلامی ملکوں کا مسئلہ ذرا سا مختلف ہے۔ یہاں مسلمان سب کے سب وہ طرز حیات اختیار کر لیں جس پر اللہ کی طرف سے ہر معاملہ میں مدد کا وعدہ ہے۔ تب بھی معاشی مسئلہ میں وہ ملک کے عام حال سے کچھ مختلف حال والے "جزیرے" نہیں پا سکتے۔ انھیں پورے ملک کے معاشی حال سے متاثر رہنا ہی پڑیگا اس لیے انھیں اپنے ساتھ ساتھ پورے ملک کو اس طرز حیات پر لانے کی جدوجہد کرنا ہوگی۔ ان کا کام صرف جدوجہد ہے۔ اگر اس جدوجہد کا وہ حق ادا کر دیں گے تو جسکو ہدایت ملنی ہوگی ملے گی اور جن کو نہیں ملے گی ان کے طرز حیات کو قانون خداوندی کے مطابق مغلوب ہو کر رہنا ہوگا۔ اور خدا کے قانون میں اعتبار غالب طرز حیات ہی کا ہے۔ بلکہ اسکے طفیل مغلوب طرز سے وابستہ بھی اسکی برکتوں میں حصہ پاتے ہیں — بہرحال راستے ان مسلمانوں کے سامنے بھی دو ہی ہیں، کہ یا تو وہ اپنے منصب کے مطابق اپنی ہم ملک اکثریت کو خدا کی رحمت کا راستہ دکھائیں، ورنہ انھیں اس حد تک اکثریت کا تابع مہمل بن کر رہنا ہوگا کہ اپنے بنیادی عقیدوں تک کے خلاف اسکی ہمرکابی اختیار کریں۔ اسکے لیے اکثریت کے کسی جبر کی بھی ضرورت نہیں ہوگی، حالات ہی کا جبر یہ کام انجام دے گا۔

ع۔ ہونا تو نہیں چاہیئے مگر پوری طرح غور نہ کرنے والوں سے اس شبہ کا خطرہ ہے کہ انسان کیلئے تسخیر کائنات تو خود قرآن سے ثابت ہے اور خود اس مضمون میں اس کا ذکر کیا ہے۔ پھر انسان کی تسخیری جدوجہد کو یہاں برائی کیوں ٹھیرایا جا رہا ہے؟ یہ شبہ اسلئے نہیں ہونا چاہیئے کہ قرآن میں جو آیا ہے وہ یہ ہے کہ خدا نے کائنات کو انسان کے لیے مسخر کیا ہے کہ وہ اس کے کام آئے۔ جبکہ یہاں کی تسخیری لت کا ذہن یہ ہے کہ ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ ہم خود اپنی طاقت سے کائناتی قوتوں کو مسخر کر رہے ہیں۔ چنانچہ یہ ذہن خود کو اس کائنات کا آزاد فرمانروا سمجھتا ہے، جبکہ اپنی تسخیری قوت کو من جانب اللہ ماننے والا خدا کے مقرر کردہ حدود کی پابندی کرتا اور اپنی حیثیت ایک اطاعت گزار غلام کی سمجھتا ہے۔

دوسری اور آخری قسط

مولانا سندھیؒ کا سفر روس و ترکی

ظفر حسن ایبک کی آپ بیتی سے اخذ و تلخیص

(ع - س)

ترکی میں مولانا سندھیؒ کے ابتدائی چند مہینے انقرہ میں گزرے، اسکے بعد جب اکتوبر ۲۳ء میں ترک فوجوں نے استانبول بھی اتحادیوں سے واپس لے لیا تو مولانا مرحوم کا بعد کا پورا قیام استانبول ہی میں رہا۔ اگست ۲۴ء تک، جب تک مسٹر ظفر حسن روس سے ترکی نہیں نہیں پہنچ گئے مولانا کی سرگرمیوں سے زیادہ باخبر نہیں رہ سکے۔ اس عرصہ سے متعلق انھوں نے مولانا کے بھتیجے عزیز احمد صاحب کے ایک خط کے حوالہ سے بس اتنا لکھا ہے کہ مولانا انقرہ کے قیام کے دوران میں ترکی کے وزیر اعظم عصمت انونو پاشا سے ملے۔ لیکن یہ ملاقات کچھ زیادہ سود مند اس لئے نہیں ہوسکی کہ مولانا یا عزیز احمد انگریزی نہیں بول سکتے تھے، اور کوئی اردو داں ترک میسر نہیں تھا جو ترجمانی کے فرائض انجام دیتا۔ ناچار ایک عربی داں ترجمان کے واسطے سے گفتگو ہوئی مگر ترجمان کی بھی عربی سے واقفیت کم تھی۔ اور مولانا بھی اس زمانہ میں عربی بولنے پر بہت زیادہ قادر نہ تھے۔ اس وجہ سے عصمت پاشا پر مولانا کا مدعا اچھی طرح واضح نہ ہوسکا، اور صرف اتنا فائدہ ہوا کہ مولانا کو استانبول میں قیام کی اجازت مل گئی۔

اگست ۲۴ء میں ظفر حسن صاحب بھی استانبول پہنچ گئے۔ اور یہاں سے پھر مولانا کے حالات تفصیل سے سامنے آتے ہیں۔ مولانا کی قیام گاہ کے بارے میں ظفر صاحب لکھتے ہیں کہ یہ محلہ آقسرائے میں ایک ہندوستانی خانقاہ تھی جس کی پہلی منزل کے ایک کمرہ میں

مولانا کا قیام تھا۔ خانقاہ کے بارے میں ظفر صاحب لکھتے ہیں:۔

"یہ خانقاہ دو منزلہ ہے۔ اسکے ارد گرد ایک چھوٹا سا باغ اور ایک قبرستان ہے .... گو یہ عمارت بہت ہی معمولی نظر آتی ہے۔ لیکن اسکی تاریخی قیمت بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ یہاں سلطان ٹیپو مرحوم کا ایک کمانڈر مدفون ہے، جس کی قبر پر سر کی طرف ایک پتھر پر یہ کتبہ لکھا ہوا ہے۔

ہو الخلاق الباقی

مرحوم ومغفور

محمد امام سردار

عسکر ایلچی ٹیپو سلطان ہند

روحہٗ فاتحہ

سنہ ۱۲۰۲ ہجری

یہ سردار محمد امام سلطان ٹیپو شہید کے بھیجے ہوئے اس وفد کے ایک رکن تھے جو انگریزوں کے خلاف سلطنت عثمانیہ سے اتحاد کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ سردار موصوف نے وہاں مرض طاعون میں انتقال کیا۔ اور اس خانقاہ کے باغ میں دفن کئے گئے۔

ظفر صاحب نے استانبول آکر محلہ "سر کہ جی" میں قیام کیا تھا جو ہندوستانی خانقاہ سے دور تھا مولانا کے ایما پر ظفر صاحب نے "محلہ فاتح" کے ایک ہوٹل "رشادیہ" میں قیام اختیار کیا جو نسبتاً کم فاصلے پر تھا۔ اس زمانہ میں مولانا نے ہندوستان کی قومی تحریک کے لئے ایک پروگرام مرتب کرنا شروع کیا تھا، جسے آزاد ہندوستان کا دستور اساسی بھی کہا جا سکتا ہے، اس میں ظفر صاحب ان کے خاص مددگار رہے۔

لالہ لاجپت رائے کا سفر ترکی

ظفر صاحب نے لکھا ہے کہ ان کے ترکی پہنچنے سے قبل کانگریسی لیڈر لالہ لاجپت رائے بھی استانبول پہنچے تھے، اور مولانا سے بھی ملے تھے۔ ۱۹۲۴ء میں جب ہندو مسلم فسادات کی خبر مولانا کو پہنچی جس سے تحریک خلافت کا ہندو مسلم اتحاد تباہ ہو کر رہ گیا تھا تو مولانا نے خیال ظاہر کیا کہ اس میں لالہ لاجپت رائے

کا دخل ہے کیونکہ ان سے جب مولانا نے روسی وزیر خارجہ چیچرن سے اپنی بات چیت کا ذکر کیا جس میں افغانستان کو بیچ کی کڑی بنانا طے کیا گیا تھا تو افغانستان کا نام سن کر لالہ جی بہت سیخ پا ہوئے تھے۔ انھیں ہندوستان کی آزادی میں ایک مسلمان ملک کا دخل پسند نہیں آیا تھا۔ مولانا کا خیال تھا کہ اس اسکیم کو تباہ کرنے ہی کے لئے لالہ لاجپت رائے اور ان کے سیاسی گرو پنڈت مدن موہن مالوی نے ہندو مسلم افتراق کی داغ بیل ڈالی۔

کانگریس لیڈرشپ سے رابطہ کی کوشش

ظفر صاحب نے نہیں لکھا لیکن قیاس یہ ہے کہ لالہ لاجپت رائے سے یہ گفتگو مولانا نے اس مقصد سے کی ہوگی کہ وہ جاکر کانگریسی لیڈروں سے اسکی منظوری حاصل کریں تاکہ سوویت گورنمنٹ سے باقاعدہ معاہدہ ہوسکے۔ مگر ظاہر ہے کہ لالہ لاجپت رائے یہ کام کیونکر انجام دے سکتے تھے۔ ایسی ہی ایک ناکام کوشش مولانا نے اور کی۔ اس میں رابطہ کا ذریعہ مسٹر عبدالرحمٰن صدیقی بنائے گئے تھے جو اسی زمانہ میں استانبول آئے۔ ظفر صاحب نے لکھا ہو کہ مولانا نے صدیقی صاحب کو چیچرن سے اپنی گفتگو بتائی اور کہا کہ وہ پوری بات ڈاکٹر انصاری صاحب کو پہنچا دیں۔ صدیقی صاحب کو واپسی کے لئے سفر خرچ کی ضرورت تھی اسکے لئے بھی سو پونڈ مولانا نے روسی قنصل خانہ سے حاصل کرکے صدیقی صاحب کو دیے۔ مگر کچھ ہی دن بعد جب خود ڈاکٹر انصاری صاحب خلافت کمیٹی کے نمائندہ کی حیثیت سے استانبول آئے تو پتہ چلا کہ عبدالرحمٰن صدیقی نے بھی انھیں کچھ نہیں بتایا۔

افسوس ہو کہ کتاب سے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ خود ڈاکٹر انصاری صاحب سے گفتگو کا نتیجہ کیا نکلا اور انھوں نے روسی حکومت سے مولانا کی قرارداد پر کیا رائے ظاہر کی۔

رؤف بک سے ملاقات اور انٹرنیشنل مسلم یونیورسٹی کا خواب

ترک لیڈروں میں عصمت پاشا (وزیر اعظم) سے مولانا کی ملاقات ظفر صاحب کی غیر موجودگی میں ہوئی تھی ـــــ ظفر صاحب کے ترکی آجانے کے بعد مولانا کی ملاقات سابق وزیر اعظم رؤف بک سے ہوئی، یہ ۱۹۲۲ء ہی کی بات ہے۔ ۱۹۲۴ء میں مصطفٰے کمال پاشا نے خلافت ختم کردی اور اس بڑی تبدیلی کے بعد وزارت عظمیٰ کا عہدہ رؤف بک کے بجائے

عصمت پاشا کو ملا۔ رؤف بک اور جنرل کاظم قرہ بک پاشا نے حزب اقتدار جمہوریت خلق پارٹی کے مقابلہ میں جمہوریت ترقی پرور پارٹی قائم کی۔ ظفر صاحب نے لکھا ہو کہ "یہ پارٹی پرانی ترکی روایات کو قائم رکھنے کی طرفدار تھی۔ اگرچہ بظاہر اس نے خلافت اسلامیہ کے ترکی سے ہٹائے جانے کو منظور کر لیا تھا، لیکن اُن تمام اصلاحات کے برخلاف تھی جو جمہوریت خلق پارٹی ملک میں ہر روز جاری کر رہی تھی۔"

عبدالرحمن پشاوری جو مولانا کے زمانہ قیام کابل میں ترکی سفیر تھے وہ ان دنوں سفارت سے واپس آکر استانبول میں رؤف بک کے ہی پاس مقیم تھے۔ اور مولانا کے پاس ان کی آمدورفت تھی۔ مولانا نے ان کو رؤف بک سے ملاقات کا وسیلہ بنایا۔ ملاقات میں جنرل کاظم قرہ بک پاشا بھی موجود تھے۔ مولانا کا منصوبہ یہ تھا کہ ان ترک لیڈروں کو ایک انٹرنیشنل مسلم یونیورسٹی استانبول میں قائم کرنے پر آمادہ کریں، تاکہ الغائے خلافت کے بعد رابطۂ عالم اسلامی کا جو خلا پیدا ہو گیا ہو وہ کسی حد تک پُر ہو جائے۔ ظفر صاحب جو اس ملاقات میں موجود تھے لکھتے ہیں:۔

قبلہ مولانا صاحب نے رؤف بک کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ وہ اپنی پارٹی کے پروگرام میں استانبول میں ایک انٹرنیشنل مسلم یونیورسٹی کے قیام کو بھی داخل کرلیں۔ (لیکن) رؤف بک نے اس تجویز کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ اگر ایسی تجویز انھوں نے اپنی پارٹی کے پروگرام میں داخل کی تو جمہوریت خلق پارٹی جو ان کی پارٹی پر پہلے ہی قدامت پسندی کا الزام لگا رہی ہے ان پر اتحاد اسلام اور پرانی روایتوں کو پھر زندہ کرنے کی تہمت لگائے گی۔ اور اس طرح اُن کی پارٹی کو ترکی تعلیم یافتہ طبقہ کی نگاہ سے گرا دے گی۔"

(صفحہ ۹۴)

ظفر صاحب مولانا پر اس جواب کا اثر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"قبلہ مولانا صاحب نے یہ جواب سن کر اس ملاقات کو اور طول دینا مناسب نہیں سمجھا...... اُن کو رؤف بک کے اس جواب سے اتنی مایوسی ہوئی کہ میں نے عمر بھر کبھی اتنا نا اُمید نہ دیکھا تھا...........

....

...... میں اُن سے جدا ہو کر شام کو اپنے ہوٹل چلا گیا اور رات بھر اس سوچ میں

لگا رہا کہ قبلہ مولانا صاحب (مرحوم)، کو میں کس طرح تسلی دوں۔ لیکن اگلے دن جب میں پھر اُن سے ملا تو میں نے دیکھا کہ ان کی طبیعت میں خدا سکون آگیا ہے اور انھوں نے خداوند لایزال کے کرم سے اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے کوئی نیا راستہ پانے کی امید پر سہارا لگا لیا ہے۔"

آزاد ہندوستان کا دستور اساسی

مولانا نے آزاد ہندوستان کا جو دستوری ڈھانچہ اور اس کیلئے ایک سیاسی پروگرام مرتب کرنا شروع کیا تھا وہ ۱۹۲۴ء ہی میں تکمیل کو پہنچ گیا۔ یہ اُردو میں لکھا گیا تھا اور پھر انگریزی اور ترکی دو زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔ ترکی ترجمہ کا مقصد یہ تھا کہ ترک حکومت کا محکمہ خارجہ مولانا کی سیاسی سرگرمیوں کے انداز سے آگاہ ہو سکے۔ اور کسی قسم کے بے اطمینانی مولانا اور ان کے ساتھیوں کی طرف سے نہ رہے۔ انگریزی کی ضرورت ہندوستان کے لئے بھی تھی اور شاید روسی حکومت کے لئے بھی اس کی ضرورت محسوس کی گئی ہوگی۔ بہرحال یہ سیاسی پروگرام یا دستور اساسی پہلے اُردو میں چھاپا گیا۔ یہ استانبول (قسطنطنیہ) کے محمود بلے پریس کے ذریعہ ۱۹۲۴ء ہی میں چھپ کر تیار ہو گیا۔

غلام ہندوستان میں ضبطی

اس مطبوعہ پروگرام کو مولانا ہندوستان بھیجنا چاہتے تھے۔ اس کا محفوظ طریقہ ان کی نظر میں یہ تھا کہ دستی بھیجا جائے۔ مگر اس کام کے لئے جو روپیہ مولانا نے روسی قنصل خانہ سے حاصل کیا تھا وہ مولانا کی قیام گاہ سے چوری ہو گیا۔ مجبوراً کم خرچ یعنی ڈاک کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ جس کی وجہ سے مرسل حضرات کو یہ تو پتہ نہیں چل سکا کہ یہ کسی کو پہنچا یا نہیں البتہ ہندوستان میں اس کی ضبطی کا حکم اِن کے علم میں آیا۔ اس کے متعلق ظفر صاحب نے اخبار زمیندار اور ریاست (مورخہ ۱۸ رمئی ۱۹۲۵ء) کے تراشے اپنی کتاب میں دیئے ہیں، جن میں حکومت ہند کی طرف سے اس رسالہ کی ضبطی کا اعلان کیا گیا ہے۔

سیاسی پروگرام کے خطوط

کتاب میں مطبوعہ پروگرام کا سرورق اور آخری صفحہ نقل کیا گیا ہے۔ پروگرام کے مقاصد

کا خلاصہ ظفر صاحب نے چار نکات میں بیان کیا ہے۔

۱۔ ہندوستان کے لئے کامل آزادی حاصل کرنا اور آزاد ہندوستان میں ایک وفاقی (FEDERAL) نظام حکومت قائم کرنا۔

۲۔ ہندوستان میں مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو محفوظ کرنا۔

۳۔ وسیع معنیٰ میں " محنت کش " طبقے کی اکثریت رکھنے والی حکومت قائم کرنا، اور زمینداری و سرمایہ داری کو ملک سے ختم کر دینا تاکہ کمیونزم کو اثر اندازی کا موقع نہ ملے۔

۴۔ امپیریلزم کا توڑ کرنے کے لئے ایشیاٹک فیڈریشن بنانا۔

" سرور اجیہ پارٹی "

ان مقاصد کے لئے کوشش کرنے کے واسطے پروگرام میں ایک پارٹی کا قیام بھی تجویز کیا گیا تھا جس کا نام " بھارت سرور اجیہ پارٹی " طے کیا گیا تھا، یعنی " سب کا راج " قائم کرنے والی پارٹی۔

پارٹی کی ممبرشپ

پارٹی کے ممبروں کے لئے شرط لگائی گئی تھی کہ وہ اپنے معیار زندگی کو ملک کے کسانوں کے معیار سے بلند نہ کریں گے، یعنی اتنی ہی آمدنی پر گزارہ کریں گے جتنی کہ ایک اوسط درجہ کے کسان کی ہوتی ہے۔

پارٹی کے پروگرام کا خلاصہ ظفر صاحب نے ص۱۰۰ سے ص۱۰۱ تک حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

" نظام توافق :۔

پارٹی ہندوستان کو ایک ملک فرض نہ کرے گی اور نہ ہندوستان میں واحد قومیت کو پیدا کرنے کی کوشش کو اساسِ آزادی مانے گی۔ بلکہ ملک میں نظام توافق (فیڈرل سسٹم) پر حکومت قائم کرے گی جس کے لئے مندرجہ ذیل طریقہ اختیار کیا جائے گا۔

جغرافیائی حیثیت سے ہندوستان شمال مغربی، مشرقی اور جنوبی تین قدرتی حصوں سے متشکل ہونے کی وجہ سے ان حصّوں کو ایسے صوبوں میں تقسیم کیا جائے جہاں ایک ہی زبان بولی جاتی ہو اور جہاں ایک ہی قسم کے رسم و رواج اور ایک ہی تمدن رکھنے والے لوگ آباد ہوں۔ ان صوبوں کو بعد میں ایک (جمہوری ملک)

قرار دیا جائے گا جس کی جمہوری حکومت کو معاملات خارجہ، معاملات جنگ اور خارجی تجارت کے سوا اپنے تمام امور پر اختیار حاصل ہوگا (مثلاً اس طرح شمالی مغربی ہندوستان، مشرقی پنجاب، مغربی پنجاب، صوبہ سرحد، کشمیر، سندھ، بلوچستان اور گجرات، جیسے جمہوری ملکوں میں تقسیم ہو جائے گا) مشرقی اور جنوبی ہندوستان بھی اسی طرح کے جمہوری ملکوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

یہ جمہوری ملک مرکزی وفاقی (فیڈرل) حکومت ہند میں شامل ہونے سے پہلے اگر چاہیں تو اپنے تمدن اور رسم و رواج کی وحدت کی بنا پر باہم مل کر خود ایک وفاقی نظام میں منسلک ہو سکتے ہیں مثلاً مغربی پنجاب، صوبہ سرحد، کشمیر، سندھ، بلوچستان آپس میں مل کر اور ایک وفاقی نظام بنا کر مرکزی حکومت ہند میں شامل ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح مشرقی اور جنوبی ہند کی جمہوری حکومتیں اگر چاہیں باہم مل کر، مرکزی حکومت میں داخل ہو سکتی ہیں۔

مجلس قانون ساز

ان جمہوریتوں میں ہر عاقل بالغ مرد اور عورت کو حق انتخاب دیا جائے گا۔ لیکن ہر اجتماعی طبقہ (SOCIAL CLASS) یعنی کسان، مزدور، دماغی کام کرنے والے لوگ، تاجر اور کارخانہ دار مجلس قانون ساز میں اپنی آبادی کے تناسب سے اور اپنے ہی طبقہ سے نمائندے چنے گا اس طرح ان جمہوریتوں کی پارلیمنٹ میں کسان، مزدور اور دماغی کام کرنے والے لوگوں کی اکثریت ہوگی اور یہ مجلس محنت کشوں کے مفاد کی حفاظت کر سکے گی۔

اقتصادی اور سماجی بنیادی اصول

ذرائع عامہ کے تمام ذرائع قومی ملکیت میں دیدیئے جائیں گے۔ انفرادی و ذاتی ملکیت (منقولہ اور غیر منقولہ) محدود کر دی جائے گی (یعنی معین حد سے زیادہ

جائداد اور مال قومی ملکیت ہو گا)

مال داروں پر منزاید ٹیکس لگایا جائے گا جس کی آخری حد (۵۰) فیصدی ہو گی۔

ملک کی زمینیں قومی ملکیت قرار دی جائیں گی اور نظام زمینداری منسوخ کر دیا جائے گا (ان جمہوریتوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو گی پارٹی فاروق اعظم کے فیصلہ کے مطابق زمینداروں کو زمین کی ملکیت چھوڑنے پر اور امام ابوحنیفہ کے فیصلہ کے مطابق مزارعۃ چھوڑنے پر مجبور کرے گی)

ہر کاشتکار خاندان کو اس قدر زمین ضرور دی جائے گی جس قدر کہ وہ خود کاشت کر سکے۔

سودی لین دین بالکل ختم کر دیا جائے گا اور محنت کش طبقہ کے پرانے قرض بے باق کر دیئے جائیں گے۔

قومی ملکیت میں دیئے ہوئے کارخانوں کو مزدوروں کی انجمنوں کے ذریعہ چلایا جائے گا اور مزدوروں کو نفع میں سے حصّہ دیا جائے گا۔

محنت کش طبقہ کو مفت طبّی امداد دی جائے گی اور اسکے لئے صاف ستھرے گھر مہیا کئے جائیں گے۔

ابتدائی اور مڈل اسکولوں کی تعلیم مجبوری (جبری) اور مفت ہو گی۔

داخلی تجارت کوآپریٹیو (COOPERATIVE) سوسائیٹیوں کے ہاتھوں میں ہو گی لیکن سوداگران کوآپریٹیو سوسائیٹیوں میں داخل ہو کر ان کے ممبر بن سکیں گے۔

خارجی تجارت مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہو گی۔

ہر ایک جمہوریت اپنی اکثریت کے مذہب کو اپنا اسٹیٹ مذہب قرار دے سکتی ہے، بشرطیکہ وہ مذہب پارٹی کے مندرجہ بالا اقتصادی اور اجتماعی اصولوں کا مخالف نہ ہو۔

. . . .

مرکزی حکومت وفاقی جمہوریت

CENTRAL GOVT. OF THE FEDERATED

REPUBLICS OF INDIA

مرکزی حکومت ہند کا مذہب سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اور نہ اس کو ان مذاہب میں دخل دینے کا حق ہوگا جو پارٹی کے مندرجہ بالا اقتصادی اور اجتماعی اصولوں کو مانتے ہیں (یعنی مرکزی حکومت ایک لادینی حکومت ہوگی۔)

مرکزی حکومت خارجی اور جنگی معاملات اور خارجی تجارت اپنے ہاتھ میں رکھے گی۔

مختلف جمہوریتیں مرکزی حکومت میں اپنے تناسب آبادی، اقتصادی، تمدنی اور فوجی اہمیت کی بنا پر حق نمائندگی حاصل کرینگی۔

بین الملل تعلقات

امپیریلزم کو توڑنے اور ایشیا میں مندرجہ بالا اصولوں پر آزاد حکومتیں قائم کرنے کے لئے ایشیاٹک فیڈریشن بنائے جائے گی جس میں روس کو بھی شامل کیا جائے گا۔"

ترمیم شدہ انگریزی ترجمہ ہندوستان میں اس رسالہ کی ضبطی کی اطلاع ملنے کے بعد مولانا نے اسکے انگریزی ترجمہ میں تھوڑی سی تبدیلی کرائی تاکہ اسے ہندوستان بھیجا جائے تو وہ ضبطی کے اس حکم کے ماتحت نہ آسکے۔ ۱۹۲۶ء میں اسے طبع کراکے دمشق اور انقرہ سے ہندوستان بھیجا گیا۔ جس کے متعلق ظفر صاحب لکھتے ہیں کہ اس کی ضبطی کی کوئی اطلاع ہمیں آج تک نہیں ملی۔ لیکن یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ وہ کہاں کہاں پہنچا۔

حجاز کو روانگی ۱۹۲۶ء ہی میں مولانا کو ہندوستانی اخبارات سے اطلاع ملی کہ اس

موجودہ ہدیہ 3-75

Regd. No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow

VOL. 36 NO 1 APRIL 1968
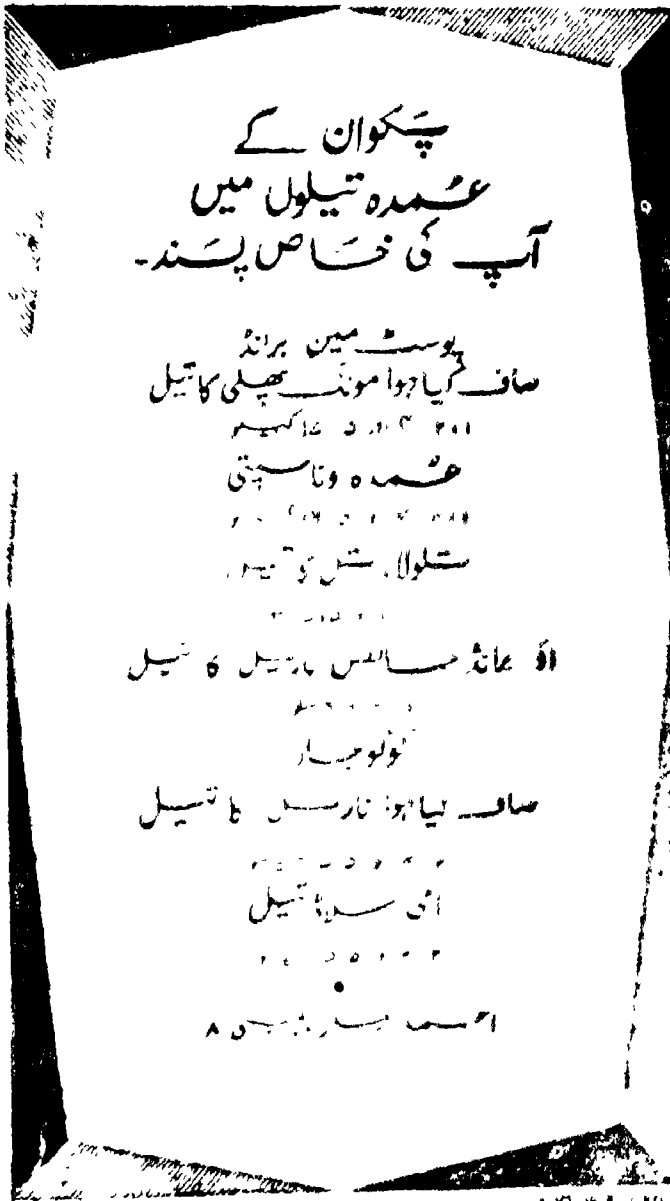
[صفر ۱۳۸۸ھ]

MAY 1968

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے
تالیف مولانا محمد منظور نعمانی
بلاشبہ قرآن مجید کی دعوت و تعلیم ہماری انسانیت کے لئے آب حیات ہے،
لیکن ہماری دنیا اس سے نا آشنا ہے یہاں تک کہ اسکو "کلام الٰہی" ماننے والی
امت کی غالب اکثریت بھی اس سے بیگانہ ہے
یہ کتاب
اسی صورت حال کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے۔
یہ قرآنی دعوت اور اسکی اہم تعلیمات کا ایک جامع خلاصہ ہے۔
جس میں ۶۰ عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور روح پرور تشریحات کیساتھ جمع کیا گیا
خاص طور پر قرآن کی دعوت توحید کا بیان اس کتاب کا شاہکار ہے۔
یہ بالکل ایک نئے طرز کی کتاب ہے، جو قرآن کی دعوت سے روشناسی کے ساتھ ساتھ
قرآن کے اعجاز بیان کا بھی لذت شناس کرتی ہے۔
کتب خانہ الفرقان لکھنؤ
قیمت 5-00

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ
ہندستان سے ۷/۵۰
پاکستان سے ۷/۵۰
ششماہی
ہندوستان سے ۴/-
پاکستان سے ۴/-

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک [illegible]
مزید [illegible] ڈاک کا اضافہ

فی کاپی ..... ۷۰ پیسے

جلد ۳۶	بابت ماہ صفر المظفر ۱۳۸۸ھ مطابق مئی ۱۹۶۸ء	شمارہ ۲

اگر اس دائرہ میں ⭘ سرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ مئی تک آ جائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں۔ نئے خریدار بھی اسی طریقہ سے چندہ ارسال فرمائیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۱۵ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولانا) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

—— عتیق الرحمٰن سنبھلی

آزاد ہندوستان میں بیس سال ایک مضبوط حکومت رہی، پھر بھی مسلمانوں کے معاملہ میں لا اینڈ آرڈر کی حالت ایک نہایت کمزور حکومت کے لا اینڈ آرڈر سے مختلف نہیں تھی۔ آج ہندستان میں حکومت کا ادارہ واقعۃً کمزوری اور بے یقینی کی حالت سے دوچار ہو، تو مسلمانوں کے لیے عدم تحفظ کا مسئلہ جس درجہ کو بھی پہونچ جائے کم ہے۔

اس نئے دور میں عدم تحفظ کا سب سے زیادہ شکار بہار کے مسلمانوں کو ہونا پڑا۔ اور اب معلوم ہوتا ہے کہ یو، پی کی باری ہے۔ یو، پی میں صدر راج چل رہا ہے، مگر اس کے الہ آباد جیسے شہر میں جو نہرو، شاستری اور اندرا —— سابق اور موجودہ وزرائے اعظم —— کا وطن ہے اور جس کے خیال سے وزیر اعظم اندرا بہت تیزی سے الہ آباد پہونچ گئی تھیں، جس آزادی کے ساتھ غارت گری، آتش زنی اور چھرے بازی کا بازار ایک مہینے تک گرم رہا وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ شہری حکام حکومت کی کمزوری اور بے یقینی کی طرف سے اس درجہ مطمئن ہیں کہ صدر راج ان کے اس اطمینان میں خلل نہیں ڈال سکا —— انتظامیہ کی نچلی سطح پر اس کیفیت کے ساتھ جب ان تقاضوں کو بھی دیکھئے جو ہندو راشٹر کا خواب دیکھنے والوں کو اکسا رہے ہیں کہ وہ اپنے منصوبہ کی رفتار تیز کر دیں تو یہ اندیشہ کچھ غیر حقیقی نظر نہیں آتا کہ نہ صرف یو، پی بلکہ پتہ نہیں کہاں کہاں مسلم دشمنی کی آگ تیزی سے نمودار ہوا چاہتی ہے۔ اور اس آگ کو اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کا موقع مل گیا تو مسلمانوں کا مسئلہ کس درجہ اور پیچیدہ ہو جائے گا۔

——————

اس صورت حال میں زندہ رہنے کی شرط اوّل یہ ہو کہ مسلمان خطرہ کے مقابلے میں متحد ہوں، وہ ایک مربوط اور منظم زندگی بسر کریں، ان حالات سے عہدہ برآ ہونے کیلئے جن مختلف صلاحیتوں کی ضرورت ہو وہ ایک تنظیم کے ساتھ بروئے کار آئیں، ایک قیادت ہو جو مختلف افراد اور متنوع صلاحیتوں میں تنظیم و ترتیب کا فرض انجام دے۔ یہ سب ضروری اور انتہائی ضروری ہو۔ اس میں جتنی دیر ہوگی اتنی ہی ہلاکت خیز ہوگی۔ لیکن اسکے لیے ایک واضح اسکیم کی بھی ضرورت ہو، جس سے مطلوبہ نتائج کا سرا ملتا ہوا نظر آتا ہو۔ ورنہ مجرد تنظیم کسی مرض کی دوا نہیں۔ یہ ایک جسد بے روح ہوگی جو کسی خطرہ کا علاج نہیں بن سکتی۔

واضح اسکیم کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اس بات کا واضح شعور ہونا چاہیئے کہ ہم کس طریق کار کے ذریعہ موجودہ حالات سے عہدہ برآ ہونا چاہتے ہیں، ہماری تنظیم کن خطوط پر سرگرم عمل ہوگی، ان سرگرمیوں (Activities) کا کیا اثر ہمارے ماحول پر پڑے گا۔ اور کیونکر ہمارے مطلوبہ نتائج اس تنظیم اور طریقہ کار سے حاصل ہوں گے؟

عرب اور اسرائیل کی ایک تازہ مثال ہمارے سامنے ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف تیاری کی۔ برسوں اپنے آپ کو منظم کرتے رہے، طاقت جمع ہوتی رہی۔ لیکن اسرائیل کی جنگی تنظیم اور تیاری حالات کے گہرے جائزے کے ساتھ تھی، عالمی ماحول کے اچھے اور برے ردعمل کی نزاکتوں پر اس کی نظر تھی، عربوں میں جس کسی کو تھی صرف تنظیم اور تیاری سے دلچسپی تھی، حالات کا تقابلی جائزہ گویا مفقود تھا اور عالمی ماحول کی رعایت سے ان کی قولی اور عملی سرگرمیوں کو جیسے کوئی واسطہ نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عرب میدان جنگ میں بھی ہارے اور برسرحق ہونے کے باوجود دنیا میں ملزم قرار پائے کہ یہ اسرائیل کے خلاف جارحانہ عزائم رکھتے تھے، اسرائیل نے تیاری سے لے کر عمل تک جو کچھ کیا وہ مدافعانہ کارروائی تھی۔ اقوام متحدہ میں عربوں کے دوستوں کی آواز پست تھی، وہ عالمی رائے عامہ کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے، وہ عربوں کا مقدمہ اس طرح نہیں لڑ سکے جیسے ایک مضبوط مقدمہ لڑا جاتا ہے۔ وہ کھلے طور پر ایک کمزور مقدمہ کے وکیل نظر آتے تھے۔ حالانکہ حقیقت کے اعتبار سے مقدمہ بیحد جاندار تھا۔

یہ فرق ہے ایک باشعور تنظیم کا اور ایک بے شعور تنظیم کا! تنظیم دونوں طرف تھی، مگر ایک طرف مجرد تنظیم جس میں اپنے قدم کے آگے نگاہ نہیں تھی، دوسری طرف وہ تنظیم جو چار آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ آگے بھی دیکھتی ہے پیچھے بھی دیکھتی ہو۔ دائیں بھی دیکھتی ہو، بائیں بھی دیکھتی ہو۔ اپنے تحفظ کی صلاحیت کا بھی اطمینان کرتی ہے اور اس صلاحیت کا بھی، کہ کم سے کم نقصان اٹھائے بغیر وہ زیادہ سے زیادہ منزل طے کر سکتی ہے۔ جس تنظیم میں یہ وصف نہ ہو وہ عربوں کے جیسے موافق حالات میں بھی کارگر نہیں ہوتی۔ اور یہ وصف موجود ہو

تو اسرائیل کے جیسے ناموافق حالات میں بھی عجیب وغریب کام دیتی ہے۔ عرب نہ صرف یہ کہ اپنی تنظیم کی اس خامی کی وجہ اسرائیل کا کچھ بگاڑ نہیں سکے بلکہ بیس برس کی بے تنظیمی میں جتنا کھویا تھا اس سے کہیں زیادہ اور کھو بیٹھے۔ یہ بات صرف جنگی تنظیم کے لیے ہی درست نہیں ہے بلکہ مقابلہ کی تنظیم خواہ وہ جنگی ہو یا غیر جنگی دونوں میں مطلوبہ نتائج کا حصول اس بات پر موقوف ہے کہ موافق وناموافق حالات پر گہری نظر کے ساتھ ایک واضح اور مرتب منصوبہ تنظیم کے اندر کام کر رہا ہو۔

مسلمانانِ ہند خصوصاً شمالی ہند کے مسلمانوں کا سابقہ بہت پیچیدہ حالات سے ہے۔ یہاں اپنے سیاسی، سماجی یا جانی، مالی اور اقتصادی و معاشی تحفظ کے لیے ان کا ہر قدم بہت غور و فکر پر مبنی ہونا چاہیے۔ انھیں حرکت اور تنظیم کی ضرورت اور بیحد ضرورت ہے۔ مگر اس سے زیادہ ضرورت فکر و نظر کی ہے۔ فکر و نظر کی روشنی کے بغیر اگر قدم اٹھائے جائیں گے تو ہر تھوڑے عرصہ کے بعد ہمیں نظر آئے گا کہ حالات کی دشواریوں سے ہم وہیں پہونچ گئے ہیں جہاں سے چلے تھے۔ اور پھر شاید یہ عزم سفر بھی باقی نہ رہے گا جو آج موجود ہے۔

مسئلہ تو بہت تفصیل طلب ہے مگر تفصیل میں جائے بغیر یہ مختصر بات اس محدود جگہ میں بھی کہی جا سکتی ہے کہ مقابلہ کی تنظیموں کے جو تجویزات لوگوں کے ذہن میں آ رہے ہیں ان کی کارکردگی کے لیے موجودہ ہندوستان میں کوئی واضح گنجائش نہیں ہے۔ البتہ دینی تنظیم وہ ایک واحد طریقہ ہے جس کے لیے اس ملک میں پوری گنجائش موجود ہے۔ اور یہ تنظیم جس میں جذبات کی فوری تسکین کا سامان نہیں ہے، مسئلہ کو صرف اُس حد تک نہیں حل کر سکے گی جو ہمارا منتہائے مقصود بن گیا ہے۔ بلکہ اس حد تک حل کرنے کی طاقت اس میں پائی جاتی ہے جو ہمارا منتہائے مقصود ہونا چاہیے۔ ہم فوری دوا چاہتے ہیں جو نایاب ہے، کاش ہم کچھ صبر سے کام لیکر وہ دوا شروع کریں جو ہمارے گھر میں موجود ہے اور ہمارے مقصود سے زیادہ ہمیں دے سکتی ہے۔

حضرت مولانا نعمانی مدظلہ سفر حج سے واپس آ گئے ہیں۔ اس سفر سے متعلق کچھ لکھنے کا بھی مولانا کا ارادہ ہے جو انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں پیش کیا جا سکے گا۔

کتاب الاذکار والدعوات

معارف الحدیث

(مسلسل)

جامع اور ہمہ گیر دعائیں :- (۲)

اس عنوان کے تحت چند حدیثیں گزشتہ اشاعت میں پیش کی جا چکی ہیں ان کے آگے آج درج کی جا رہی ہیں

عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَّمَهَا هٰذَا الدُّعَاءَ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ مِنَ الْخَيْرِ كُلِّهٖ عَاجِلِهٖ وَاٰجِلِهٖ مَا عَلِمْتُ مِنْهُ وَمَا لَمْ اَعْلَمْ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشَّرِّ كُلِّهٖ عَاجِلِهٖ وَاٰجِلِهٖ مَا عَلِمْتُ مِنْهُ وَمَا لَمْ اَعْلَمْ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا سَأَلَكَ مِنْهُ عَبْدُكَ وَنَبِيُّكَ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا اسْتَعَاذَ مِنْهُ عَبْدُكَ وَنَبِيُّكَ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ الْجَنَّةَ وَمَا قَرَّبَ اِلَيْهَا مِنْ قَوْلٍ وَعَمَلٍ، وَاَعُوْذُ بِكَ مِنَ النَّارِ وَمَا قَرَّبَ اِلَيْهَا مِنْ قَوْلٍ وَعَمَلٍ، وَاَسْأَلُكَ اَنْ تَجْعَلَ كُلَّ قَضَاءٍ تَقْضِيْهِ لِیْ خَيْرًا۔

(رواه ابن ابی شیبہ وابن ماجہ)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ جامع دعا تعلیم فرمائی اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ مِنَ الْخَيْرِ كُلِّهٖ .....

لہ ۱۰ رمضان [illegible] جنوری [illegible]

.... تا..... كل قضاء تقضيه لي خيراً " (یعنی اے اللہ میں تجھ سے ہر قسم کی خیر اور بھلائی مانگتی ہوں، دنیا کی خیر بھی اور آخرت کی خیر بھی، وہ خیر بھی مانگتی ہوں جس کو میں جانتی ہوں اور وہ بھی جس کو میں نہیں جانتی اور میں تیری پناہ چاہتی ہوں ہر قسم کے شر اور برائی سے، دنیا کے بھی شر سے اور آخرت کے بھی شر سے، اُس شر سے بھی جس کو میں جانتی ہوں اور اس سے بھی جس کو میں نہیں جانتی۔ اے میرے اللہ تیرے خاص بندے اور پیارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جس جس خیر کا بھی تجھ سے سوال کیا میں تجھ سے اسکی سائل ہوں اور جس جس شر سے انھوں نے تیری پناہ چاہی اے اللہ میں بھی اس شر سے تیری پناہ چاہتی ہوں۔ اے اللہ میں تجھ سے جنت مانگتی ہوں اور اس قول و عمل کی توفیق کی سائل ہوں جو مجھے جنت سے قریب کرے اور میں تجھ سے دوزخ سے پناہ چاہتی ہوں اور ہر اُس قول و عمل سے جو دوزخ سے قریب کرنے والا ہو۔ اور اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتی ہوں کہ جو فیصلہ تو میرے حق میں فرمائے وہ میرے لئے خیر اور بھلائی کا ضامن ہو۔

(مصنف ابن ابی شیبہ و سنن ابن ماجہ)

(تشریح) اس دعا کے ایک ایک جز پر غور کیا جائے، انسان کو دنیا اور آخرت میں جس چیز کی بھی ضرورت ہو سکتی ہے یہ سب اس پر حاوی ہے۔

عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ قَالَ دَعَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِدُعَاءٍ کَثِیْرٍ لَمْ نَحْفَظْ مِنْہُ شَیْئًا فَقُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ دَعَوْتَ بِدُعَاءٍ کَثِیْرٍ لَمْ نَحْفَظْ مِنْہُ شَیْئًا، قَالَ اَلَا اَدُلُّکُمْ عَلٰی مَا یَجْمَعُ ذٰلِکَ کُلَّہٗ؟ تَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْاَلُکَ مِنْ خَیْرِ مَا سَاَلَکَ مِنْہُ نَبِیُّکَ مُحَمَّدٌ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَنَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّ مَا اسْتَعَاذَ مِنْہُ نَبِیُّکَ مُحَمَّدٌ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاَنْتَ الْمُسْتَعَانُ وَعَلَیْکَ الْبَلَاغُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ ———— رواہ الترمذی

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی دعائیں فرمائیں جو ہمیں یاد نہیں رہیں، تو ہم نے آپ سے عرض کیا یا رسول اللہ آپ نے بہت سی دعائیں فرمائی تھیں ان کو ہم یاد نہیں رکھ سکے (اور چاہتے یہ ہیں کہ اللہ سے وہ سب دعائیں مانگیں، تو کیا کریں؟) آپ نے فرمایا میں تمہیں ایسی دعا بتائے دیتا ہوں جس میں وہ ساری دعائیں آجائیں! اللہ تعالیٰ کے حضور میں یوں عرض کرو کہ "اے اللہ ہم تجھ سے وہ سب مانگتے ہیں جو تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھ سے مانگا اور ہم اُن سب چیزوں سے تیری پناہ چاہتے ہیں جن سے تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تیری پناہ چاہی۔ بس تو ہی ہے جس سے مدد چاہی جائے، اور تیرے ہی کرم پر موقوف ہے مقاصد اور مرادوں تک پہنچنا۔ اور کسی مقصد کے لئے سعی وحرکت اور اس کو حاصل کرنے کی قوت و طاقت بس اللہ ہی سے مل سکتی ہے۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) دنیا میں ایسے ہی بندوں کی تعداد زیادہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول شدہ زیادہ دعائیں یاد نہیں رکھ سکتے، ان کے لئے اس حدیث میں نہایت آسان طریقہ بتادیا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح مانگا کریں کہ اے اللہ تجھ سے جو کچھ تیرے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مانگا میں وہ سب تجھ سے مانگتا ہوں اور، جن چیزوں سے انھوں نے تیری پناہ چاہی میں ان سب چیزوں سے تیری پناہ چاہتی ہوں۔ ناچیز راقم سطور عرض کرتا ہے کہ اس میں بھی کوئی خسارہ اور مضائقہ نہیں ہے کہ یہ بات اپنی ہی زبان میں کہی جائے، مگر اللہ تعالیٰ کے حضور میں دل سے عرض کیا جائے، دراصل دعا وہی ہے جو دل سے ہو۔

عن ابن مسعود مرفوعاً۔ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْأَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ وَالسَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ اِثْمٍ وَالْغَنِيْمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ وَالْفَوْزَ بِالْجَنَّةِ وَالنَّجَاةَ مِنَ النَّارِ۔

(رواہ الحاکم)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا

روایت کی ہے "اللّٰھُمَّ اِنَّا نسألک ..... تا ..... من النار" (اے اللہ
ہم تجھ سے سوال کرتے ہیں تیری رحمت کو واجب کر دینے والے، اور تیری مغفرت
کو پکا کر دینے والے اعمال کا اور ہر گناہ سے محفوظ رہنے کا اور ہر نیکی کی توفیق کا اور
تجھ سے مانگتے ہیں جنت کا حصول اور دوزخ سے نجات۔)

(مستدرک)

عَنْ اِبْنِ مَسْعُوْدٍ مَرْفُوْعاً "اَللّٰھُمَّ احْفَظْنِیْ بِالْاِسْلَامِ قَائِماً
وَاحْفَظْنِیْ بِالْاِسْلَامِ قَاعِداً وَاحْفَظْنِیْ بِالْاِسْلَامِ رَاقِداً
وَلَا تُشْمِتْ بِیْ عَدُوًّا وَّلَا حَاسِداً اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ
مِنْ كُلِّ خَيْرٍ خَزَائِنُهٗ بِيَدِكَ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ كُلِّ شَرٍّ
خَزَائِنُهٗ بِيَدِكَ۔ (رواہ الحاکم)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت
کی ہے "اَللّٰھُمَّ احْفَظْنِیْ ..... تا ..... خزائنه بيدك (اے اللہ میری
حفاظت فرما اسلام کے ساتھ کھڑے ہونے کی حالت میں اور بیٹھے ہونے کی حالت
میں اور سونے کی حالت میں یعنی میں کھڑے، بیٹھے اور سوتے ہر حال میں ایمان و
اسلام کے ساتھ محفوظ رہوں اور میرے دشمنوں اور حاسدوں کو تیرے کسی فیصلہ سے
شماتت کا موقع نہ ملے، اے میرے اللہ تیرے ہاتھ میں تیرے جو خزانے ہیں میں تجھ
سے ان کو مانگتا ہوں اور تیرے قبضہ میں جو شر ہے اس سے میں تیری پناہ چاہتا ہوں۔

عَنْ بُرَيْدَةَ مَرْفُوْعاً "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ شَكُوْراً وَّاجْعَلْنِیْ
صَبُوْراً وَّاجْعَلْنِیْ فِیْ عَيْنِیْ صَغِيْراً وَّفِیْ اَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيْراً۔

(رواہ البزار)

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے
"اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ ..... تا ..... کبیراً (اے اللہ مجھے اپنا شکر کرنے والا اور صبر
کرنے والا بندہ بنا، اور مجھے اپنی نگاہ میں چھوٹا اور دوسرے لوگوں کی نگاہ میں بڑا بنادے۔
(مسند بزار)

(تشریح) اس دعا کا آخری جزو خاص طور سے قابل غور ہے، بندہ کو چاہئے کہ اپنے کو وہ چھوٹا اور حقیر و ذلیل سمجھے اور ساتھ ہی اللہ سے دعا کرتا رہے کہ دوسروں کی نگاہ میں وہ ذلیل نہ ہو۔

عَنِ الْأَوْزَاعِيِّ مُرْسَلاً " اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ التَّوْفِيْقَ لِمَحَابِّكَ مِنَ الْأَعْمَالِ وَصِدْقَ التَّوَكُّلِ عَلَيْكَ وَحُسْنَ الظَّنِّ بِكَ ________ رواہ ابونعیم فی الحلیہ

امام اوزاعیؒ نے بطریق ارسال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے۔ " اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ ...... تا ...... وحسن الظن بك "

(اے اللہ میں تجھ سے التجا کرتا ہوں تو مجھے توفیق دے اُن اعمال کی جو تجھے محبوب ہیں، اور عطا فرما مجھے سچا توکل، اور اپنی ذات پاک کے ساتھ حسن ظن۔

(حلیہ ابونعیم)

عَنْ عَلِيٍّ مَرْفُوْعاً " اَللّٰهُمَّ افْتَحْ مَسَامِعَ قَلْبِيْ لِذِكْرِكَ وَارْزُقْنِيْ طَاعَتَكَ وَطَاعَةَ رَسُوْلِكَ وَعَمَلاً بِكِتَابِكَ ____

رواہ الطبرانی فی الاوسط

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا روایت کی گئی ہے " اَللّٰهُمَّ افْتَحْ مَسَامِعَ قَلْبِيْ ..... تا ...... وعملاً بكتابك " (اے اللہ اپنے ذکر کے لئے اور اپنی نصیحت کے لئے میرے دل کے کان کھول دے اور مجھے اپنی فرمانبرداری اور اپنے رسول پاک کی تابعداری نصیب فرما اور اپنی مقدس کتاب پر عمل کی توفیق دے۔

(معجم اوسط طبرانی)

عن ابی هريرة مرفوعاً " اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ صِحَّةً فِيْ إِيْمَانٍ وَإِيْمَاناً فِيْ حُسْنِ خُلُقٍ وَنَجَاحاً تُتْبِعُهُ فَلَاحاً وَرَحْمَةً مِنْكَ وَعَافِيَةً وَمَغْفِرَةً مِنْكَ وَرِضْوَاناً ۔

رواہ الطبرانی فی الاوسط والحاکم فی المستدرک۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا روایت کی

گئی ہے " اَللّٰھُمَّ اِنِّی اسألک صحۃ ...... تا ...... ورضوانا "
(اے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں صحت ایمان کے ساتھ، اور استدعا کرتا ہوں ایمان کی حسن اخلاق کے ساتھ، اور سوال کرتا ہوں تجھ سے مقاصد میں کامیابی کا آخرت کی فلاح کے ساتھ، اور سائل ہوں تجھ سے رحمت اور عافیت کا اور تیری مغفرت اور رضامندی کا۔

(معجم اوسط للطبرانی و مستدرک حاکم)

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ مَرْفُوْعًا " اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ اِیْمَانًا یُبَاشِرُ قَلْبِیْ وَیَقِیْنًا صَادِقًا حَتّٰی اَعْلَمَ اَنَّہٗ لَا یُصِیْبُنِیْ اِلَّا مَا کَتَبْتَ لِیْ وَرِضًا مِنَ الْمَعِیْشَۃِ بِمَا قَسَمْتَ لِیْ " ______ (رواہ البزار)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا روایت کی گئی ہے " اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ ...... تا ...... بما قسمت لِی " ____
(اے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں ایسا ایمان جو میرے دل میں پیوست ہو جائے اور ایسا یقین صادق جس کے بعد یہ حقیقت میرا علم بن جائے کہ مجھ پر صرف وہی تکلیف آئے گی جو تو نے میرے لئے لکھ دی ہے، اور میں تجھ سے استدعا کرتا ہوں کہ میرا یہ حال کر دے کہ زندگی کا جو سامان تو مجھے دے میں اس پر دل سے راضی رہوں۔)

(مسند بزار)

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ مَرْفُوْعًا " اَللّٰھُمَّ الْطُفْ بِیْ فِیْ تَیْسِیْرِ کُلِّ عَسِیْرٍ فَاِنَّ تَیْسِیْرَ کُلِّ عَسِیْرٍ عَلَیْکَ یَسِیْرٌ وَ اَسْأَلُکَ الْیُسْرَ وَ الْمُعَافَاۃَ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃِ۔

(رواہ الطبرانی فی الاوسط

حضرت ابوہریرہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا روایت کی گئی ہو " اللھم الطف بی ..... تا ..... والآخرہ " (اے اللہ میری ہر دشواری کو آسان فرما کے مجھ پہ مہربانی فرما، ساری دشواریوں مشکلوں کو آسان کرنا تیرے لئے

بالکل آسان ہے اور میں تجھ سے استدعا کرتا ہوں دنیا اور آخرت میں سہولت اور آسانی کے لئے اور کامل عافیت کے لئے۔ (معجم اوسط للطبرانی)

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ مَرْفُوْعاً " اَللّٰهُمَّ عَافِنِیْ فِیْ قُدْرَتِكَ وَ اَدْخِلْنِیْ فِیْ رَحْمَتِكَ وَ اقْضِ اَجَلِیْ فِیْ طَاعَتِكَ وَاخْتِمْ لِیْ بِخَیْرِ عَمَلِیْ وَاجْعَلْ ثَوَابَهُ الْجَنَّةَ۔ (رواہ ابن عساکر)

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا روایت کی گئی ہے " اللھم عافنی فی قدرتك ....تا...... واجعل ثوابه الجنة " (اے اللہ) مجھے عافیت عطا فرما اپنی قدرت سے اور مجھے اپنی رحمت کے آغوش میں لے لے اور اپنی اطاعت و فرمانبرداری میں میری عمر تمام کر دے اور بہترین عمل پر میرا خاتمہ کر دے اور جنت کو اس کا صلہ ٹھیرا دے۔

(ابن عساکر)

عَنْ مَالِكٍ قَالَ بَلَغَنِیْ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كَانَ یَدْعُوْ " اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ فِعْلَ الْخَیْرَاتِ وَتَرْكَ الْمُنْكَرَاتِ وَحُبَّ الْمَسَاكِیْنِ وَاِذَا اَرَدْتَ بِقَوْمٍ فِتْنَةً فَاقْبِضْنِیْ اِلَیْكَ غَیْرَ مَفْتُوْنٍ "۔ مالک فی الموطا

امام مالکؒ سے مروی ہے انھوں نے بیان کیا کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے " اللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ....تا... غیر مفتون " (اے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں اچھے عمل کرنے کی توفیق، اور برے اعمال کو چھوڑ دینے کی توفیق اور تیرے مسکین بندوں کے ساتھ محبت کرنے کی توفیق، اور اے اللہ جب تیرا فیصلہ کسی قوم کو فتنہ اور عذاب میں مبتلا کرنے کا ہو تو مجھے اس فتنہ میں مبتلا کئے بغیر اپنی طرف اٹھا لے"۔)

(موطا امام مالک)

(تشریح) اس سلسلۂ معارف الحدیث میں پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ

جو تبع تابعین میں سے ہیں، کبھی کبھی بعض حدیثیں سند کا ذکر کئے بغیر "بلغنی" کے عنوان سے بھی بیان کرتے ہیں، ان کو اصطلاح میں "بلاغات مالک" کہا جاتا ہے اور محدثین کے نزدیک یہ سب قابل قبول ہیں، یہ روایت بھی انھیں "بلاغات" میں سے ہے۔

عَنْ بُسْرِ بْنِ اَرْطَاةَ (مرفوعاً) اَللّٰهُمَّ اَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِي الْاُمُوْرِ كُلِّهَا وَاَجِرْنَا مِنْ خِزْيِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْآخِرَةِ ــــــ

(رواہ احمد وابن حبان والحاکم)

بُسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا نقل فرمائی "اَللّٰهُمَّ اَحْسِنْ ..... تا ..... وَعَذَابِ الْآخِرَةِ" (اے اللہ ہمارے سارے کاموں کا انجام بہتر کر اور دنیا کی رسوائی اور آخرت کے عذاب سے ہمیں بچا اور ہماری حفاظت فرما۔ (مسند احمد، صحیح ابن حبان، مستدرک حاکم)

(تشریح) یہ دعا کس قدر بہت ہی مختصر اور بہت جامع ہے۔

عَنْ اُمِّ مَعْبَدٍ الْخُزَاعِيَّةِ مرفوعاً "اَللّٰهُمَّ طَهِّرْ قَلْبِيْ مِنَ النِّفَاقِ وَعَمَلِيْ مِنَ الرِّيَاءِ وَلِسَانِيْ مِنَ الْكَذِبِ وَعَيْنِيْ مِنَ الْخِيَانَةِ فَاِنَّكَ تَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ــــــ

(رواہ الحکیم الترمذی والخطیب)

ام معبد خزاعیہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے "اَللّٰهُمَّ طَهِّرْ قَلْبِيْ ..... تا ..... وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ" (اے اللہ میرے دل کو نفاق سے، میرے اعمال کو ریا کی آمیزش سے، میری زبان کو جھوٹ سے، اور میری آنکھوں کو نظر کی خیانت سے بالکل پاک صاف کر دے، تو آنکھوں کی خیانت اور دلوں کے رازوں کو بھی جانتا ہے تجھ سے میری کوئی چیز مخفی نہیں)

(نوادر حکیم ترمذی، خطیب)

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ دُعَاءُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ عَشِيَّةَ عَرَفَةَ۔

"اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ تَسْمَعُ كَلَامِي وَتَرَىٰ مَكَانِي وَتَعْلَمُ سِرِّي وَعَلَانِيَتِي لَا يَخْفَىٰ عَلَيْكَ شَيْءٌ مِنْ أَمْرِي وَأَنَا الْبَائِسُ الْفَقِيرُ الْمُسْتَغِيثُ الْمُسْتَجِيرُ الْوَجِلُ الْمُشْفِقُ الْمُقِرُّ الْمُعْتَرِفُ بِذَنْبِهِ أَسْأَلُكَ مَسْأَلَةَ الْمِسْكِينِ وَأَبْتَهِلُ إِلَيْكَ ابْتِهَالَ الْمُذْنِبِ الذَّلِيلِ وَأَدْعُوكَ دُعَاءَ الْخَائِفِ الضَّرِيرِ مَنْ خَضَعَتْ لَكَ رَقَبَتُهُ وَفَاضَتْ لَكَ عَبْرَتُهُ وَذَلَّ لَكَ جِسْمُهُ وَرَغِمَ لَكَ أَنْفُهُ اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْنِي بِدُعَائِكَ شَقِيًّا وَكُنْ بِي رَءُوفًا رَحِيمًا يَا خَيْرَ الْمَسْئُولِينَ وَيَا خَيْرَ الْمُعْطِينَ" ——— (رواہ الطبرانی فی الکبیر)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حجۃ الوداع میں عرفہ کی شام کو میدان عرفات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا بھی فرمائی تھی۔" اللهم انك تسمع كلامى ...... تا ...... ويا خير المعطين (اے میرے اللہ! تو میری بات سنتا ہے اور میں جس جگہ جس حال میں ہوں وہ تیری نظر میں ہے۔ اور میرا ظاہر و باطن سب تیرے علم میں ہے اور میری کوئی چیز بھی تجھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اور میں مصیبتوں دکھوں کا مارا ہوا ہوں، تیرے در کا فقیر ہوں، تیرے ہی پاس فریاد لے کر آیا ہوں اور تجھ ہی سے پناہ کا طالب ہوں، تیرا خوف اور ڈر مجھ پر چھایا ہوا ہے، میں اپنے گناہوں کا اقراری ہوں، میں تجھ سے بیکس اور بے وسیلہ مسکین کی طرح سوال کرتا ہوں اور ایک ذلیل گناہگار بندہ کی طرح تیرے حضور میں گڑگڑاتا ہوں، اور خوف زدہ اور دکھ درد میں مبتلا کسی بندہ کی طرح تجھ سے دعا کرتا ہوں۔ اس بندہ کی سی دعا جس کی گردن تیرے سامنے خم ہو، اور جس کے آنسو تیرے حضور میں بہہ رہے ہوں اور جس کا جسم جھکا ہوا اور جو تیرے سامنے اپنی ناک رگڑ رہا ہو، اور زمین پر سر رکھے پڑا ہو۔ اے میرے اللہ! میری دعا کو رد کر کے مجھے شقی بے نصیب نہ بنا، اور مجھ پر مہربانی اور رحم فرما، اے سب اچھے سے بڑے داتا، اے خیر المسئولین۔

معجم کبیر للطبرانی

(تشریح) ان سب دعاؤں کی جامعیت اور ہمہ گیری ظاہر ہے۔ ان کے مضامین بھی کسی خاص تشریح اور وضاحت کے محتاج نہیں، غور کرنے والوں اور سمجھنے والوں کے لیے ان کا ہر جز معرفت کا خزانہ ہے، خاصکر یہ آخری دعا جس کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حجۃ الوداع میں وقوف عرفات کے دن شام کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا کی تھی۔ اس کا تو ایک ایک لفظ کمال عبدیت اور کمال معرفت کا ترجمان ہے۔ دنیا کے دینی و مذہبی ادب میں اور کسی بھی زبان کی دعاؤں اور مناجاتوں میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی ـــــ اس عاجز کو زندگی میں کئی دفعہ اس کا موقعہ ملا کہ بعض خدا پرست غیر مسلموں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا سنائی اور اس کا ترجمہ کر کے بتایا تو وہ اپنا یہ تاثر ظاہر کرنے پر مجبور ہو گئے کہ یہ دعا اسی دل سے نکل سکتی ہے جسے اللہ نے اپنے علم کا خاص حصہ دیا ہو اور اس کو معرفت نفس اور معرفت رب کا اعلیٰ سے اعلیٰ مقام حاصل ہو۔

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس محفوظ اور نہایت قیمتی ورثہ کی قدر کریں اور ان دعاؤں کے ذریعہ دنیا اور آخرت کی برکتیں اور رحمتیں براہ راست مالک الملک کے خزانہ سے حاصل کیا کریں۔

یک ساعت صحبت با اہل دل

مجلس حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی مدظلہ العالی

مرتبہ: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

۲۲ شوال ۱۳۸۷ھ مطابق ۲۳ جنوری ۱۹۶۸ء خانقاہ شریف بھوپال

(چوتھی مجلس)

فرمایا اس فضا میں فیوض ہر طرح کے موجود ہیں فیوض ہی نہیں میں تو کہتا ہوں وجود بھی ہر طرح کے موجود ہیں، لیکن ان فیوض کے ادراک اور ان سے استفادہ کرنے کے لئے استعداد اور اس حاسّہ کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے جس سے ان کا تعلق ہے، قوتِ سامعہ سب کو ملی ہے لیکن اس سامعہ کے اندر ایک اور سامعہ ہے جو اگر بیدار نہیں ہو تو بہت سی اصوات اور مسموعات کا ادراک نہیں کر سکتا اس قوت اور اس کے مدرکات کے درمیان ایک رابطہ کی ضرورت ہے، اگر وہ رابطہ موجود ہے تو وہ قوت اُن کو اخذ کر لے گی ورنہ اس کو ان کا ادراک بھی نہیں ہوگا، دیکھئے آوازیں ہمیشہ سے فضا میں موجود تھیں لیکن جب تک وہ رابطہ پیدا نہیں ہوا ان کا کسی کو بھی احساس نہ تھا اور نہ کوئی ان کو سنتا تھا، اب آپ یہاں بیٹھے بیٹھے کراچی کی، مکہ کی، اور لندن کی آوازیں سنتے رہتے ہیں، یہ حاسّہ سب کو ملا ہے صرف بیدار کرنے نہ کرنے، ترقی دینے نہ دینے کا فرق ہے اسی کو لوگ بزرگی اور ولایت سمجھنے لگتے ہیں۔ ایک شخص آپ کے سامنے انگریزی کا خط فر فر پڑھتا چلا جاتا ہے، آپ

انگریزی پڑھے ہوئے نہیں ہیں آپ اس کو کرامت یا بزرگی سمجھنے لگیں گے کہ آپ دو لفظ نہیں پڑھ سکتے آپ کو معلوم نہیں اس میں کیا لکھا ہوا ہے اور وہ سبق کی طرح اس کو ناتا چلا جاتا ہے، لیکن اگر آپ بھی اس علم کو سیکھ لیں اور اس حاسّہ کو بیدار کرلیں تو آپ بھی پڑھ سکتے ہیں، ولایت اور بزرگی کے جو مراتب و کمالات بیان کئے گئے ہیں اور بزرگوں کے جن کمالات کا ذکر ہم سنتے ہیں ان سب کی استعداد عام مسلمانوں میں موجود ہے صرف نبوت، شرف صحابیت اور اسی طرح سے تابعی ہونے کی سعادت اس زمانہ میں ممکن نہیں کہ ان کا ایک زمانہ پر اختتام ہو چکا ہے، باقی سب ممکن ہے، البتہ استعدادیں مختلف ہیں، یہ ضروری نہیں کہ جو مرتبہ حضرت مجدد صاحبؒ کو حاصل ہوا وہ آپ کو حاصل ہو جائے۔ استعدادوں کا تفاوت برحق ہے۔

لوگوں کی عادت ہے کہ ایک کو بزرگ مان لیتے ہیں اور اسی سے دعا کراتے ہیں، باقی نہ اپنے کو دعا کے قابل سمجھتے ہیں نہ عام مسلمانوں میں کوئی بزرگی مانتے ہیں، میں تو سمجھتا ہوں کہ گنا ہگار مسلمانوں میں بھی اثر و قبولیت ہے، ولایت ہر مسلمان کے لئے ذاتی ہے اور گناہ عارضی، اللہ نے تو بزرگ ہی پیدا کیا، ہم شیطان ہو گئے، دیکھئے جب ہم بچے تھے تو گناہوں سے معصوم ولی قطب سب تھے۔ بڑھ کر شیطان ہو گئے مگر یہ عارضی چیز ہے۔ مسلمانوں نے ہر چیز میں تقسیم کر رکھی ہے، امامت کے لئے بھی وہ کسی کو مخصوص کر دیتے ہیں حالاں کہ امامت بھی کسی کے ساتھ مخصوص نہیں، ہر مسلمان امامت کر سکتا ہے، مجھے یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ ایک شخص کو امامت کے لئے نوکر رکھ لیا جائے اور وہی نماز پڑھاتا رہے، یہ کیا امام و موذن؟ ہر ایک امام و موذن ہے، اسی طرح دعا ہر مسلمان کر سکتا ہے اور اس کی دعا سے بڑے بڑے کام ہو جاتے ہیں، پیر صاحب ہی دعا کرنے کے لئے نہیں ہیں تم بھی ہو، یہاں ایک معزز آدمی تھے ریاست کے انضمام کے بعد بہت سے معزز مسلمانوں پر داروگیر ہوئی ان پر بھی چیف کمشنر صاحب نے ایک مقدمہ قائم کر دیا بیچارے نماز روزہ اور ذکر و تلاوت سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے تھے، ایک حافظ صاحب کو لے کر میرے پاس آئے اور کہا کہ مجھ پر مقدمہ قائم

ہو گیا ہے آپ جو کچھ بتائیں ان حافظ صاحب کو بتا دیجئے یہ پڑھ لیں گے، میں نے کچھ پڑھنے کو بتایا، کئی روز پڑھتے ہوئے ہو گئے کوئی اثر ظاہر نہیں ہوا، ایک دن انھوں نے ان حافظ صاحب کو موٹر پر بٹھایا اور جنگل میں لے گئے اور کہنے لگے کہ تم اتنے دن سے اللہ کا کلام پڑھ رہے ہو ابھی تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا، میں یہ نہیں مان سکتا کہ اللہ کے کلام میں اثر نہ ہو اللہ کا کلام اور اس سے ابھی تک نتیجہ نہ نکلے یہ ممکن نہیں! اب میں تم سے صاف صاف کہتا ہوں کہ اگر میں نہ چھوٹا تو میں تمھارے قتل کر دونگا، میں نے معلوم نہیں کتنے خون کئے ہیں، میں تمھاری بوٹی بوٹی کر کے کسی کنوئیں میں ڈال دوں گا، کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا اب تم جانو تمھارا کام! وہ گھبرائے ہوئے میرے پاس آئے اور قصہ سنایا، میں نے کہا کہ اب تم اپنی فکر کرو، میں کچھ نہیں جانتا، بہر حال انھوں نے اس بیقراری میں جو کچھ دعا کی ہو، وہ رئیس صاحب صاف بری ہو گئے، مجھے تو انکے اس یقین اور ایمانی قوت کا لطف آیا کہ خدا کا کلام اور اس کے پڑھنے سے کچھ نہ ہو نہیں ہو سکتا!۔

فرمایا کہ تنگی کا وقت بڑی برکت کا ہوتا ہے، انقباض کا وقت انشراح کے وقت سے بہتر ہے، انشراح کی حالت میں عبادت بلا تکلف اور فطرتاً ہوتی ہو، انقباض کے وقت جب فتوحات کے دروازے بند ہو جائیں بندگی اور وفاداری بڑی مردانگی ہے اور اس کی بڑی قدر کی جاتی ہے اگر کوئی کسی کا خیال کرے اور وہ اس کا دم بھرے یہ تو ایک قدرتی بات ہے اس وقت کی عبادت و خدمت خلوص سے نہیں ہوتی، جو شخص اس موقع پر اپنے محسن کی خدمت کرے تو اس کو ذات سے محبت نہیں، انعامات و عطایا سے محبت ہے اور جب بظاہر نگاہ پھر جائے تو اس وقت جو محبت کا دم بھرے تو یہ محبت ذاتی ہے، محبت ذاتی میں دوام ہے پختگی ہے ثبات استقامت ہے، خلوص تو یہ ہے سب بند کر دو پھر بھی دروازہ نہ چھوڑیں گے۔ حافظ فرماتے ہیں:۔

ہنگام تنگ دستی در عیش کوش و مستی
کیں کیمیائے ہستی قارون کند گدا را

لوگ کہتے ہیں کہ اسلام پر بڑا نازک وقت آیا ہے، مسلمانوں پر بڑی پریشانی کا دور ہے، میں کہتا ہوں بڑی فرحت کا دور ہے، اسلام مسلمانوں کے لئے ہر وقت فرحت ہی کا زمانہ ہے، دیکھئے اسلام کی تاریخ میں جنگ احد سے زیادہ کوئی سخت وقت نہیں آیا، ستر جلیل القدر صحابی شہید ہوئے، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا مثلہ کیا گیا، دندان مبارک شہید ہوئے چہرہ مبارک پر ایسے گہرے زخم آئے کہ حضرت فاطمہ رضؓ نے چٹائی جلا کر اس کی راکھ بھری، اُن سب کے بعد ابو سفیان، اور حضرت خالد نے جو اس وقت کفار کے قائد تھے للکارا کہ ابھی کیا ہوا ہے ایک اور فوج آرہی ہے وہ تمھارا رہا سہا کام تمام کرے گی لیکن اس حالت میں صحابہؓ کرام کے ایمان و یقین اور فرحت و انبساط میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ اضافہ ہوا اللہ تعالےٰ فرماتا ہے، اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ " یہ جو منی ایمان ہے جاپانی نہیں جب ٹھیس لگی تو معلوم ہوا کہ کتنا پختہ ہے۔ مسلمان کی شان تو یہ ہے کہ اس کو کسی نے پچھاڑ دیا اسکے سینہ پر سوار ہو گیا اور چھرا نکال کر اس کو دکھایا کہ اب تیری مدد کون کرے گا اور تجھے اس وقت کون بچا سکتا ہے اس نے کہا اللہ، چنانچہ ایک تیر پیچھے سے آیا اور وہ شخص گرا مسلمان نے اس کا چھرا لے کر اس کو ذبح کر دیا، اس طرح کے واقعات تاریخ اسلام میں بہت آئے ہیں، یہاں تو یہ حال ہے کہ جدھر کی ہوا چلی اُدھر کو مڑ گئے۔

فرمایا کہ وظائف و اذکار سے بعض مرتبہ فتوحات کا دروازہ کھلتا ہے اس وقت یہ دیکھنے کی بات ہے کہ یہ حلال ہے یا حرام، شریعت کا حکم ہے یا نہیں، اگر اس امتحان میں آدمی پورا اترا تو پھر اللہ کی مدد ہوتی ہے اور دروازہ کھل جاتا ہے، دہلی میں ایک زرکوب تھے نیک اور صالح آدمی، ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ جب سے میرا ہاتھ بیکار ہو گیا ہے اور ورق کوٹنے سے میں معذور ہو گیا ہوں تنگ دستی اور ناداری نے پریشان کر دیا ہے، میں نے کچھ پڑھنے کو بتا دیا چند دن کے بعد وہ ملے اور بہت خوشی سے کہنے لگے کہ آپ نے پڑھنے کو جو کچھ بتایا تھا اس سے بڑا فائدہ ہوا میں سڑک پر جا رہا تھا کہ

ایک پڑیا پڑی ہوئی دکھائی دی میں نے اٹھایا تو اس میں سو سو کے نوٹ تھے میں نے کہا کہ یہ اس پڑھنے کی برکت ہے اور رکھ لیا، میں نے جواب دیا کہ تم کو اس وقت سمجھنا چاہیئے تھا کہ یہ ناجائز ہے اگر تم اس امتحان میں پورے اترتے تو پھر اللہ کی مدد ہوتی۔

فرمایا ایک چیز کے سمجھنے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ جہاں آپ بیٹھے ہیں اس کو سمجھ لیں کہ اس کا کیا حق اور کیا آداب ہیں پھر کسی نصیحت اور وعظ کی ضرورت نہیں، صرف زبان مکان کو دیکھنے کی ضرورت ہے پھر کسی وعظ و تلقین کی ضرورت نہیں، اگر کوئی شخص مسجد میں بیٹھا ہو تو اس سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میاں یہاں بیڑی سگرٹ نہ پینا یہاں پیشاب و پاخانہ نہ کرنا اس کو صرف یہ بتانے اور معلوم کرانے کی ضرورت ہے کہ وہ خانۂ خدا میں ہو اگر اس کو کوئی یہ نصیحت کرنے لگے کہ وہ گھر اور بازار والے کام یہاں نہ کرے تو یہ ایک مجنونانہ بات ہوگی اور وہ اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگے گا کہ کیا کہہ رہا ہے اب ہم کو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ہم اسلام کے مکان میں بیٹھے ہیں ہم اسکے حقوق و آداب کی پابندی خود کریں گے بہت سے حضرات ہیں جو نماز روزہ ذکر و اذکار ورد و وظیفہ بہت کرتے رہتے ہیں لیکن ان کو حلال و حرام مشتبہ و غیر مشتبہ کا کوئی خیال نہیں، ہمارے دوستوں میں ایک صاحب بڑے ذاکر و شاغل تھے، صاحبزادہ بینک میں ملازم تھے ان کی تخفیف ہوگئی وہ ایک دن صاحبزادے کو میرے پاس لے کر آئے اور کہا کہ دعا کیجئے کہ یہ بچہ بحال ہو جائے، میں نے کہا کہ اللہ کرے وہ راستہ ہی بھول جائے جو بینک کو جاتا ہے، میں نے اکثر دیکھا ہے کہ گنہگار اور عام مسلمانوں پر بات کا بڑا اثر ہوتا ہے لیکن متقیوں پر کلام کا اثر نہیں ہوا کرتا، وجہ یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ سب کچھ جانتے ہی ہیں اور سب کچھ کرتے ہی ہیں کہنے والے نے غلط نہیں کہا:

آں کس کہ نداند و بداند کہ بداند

در جہل مرکب ابد الدہر بماند

پیری نے اسلام کے اندر جو تلاطم پیدا کیا وہ کسی نے نہیں پیدا کیا، راہ پر تو کم آئے ہوں گے بے راہ بہت ہو گئے، جہاں بھی ہم پہونچے وہاں یہی دیکھا کہ پیر و مرشد جو گوٹ چلیں گے بس وہی شطرنج ہے حالاں کہ شطرنج کے اصول و ضوابط مستقل ہیں کوئی اس

میں ترمیم نہیں کرتا، یہ تو حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ ہی کا کمال ہے کہ انھوں نے شریعت کو طریقت و حقیقت پر ہر جگہ مقدم رکھا عام قاعدہ ہے کہ آدمی جس فن کی وکالت کرتا ہے اور جس موضوع پر کتاب لکھتا ہے اسی کو سراہتا ہے اور اسکے مقابلہ میں ہر چیز کی نفی کرتا ہے اور یہی دکھانے کی کوشش کرتا ہے کہ یہی سب کچھ ہے باقی سب ہیچ، مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ طریقت و حقیقت پر مکاتیب تحریر فرماتے ہیں لیکن یہی کہتے ہیں کہ "پس شریعت متکفل جمیع سعادات دنیویہ واخرویہ آمد و مطلبے نماند کہ بماورائے شریعت دراں مطلب احتیاج افتد طریقت و حقیقت کہ صوفیہ بآں ممتاز گشتہ اند ہر دو خادم شریعت اند[1]......

البتہ یہاں حضرت طریقہ نقشبندیہ کو تمام طرق پر کھلی ترجیح دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جو اور طریقوں کی نہایت ہے وہ اس طریقہ کی بدایت ہے اور اس میں اندراج النہایۃ فی البدایۃ ہے اور یہ کہ اقرب و اعلیٰ طریق یہ ہے، تو بادب یہ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ آپ بھی دوسرے طریق میں بیعت ہوئے ہیں، سلسلۂ چشتیہ کے مشائخ کیسے کیسے باکمال اور صاحب فیض گذرے ہیں، بیسیوں واقعات ہیں کہ جس پر نظر پڑ گئی وہ ولی بن گیا خلق اللہ کو اس کی نظر کیمیا اثر سے کیسے کیسے مراتب عالیہ حاصل ہوئے حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک جگہ جنگل میں خیمہ ڈالے ہوئے تھے جنگل میں ایک بھنگ پینے والے فقیر نے اپنے چیلے سے کہا بھنگ لا، اس نے کہا کہ بھنگ تو اس وقت کٹیا میں موجود نہیں، کہا کہ یہی تو میرے پینے کا وقت ہے میں کیا پیوں جا کہیں سے ڈھونڈ کر لا، وہ ڈھونڈھنے نکلا اس نے دیکھا کہ ایک جگہ چراغ جل رہا ہے، حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلوی رونق افروز تھے اس نے پکار کر کہا کہ کیا یہاں بھنگ ملے گی؟ جواب میں ارشاد ہوا کہ یہاں بھنگ نہیں، ولایت ہے اس نے کہا وہی دیدو، فرمایا جا وضو کر کے دو رکعت پڑھ، وہ نماز پڑھ کر آیا تو توجہ دی وہ مست ہو گیا، جب

---

[1] شریعت تمام دنیوی اور اخروی سعادتوں کی کفیل ہو۔ سعادت کا کوئی شعبہ ایسا نہیں کہ اس میں شریعت کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت پڑتی ہو۔ صوفیا کی طریقت و حقیقت دونوں کی دونوں خادم شریعت ہیں۔

اپنے گرو کے پاس پہونچا تو اس نے دیکھتے ہی کہا، ارے میں نے کہا تھا لے کر آنا تو پی کر آیا، اچھا چل مجھ کو بھی پلوا، وہ گیا اور اس پر بھی وہی رنگ چڑھ گیا، شاہ گل صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مسجد میں بیٹھے تھے، ایک بی بی نے بناؤ سنگار کر کے کھڑکی سے چہرہ نکالا، خدام نے عرض کیا حضرت یہ بڑی بے ادب اور گستاخ ہے، ایک مرتبہ کہا دو مرتبہ کہا توجہ نہ کی تیسری مرتبہ کہنے پر نظر اٹھا کر دیکھا قدموں میں آکر گر گئی اور تائب ہوئی، ان حضرات کے ایسے بیسیوں واقعات ہیں، کسی نے خوب کہا کہ نقشبندیہ ایک مکان بناتے ہیں، سجاتے ہیں، سنوارتے ہیں، چشتی اس کو کھود کر میدان کر دیتے ہیں،

حضرت شاہ احمد سعید صاحبؒ نے اربعہ انہار میں چاروں نسبتوں کا فرق خوب بیان کیا ہے، دراصل طریقہ نقشبندیہ کوئی الگ طریقہ نہیں، سب طریقوں کا مرکب ہے، سب طریقوں کی تعظیم اور سب کی خوبیوں کا اعتراف کرنا چاہئیے، رکابی کا حسن جبھی ہے جب وہ سب طرف سے ثابوت اور مکمل ہو اگر کوئی کونا ٹوٹ گیا اگرچہ اسکو استعمال کیا جا سکتا ہے، مگر وہ حسن، موزونیت اور اس کی وہ قیمت نہیں رہتی، پھر ہر ایک کے کہنے کی نقل بھی نہیں کی جا سکتی، ہر ایک اپنے لحاظ سے کہتا ہے، ایک خاتون بیٹھی ہوئی ہیں، شوہر اُن کو بیوی کی طرح خطاب کرتا ہے بیٹا والدہ کہتا ہے، بھانجا خالہ کہتا ہے، اور سب صحیح کہتے ہیں، ہم تو یہی کہیں گے کہ یہ اربعہ انہار ہیں ہر کمال اور ہر مقام ہر ایک کی تقلید کا نہیں ہوتا، حکیم ابوحبیب صاحبؒ ایک دن فرمانے لگے کہ حضرت نے مراقبہ ذات مع قطع صفات کی تلقین کی ہے، میں نے عرض کیا کہ حکیم صاحب اس چکّر میں نہ آ جانا، جن مشائخ نے یہ کیا ہے جہاں ٹھیرے ہیں

ؔ۱ یہ ملفوظ الفرقان کے کسی پچھلے نمبر میں گذر چکا ہے۔ ؔ۲ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے بڑے بھائی، مولانا سید ابوظفر ندوی مرحوم کے والد حضرت شاہ ابواحمد صاحب مجددی کے مخصوص مجازین و خلفاء میں سے تھے عرصہ تک خانقاہ میں مقیم رہے، مکتوبات شریف سے عشق اور اس پر بڑا عبور تھا۔

وہاں بلا آگئی ہے، صفات ہی حفاظت و بقا کا سبب ہیں، حکیم صاحب کو بڑا تعجب ہوا، میں نے کہا کہ یہ حضرت مجدد صاحب کی مخالفت نہیں ہے بلکہ یہ ایسا ہی ہے کہ ایک ماہر پیرنے والا چڑھے ہوئے دریا میں پیر رہا ہے، معمولی آدمی کا کام نہیں کہ وہ بھی دریا میں کود پڑے، یہ علو مراتب کی بات ہے تردید و مخالفت نہیں، در اصل مکتوبات کے مطالعہ کے لئے قرآن مجید سمجھنے کی ضرورت ہے، سب سے بڑا مکتوب قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے ایسے مضامین اور مکتوبات کے بارے میں صحیح اصول یہی ہے کہ جو سمجھ میں آئے اس پر عمل کرو، ورنہ ادب سے کترا کر نکل جاؤ، یہاں ایک صاحب تشیع سے متاثر تھے ایک دن کہنے لگے کہ کیا امام حسینؓ کی شہادت کی ذمہ داری حضرت معاویہؓ اور ان کے طرز عمل پر بھی عائد نہیں ہوتی؟ میں نے کہا کہ اسکی مثال ایسی ہے کہ ایک مرتبہ ایک بڑے عالم اور ان کی بیوی میں رات کو کچھ تکرار ہوگئی اور سخت درشت کلامی کی نوبت آئی ایک صاحب جھانک کر یہ منظر دیکھ رہے تھے صبح کہنے لگے کہ صاحب شریف گھر کی بیٹی، آپ عالم آپ اس کو اتنا سخت وسست کہہ رہے تھے اور زدوکوب کی نوبت آگئی، ان بزرگ نے فرمایا کہ آپ کو اسکی اطلاع کیسے ہوئی کہا کہ میں جھانک کر دیکھ رہا تھا، کہا کہ میں اپنے عمل کی توجیہ بعد میں کروں گا، پہلے آپ اپنے عمل کا جواز ثابت کیجئے کہ آپ کو کسی کے خلوت خانہ میں جھانک کر دیکھنے کی اجازت کس نے دی؟ اس کی تو ممانعت ہے، میں نے کہا کہ اسی طرح ہم کو صحابہ کرامؓ پر اعتراض کرنے اور ان کو برا بھلا کہنے کی ممانعت ہے "اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذوا ھم بعدی غرضا" اب آپ بتائیے کہ آپ کو قانون و عدالت کی کرسی پر کس نے بٹھایا کہ آپ صحابہ کرامؓ پر فیصلہ صادر کریں، بہت لوگ قرآن حدیث کے بجائے تاریخ پڑھ کر گمراہ ہوئے، کسی نے سلف میں کسی بزرگ سے سوال کیا کہ حضرت علیؓ حضرت معاویہ میں کون حق پر تھا کہا تلک امۃ قد خلت لھا ما کسبت ولکم ما کسبتم، ہم کو اپنے اعمال و اخلاق کی فکر چاہیئے، ان کی فکر میں رہنے سے کوئی فائدہ نہیں، نواب صاحب کے یہاں شادی ہے میں احمد آباد دوڑا

جا رہا ہوں کہ کچھ فکر کر دوں، کوئی کہے حضرت آپ کے یہاں تو ان میں کچھ بھی ہو یا نہیں، آپ اپنے گھر کی فکر کیجئے، بیگم صاحبہ نے اپنی بیٹی کے لئے بہت کچھ سامان کر رکھا وہاں سب انتظامات ہو رہے ہیں، کسی کی ایک حرکت دیکھ کر پوری زندگی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، مدتوں کے بعد ہی کچھ اندازہ ہو سکتا ہے، ایک حدیث دیکھ کر کیسے اندازہ کر لیا جائے، کبھی آپ غصہ میں ہوتے تھے، کبھی ترحم اور شفقت کی حالت میں، صحابہؓ کی غلطیاں بھی ہمارے لئے رحمت ہیں۔

فرمایا ہر چیز کی علت غائی دیکھنی چاہئیے جس کے لئے بنائی گئی ہے، ایک شخص مسہری بچھاتا ہے، اس پر نہایت تکلف بستر لگاتا ہے بڑا نرم گدا، بڑی اجلی چادر بڑا نفیس منقش تکیہ لیکن آدمی جب رات کو اس پر سوتا ہے تو اتنے کھٹمل اور چھچھڑیاں کہ بھن جاتا ہے اور پلک سے پلک نہیں لگتی، اب اس مسہری اور گدے کو لے کر کوئی کیا کرے، اس سے تو یہ کہیں اچھا ہے کہ زمین پر معمولی بستر ڈال کر سو جائے جہاں نہ کھٹمل ہوں، نہ پسو، مقصود تو آرام ہے چاہے زمین پر ہو چاہے مسہری پر، آج کل کی زندگی تعلیم سب ایسے ہی ہیں کہ ٹیپ ٹاپ تو بہت ہے، مگر قبر میں اس سے آرام نہ ملے گا، اس سے تو وہ تکلف و بے سروسامانی مبارک ہے کہ جس کے نتیجہ میں قبر میں آرام سے سونا نصیب ہو، وہاں گدا تکیہ سب مل جائے گا اور آدمی ایسا مسرور اور باآرام ہوگا کہ کہے گا "یا رب أقم الساعة حتى ارجع الى اهلي ومالي"

فرمایا دنیا کا سب آرام اور ہر طرح کی راحتیں ہماری راحت ہیں، لیکن ان سے فائدہ اٹھانے کا ایک وقت ہے، ایک وقت دیکھنے کو بھی منع کرتے ہیں، دوسرے وقت نہ دیکھنے کو برا سمجھتے ہیں، جس کی ابھی صرف نسبت ہوئی اس کا جھانکنا بھی معیوب ہے اور گھر کے اندر چلا جانا بھی ممنوع ہے لیکن شادی کے بعد الگ رہنا قابل اعتراض ہے، یہی تمام لذات کا حال ہے کہ ان سے تمتع کا ایک وقت اور محل ہے، لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ بے موقع اور قبل از وقت فائدہ اٹھاتے ہیں بلوغ کے

بعد جو چیزیں حاصل ہوتی ہیں وہ بلوغ سے پہلے ممکن نہیں، جس کو ہم فسق و فجور کہتے ہیں وہ در حقیقت وقت سے پہلے کسی کام کو کرنا اور اعلیٰ چیز کو چھوڑ کر ادنیٰ پر قناعت کرنا، یہ ایسی بات ہے جیسے کوئی تاڑی یا ٹھراپی رہا ہو اور کوئی کہے یہ شراب نہ پیو، ہم ولایت سے منگائے دیتے ہیں، وہ کہے پھر منگا دو، تو اس سے کہا جائے گا کہ ٹھیر و ابھی وقت لگے گا اللہ تعالیٰ نے ان جذبات کو اپنے محل میں صرف کرنے کا حکم دیا ہے، قرآن شریف میں آتا ہے وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ[عہ] دیکھئے یہ نہیں فرمایا وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي اَرواحکم، معلوم ہوا کہ ان لذات کی اشتہا نفوس کا کام ہے نہ کہ ارواح کا، مومن جنت میں ترقی کرتے کرتے ایسے مقام میں پہونچ جائے گا کہ وہ اس محل میں رکھا جائے گا جہاں صرف دیدار الٰہی ہو نہ حور نہ قصور۔

فرمایا قرآن مجید میں حکم ہے وَاذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيرًا، ذکر کی کثرت کرنے سے ذکر ذہن میں جم جاتا ہے اور جو چیز ذہن میں جم جاتی ہے سامنے آتی ہے۔ ایک ٹائپسٹ نوجوان کہنے لگے کہ سونے میں بھی اور نماز میں بھی وہی حرف سامنے آجاتے ہیں اور بغیر ذہن میں جمے ہوئے کوئی ٹائپ نہیں کر سکتا، اسی کا نام مراقبہ ہے۔

فرمایا کہ جب میں کسی (کھاتے پیتے) آدمی کی نبض دیکھتا ہوں اور وہ کمزور معلوم ہوتی ہے تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ یا تو ان کے پاس مال زیادہ ہے یا مال کی محبت، اکثر لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں جس کا قرآن میں ذکر کیا گیا "يَا لَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَا أُوتِيَ قَارُونُ إِنَّهُ لَذُو حَظٍّ عَظِيمٍ" یعنی اہل دولت پر رشک اور مال کی کثرت کی تمنا، میں نے ایسے بہت سے لوگوں کا ہارٹ فیل ہوتے ہوئے دیکھا۔ جو اس مرض سے آزاد ہو وہ تندرست اور قوی و توانا ہو، میرے بعض ساتھی کہنے لگے کہ آپ کی تندرستی بہت اچھی ہے، میں نے کہا کہ آپ بھی یاقوتی کھایا کرو تندرست رہو گے۔ ایک ڈاکٹر صاحب نے مجھے دیکھ کر کہا آپ جھکے نہیں؟ میں نے کہا میں جھکا رہتا ہوں اس لئے نہیں جھکا، جو شخص بھی ننانوے کے پھیر میں پڑا "الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ" وہاں اسکو تفکرات پریشانیوں نے گھیرا شیخ سعدی فرماتے ہیں کہ ایک بادشاہ اور ایک درویش کا انتقال ہوا کسی نے خواب میں دیکھا کہ بادشاہ

[عہ] تمہارے واسطے جنت میں وہ سب کچھ ہے جسکو تمہارا نفس چاہے اور جو تم مانگو ۱۲

لہ ۲ہ ۳ہ ۵ہ صفحہ ۴۶ پر پڑھئے۔

(باقی صفحہ ۴۶ پر)

تقسیمِ دولت کا اسلامی نظام

(از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی، پاکستان)

(۲)

سرمایہ داری اور اسلام اوپر ہم نے اسلام اور سرمایہ داری کے نظام تقسیم دولت کے جو اجمالی خاکے پیش کیے ہیں ان کا تقابل کرنے سے اسلام اور سرمایہ داری کے درمیان مندرجہ ذیل فرق واضح ہوتے ہیں۔

(۱) عوامل پیداوار کی فہرست سے آجر کو مستقل عامل ہونے کی حیثیت سے ختم کردیا گیا ہے۔ اور صرف تین عوامل پیداوار تسلیم کیے گئے ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ آجر کے وجود سے انکار کیا گیا ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ کوئی الگ عامل نہیں بلکہ ان تین عوامل میں سے کسی نہ کسی میں شامل ہے۔

(۲) "سرمایہ کا صلہ "سود" کے بجائے "منافع" قرار دیا گیا ہے۔

(۳) عوامل پیدائش کی تعریفیں بدل دی گئی ہیں "سرمایہ" کی تعریف سرمایہ دارانہ معیشت میں "پیدا شدہ ذریعہ پیدائش" سے کی جاتی ہے۔ لہٰذا نقد روپیہ اور اشیائے خوردنی کے علاوہ مشینری وغیرہ بھی اس میں داخل ہے۔ لیکن ہم نے اسلامی نظریہ تقسیم دولت کی توضیح کرتے ہوئے "سرمایہ" کی جو تعریف کی ہے اس میں صرف وہ چیزیں شامل ہیں جنھیں خرچ کیے بغیر ان سے استفادہ ممکن نہیں، یا بالفاظ دیگر جنھیں کرایہ پر نہیں چلایا جا سکتا مثلاً روپیہ، مشینری اس

تعریف کی رو سے "سرمایہ" میں داخل نہیں۔

(۴) اسی طرح "زمین" کی تعریف زیادہ عام کردی گئی ہے۔ یعنی اس میں ان تمام چیزوں کو شامل کرلیا گیا ہے جن سے استفادہ کے لیے انھیں خرچ کرنا نہیں پڑتا۔ لہٰذا مشینری بھی اس میں داخل ہوگئی ہے۔

(۵) محنت کی تعریف میں بھی زیادہ عموم پیدا کردیا گیا ہے اور اس میں ذہنی محنت اور منصوبہ بندی بھی شامل ہوگئی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں "آجر" کی سب سے بڑی خصوصیت جس کی بنا پر اسے "منافع" کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ کاروبار کے نفع و نقصان کا خطرہ برداشت کرتا ہے، گویا سرمایہ دارانہ نقطۂ نظر سے "منافع" آجر کی اس ہمت کا صلہ ہے کہ اس نے ایک ایسی کاروباری مہم کا آغاز کیا جس میں اگر نقصان ہوجائے تو وہ تن تنہا اسی پر پڑے گا، باقی تینوں عوامل پیدائش میں سے سرمایہ کو معین سود، زمین کو معین لگان اور محنت کو معین اُجرت مل جاتی ہے۔ اس لیے وہ نقصان سے بری ہیں۔

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ درحقیقت "نقصان کا خطرہ مول لینے" کی یہ صفت خود سرمایہ میں موجود ہونی چاہیے۔ اس خطرے کا بار کسی اور پر نہیں ڈالا جا سکتا۔ جو شخص کسی کاروبار میں اپنا سرمایہ لگانا چاہتا ہے اس کو یہ خطرہ مول لینا پڑے گا۔ اس لیے جو سرمایہ دار ہے وہی خطرہ مول لینے کے لحاظ سے آجر بھی ہے اور جو شخص آجر ہے وہی سرمایہ دار بھی ہے۔

اب سرمایہ کے کسی کاروبار میں لگنے کی تین صورتیں ہیں۔

۱ انفرادی کاروبار۔ سرمایہ لگانے والا بلا شرکتِ غیرے خود ہی کاروبار بھی چلائے گا۔ اس صورت میں اس کو جو صلہ ملے گا وہ خواہ عرفی اور قانونی اعتبار سے صرف "منافع" کہلائے۔ لیکن معاشی اصطلاح کے مطابق وہ صلہ دو چیزوں کا مجموعہ ہوگا۔ سرمایہ لگانے کی وجہ سے "منافع" کا اور کاروبار چلانے کی محنت کے لحاظ سے "اجرت" کا۔

شرکت۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کئی آدمی مل کر سرمایہ لگائیں، کاروبار

چلانے میں بھی سب شریک ہوں اور نفع و نقصان میں بھی، اسے فقہی اصطلاح میں "شرکۃ العقود" کہا جاتا ہے۔

اس صورت میں بھی معاشی اصطلاح کے مطابق تمام شرکاء سرمایہ لگانے کی حیثیت سے "منافع" کے حق دار ہوں گے اور کاروبار چلانے کی حیثیت سے "اُجرت" کے۔ یہ صورت بھی اسلام نے جائز قرار دی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل تجارت کا یہ طریقہ رائج تھا۔ آپ نے لوگوں کو اس پر برقرار رکھا۔ اور اس کے جواز پر اجماع منعقد ہو گیا۔[1]

(۳) مضاربت۔ تیسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص سرمایہ لگائے اور دوسرا کاروبار چلائے اور نفع میں دونوں شریک ہوں۔ اسے فقہی اصطلاح میں "مضاربت" کہا جاتا ہے اس صورت میں معاشی اصطلاح کے مطابق سرمایہ لگانے والے (رب المال) کو اس کا حصہ "نفع" کی صورت میں ملے گا اور کاروبار چلانے والے (مضارب) کو اجرت کی صورت میں۔ ہاں اگر کاروبار چلانے والے مضارب کو .... کاروبار میں نقصان ہو جائے تو جس طرح رب المال کا سرمایہ بیکار گیا اسی طرح مضارب کی محنت بیکار رہی۔

یہ صورت بھی اسلام میں جائز ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ کے ساتھ نکاح سے قبل یہی معاملہ فرمایا تھا۔[2] اس کے بعد اس کے جواز پر بھی فقہائے امت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔[3] ان تین صورتوں کے سوا کاروبار میں سرمایہ کے شریک ہونے کی اسلام میں کوئی اور صورت نہیں ہے۔

سود کا کاروبار

شغل سرمایہ کی چوتھی صورت جو غیر اسلامی معاشروں میں شروع سے رائج چلی آتی ہے۔ سود کا کاروبار ہے۔ یعنی ایک شخص سرمایہ بطور قرض دے۔ دوسرا محنت کرے۔ نقصان ہو تو محنت کا ہو اور سرمایہ کا سود ہر صورت میں کھرا رہے، اس

---

[1] ملاحظہ ہو المبسوط للسرخسی ص ۱۵۱ ج ۱۱ مطبع السعادۃ مصر۔ [2] زرقانی شرح المواہب ص ۱۹۰ ج اول الازہریہ مصر ۱۳۲۵ھ۔ [3] المبسوط للسرخسی ص ۱۸ ج ۲۲۔

کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔

"یاایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ و	"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو۔ اور سود میں سے
ذروا ما بقی من الربوا ان کنتم	جو کچھ باقی رہ گیا ہو اسے چھوڑ دو۔ اگر تم مومن
مومنین۔ فان لم تفعلوا فاذنوا	ہو، پس اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول
بحرب من اللہ و رسولہ۔	کی طرف سے اعلان جنگ سن لو۔"

اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ

"فان تبتم فلکم رؤس	پس اگر تم (سود سے) توبہ کرو تو تمہیں تمہارے
اموالکم لا تظلمون	اصل اموال مل جائیں گے۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو
ولا تظلمون۔"	اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے۔

ان دو آیتوں میں "ما بقی من الربوا" اور "فلکم رءوس اموالکم" کے الفاظ نے پوری وضاحت کے ساتھ یہ بات صاف کر دی ہے کہ سود کی ادنیٰ سی مقدار کا باقی رہنا بھی اللہ کو گوارا نہیں ہے اور سود کو چھوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ قرض دینے والے کو صرف "راس المال" واپس ملے: لہٰذا اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ اسلام کی نظر میں صفر کے سوا سود کی ہر شرح نامعقول ہے۔

جاہلیت میں بعض قبائل عرب دوسرے قبیلوں سے سود پر قرض لے کر کاروبار کرتے تھے۔ اسلام نے ان تمام معاملات کو یکسر موقوف کر دیا۔ ابن جریرؒ فرماتے ہیں۔

"کانت بنو عمرو بن عوف یاخذون الربا	جاہلیت میں بنو عمرو بن عوف بنو المغیرہ سے سود لیا کرتے
من بنی المغیرۃ وکانت بنی المغیرۃ یربون لھم	تھے اور بنو المغیرہ انہیں سود دیتے تھے جب
فی الجاہلیۃ فجاء الاسلام ولھم علیھم مال کثیر"	اسلام آیا تو ان کا ان پر بہت سارا مال واجب تھا۔

اور ——

"کان بنو المغیرۃ یربون لثقیف"[1] "بنو مغیرہ بنو ثقیف کو سود دیا کرتے تھے۔"

واضح رہے کہ قبائل عرب کی حیثیت مشترکہ کمپنیوں کی سی تھی جو افراد کے مشترکہ سرمایہ سے کاروبار کرتی تھیں اس لیے ایک قبیلے سے دوسرے قبیلہ کا اجتماعی طور پر قرض لینا عموماً کاروبار کے لیے ہوتا تھا اور اس کو بھی قرآن کریم نے ممنوع قرار دے دیا۔

[1] تفسیر الدر المنثور بحوالہ ابن جریر ص ۳۶۶ ج ۱

غرض اسلامی نظام معیشت میں جو شخص کاروباری آدمی کو اپنا روپیہ کاروبار میں لگانے کیلئے دینا چاہتا ہے، اسے پہلے یہ متعین کرنا پڑے گا کہ وہ روپیہ کاروبار کے نفع میں خود حصہ دار ہونے کے لیے دے رہا ہے۔ یا وہ اس روپیہ سے اس کاروباری آدمی کی امداد کرنا چاہتا ہے اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ روپیہ دے کہ کاروبار کے نفع سے مستفید ہو تو اسے "شرکت" یا "مضاربت" کے طریقوں پر عمل کرنا پڑے گا۔ یعنی اسے کاروبار کے نفع و نقصان کی ذمہ داری بھی اٹھانی پڑیگی کاروبار کو نفع ہوا تو وہ نفع میں شریک ہوگا اور اگر کاروبار کو خسارہ ہوا تو اسے خسارے میں بھی حصہ دار ہونا پڑے گا۔

اور اگر وہ روپیہ دوسرے کی امداد کی غرض سے دے رہا ہے تو پھر ضروری ہے کہ وہ اس امداد کو امداد ہی سمجھے اور "نفع" کے ہر مطالبہ سے دستبردار ہو جائے۔ وہ صرف اتنے ہی روپے کی واپسی کا مستحق ہوگا جتنے اس نے قرض دئیے تھے۔ اسلام کی نظر میں اس ناانصافی کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ وہ اپنے "سود" کی ایک شرح متعین کر کے نقصان کا سارا بوجھ مقروض پر ڈالے۔

اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ اسلام میں "نقصان کا خطرہ مول لینے" کی ذمہ داری "سرمایہ" پر ہے۔ جو شخص کاروبار میں سرمایہ لگائے گا اسے یہ خطرہ ضرور مول لینا پڑے گا[1] لہٰذا اگر "آجر" کی بنیادی خصوصیت یہ ہے (جیسا کہ بیشتر ماہرین معاشیات کا خیال ہے) کہ وہ "خطرہ مول لیتا ہے" تو یہ خصوصیت اسلام کی نظر میں درحقیقت "سرمایہ" کی ہے۔ اس لیے اسلامی نظام معیشت میں سرمایہ اور آجر ایک ہی چیز ہو جاتے ہیں، اور تقسیم دولت میں ان کا حصہ منافع ہے نہ کہ سود۔

اور اگر آجر کی بنیادی خصوصیت یہ سمجھی جائے کہ وہ تنظیم اور منصوبہ بندی کرتا ہے (جیسا کہ بعض ماہرین معاشیات کا خیال ہے) تو پھر یہ کام "محنت" میں داخل ہے اور اسے الگ عامل پیدا دار سمجھنا طول لاطائل ہے۔

کرایہ اور سود کا فرق

مذکورہ بحث سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اسلام کی رو سے منافع اور اجرت جائز ہے اور سود ناجائز۔ اب چوتھی چیز "کرایہ" رہ جاتی ہے۔

[1] اگر کسی شخص نے قرض حسن لے کر کاروبار میں سرمایہ لگایا ہے اور دائن کیساتھ شرکت یا مضاربت کا معاملہ نہیں کیا تو قرض لینے کے بعد مدیون خود اس روپے کا مالک ہو گیا اب وہ خود سرمایہ دار کی حیثیت سے روپیہ لگا رہا ہے اسلیے نقصان کی ذمہ داری اسی پر ہوگی۔

اسلام نے اسے بھی جائز قرار دیا ہے. بعض حضرات کو یہاں یہ اشکال ہونے لگتا ہے کہ جب سرمایہ پر سود کا لین دین متعین ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے تو زمین کا کرایہ (واضح رہے کہ ہماری اصطلاح میں زمین کے اندر مشینری وغیرہ بھی داخل ہے) کیوں جائز ہے جبکہ وہ بھی متعین ہوتا ہے؟

اس سوال کے جواب کے لیے پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ معیشت کے مادی وسائل دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک تو وہ جنھیں استعمال کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے انھیں خرچ کرنا نہیں پڑتا. بلکہ وہ اپنا وجود برقرار رکھتے ہوئے فائدہ دیتے ہیں. مثلاً زمین، مشینری، فرنیچر، سواری وغیرہ کہ ان کے وجود کو باقی رکھتے ہوئے ان سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے. ان سے مستفید ہونے کے لیے انھیں خرچ یا فنا کرنا نہیں پڑتا. ایسی چیزیں چونکہ بذات خود قابل استفادہ ہوتی ہیں. اور ان کے بہت سے فوائد ہیں جنھیں حاصل کرنے کے لیے کرایہ پر لینے والے کو ذرہ برابر محنت نہیں کرنی پڑتی. دوسری طرف ان کے استعمال سے ان کی قدر گھٹتی ہے. اس لیے ان کے منافع کی اجرت کا لین دین بالکل معقول اور درست ہے. اور اسی "منافع" کی اجرت کو اسلام "کرایہ" کہتا ہے.

اس کے برخلاف نقد روپیہ وہ چیز ہے جس سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے اسے خرچ یا فنا کرنا پڑتا ہے. اس سے کسی قسم کا فائدہ اس وقت تک نہیں اٹھایا جاسکتا جب تک کہ اس سے کوئی چیز خریدی نہ جائے. لہٰذا روپیہ چونکہ بذات خود قابل استفادہ نہیں ہوتا. اس لیے ایک طرف اس سے جس قسم کا فائدہ بھی مقروض اٹھانا چاہے اسے خرچ کرکے خود کچھ عمل کرنا پڑتا ہے. دوسری طرف مقروض کے استعمال کی وجہ سے روپیہ کی قدر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی. اس لیے اس پر کوئی معین "شرح سود" مقرر کرنے میں کوئی معقولیت نہیں ہے. روپیہ کے مالک کو اختیار ہے کہ وہ چاہے تو قرض نہ دے یا چاہے تو اس کے ذریعہ روپے کے حاجتمند کے ساتھ شرکت و مضاربت کا کاروبار کرے. لیکن اگر وہ قرض دیتا ہے تو اس پر معین "شرح" سے سود لینے کی اسلام اجازت نہیں دے سکتا.

اسی بنا پر ہم نے یہ اصطلاح مقرر کی ہے کہ جو چیزیں بذاتِ خود خرچ کیے بغیر قابل استفادہ نہیں ہوتیں وہ سرمایہ کہلائیں گی اور جب وہ عامل پیداوار کی حیثیت سے کاروبار میں شریک ہوں گی تو "منافع" کی مستحق ہوں گی اور جو چیزیں خرچ کیے بغیر قابل استفادہ ہوتی ہیں وہ

"زمین" کہلائیں گی اور عمل پیدائش میں حصہ دار ہونے کی وجہ سے انھیں "کرایہ" کی صورت میں دولت تقسیم کی جائے گی۔

حرمت سود کا اثر تقسیم دولت پر مذکورہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہوئی ہے کہ اسلام اور سرمایہ داری کے نظام تقسیم دولت میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معاشیات میں سود جائز ہے اور اسلام میں ناجائز۔ اب مختصراً اس پہلو پر نظر ڈال لینا بھی مناسب ہوگا کہ حرمت سود کے معاشی اثرات کیا ہیں؟

یوں تو "سود" کی حرمت سے "پیدائش دولت" کے نظام پر بھی بڑے گہرے دوررس اور مفید اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اس لیے یہاں اس کے صرف ان اثرات کی طرف مجمل اشارے عرض کیے جاتے ہیں جو "تقسیم دولت" کے نظام پر مرتب ہوتے ہیں۔ حرمت سود کا ایک سادہ اثر تو یہ ہے کہ اس کی وجہ سے تقسیم دولت کے نظام میں توازن اور ہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔ سودی نظام معاشیات کا یہ خاصہ لازمہ ہے کہ اس میں ایک فریق (سرمایہ) کا نفع تو معین صورت میں بہرحال کھرا رہتا ہے۔ لیکن اس کے مقابل دوسرے فریق (محنت) کا نفع مشتبہ اور موہوم رہتا ہے۔ وسیع پیمانہ کی تجارتیں خواہ کتنی ہی نفع بخش کیوں نہ ہو جائیں، انھیں بہرحال "خطرے" سے خالی نہیں کہا جا سکتا بلکہ جہاں موجودہ وسائل معیشت کی فراوانی سے بڑے پیمانہ کی تجارتوں کے خطرات کم ہوئے ہیں۔ وہاں کچھ خارجی عوامل کی بنا پر ان میں اضافہ بھی ہوا ہے اور تجارت جتنے بڑے پیمانے کی ہوتی ہے۔ یہ خطرات بھی اتنے وسیع ہو جاتے ہیں۔ اس لیے سرمایہ دارانہ معیشت میں تقسیم دولت کا توازن نہایت ناہموار ہو جاتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قرض لینے والے کو سخت نقصان اٹھانا پڑا لیکن قرض دینے والے کی تجوری بھرتی ہی چلی گئی اور کبھی اس کے برعکس یہ ہوتا ہے کہ آجر کو بے انتہا منافع ہوا اور سرمایہ دینے والے کو اس میں سے بہت معمولی سا حصہ مل سکا۔

اس کے برخلاف اسلامی نظام میں چونکہ سود حرام ہے اس لیے موجودہ دنیا میں عموماً شغل سرمایہ کی صرف دو صورتیں ہوں گی۔ شرکت اور مضاربت اور یہ دونوں صورتیں تقسیم دولت کی اس غیر منصفانہ ناہمواری سے خالی ہیں۔ ان صورتوں میں نقصان ہوتا ہے تو فریقین کو ہوتا

سے [illegible] طریقے سے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ "ارتکاز دولت" جو سرمایہ دارانہ [illegible] خرابی ہے۔ اس طریقے کی بدولت اس کی بڑی حد تک مؤثر روک تھام ہو جاتی ہے [illegible] دولت کا ذخیرہ چند ہاتھوں میں سمٹنے کے بجائے معاشرہ کے افراد میں اس طرح پھیلتا ہو کہ اس سے کسی شخص پر کوئی ظلم نہیں ہو پاتا۔ سرمایہ داری میں سود کی وجہ سے سرمایہ دار صرف یہ کہ دولت کے بڑے خزانوں پر قابض ہو جاتے ہیں بلکہ وہ پورے بازار پر بھی پوری خود غرضی کے ساتھ حکمرانی کرتے ہیں [illegible] اشیاء" اور "قیمتوں" کا نظام بھی قدرتی رہنے کے بجائے مصنوعی ہو جاتا ہے اور [illegible] ملکی سیاست [illegible] زندگی کا کوئی گوشہ اس کے برے اثرات سے محفوظ نہیں رہتا۔

اسلام نے "سود" کو ممنوع قرار دے کر ان تمام خرابیوں کی بنیاد کو منہدم کر دیا ہے۔ اسلامی نظام میں [illegible] لگانے والا کاروبار اور اس کی پالیسی میں شریک ہوتا ہے۔ نفع و نقصان کی ذمہ داریاں [illegible] ہے۔ اور اس طرح انفرادی کاروباری مرضی بے لگام نہیں ہونے پاتی۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

یہاں ایک شبہ کا ازالہ کر دینا مناسب ہوگا۔ "سود" کے نقصانات کے بارے میں جو یہ کہا گیا ہے کہ اس کی وجہ سے تقسیم دولت میں ناہمواری پیدا ہوتی ہے اور فریقین میں سے کوئی نہ کوئی اس سے متاثر ہوتا ہے۔ اس پر بعض حضرات کے دل میں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ سودی کاروبار میں جس شخص کو بھی نقصان پہنچتا ہے وہ اس کی مرضی سے پہنچتا ہے اور جب وہ خود یہ خطرہ مول لینے پر راضی ہے تو [illegible] کیوں دخل انداز ہوتا ہے؟

حالانکہ ذرا سا غور کیا جائے تو اس کا جواب سمجھنا کوئی مشکل نہیں۔ اسلامی نظام زندگی کا معمولی سا مطالعہ بھی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ اسلام میں فریقین کی باہمی رضامندی ہمیشہ [illegible] جواز نہیں ہوتی اگر کوئی شخص دوسرے کے ہاتھوں قتل ہو جانے [illegible] بری نہیں کر سکتی۔ یہاں تک کہ "زنا" جسے مغربی تہذیب [illegible] جاتا ہے۔ اس میں بھی فریقین کی رضامندی [illegible] معاشی نظام کی بہبود کا معاملہ تو اس سے

کچھ آگے ہی ہے۔ شروع میں قرآن کریم کے حوالوں سے عرض کیا جا چکا ہے کہ
دولت اصلاً اللہ کی ملکیت ہے اور اس نے انسان کو جو ملکیت عطا کی ہے وہ آزاد اور بے لگام ہونے کے بجائے اصولوں کی پابند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وہ معاملہ جو اسلام کی نظر میں فی نفسہ غیر منصفانہ ہے یا جس کا اثر معاشرے کی اجتماعی بہتری پر پڑ سکتا ہے۔ اس میں اسلام نے فریقین کی رضامندی کو وجہ جواز قرار نہیں دیا احادیث میں فریقین کی رضامندی کے باوجود "تلقی الجلب" "بیع الحاضر للباد" "محاقلہ" "مزابنہ" اور "مخابرہ" وغیرہ کی شدید ممانعت آئی ہے۔ اس کے پیچھے یہی حکمت کار فرما ہے اس لیے "سود" کے معاملہ کو بھی محض اس بنا پر جائز قرار نہیں دیا جا سکتا کہ فریقین اس پر رضامند ہیں۔

جاہلیت کے لوگ حرمت سود پر اس قسم کا اعتراض کرتے تھے کہ
"انما البیع مثل الربوا" "بیع ربوا ہی کی طرح تو ہے"
قرآن کریم نے مختصر لفظوں میں اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ
"واحل اللہ البیع وحرم الربوا" "اور اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربا کو حرام"
یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اعتراض کے جواب میں "حرمت سود" کی کوئی حکمت اور مصلحت نہیں بیان فرمائی۔ بلکہ صرف یہ فرمایا ہے کہ جب اللہ نے بیع کو حلال اور ربوا کو حرام کر دیا ہے تو خواہ اس کی مصلحت تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اس حکم کو ماننا پڑے گا۔ یہاں قرآن کریم نے حکمتوں کو بیان فرمانے کے بجائے حاکمانہ اسلوب اختیار فرمایا ہے جس سے حرمت سود پر ہر قسم کے اعتراض کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سود کی حرمت اسلام کا وہ حکیمانہ فیصلہ ہے جس کی وجہ سے سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی بہت سی خرابیاں بھی دور ہو جاتی ہیں اور اس کے بعد اشتراکیت کے ستبداد اور غیر فطری نظام معیشت کو اختیار کرنے کی بھی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہی وہ اعتدال کی راہ ہے جو موجودہ دنیا کو افراط و تفریط سے نجات دلا کر ایک متوازن اور منصفانہ نظام معیشت کی طرف رہنمائی کر سکتی ہے۔ فرانسیسی پروفیسر لوئی ماسین نون نے بڑی سچی بات کہی ہے کہ
سرمایہ داری اور اشتراکیت کے تصادم میں اسی تمدن اور تہذیب کا مستقبل

محفوظ اور درخشاں رہے گا جو سود کو ناجائز قرار دے کر اس پر عمل بھی کرا رہا ہو۔

اجرتوں کا مسئلہ

یہاں تک تقسیم دولت کے معاملہ میں اسلام اور سرمایہ داری کا ایک بنیادی فرق واضح ہوا ہے اور وہ ہے مسئلہ سود۔ اس کے بعد ان دونوں کے درمیان ایک اور فرق کو ذہن میں رکھنا بھی ضروری ہے جو آجر اور اجیر کے رشتے سے متعلق ہے اور جس میں اجرتوں کا مسئلہ زیر بحث آتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف موجودہ دنیا میں جو شدید ردعمل ہوا ہے اس کی بہت بڑی وجہ آجر اور اجیر کے جھگڑے اور اجرتوں کی تعیین کے مسائل تھے۔ سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی بنیاد ہی چونکہ خود غرضی اور بے لگام انفرادی ملکیت پر ہے۔ اس لیے اس نظام میں آجر اور اجیر کے درمیان "رسد و طلب" کا ایک ایسا خشک، کھردرا اور رسمی تعلق ہے جس کی بنیاد خالص خود غرضی پر استوار ہوئی ہے۔ آجر صرف اسی حد تک اجیر کی انسانیت کا احترام کرتا ہے، جب تک وہ اپنے کاروبار کے لیے اس کے ہاتھوں مجبور ہے۔ لہٰذا جہاں یہ مجبوری ختم ہو جاتی ہے وہاں وہ اس پر اپنے ظلم کا شکنجہ کس دیتا ہے۔ دوسری طرف اجیر صرف اس وقت تک آجر کے کام اور اسکے احکام سے دلچسپی رکھتا ہے جب تک اس کا روزگار کسی آجر پر موقوف ہو، لہٰذا جہاں اس کی یہ مجبوری ختم ہو جاتی ہے وہاں وہ کام چوری اور ہڑتال سے نہیں چوکتا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مزدور اور سرمایہ دار میں ایک ابدی کشمکش قائم رہتی ہے اور دونوں کے درمیان کوئی صحت مند رابطہ قائم نہیں ہو پاتا۔

اس کے برخلاف اسلام نے اگرچہ آجر اور اجیر کے درمیان رسد اور طلب کے نظام کو ایک حد تک تسلیم کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی محنت کی رسد اور طلب دونوں پر کچھ ایسی پابندیاں عائد کر دی ہیں کہ ان کا کاروباری رابطہ ایک خشک رسمی تعلق نہیں رہا۔ بلکہ بڑی حد تک بھائی چارہ بن گیا ہے آجر کا نقطۂ نظر اجیر کے بارے میں کیا ہونا چاہیے؟ اس کو قرآن کریم نے حضرت شعیب علیہ السلام کا ایک مقولہ نقل فرماتے ہوئے مختصر لفظوں میں واضح فرما دیا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے "آجر" تھے اور انھوں نے فرمایا۔

لہ ڈاکٹر یوسف الدین اسلام کے معاشی نظریے ص ۲۲۰ ج ۲ بحوالہ ڈاکٹر حمید اللہ انجمن امداد قرضہ حسنہ کی اہمیت مجلہ طیلسانین عثمانیہ ج ، حصہ معاشیات ج ۳ سنہ ۱۹۴۳ء۔

"وما ارید ان اشق علیك ستجدنی ان شاء الله من الصالحین"۔

"میں تم پر (غیر ضروری) مشقت ڈالنا نہیں چاہتا۔ خدا نے چاہا تو مجھے نیکوکار پاؤ گے"

اس آیت نے واضح فرمادیا کہ ایک مسلمان آجر جس کی اصلی منزل مقصود "صالح" ہونا ہے اس وقت تک "صالح" نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے اجیر کو غیر ضروری مشقت سے بچانے کا داعیہ نہ رکھتا ہو، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو مزید واضح الفاظ میں اس طرح کھول دیا ہے کہ

"ان اخوانکم خولکم جعلھم الله تحت ایدیکم فمن کان أخوہ تحت یدہ فلیطعمہ مما یاکل ولیلبسہ مما یلبس ولا تکلفوھم ما یغلبھم فان کلفتموھم ما یغلبھم فاعینوھم"[1]۔

"تمہارے بھائی تمہارے خادم ہیں جنھیں اللہ نے تمہارا زیر دست کیا ہے۔ لہٰذا جس شخص کا بھائی اس کا ماتحت ہو اسے چاہیے کہ جو کچھ وہ خود کھائے اس میں سے اس کو بھی کھلائے اور جو خود پہنے اس میں سے اس کو بھی پہنائے اور ان پر کسی ایسے کام کا بوجھ نہ ڈالو جو ان کی طاقت سے زیادہ ہو۔ اور اگر کسی ایسے کام کا بوجھ ڈالو تو خود ان کی مدد کرو۔"

نیز ارشاد فرمایا کہ

"اعطوا الاجیر أجرہ قبل ان یجف عرقہ"[2]۔

"مزدور کی اجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کردو۔"

اسی طرح آپ کا ارشاد ہے کہ تین شخص ایسے ہیں جن کا میں قیامت کے دن دشمن ہوں گا۔ ان میں سے ایک وہ ہے کہ

"رجل استاجر اجیراً فاستوفی منہ ولم یعطہ اجرہ"[3]

"وہ شخص جو کسی مزدور کو اجرت پر لے۔ پھر اس سے کام پورا لے لے۔ اور اس کو اس کی اجرت نہ دے"

---

[1] صحیح بخاری کتاب العتق ص ۳۴۶ ج اول [2] ابن ماجہ وطبرانی عن ابن عمر، جمع الفوائد ص ۲۵۹ جلد اول۔ میرٹھ ۱۳۴۵ھ [3] صحیح بخاری کتاب الاجارہ بروایت ابو ہریرہ ص ۳۰۲ جلد اول

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مزدور کے حق کا کس قدر احساس تھا، اس کا اندازہ حضرت علیؓ کی ایک روایت سے ہوتا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ وفات سے قبل آپؐ کے آخری الفاظ یہ تھے

"الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم"[1] "نماز کا خیال رکھو، اور ان لوگوں (کے حقوق) کا خیال جو تمہارے زیر دست ہیں"

ان ہدایات کے نتیجے میں "مزدور" کو اسلامی معاشرہ میں جو باوقار اور برادرانہ مقام حاصل ہوا اس کی بے شمار مثالیں قرون اولیٰ کی اسلامی تاریخ میں ملتی ہیں اور پورے وثوق اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ "مزدور" کے حقوق کی رعایت اس سے بہتر طریقے پر ممکن ہی نہیں ہے۔

دوسری طرف اسلام نے "اجیر" کو بھی کچھ احکام کا پابند بنا کر آجر سے اس کے تعلقات کو مزید خوشگوار کر دیا ہے۔ مزدور آجر کے جس کام کی ذمہ داری اٹھاتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے وہ ایک ایسا معاہدہ ہوتا ہے جس کی پابندی اسے صرف اپنا پیٹ بھرنے کے لیے نہیں کرنی ہے بلکہ اسکی اصل منزل مقصود یعنی آخرت کی بہتری بھی اس پر موقوف ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

"یا ایہا الذین آمنوا اوفوا بالعقود" "اے ایمان والو، تم اپنے معاہدوں کو پورا کرو"

اور ـــــــــ

"ان خیر من استاجرت القوی الامین" "بہترین اجیر وہ ہے جو قوی بھی ہو اور امانتدار بھی ہو۔"

نیز ارشاد ہے۔

"ویل للمطففین الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون واذا کالوھم او وزنوھم یخسرون۔" "دردناک عذاب ہے ان ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے جو اپنا حق لینے کے وقت پورا پورا وصول کریں اور جب انھیں ناپ یا تول کر دینے کا موقع آئے تو کمی کر جائیں"

فقہائے امت کی تصریحات کے مطابق اس آیت "تطفیف" یا ناپ تول میں کمی کرنے

---

[1] ابن ماجہ (جمع الفوائد ص ۲۹۴ جلد اول)

والے کے مفہوم میں وہ مزدور بھی داخل ہے جو طے شدہ اجرت پوری وصول کرنے کے باوجود کام چوری کا مرتکب ہو، اور اپنے جو اوقات اس نے آجر کو دے دیے ہیں انہیں آجر کی مرضی کے خلاف کسی اور کام میں صرف کرے۔ اس لیے ان احکام نے "کام چوری" کو گناہ عظیم قرار دے کر اجیر کو بھی یہ جتلا دیا ہے کہ جس آجر کا کام کرنا اس نے قبول کیا ہے۔ اس کی ذمہ داری اٹھا لینے کے بعد اب وہ خود اس کا اپنا کام بن گیا ہے اور اس کے ذمے ضروری ہے کہ وہ پوری دیانتداری متعدی اور لگن کے ساتھ اسے انجام دے۔ ورنہ وہ آخرت کی اس بہتری کو حاصل نہ کر سکے گا جو اس کا اصل منتہائے مقصود رہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام نے اجرتوں کے سلسلے میں "رسد و طلب" کے نظام کو ایک حد تک تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ آجر اور اجیر دونوں کے لیے کچھ ایسے احکام دیدیے ہیں کہ ان کی وجہ سے "رسد و طلب" کا یہ نظام خود غرضی کے بجائے اخوت و ہمدردی پر مبنی ہو گیا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ یہاں کسی صاحب کو یہ شبہ پیدا ہو کہ آجر اور اجیر دونوں پر پابندیاں عائد کرنے کے لیے قرآن و سنت نے جو احکام دیے ہیں ان کی حیثیت اخلاقی ہدایات کی سی ہے۔ جو ٹیٹھ معاشی اور قانونی نقطۂ نظر سے خارج از بحث ہیں ــــ لیکن یہ اعتراض اسلام کے مزاج کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہوگا۔ یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اسلام محض ایک معاشی نظام ہی نہیں ہے بلکہ وہ زندگی کا ایک مکمل دستور العمل ہے جس میں زندگی کے تمام شعبے باہم مربوط ہو کر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ یہ ان میں سے کسی ایک شعبے کو دوسرے تمام شعبوں سے کاٹ کر سمجھنے کی کوشش لازماً غلط فہمیاں پیدا کرے گی۔ اس کے ہر شعبہ کا صحیح رد کار اسی وقت سامنے آسکتا ہے جب اسے اس کے مجموعی نظام زندگی میں فٹ کر کے دیکھا جائے اس لیے اسلامی معاشیات کی بحث میں ان اخلاقی ہدایات کو خارج از بحث قرار نہیں دیا جا سکتا۔

پھر اسلام کا ایک امتیاز یہ ہے کہ اگر ذرا وسیع نظر سے دیکھا جائے تو اس کی اخلاقی ہدایات بھی درحقیقت قانونی احکام ہیں اس لیے کہ ان پر بالآخر آخرت کی جزا و سزا مرتب ہوتی ہے جس کو ایک مسلمان کی زندگی میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہ "عقیدۂ آخرت" ہی وہ چیز ہے جس نے نہ صرف یہ کہ اخلاق کو قانون کا درجہ عطا کیا ہے بلکہ اصطلاحی قوانین کی پشت پناہی بھی کی ہے

قرآن کریم کے اسلوب پر اگر آپ غور فرمائیں تو نظر آئے گا کہ اس کے ہر قانونی اور اخلاقی حکم کیساتھ "خوف خدا" اور "فکر آخرت" کے مضامین لگے ہوئے ہیں۔ اس میں اصلی راز یہی ہے کہ درحقیقت قانون کی پابندی محض انسانی ڈنڈے کے زور سے کبھی نہیں کرائی جا سکتی۔ تاوقتیکہ انسان کی ہر نقل و حرکت اور ہر فکر و عمل پر پہرہ دینے کے لیے "فکر آخرت" موجود نہ ہو، یوں تو دنیا کی ہزار سالہ طویل تاریخ جو پوری قانونی جکڑ بندیوں کے باوجود مظالم اور جرائم کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے اس ناقابل انکار حقیقت کی تصدیق کرتی ہے۔ لیکن خاص طور سے آج کی مہذب دنیا نے تو اسے روز روشن کی طرح عیاں کر دیا ہے کہ جس رفتار سے قانونی مشینریوں میں اضافہ ہو رہا ہے اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے جرائم بڑھ رہے ہیں۔

اس لیے یہ سمجھنا کہ "اجیر" اور "آجر" کے تعلقات محض قانونی جکڑ بندیوں سے درست ہو سکیں گے انتہا درجہ کی خود فریبی کے سوا کچھ نہیں، اس کا اصلی علاج صرف اور صرف "فکر آخرت" ہے اور اس معاملہ میں اسلام نے اسی پر زیادہ زور دیا ہے۔

آج کا ذہن جو محض دنیوی زندگی کے الٹ پھیر میں الجھ کر مادے کے اس پار جھانکنے کی صلاحیت کھو چکا ہے۔ اس کے لیے شاید اس بات کو سمجھنا مشکل ہو لیکن یقین ہے کہ اگر امن و سکون انسانیت کے لیے مقدر ہے تو وہ سینکڑوں ٹھوکریں کھا کر بالآخر اس حقیقت تک پہونچے گی جس کی طرف قرآن کریم نے بار بار توجہ دلائی ہے۔ جس زمانے میں اسلام ایک عملی نظام کی حیثیت سے اس دنیا میں کارفرما تھا، اس وقت دنیا اس قرآنی نظریہ کی صداقت کو خوب اچھی طرح دیکھ چکی ہے۔ اس دور کی تاریخ میں "آجر" اور "اجیر" کے جھگڑوں کی یہ کیفیت ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی جس نے کچھ عرصہ سے پوری دنیا کو تہ و بالا کر رکھا ہے۔ قرآن و سنت کی یہی وہ اخلاقی ہدایات تھیں جنھوں نے اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل پیش کر کے دکھا دیا اور جن کی وجہ سے اسلام کے قرون اولیٰ کی تاریخ آج کے جبر و تشدد اور اجیر کی ہڑتالوں سے تقریباً خالی نظر آتی ہے۔

تقسیم دولت کے ثانوی مدات

اب تک ہماری بحث تقسیم دولت کے اولیں حقداروں سے متعلق تھی۔ اسلامی نظریہ تقسیم دولت کی ایک

نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے معاشرے کے کمزور عناصر کو قوی کرنے اور بیکار افراد کو کام کے قابل بنانے کے لیے عاملین پیداوار کے ساتھ دولت کے ثانوی مستحقین کی ایک طویل فہرست دی ہے اور اس کا ایک باقاعدہ نظام بنایا ہے۔

مقالے کی تمہید میں اس بات کی طرف اشارے کیے جا چکے ہیں کہ دولت اصلاً اللہ کی ملکیت ہے۔ وہی اس کا پیدا کرنے والا ہے۔ اور اسی نے انسان کو اس پر ملکیت کے حقوق عطا کیے ہیں۔ انسان کو اس کے کسب و عمل کا جو بھی صلہ ملتا ہے وہ اس کا مالک ضرور ہے لیکن چونکہ کسب و عمل کی تمام توفیق اللہ دیتا ہے اور دولت کی تخلیق بھی اسی نے کی ہے۔ اس لیے انسان اپنی ملکیت کے استعمال میں قطعی طور پر خود مختار نہیں ہے۔ بلکہ اللہ کے احکام کا پابند ہے۔ لہٰذا جس جگہ خرچ کرنے کا وہ حکم دیدے انسان کے لیے وہاں خرچ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

اس بنیادی نظریے سے عمل پیدائش کے علاوہ استحقاق دولت کی ایک دوسری مد خود بخود نکل آتی ہے یعنی ہر وہ شخص اسلامی نقطۂ نظر سے دولت کا مستحق ہے جس تک دولت کا پہونچانا اللہ نے دولت کے اولین مالکوں کے ذمہ فرض قرار دیا ہے اس طرح تقسیم دولت کے ثانوی مستحقین کی ایک طویل فہرست مرتب ہو جاتی ہے۔ جن میں سے ہر ایک دولت کا مستحق ہے۔

ان مدات کو مقرر کر کے اسلام درحقیقت یہ چاہتا ہے کہ دولت کو معاشرے میں زیادہ سے زیادہ گردش دی جائے اور اکتناز دولت پر جو پابندیاں "سود" کی حرمت کے ذریعہ عائد کی گئی ہیں ان کو مزید توسیع دی جائے۔ ان مدات کا تفصیلی بیان تو اس مختصر مقالے میں ممکن نہیں ہے تاہم بالخصیص اختصار کے ساتھ شمار کیا جاتا ہے۔

زکوٰۃ:۔ ان میں سب سے پہلا اور سب سے زیادہ وسیع مد "زکوٰۃ" ہے قرآن کریم نے بے شمار مقامات پر اس فریضہ کو "نماز" کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ہر وہ شخص جو سونے چاندی، مویشی اور مال تجارت کا مقدار نصاب کی حد تک مالک ہو۔ اس کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ سال گزرنے پر اپنی ان مملوکات کا ایک حصہ دوسرے ضرورت مند افراد پر صرف کرے۔ اور جو شخص اس فریضہ کو ادا نہ کرے اس کے لیے قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ۔

"الذین یکنزون الذهب والفضة   جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کر کے رکھتے ہیں اور

ولا ینفقونھا فی سبیل اللّٰہ	اور اسے اللہ کے راستہ میں خرچ نہیں کرتے
فبشرھم بعذاب الیم یوم	ان کو آپ دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے۔
یحمیٰ علیھا فی نار جھنم	جس دن اس (دولت) کو جہنم کی آگ میں
فتکویٰ بھا جباھھم وجنوبھم	گرم کیا جائے گا۔ پھر اس سے انکی پیشانیوں
وظھورھم ھذا ما کنزتم	اور پہلوؤں اور پشتوں کو داغا جائے گا۔ یہ
لانفسکم فذوقوا ما کنتم	وہ مال ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا۔
تکنزون"	چکھو جسے تم جمع کیا کرتے تھے۔

پھر اس زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے قرآن کریم نے آٹھ مصارف خود مقرر فرما دیے ہیں۔

اس طرح "زکوٰۃ" کے اس مد کے لیے آٹھ مصارف مقرر فرما کر قرآن کریم نے دولت کی زیادہ سے زیادہ گردش کا دروازہ کھول دیا ہے۔

"زکوٰۃ" کے مصارف میں استحقاق کی قدر مشترک "ناداری" اور "افلاس" ہے اور اس مد میں افلاس ہی کے خاتمہ پر زور دیا گیا ہے۔ اس طریقے سے نادار اور مفلس افراد کے درمیان کس قدر وسیع پیمانہ پر تقسیم دولت ممکن ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۶۵ء میں پاکستان کی قومی آمدنی تقریباً پندرہ ارب تیس کروڑ روپے تھی۔ زکوٰۃ کی ادنیٰ ترین شرح یعنی ۵ر۲ فیصد کے حساب سے اگر قومی آمدنی کی پوری زکوٰۃ نکالی جائے تو کم از کم اڑتیس کروڑ پچیس لاکھ روپیہ سالانہ صرف غریبوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر تمام عالمی پیداوار ہر سال باقاعدگی کے ساتھ زکوٰۃ نکالیں تو سالانہ کتنی خطیر رقم سرمایہ داروں کی جیب سے نکل کر غریبوں اور ناداروں کے پاس پہونچتی ہے۔ اور اس طرح تقسیم دولت کی ناہمواری کتنی تیزی سے رفع ہو سکتی ہے۔

(۲) عُشر:۔ "عشر" درحقیقت زمینی پیداوار کی "زکوٰۃ" ہے لیکن چونکہ اس پیداوار میں انسانی محنت کا دخل نسبتاً کم ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی شرح ۵ر۲ فیصد کے بجائے ۱۰ فیصد رکھی گئی ہے۔ "عشر" صرف ان زمینوں کی پیداوار پر واجب ہوتا ہے جو فقہی تفصیلات کے مطابق عشری ہوں اور اس کو زکوٰۃ ہی کے مصارف پر خرچ کیا جاتا ہے۔

(۳) **کفارات**:۔ معاشرے کے سینکڑوں افراد تک دولت پہنچانے کا ایک مستقل راستہ اسلام نے کفارات کے ذریعہ مقرر کیا ہے۔ کوئی شخص بلا عذر رمضان کا روزہ توڑ دے، یا کسی مسلمان کو بلا عمد قتل کر دے یا اپنی بیوی سے ظہار کرے یا قسم کھا کر اسے توڑ دے تو بعض صورتوں میں لازمی اور بعض صورتوں میں اختیاری طور پر اسے حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مال کا کچھ حصہ ناداروں پر خرچ کرے۔ یہ نقد روپے کی شکل میں بھی ہو سکتا ہے اور کھانے کپڑے کی صورت میں بھی۔

(۴) **صدقۃ الفطر**:۔ اس کے علاوہ جو لوگ صاحب نصاب ہوں ان کے لیے عید الفطر کے موقع پر لازم کیا گیا ہے کہ نماز عید کو جانے سے پہلے فی کس پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت مفلسوں ناداروں، یتیموں اور بیواؤں پر خرچ کریں، یہ رقم نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے بھی نکالی جاتی ہے، اور اس کے وجوب کے لیے مقدار نصاب کا "لازمی" ہونا یا اس پر پورا سال گزرنا بھی ضروری نہیں ہے، لہٰذا اس فریضہ کا دائرہ "زکوٰۃ" سے بھی زیادہ وسیع ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ خاص طور سے ایک اجتماعی مسرت کے موقع پر زیادہ سے زیادہ مساوات پیدا کی جا سکتی ہے۔

مذکورہ بالا چار مدات غریبوں اور مفلسوں میں دولت تقسیم کرنے کے لیے تھے۔ اس کے علاوہ دو مدّہ ہیں جن سے اعزہ و اقربا کی امداد اور ان تک دولت کا پہونچانا مقصود ہے ان میں سے ایک مد نفقات کی ہے اور دوسری وراثت کی۔

(۵) **نفقات**:۔ اسلام نے ہر انسان پر ذمہ داری عائد کی ہے کہ وہ اپنے خاص خاص رشتہ داروں کی معاشی کفالت کرے، پھر ان میں سے بعض تو وہ ہیں جن کی کفالت بہر صورت واجب ہے خواہ انسان تنگدست ہو یا خوش حال مثلاً بیوی نابالغ اولاد، اور بعض وہ ہیں جن کی کفالت کی ذمہ داری وسعت کے ساتھ مشروط ہے، ایسے رشتہ داروں کی ایک طویل فہرست اسلامی فقہ میں موجود ہے، اور اس کے ذریعہ خاندان کے اپاہج، کمزور افراد کی معاشی کفالت کا بڑا اچھا نظام بنایا گیا ہے۔

(۶) **وراثت**:۔ اسلام کا نظام وراثت، اس کے نظریہ تقسیم دولت میں ایک بنیادی امتیاز رکھتا ہے، وراثت کی غیر مرتکز تقسیم سے تقسیم دولت میں جو ناہمواری پیدا ہوتی ہے وہ

محتاج بیان نہیں مغربی ممالک میں اس ناہمواری کا ایک بہت بڑا سبب یہ ہے جس کا اقرار بہت سے ماہرین معاشیات نے کیا ہے۔

یورپ میں بالعموم اکبر الاولاد کی جانشینی کا طریقہ رائج ہے، جس میں سارا ترکہ بڑے لڑکے کو مل جاتا ہے، باقی سب محروم ہو جاتے ہیں۔ پھر بعض مقامات پر اگر مرنے والا چاہے تو کسی دوسرے شخص کے نام اپنے سارے ترکہ کی وصیت کر سکتا ہے، اور اس سلسلہ میں اسے مذکر اولاد کو بھی محروم کرنے کا حق ہے۔ اس طریقہ کے نتیجہ میں دولت پھیلنے کے بجائے سمٹتی ہے، اسکے برعکس ہندو مذہب میں تقسیم وراثت کو مردوں میں تو اشتراکی حد تک مساوی کر دیا گیا ہے، لیکن عورتیں بہرحال وراثت سے محروم رکھی گئی ہیں جس سے ان پر ظلم ہونے کے علاوہ گردش دولت کا دائرہ اسلام کی بہ نسبت سمٹ جاتا ہے۔

اس کے برخلاف اسلام نے تقسیم وراثت کا جو نظام بنایا ہے اس میں ان تمام خرابیوں کا انسداد ہو جاتا ہے، اس نظام کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) قرابت کے لحاظ سے وارثوں کی ایک طویل فہرست رکھی گئی ہے جس کی وجہ سے متروکہ دولت زیادہ وسیع پیمانہ پر پھیلتی ہے۔ یہاں یہ بات قابل نظر ہے کہ دولت کے وسیع پھیلاؤ کے پیش نظر یہ حکم دیا جا سکتا تھا کہ سارا ترکہ غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے یا بیت المال میں داخل کر دیا جائے، لیکن اس صورت میں ہر مرنے والا کوشش کرتا کہ وہ اپنی زندگی ہی میں سارا مال ختم کر جائے۔ اور اس سے معیشت کے نظام میں ابتری پیدا ہو جاتی۔ اس لیے اسلام نے اُسے میّت کے رشتہ داروں میں تقسیم کرنے کا نظام بنایا ہے جو مالک سرمایہ کی فطری خواہش ہے۔

(۲) دنیا کے تمام نظام ہائے وراثت کے برخلاف عورتوں کو بھی میراث کا مستحق قرار دیا گیا ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

للرجال نصیب مما ترك	مردوں کے لیے (بھی) ایک حصہ ہے۔ اس
الوالدان والاقربون و	مال میں جو والدین اور اقربا چھوڑ کر جائیں
للنساء نصیب مما ترك	اور عورتوں کے لیے بھی ایک حصہ ہے۔

الوالدان والاقربون مما	اس مال میں جو والدین اور اقارب چھوڑ کر
قل منه او کثر نصیبا مفروضا	جائیں تھوڑے میں سے بھی اور زیادہ میں
(النساء)	سے بھی ایک معین حصہ ہے۔

(۳) مرنے والے کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ کسی وارث کو محروم کر دے یا کسی کے حصہ میں ترمیم کر سکے۔ اس طرح وراثت کے راستے سے ارتکاز دولت کا امکان ختم کر دیا گیا ہے ارشاد ہے:-

آباؤکم وابناؤکم لاتدرون	تمہارے باپ بیٹوں میں کون نفع کے اعتبار
ایّھم اقرب لکم نفعاً فریضة	سے تم سے قریب تر ہے؟ تم نہیں جانتے؟
من اللہ۔	یہ اللہ کا مقرر کیا ہوا قانون ہے۔

(۴) چھوٹی اور بڑی اولاد میں کوئی تفریق نہیں کی گئی بلکہ سب کو برابر حصہ دیا گیا ہے۔

(۵) کسی وارث کے لیے اس کے حصّہ رسدی کے علاوہ کسی مال کی وصیّت کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ اس طرح کوئی وارث متوفی کے مال سے اپنے حصّہ وراثت کے سوا کچھ نہیں پا سکتا۔

(۶) متوفی کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ وارثوں کے سوا دوسرے لوگوں کے لیے وصیت کر جائیں؟ اس سے بھی دولت کے پھیلاؤ میں مدد ملتی ہے۔ اور تقسیم وراثت سے قبل دولت کا ایک حصہ وصیت پر صرف ہو جاتا ہے۔

(۷) لیکن وصیت کرنے والے کو اس بات کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ پورے مال کی وصیت کر جائے۔ بلکہ اسے اپنے مال کے صرف ایک تہائی حصہ میں ایسا کرنے کی اجازت دی گئی ہے؛ اس سے زیادہ کی وصیت کا وہ مجاز نہیں۔ اس طرح ارتکاز دولت کے اس خطرے کا سدباب بھی کر دیا گیا ہے جو پورے مال کی وصیت کی اجازت کی صورت میں پیدا ہو سکتا تھا اور اقرباء کے حقوق کو بھی محفوظ کر دیا گیا ہے۔

(۸) خراج و جزیہ:- مذکورہ بالا مدّات کے علاوہ وہ مد ایسے ہیں جن میں مالکان دولت کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی دولت کا کچھ حصہ حکومتِ وقت کو ادا

کردیں ایک خراج اور دوسرا جزیہ۔

خراج ایک قسم کا زمینی لگان ہے جو صرف ان زمینوں پر عائد کیا جاتا ہے جو فقہی تفصیلات کے مطابق خراجی ہوں اور اس کو حکومت اجتماعی کاموں میں صرف کرسکتی ہے اور جزیہ ایک تاوان غیر مسلم افراد سے وصول کیا جاتا ہے جو اسلامی حکومت کے باشندے ہوں۔ اور حکومت ان کے جان و مال اور آبرو کی حفاظت کا ذمہ لیا ہو۔ نیز دوسرے ان غیر مسلم ممالک سے بھی جزیہ وصول کیا جا سکتا ہے جن سے جزیہ کی ادائیگی پر صلح ہوئی ہو۔ یہ رقم بھی حکومت کے اجتماعی مقاصد میں صرف ہوتی ہے۔

اوپر تقسیم دولت کے جو ثانوی مدّات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ سب وہ ہیں جن میں دولت صرف کرنا دولت کے اولین مالکوں کے ذمّے شخصی طور پر واجب قرار دیا گیا ہے غرباء و مساکین پر اور مسلمانوں کے اجتماعی مقاصد میں خرچ کرنے کی جو ترغیبات قرآن و سنت میں وارد ہوئی ہیں، وہ ان کے علاوہ ہیں، قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا ينفقون	لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ
قل العفو۔	کریں آپ فرما دیجئے کہ جو بچ رہے۔

اس ارشاد نے واضح فرما دیا ہے کہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ بات یہ ہے کہ انسان صرف مقدار واجب خرچ کرنے پر اکتفا نہ کرے، بلکہ جس قدر دولت اس کی ضرورت سے زائد ہو، وہ سب معاشرے کے ان افراد تک پہونچانے کو اپنی سعادت سمجھے جو دولت سے محروم ہیں، قرآن کریم اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "انفاق فی سبیل اللہ" کے احکام و فضائل سے بھرے ہوئے ہیں۔

پیشہ ورانہ گداگری کا انسداد

معاشرہ کے کمزور افراد کو سرمایہ داروں کے اموال میں حق دلانے سے دوسری طرف معاشرہ میں اس خرابی کے امکانات تھے کہ معاشرہ کا یہ طبقہ مفلوج ہو کر ہمیشہ قوم پر بار بنا رہے۔ شریعت اسلام نے اس پر بھی گہری نظر کر کے ان کو بھی خاص قانون کا پابند بنایا ہے کہ

(۱) تندرست توانا آدمی کو بجز مخصوص حالات کے سوال کرنے کا حق نہیں دیا،

قرآن کریم میں "فقراء" کی قابل تعریف صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ "وہ لوگوں سے لگ لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔"

(۲) جس شخص کے پاس ایک دن کے گزارہ کا سامان موجود ہو اس کے لیے سوال حرام کر دیا۔

(۳) سوال کرنے کو حدیث میں ذلت قرار دیا ہے۔

(۴) جس شخص کے پاس بقدر نصاب مال موجود ہو اس کے لیے بغیر سوال کے بھی صدقہ لینا حرام کر دیا۔

(۵) غرباء و مساکین کو اس کی ترغیب دی کہ محنت مزدوری کی کمائی کو عزت سمجھیں صدقات سے گریز کریں۔

(۶) ارباب اموال کو اس کی ہدایت کی کہ اموال صدقات صرف اپنی جیب سے نکالنا کافی نہیں۔ بلکہ اس کے مستحقین حاجتمند لوگوں کو تلاش کر کے ان کو پہونچانا بھی ان کی ذمہ داری ہے۔

(۷) محکمہ احتساب کے ذریعہ گداگری کا انسداد کیا گیا۔

ان احکام کے ذریعہ اسلام نے تقسیم دولت کا جو خوشگوار نظام قائم فرمایا ہے اس کے نتیجہ میں ہماری تاریخ کے اندر ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ معاشرے میں صدقات کو قبول کرنے والا ڈھونڈے سے نہیں ملتا تھا۔

یہ اسلامی نظام تقسیم دولت کے چند نمایاں خدوخال تھے، اس مختصر مقالہ میں اس نظام کی اتنی ہی جھلک دکھائی جا سکتی تھی لیکن امید ہے کہ ان گزارشات سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ اس معاملے میں اسلامی نظام معیشت سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے کس طرح ممتاز ہے اور اس کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں۔

وللہ الحمد اولہ وآخرہ وظاہرہ وباطنہ

بقیہ :- "صحبتے بہ اہلِ دِل"

تو جنت میں بھی رہا ہو اور درویش دوزخ میں پڑا ہوا ہو۔ کسی بزرگ سے تعبیر پوچھی تو کہا کہ وہ بادشاہ صاحبِ تخت و تاج تھا مگر درویشی کی تمنا کرتا تھا اور درویشوں کو بڑی حسرت کی نگاہ سے دیکھا کرتا اور یہ درویش تھے تو فقیر بے نوا مگر بادشاہ کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس طرح اگر کوئی شخص مسجد میں ہو اور اسکا دل لگا ہوا ہو کہ جلدی نماز ہو اور میں اپنے کام کو جاؤں تو گویا وہ مسجد سے باہر نکل چکا اور اگر کوئی بازار میں ہو اور اسکا دل مسجد و نماز میں لگا ہوا ہے تو گویا وہ نماز ہی میں ہے یہی معنی ہیں انتظار الصلوٰۃ بعد الصلوٰۃ کے۔ زہد خانقاہ میں بیٹھنے کا نام نہیں ہے، معلوم نہیں ہم کہاں ہیں، اس کا حال قیامت میں معلوم ہوگا، فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ وہاں اِدھر کا پلہ بھاری ہوا تو اُدھر، اگر اُدھر کا پلہ بھاری ہوا تو اِدھر۔

---

[۱] یعنی بے فکری اور استغنا [۲] حضرت کی عمر مبارک اس تحریر کے وقت ۵۵ سال کی ہے اللہ تعالےٰ برکت عطا فرمائے لیکن قد مبارک میں ذرا بھی خم نہیں۔
[۳] یعنی خدا کے سامنے۔

سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی

مکتوبات، علمی و ادبی تبرکات

مرتبہ — مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

مکتوب شاہ عبدالعزیزؒ — کسی عزیز کے نام

اما بعد المرسوم بین الاحیاء من التحیۃ والدعاء فقد طالعت رقیمتکم الانیقۃ التی صدرت نحونا باسم خواجہ محمد امین ودستموها فی غلاف دیوان الحزین واطلعت ما فیها من المضامین المتنوعۃ وکان من جملتها الاستفسار والاستکشاف عما تقرر من احتمالی الاقامۃ والارتحال فاعلموا ان

بعد سلام و دعا کے واضح ہو کہ میں نے آپ کے اس مکتوب گرامی کا مطالعہ کیا جو خواجہ محمد امین کے نام لکھا اور جس کو دیوان حزیں کے غلاف میں آپ نے رکھا تھا، میں نے اس کے تمام مندرجہ مضامین پڑھے اس میں میری اقامت اور سفر کے بارے میں بھی سوال تھا آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ فقیر ابھی آج کل میں جانے کا قصد کر رہا ہے۔ میری والدہ اور بھائی مجھے یہاں تنہا چھوڑنے پر راضی نہیں

الفقیر ایضاً غداً او
بعد غد قاصد وذلك
لان الوالدة والاخوة
لا یدعوننی ان اقیم
ههنا منفرداً
..... تعب السفر الذی
یعنی فی الاجتماع اولی
من لذة الاقامة
التی فی الانفراد فقبلت
منهم ذلك وقد تقرر التوجه
الی البدهانه بالفعل
ثم ان طلعت شموس الفتن
من المشرق او المغرب
نرتحل من هناك (الی)
الموضع المعلوم اسمه
وان سكنت ریاحها الجنوبیة
والشمالیة اخترنا العود
الی هذا البلد المألوف
عمره الله ــــ واما
طلب الكتب المرقومة
فالقول الفصل فیها
انها سُدّت فی الغرائر
لا یطاق اخراجها الآن

ہیں ــــ میں نے بھی سفر کی اس
مشقت کو جو سب کے ساتھ ہو اپنی
انفرادی اقامت کی راحت
پر ترجیح دے کر ان کے فیصلے کو قبول
کر لیا ــــ اب بالفعل بڈھانہ کی
سکونت طے پائی ہے۔ پھر اگر مشرق
یا مغرب سے فتنے نمودار ہوئے تو
ہم وہاں سے ایک اور مقام پر
چلے جائیں گے جو ذہن میں ہے
اگر جنوبی اور شمالی فتنے دب گئے تو پھر
ہم اسی بلد مالوف (دہلی) کی طرف
لوٹنا پسند کریں گے اللہ تعالیٰ اس
کو آباد رکھے۔

اور آپ نے جو مجھ سے چند
کتابیں طلب کی ہیں اس کے بارے
میں صحیح بات یہ ہے کہ تمام کتابیں
باندھ کر بقچوں وغیرہ میں
رکھ دی گئی ہیں اس وقت

وسأ بلغها ان شاء الله	ان کا نکالنا بہت مشکل ہے کسی
تعالیٰ بعد الاستقرار	جگہ استقرار نصیب ہونے پر انشاء اللہ
فی موضع .... واما	تعالیٰ ان کتابوں کو جلد بھیجدوں گا۔
رسالة الجمع بین وحدتی	اور رسالہ وحدت الوجود والشہود
الوجود والشہود فهو	جو دراصل والد صاحب قدس سرہٗ
مكتوب سيدنا الوالد	کا آفندی اسمٰعیل رومی کے
قدس سرہٗ ...... الیٰ	نام ایک مکتوب ہے، جسے
آفندی اسمعیل الرومی	مکتوب مدنی کا نام دیا گیا ہے۔
ولقبہٗ بالمکتوب المدنی	نیز ازالۃ الخفا کا مقدمہ یہ دونوں
وکذلك مقدمة ازالة الخفا	بھی دیگر کتابوں کے ساتھ بند ہیں۔
مسدودةٌ فی الغرائر واما	آپ نے جو دیوان حزیں کا
دیوان الحزین فقد طالعتُ	نسخہ بھیجا تھا اس کا بعض
بعضہٗ من ذروة النهار	حصہ آج دیکھ لیا ہے۔ حامل
الیٰ هذا الوقت وارسلتُهٗ	رقعہ کے ہاتھ اس کو واپس
علیٰ یدی حامل الرقیمة	کر رہا ہوں۔
والسّلام۔	والسّلام

مکتوب شاہ عبدالعزیزؒ ــــ بعض افاضل کے نام

السّلام علیکم ورحمة الله	بعد سلام مسنون واضح ہو کہ شرح
وبرکاتہٗ۔	چغمنی کا انتظار بہت طویل ہو گیا
وبعدُ ــــ فقد طال انتظار	ابھی تک یہ کتاب نہیں پہونچی ــــ
شرح الجغمنية الی الآن	ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہل پہلت
ولم یصل بعدُ ــــ فکانّہٗ	اس کتاب کو بھیجنے کا موقع نہیں

لم یتفق لاہل الفلہت
ارسالہ_ قد اشتغل
بہ اخی رفیع الدین سلمہ
ربہ والنسخۃ منفردۃ
لیس یعتمد فی صحتہ
والسقم مع ذلک فیہی
کثیرۃ فی الغالب فالواجب
ان یبلغ اقصی الجہد فی الطلب
فان اتفق فیہا (والا)
فالیاس احدی الراحتین السلام

پاسکے۔ یہ کتاب برادر عزیز شیخ
رفیع الدین سلمہٗ کے کام میں ہے
صرف ایک ہی نسخہ ہے جس پر
صحیح اور غلط کا دار و مدار ہے۔
پھر وہ بھی اکثر غلط ہے آپ
اچھی طرح کوشش کرکے دوسرا
نسخہ تلاش کریں اگر مل جائے
تو بہتر ہے ورنہ ناامیدی بھی
ایک قسم کی راحت ہے۔

مکتوب شاہ عبدالعزیزؒ ــــ بعض افاضل کے نام

امّا بعد السلام المسنون
فقد وصلت صحیفتکم
الشریفۃ محتویۃ علی
عافیتکم وعافیۃ اہل
بیتکم_ فشکرنا اللہ علی
ذلک_ و ان سألتم عنّا
فنحن ایضاً بحمد اللہ بعافیۃ
ورفاہیۃ غیر ان ماجری
فینا من نقد برات اللہ
تعالیٰ (رحلۃ) الولد العزیز
احمد[1] واختلال الانتظام

بعد سلام مسنون ــــ آپ کا گرامی نامہ
ملا جو آپ کی اور آپ کے متعلقین
کی عافیت پر مشتمل تھا۔ اس پر
اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اور
ہماری حالت دریافت طلب ہو تو
ہم بحمد اللہ عافیت و رفاہیت
سے ہیں ــــ البتہ تقدیرات
الہیہ کا ظہور میاں احمد کے
انتقال اور انتظام منزلی
کے اختلال کی شکل میں ہوا۔
الخ

---

[1] اس مکتوب سے معلوم ہوا کہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے ایک صاحبزادے کا نام احمد تھا۔

المنزلی ۱۷

مکتوب شاہ عبدالعزیز بنام شاہ نوراللہ (خسر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ)

..... فیمَا شاعَ و ذاعَ و	وہ بات جو بہت شائع، مشہور اور
ملاء السامع وتواتر بل	گوش زد خاص وعام ہو رہی ہے
وقع علیہ الاجماع،	بلکہ تواتر کی حد تک پہونچ گئی ہے
نہوض موکب الدرانی	یہ ہے کہ لشکر احمد شاہ عـ٥ درّانی اٹھ کھڑا
الی تسخیر ھذہ البلاد	ہوا ہے یہاں کے شہروں اور علاقوں
والاریاع وانّ مقدمۃَ	کو مسخر کرنے کے لیے ____ اس کے
جیشہ عَبَرت النہراو	مقدمۃ الجیش نے نہر کو عبور کر لیا ہے
کادتْ وشوکتہُ التی	یا عبور کیا چاہتا ہے، اور اس کی وہ
فَارَقَتہُ قدعادت و	پہلی شوکت جو اس سے جاتی رہی تھی
انہٗ بنفسہ وصَلَ الی	اب پھر لوٹ آئی ہے۔ اور وہ بنفس
جلال آباد وحصل من	نفیس جلال آبادلہ ..... تک پہونچ
رُؤساء الافَاغنۃِ لہٗ	گیا ہے۔ افغان رؤسا، اس کے

عـ٥ جنگ پانی پت کے بعد احمد شاہ درّانی تین مرتبہ اور ہندوستان میں اپنا لشکر لے کر آئے۔ جن میں ایک مرتبہ حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ کی حیات میں اور دو مرتبہ ان کے بعد۔ ان دو میں ایک حملہ سنہ ۱۷۶۶ء میں کیا۔ اس وقت یہ مشہور ہو گیا تھا کہ درّانی کا مقصد اس حملے سے انگریزوں کو بنگال سے نکالنا ہے۔ چنانچہ انگریزوں نے بھی ایک دستہ الہ آباد بھیج دیا تھا کہ ادھر ہی میں مقابلہ ہو جائے۔ اس کے بعد سنہ ۱۷۶۹ء میں آخری بار سکھوں سے نبرد آزما ہوئے۔ اس مکتوب میں ان آخری دو حملوں میں سے کسی ایک کا ذکر ہے۔ اس مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ پانی پت کے بعد درمیان میں درّانی کی شوکت میں کچھ خلل آگیا تھا۔ بعد کو یہ خلل دور ہوا۔

لہ افغانستان کا مشہور شہر ۱۲

الانقیادُ ھذا ھو الخبر	تابع فرمان ہو گئے ہیں یہ خبر
المحققُ المنقحُ بحسبِ الظنِّ	بحسب الظن اور شہرت کے لحاظ سے
والذی سار فی الاطراف	محقق اور منقح ہے۔ باقی اصل
کالمثلِ السائر۔ والعلم	علم خدائے علیم و خبیر ہی
عند العلیم الخبیر۔	کو ہے۔
واما کفارُ مرھٹہ فھم	گروہ مرہٹہ اسی حال میں ہے جس
علیٰ ما کانوا علیہ من	حال پر تھا، یعنی سکون و جمود میں
السکون جامدون فی	مبتلا ہے اور ادبار و خسران
خیم الادبار و معسکر	کے خیموں میں سکونت پذیر ہے۔
الخسران۔	

.....

مکتوب شاہ اہل اللہ بنام شاہ عبد العزیز[۲۱]

یا من ھو عزیزٌ عند القلوب	اے وہ کہ جو سب کے دلوں کو عزیز
ویا من فضلہٗ بالعلمِ علامُ	ہے اور جس کو علام الغیوب نے
الغیوب۔ نسألُ اللہ لنا و	علم کے ساتھ فضیلت بخشی ہے۔
لکم ان ینجینا وایاکم من	ہم اللہ تعالیٰ سے درخواست
من شرورِ الزمان خصوصًا	کرتے ہیں کہ وہ ہم کو اور تم کو شرور
من غلبۃ اھل الطغیان	زمانہ سے محفوظ رکھے خصوصاً اس
فی البلدان وقد وصل	فتنے سے جو اہل طغیان کے غلبے کی
الینا مکتوبکم المرغوبُ	صورت میں شہروں میں رونما ہے۔
واطلعنا علیٰ ما فی	تمہارا مکتوب مرغوب پہونچا۔
مطویاتہ من تلاقی	اور اس کے مندرجات سے آگاہی
الفئتین ومصاف الفرقتین	ہوئی ــــ اس میں دو گروہوں اور

[illegible] تقاتل في سبيل الله	[illegible]
وأخرى كافرة يرونهم	ایک جماعت فی سبیل اللہ قتال کرنے
مثليهم رأي العين والمرجو	والوں کی ہے اور دوسری مخالفین
من فضل الله سبحانه أن	اسلام کی جن کی تعداد دیکھنے میں
ينصر المسلمين ويخذل	دوگنی نظر آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ
الكافرين...... فكم من فئة	کے فضل سے امید ہے کہ وہ مسلمین
قليلة غلبت فئة كثيرة	کو کامیاب اور ان سے مقابلہ
بإذن الله ــ والذي سمع	کرنے والوں کو ناکامیاب کرے گا۔
من أخبار جنود الشجاع الدولة	...... کتنی کچھ کم تعداد کی جماعتیں
من كفار فرنگ فإلى الله	ایسی تھیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے بڑی
المشتكى ــ الأيّامُ أيّامُ	تعداد والی جماعتوں پر غالب آئیں۔ ــ
الفِتَنِ والحوادث والمحن	اور وہ خبر جو کفار فرنگ (انگریزوں) کے ہاتھوں
فقراء المسلمين مثلُ	شجاع الدولہ عہ کے لشکر کی شکست سے

عہ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ کے بعد ہندوستان میں انگریزوں نے اپنی سلطنت کی گویا بنیاد رکھ دی تھی۔ کلکتہ پر تو انگریز پہلے ہی قبضہ کر چکے تھے اس کے بعد انھوں نے پٹنہ پر بھی اپنا قبضہ جما لیا۔ میر قاسم نے بھاگ کر اودھ کے نواب شجاع الدولہ کے پاس پناہ لی۔ پھر شجاع الدولہ، میر قاسم اور مغل بادشاہ شاہ عالم ان تینوں نے مل کر پٹنہ پر حملہ کیا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ پھر یہ تینوں دوسری مرتبہ ۲۳ اکتوبر ۱۷۶۴ء کو بکسر کے میدان میں جمع ہوئے۔ انگریز فوج لے کر مقابلہ کے لیے آیا۔ بڑی بھاری جنگ ہوئی جس میں شجاع الدولہ وغیرہ کو شکست ہوئی۔ شاہ عالم نے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ شجاع الدولہ دوبارہ کچھ دنوں بعد اپنی فوج جمع کر کے مقابلے کے لیے نکلے، پھر شکست ہوئی اور انگریزوں سے معافی مانگی ــ اس مکتوب میں غالباً بکسر کی شکست کا ذکر ہے جس کا سال ہجری ۱۱۷۸ھ ہے۔ اور جو حضرت شاہ ولی اللہ رح کی وفات سے دو سال بعد ہوئی تھی۔ اور ممکن ہے کہ بکسر کے بعد والی جنگ کا ذکر ہو جس میں شجاع الدولہ کا لشکر نبرد آزما ہوا تھا۔ اور جو بکسر سے تھوڑے عرصے بعد ہوئی تھی۔

حشراتِ الارضِ من أتی
علیھا یدسُھا بالاقدام۔
لانستطیع الانتقالَ والارتحالَ
من بلدٍ إلیٰ بلدٍ وابنِ المفر۔
لا ملجأ ولا منجأ من اللهِ الّا
الی اللہ — کان ما کان۔
لکن الرقعۃ اللتی فیھا اخبار
السکھان اوحشنا غایۃ
الوحشۃ — فان شرورھم
احدران یُخافَ منھا القربھم
وھجومھم بغتۃً کما وقعَ
مراراً وعدوا نھم شدیدۃٌ
یفعلون بھم مالا یفعلون
بغیرھم — خصوصاً من
کان معروفا فی العلم
والمشیخۃ اعاذنا اللہُ
وجمیع المسلمین من
شرورھم وخبث صدورھم
والسلام۔

متعلق سنی جا رہی ہے (اس سے
صدمہ ہے) بس اللہ ہمارے ہماری
فریاد ہے۔ یہ زمانہ حوادث کا
زمانہ ہے۔ اور ہم فقرا مسلمین بے
دقعتی میں حشرات الارض کی مانند
ہو رہے ہیں کہ جو آتا ہے ہم کو پامال
کر جاتا ہے۔ ہم نہ کہیں جا سکتے ہیں
نہ کسی جگہ منتقل ہو سکتے ہیں — اور
بھاگنے کی جگہ بھی کہاں ہے؟ —
کوئی لجار اور نجات کا ٹھکانہ اللہ
سے بچ کر نہیں — بس اسی کی طرف
رجوع کرنے میں نجات ہے —
یہ واقعہ تو ہوا سو ہوا — تمہارے
اس خط نے جس میں سکھوں سے
متعلق لکھا تھا بہت زیادہ فکر
میں ڈال دیا۔ ان کے شرور سے
خوف ہونا ہی چاہیئے۔ اس لیے
کہ یہ قریب کے ہیں اور ان کا ہجوم
اچانک ہوتا ہے جیسا کہ کئی مرتبہ ہو چکا
ہو اور (اس وقت) ان کی دشمنی بھی
دوسروں کی بہ نسبت اہل اسلام سے
شدید قسم کی ہے — خصوصًا ان حضرات
سے جو علم و مشیخت میں معروف و٭

٭ ممتاز ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اور
جمیع مسلمین کو ان کے شرور اور خبث صدور
سے محفوظ رکھے۔ والسلام

مکتوب شاہ اہل اللہؒ بنام شاہ عبدالعزیزؒ

(۱) یامن لدی اہل الصفا مافیک معقول
ثم الذی یاتیک من فضل فمامول

(۱) اے وہ کہ اہلِ صفا کے نزدیک تمہارے اندرون کی خوبیاں مقبول و پسندیدہ ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ تم پر فضل الٰہی سایہ فگن ہوگا۔

(۲) ان السعادۃ کلہا فی کلکم مشہودۃ
والخیر فی اصلابکم واللّٰہ مجبول

(۲) سعادت کلیۃً تم سب میں ظاہر اور روشن ہے۔ اور خیر تو خدا کی قسم تمہارے خاندان کی سرشت میں ہے۔

(۳) یاتی من الاخبار ما یدھش قلوبنا
فالحفظ من کان من الآفات مسئول

(۳) خبریں اس قسم کی آرہی ہیں جس سے قلوب خوف زدہ ہیں۔ آفات سے حفاظت کی درخواست اللہ تعالیٰ سے کی جارہی ہے۔

(۴) اللّٰہ یحفظنا وایاکم من البلاء
فی الدین والدنیا فبعض الخلق مبتول

(۴) اللہ تعالیٰ ہم کو اور تم سب کو بلاؤں سے محفوظ رکھے، دین میں بھی اور دنیا میں بھی۔۔ بعض مخلوق بہت ہی پریشان اور تباہ حال ہے۔

مکتوب شاہ عبدالعزیزؒ بنام مولانا رشید الدین خاں دہلویؒ

خان صاحب عالی مراتب جامع الفنونؔ
خاں صاحب عالی مراتب جامع الفنون

ع۵ یہ منظوم مکتوب غالباً شاہ عبدالعزیزؒ کے اس منظوم خط کے جواب میں ہو جس کا ایک شعر یہ ہے۔
ایّامُ برجِ انت والقلب منجزع   من قوم سکھ وان الخوف معقول
اور جو حیات ولی کے صفحہ ۲۳۳ و ۲۳۴ پر درج ہے۔

Regd. No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow

VOL. 36 NO. 2 MAY 1968

صرف نفیس پریس اینڈ پرنٹرس قطب الدین روڈ لکھنؤ ۳ میں چھپا۔

[ربیع الاول ۱۳۸۸ھ]

JUNE 1968

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

موجودہ قیمت 5-00

ماہنامہ **الفرقان** لکھنؤ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۵۰/۷
پاکستان سے ۵۰/۷
ششماہی
ہندوستان سے ۴/-
پاکستان سے ۴/-

فی کاپی ...... ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے
مزید محصول ڈاک کا اضافہ

جلد ۳۶	بابت ماہ ربیع الاول ۱۳۸۸ھ مطابق جون ۱۹۶۸ء	شمارہ ۳

اگر اس دائرہ میں سرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ رجون تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی، پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کاغذ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں۔ نئے خریدار بھی اسی طریقہ سے چندہ ارسال فرمائیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۵ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، اس کی اطلاع ۱۵ تاریخ تک آجانا چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

از ـــــــــ محمد منظور نعمانی

قرآن مجید میں ایک بڑی حقیقت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہو۔ " عَسٰی اَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ " (ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ تمھیں کوئی چیز یا کوئی بات ناگوار و ناپسند ہو اور انجام کے لحاظ سے وہ تمھارے حق میں سراسر خیر اور بھلائی ہو)۔ دوسری جگہ فرمایا گیا ہے " عَسٰی اَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا " یعنی بالکل ممکن ہے کہ کوئی چیز یا کوئی واقعہ تمھیں سخت ناگوار اور ناپسند ہو اور اللہ تعالیٰ اسی سے تمھارے لئے کوئی " خیر کثیر " پیدا فرما دے۔

اللہ تعالیٰ کے اس قانون رحمت کا ایک عجیب و غریب تجربہ اس عاجز کو نصیب ہوا، ناظرین الفرقان کا حق ہے کہ وہ بھی اس سے واقف ہو کر مسرت میں شریک ہوں۔

گزشتہ اکتوبر کے شروع میں اس ناچیز نے جنوب مشرقی افریقہ کے جزیرہ ماریشس اور ری یونین کا، اور پھر رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس کی شرکت کے لئے وہیں سے مکہ معظمہ کا سفر کیا تھا اس سفر کا تذکرہ خاصی تفصیل سے " الفرقان " میں کیا جا چکا ہے اور اسی سلسلہ میں یہ بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ ماریشس کے دوستوں نے مجھے دراصل اگست میں بلایا تھا لیکن اس وقت پاسپورٹ ملنے میں دیر ہو جانے کی وجہ سے مقررہ تاریخ پر نہ جا سکا۔

پھر پاسپورٹ مل جانے کے بعد میں نے ستمبر میں وہاں جانے کا پروگرام بنایا۔

رابطۂ عالم اسلامی کے اجلاس کا دعوت نامہ بھی آچکا تھا جو ۱۰ اکتوبر سے مکہ معظمہ میں شروع ہونے والا تھا۔ میں نے طے کیا اور یہی اس وقت کے میرے حالات کا تقاضا تھا کہ میں ماریشس صرف ایک ہفتہ قیام کرکے واپس آجاؤں گا اور رابطہ کے اجلاس کے لئے ۱۰ اکتوبر میں دوبارہ سفر کروں گا، اسی حساب سے میں بمبئی پہنچا۔ میرے کاغذات چونکہ مکمل تھے اس لئے اطمینان تھا کہ پی۔ فارم ملنے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی اور میں جلدی ہی اپنے پروگرام کے مطابق ماریشس جاسکوں گا۔ لیکن پی۔ فارم کے مرحلہ میں میرے نزدیک بالکل بلاوجہ کئی دن صرف ہوگئے۔ اسکے بعد ایر انڈیا کے دفتر کے ایک کلرک کی غلطی اور ناواقفی کی وجہ سے میرے ۴-۵ دن مزید برباد ہوئے اور اس طرح جو ہفتہ میں نے ماریشس کے قیام کا سوچا تھا وہ بمبئی ہی میں ختم ہوگیا۔ قدرتی طور پر مجھے یہ تاخیر اس وقت بے حد ناگوار ہوئی تھی، اور مجھے یاد ہے کہ اسکی وجہ سے مجھے انتہائی کوفت اور میری طبیعت میں سخت جھنجھلاہٹ تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی کو میرے حق میں ایک بڑی رحمت اور بڑے لطف و کرم کا وسیلہ بنایا اور اس سے میرے لئے وہ "خیر عظیم" پیدا فرمایا جس کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا اور یہ قرآنی حقیقت واقعہ بن کر میرے سامنے آئی عَسٰی اَن تَکرَھُوا شَیئاً وَّیَجعَلَ اللّٰہُ فِیہِ خَیراً کَثِیراً ۔ ہوا یہ کہ میرا بنایا ہوا پروگرام سب غلط ہوگیا اور میں بجائے ستمبر کے شروع اکتوبر میں ماریشس پہنچ سکا۔ اسکے بعد وقت میں اتنی گنجائش نہیں رہی کہ میں ماریشس سے یہاں واپس آکر رابطہ کے لئے ازسرِنو دوسرا سفر کروں اس لئے مجھے وہیں سے براہ راست مکہ معظمہ کے لئے سفر کرنا پڑا۔ میرے پاس بمبئی سے ماریشس کا واپسی کا ٹکٹ تھا اور رابطہ کی طرف سے آیا ہوا بھی لکھنؤ سے جدہ کا واپسی ٹکٹ تھا۔ ماریشس سے براہ راست جدہ چلے جانے کی وجہ سے ماریشس سے بمبئی واپسی ٹکٹ کے حساب کی رقم ہوائی کمپنی کے ذمہ بچ گئی، پھر جدہ پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ یہ رقم اتنی ہے کہ اس سے بمبئی سے جدہ کا ایک اور واپسی ٹکٹ مل سکتا ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر اہلیہ کے ٹکٹ کا بھی کوئی انتظام کیا جاسکا تو میں ان کو ساتھ لے کر اس رقم سے انشاء اللہ اسی سال سفر حج

کرلوں گا اور چونکہ میں اپنا حج فرض پہلے ادا کرچکا ہوں اور یہ موقع اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم نے میرے وہم و گمان اور ارادہ و خیال کے بغیر بالکل "لاتحتسبی" طریقہ پر پیدا فرمایا ہے اس لئے اس کے اس لطف و کرم کے شکریہ میں یہ حج میں کسی ایسی ذات کی طرف سے کروں گا جس کی طرف سے حج کرنا اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہو۔

پھر اسی رب کریم کے لطف و کرم سے اہلیہ کے ٹکٹ کا بھی انتظام ہو گیا۔

اس کے بعد مرحلہ یہ تھا کہ ہم دونوں انٹرنیشنل پاسپورٹ ہی سے سفر کرسکتے تھے حج والے پاسپورٹ سے سفر کا ہمارے لئے کوئی امکان نہیں تھا اور صورت یہ تھی کہ میرے پاسپورٹ کی مدت ختم ہو چکی تھی اور اس میں توسیع کی ضرورت تھی اور اہلیہ کے لئے نیا پاسپورٹ حاصل کرنا تھا اور وقت میں گنجائش بہت ہی کم تھی۔ بعض سابقہ تجربوں کی بنا پر خطرہ تھا کہ اتنے تنگ وقت میں شاید پاسپورٹ حاصل ہی نہ ہو سکے لیکن یہاں بھی اللہ تعالیٰ کے خاص کرم سے بالکل خلاف توقع صرف ۳-۴ دن میں پاسپورٹ کا مرحلہ طے ہو گیا اور صاف معلوم ہوا کہ یہ صرف ارادۂ الٰہیہ کی کارفرمائی ہے۔

اس کے بعد ایک مشکل ترین مسئلہ یہ سامنے آیا کہ انٹرنیشنل پاسپورٹ سے سفر کرنے والوں کو صرف ۶۵ روپے لے جانے کی اجازت ہوتی ہے جو ہم جیسوں کے لئے جدّہ کے ہوائی اڈہ پر اترنے کے بعد مکہ معظمہ پہنچنے تک کے لئے بھی مشکل ہی سے کافی ہو سکتے ہیں اس مسئلہ نے اچھا خاصا تردد پیدا کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے دستگیری فرمائی اور میں نے اپنے دل سے کہا کہ اس سفر کا انتظام رب کریم نے میرے ارادہ بلکہ وہم و گمان کے بغیر محض اپنے لطف و کرم سے فرمایا ہے اس لئے اسی کے کرم پر بھروسہ کرکے چلنا چاہیئے۔ اور اپنا ہر مسئلہ اسی کے اوپر چھوڑ دینا چاہیئے۔ آخری بات یہ ہو کہ ضرورت پڑے گی تو جاننے والوں سے قرض لیں گے۔

اس فیصلہ کے بعد ہم لوگ بمبئی پہونچ گئے اور ۲۹ ر فروری کی صبح کو سعودی طیارہ سے روانہ ہو گئے جو ہر ہفتہ جمعرات کو بمبئی سے کراچی، ظہران اور ریاض ہوتا ہوا جدّہ جاتا ہے اور ظہر کے اوّل وقت جدہ کے ہوائی اڈہ پر اتر گئے۔

عام طور کر زمانۂ حج میں جدّہ اترنے والے مسافروں کو پاسپورٹ، ویزا، ڈاکٹری سارٹیفکٹ کی جانچ پڑتال اور سامان کی دیکھ بھال میں کئی کئی گھنٹے لگ جاتے ہیں اور یہ چیز اس وقت بڑی ذہنی کوفت کا باعث ہوتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے اس سے بھی محفوظ رکھا، میں نے اسی مقصد کے لئے رابطۂ عالم اسلامی کے جدّہ کے دفتر کو تار سے اطلاع دیدی تھی؛ وہاں سے ایک صاحب ہوائی اڈہ پر آگئے اور میں چند منٹ میں فارغ کر دیا گیا۔ اور وہی صاحب مجھے رابطہ کے دفتر لے گئے جس کی وساطت سے مجھے "بطاقۃ المجاملہ" (نقل وحرکت کی آزادی کا پاس) حاصل کرنا تھا، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ "بطاقہ" کے لیے میرے فوٹو کی دو کاپیوں کی ضرورت ہوگی جو پاسپورٹ کے فوٹو سے لی جا سکیں گی اسلیے کچھ دیر لگے گی، چنانچہ میں نے اپنا پاسپورٹ دفتر کے مدیر شیخ منانی کے حوالہ کر دیا انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ آپ کے لیے فلاں ہوٹل میں کمرہ محفوظ ہے۔ اور ڈرائیور سے کہا کہ وہ مجھے وہاں پہنچا دے۔ میں نے شکریہ ادا کرنے کے بعد اُن سے کہا کہ یہ سفر میں نے خالص حج کے لیے کیا ہے اس لیے میں اپنے قیام وغیرہ کا بار رابطہ پر ڈالنا پسند نہیں کروں گا ——— اُس کے بعد میں جدہ میں اپنے خاص عنایت فرما اور مستقل میزبان جناب عبد القادر نوردلی صاحب کے مکان پر آگیا۔ اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم سے وہاں گھر سے زیادہ راحتوں کے سامان تھے۔ رات بھی وہیں گزاری اور یکم مارچ کی صبح جبکہ وہاں ذی الحجہ کی دوسری تاریخ تھی اور جمعہ کا دن تھا مکہ معظمہ پہنچ گیا، مکہ کرمہ میں قیام کے لیے ایک نہایت مخلص عزیز صالح دہلوی صاحب نے بھی پہلے سے کہہ رکھا تھا اور اپنے مکان کا ایک حصہ انھوں نے میرے لیے خالی بھی رکھا تھا لیکن مختلف پہلوؤں پر غور کر کے میں نے مدرسہ صولتیہ میں (جو ہمارے شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ نور اللہ مرقدہٗ کی قیام گاہ رہا ہے۔) ٹھہرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

مجھے اندازہ تھا کہ ایام حج میں ہندوستان و پاکستان کے سیکڑوں حجاج جن میں خواص کی بھی اچھی خاصی تعداد ہوتی ہے صولتیہ میں قیام کرتے ہیں اسلیے بس گذارہ کی جگہ پر قناعت کرنا ہوگا اور اسکے لیے دل پوری طرح بلکہ خوشی کے ساتھ آمادہ ومطمئن تھا لیکن جب جمعہ کی صبح صولتیہ پہنچکر کار سے اترا تو معلوم ہوا کہ مدرسہ کے خاص دفتر کے اوپر ایک نیا

کمرہ اسی سال بنا ہے اور وہ میرے لیے محفوظ ہے۔ میں وہاں پہنچا تو رہائش ہی کے نہیں بلکہ آسائش کے بھی ضروری سامان موجود تھے، صراحی میں پینے کا پانی تک غالباً رات ہی کو بھر دا کر رکھ دیا گیا تھا۔ دو پلنگوں پر بستر لگے ہوئے تھے، الغرض وہ سب کچھ تھا جو راحت کے لیے ضروری تھا اور جس کا پہلے سے وہم و گمان بھی نہیں تھا۔

چونکہ اپنے بارے میں مجھے کوئی غلط فہمی نہیں تھی اس لئے میں نے یقین کے ساتھ سمجھا کہ جس رب کریم نے اس سفر کا انتظام اپنے خاص لطف و کرم سے بالکل لا یحتسب طریقہ پر فرمایا ہے اسی نے ہمارے مولانا شیخ محمد سلیم صاحب اور اُن کے سعادتمند فرزند برادرم مولوی محمد شمیم سے یہ انتظامات کرائے ہیں اللہ تعالیٰ ان حضرات کو ہماری طرف سے بہتر سے بہتر جزا دے اور دنیا و آخرت میں خاص الخاص انعامات سے نوازے۔

عرض کیا جا چکا ہو کہ یہ جمعہ کا دن تھا کمرہ میں سامان رکھنے کے بعد سیدھے مسجد حرام پہنچے۔ سب سے پہلے عمرہ کا طواف کیا، اسکے بعد سعی کی۔ عمرہ سے فارغ ہو کر جمعہ کی نماز حرم شریف میں ادا کر کے قیام گاہ پر آئے۔

میرے ایک مخلص دوست اور عنایت فرما قاری محمد سلیمان صاحب ہیں پہلی دفعہ ۱۹۶۳ء میں اور اس کے بعد ۱۹۶۵ء میں حج ہی کے زمانہ میں ان سے ملاقات ہوئی تھی اور مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ دونوں جگہ ان کا ساتھ رہا تھا اور ان کی عنایتوں نے دل کو بہت متاثر کیا تھا، وہ اب کچھ مدت سے مدرسہ صولتیہ کے بالکل قریب مکہ معظمہ ہی میں مقیم ہیں۔ میرے اس سفر کے انتظامات کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے انہی کو خاص وسیلہ بنایا، جب ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا قیام تو آپ نے صولتیہ میں کر لیا، یہی سب سے بہتر تھا، کھانا میرے یہاں سے آیا کرے گا اور اس سلسلہ میں کوئی معذرت قبول نہیں ہوگی۔ میں نے اسکو منجانب اللہ سمجھا اور خوشی کے ساتھ قبول کر لیا اور مکہ معظمہ کی پوری مدت قیام میں گویا اُن ہی کا مہمان رہا۔ اللہ تعالیٰ اپنی شان عالی کے مطابق ان عنایات کا بہتر سے بہتر صلہ ان کو عطا فرمائے۔

پھر جب مدینہ طیبہ جانے کا ارادہ کیا تو ایک مخلص ترین دوست اور دینی بھائی ڈاکٹر

اسماعیل مرچنٹ (جو کراچی کے رہنے والے ہیں لیکن اب کئی سال سے سعودی عربیہ میں سرکاری ڈاکٹر ہیں۔) اپنی کار سے مجھے مدینہ طیبہ لے گئے اور وہاں ڈیڑھ ہفتہ کے قیام کے بعد ایک دوسرے دوست بھائی محمد یوسف جو ہیں تو بمبئی کے لیکن اِدھر کئی سال سے کویت میں مقیم ہیں اور وہیں سے اپنی ذاتی کار لیکر حج پر آئے تھے وہ مجھے اپنے ساتھ مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ لے آئے۔ بلاشبہ یہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوا۔ اللھم کل ذالک منک وحدک لاشریک لک فلک الحمد ولک الشکر۔

مدینہ طیبہ میں ایک نہایت ہی عزیز دوست مولوی صوفی محمد اقبال ہوشیارپوری ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا اُن پر خاص فضل ہے مخدومنا شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم کے مجازین میں ہیں کئی سال ہوئے ہجرت کی نیت کرکے مدینہ طیبہ ہی کو اپنا مسکن بنالیا ہے۔ حج کے ایام میں وہ مکہ معظمہ میں ملے تو فرما گئے کہ میں مدینہ طیبہ پہنچ کر پہلے ان ہی کے پاس اتروں، میں نے ایسا ہی کیا اور ان کے تعلق کا یہ حق اور تقاضا تھا لیکن ارادہ تھا کہ ایک دو دن کے بعد اجازت لے کر کسی دوسری جگہ منتقل ہو جاؤں گا مگر وہ اُس پر راضی نہ ہوئے۔ ان کے مکان کے بالکل برابر میں ایک دوسرے دوست حاجی عبدالعزیز صاحب لائل پوری کا مکان تھا انھوں نے اُنہیں ہمارے قیام کا انتظام کر دیا اور مدینہ طیبہ کے پورے زمانہ قیام میں اپنا ہی مہمان بنائے رکھا۔ میں نے اس کو بھی یہی سمجھا کہ یہ اسی رب کریم کی طرف سے ہو جس کے لطف و کرم نے یہ سفر اس طرح کرایا ہے۔ الغرض اس طرح پورے سفر مبارک میں اللہ تعالیٰ کے الطاف بارش کی طرح برستے رہے اور مجھے بار بار یہ یاد آتا رہا کہ اللہ تعالیٰ نے ماریشس والے سفر میں جبری تاخیر کرا کے (جو اس وقت میرے لیے سخت ناگوار اور انتہائی تکلیف دہ تھی) اس سفر کا سامان فرمایا لہٰذا اُس میں قدم قدم پر اُن عنایات اور انعامات سے نوازا جن کا تصور بھی مجھے نہ تھا۔ بے شک حق ہے۔

"عسیٰ ان تکرھوا شیئاً ویجعل اللہ فیہ خیراً کثیراً"

ایک وضاحت:-

"معارف الحدیث جلد چہارم" میں زکوٰۃ کے بیان میں نصاب زکوٰۃ سے متعلق صحیحین کی

مشہور حدیث درج کی گئی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ ـــ دو سو درہم سے کم چاندی میں اور ۵ وسق (تقریباً [illegible]) سے کم کھجوروں میں اور اسی طرح ۵ راس سے کم اونٹوں میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

پھر اس حدیث کی تشریح کے ضمن میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ کہ ۵ وسق کھجور، دو سو درہم بھر چاندی اور ۵ راس اونٹوں کی مالیت اتنی ہوتی تھی کہ ایک مختصر گھرانے کا سال بھر کا خرچ اس سے چل سکتا تھا، اس لیے ایسے شخص کو جس کے پاس سال پورا کرنے کے بعد اتنا محفوظ ہو خوشحال اور صاحب مال قرار دے کر وجوب زکوٰۃ کا حکم کیا گیا۔

پھر اس پر ایک مختصر حاشیہ لکھا گیا تھا جس میں فی زمانا روپیہ کی قیمت اور مالیت میں بہت زیادہ کمی ہو جانے کی بنا پر زکوٰۃ کے کم سے کم نصاب پر غور کرنے کے لیے حضرات علمائے کرام سے عرض کیا گیا تھا۔

بعض حضرات نے اس حاشیہ سے میرا مطلب یہ سمجھا کہ اس زمانہ میں معاشی حالات میں جو تبدیلیاں ہو گئی ہیں ان کی وجہ سے نصاب زکوٰۃ کی منصوص مقادیر پر از سر نو غور کرنے کی [illegible] علماء کرام کو دعوت دے رہا ہوں اور ان میں کسی ترمیم و تبدیلی کی گنجائش سمجھتا ہوں ـــ

یہ بات کبھی میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقرر کی ہوئی اس طرح کی حدود و مقادیر میں تبدیلی و ترمیم کا حق امت کے کسی ادارہ یا طبقہ کو ہرگز نہیں دیا جا سکتا۔

دراصل میں نے اس حاشیہ کے ذریعہ حضرات علماء کرام کو اس صورت حال پر غور کرنے کی دعوت دینا چاہا تھا کہ ہمارے اس زمانہ میں لوگوں کے پاس دولت یا تو نوٹوں کی شکل میں ہوتی ہے یا بضائع اور تجارتی اموال کی شکل میں، اور اب چاندی، سونے اور سوائم (اونٹوں وغیرہ) کے منصوص نصابوں کی مالیت میں وہ یکسانی باقی نہیں رہی ہے جس کا ذکر حضرت شاہ ولی اللہؒ نے کیا ہے، بلکہ بہت بڑا فرق ہو گیا ہے، تو اس صورت میں یہ مسئلہ علماء کرام کے غور و فکر کا مستحق ہے کہ کس نصاب کی مالیت کو معیار قرار دے کر زکوٰۃ کے وجوب یا عدم وجوب کا فیصلہ کیا جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ منصوص دائرہ سے باہر کی چیز ہے۔ بہرحال میرا مقصد اس صورت حال

کی طرف توجہ دلا کر غور و فکر کی دعوت دینا تھا ۔ میں یہ بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اس طرح کے مسائل میں انفرادی فتوؤں کے بجائے حتی الامکان اجتماعی اور شورائی فیصلے ہونے چاہئیں ۔

میں نے اب غور سے دیکھا تو مجھے اعتراف ہے کہ میرے حاشیہ کے الفاظ میرا یہ مقصد ادا کرنے کے لیے ناکافی ہیں اور اگر کسی کو غلط فہمی ہوئی تو اس کی ذمہ داری میری تعبیر کے قصور اور ابہام پر بھی ہے ۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل ۔

——— محمد منظور نعمانی

کتاب الدعوات

معارف الحدیث

(مسلسل)

جامع اور ہمہ گیر دعائیں:-

[اس عنوان کے تحت احادیث دو قسطوں میں پہلے پیش کی جا چکی ہیں یہ تیسری قسط ہے]

عَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَلِّمُنَا اَنْ نَقُوْلَ "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ الثَّبَاتَ فِی الْاَمْرِ وَاَسْأَلُكَ عَزِيْمَةَ الرُّشْدِ وَاَسْأَلُكَ شُكْرَ نِعْمَتِكَ وَحُسْنَ عِبَادَتِكَ وَاَسْأَلُكَ لِسَانًا صَادِقًا وَّقَلْبًا سَلِيْمًا وَّاَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا تَعْلَمُ وَاَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا تَعْلَمُ وَاَسْتَغْفِرُكَ مِمَّا تَعْلَمُ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ.

رواہ الترمذی والنسائی

حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں تعلیم فرماتے تھے کہ ہم دعا میں اللہ تعالیٰ سے یوں عرض کیا کریں۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ الثَّبَاتَ فِی الْاَمْرِ..... تا ..... اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ۔

(اے اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے استقامت اور ثابت قدمی دین کے معاملہ میں اور طلب کرتا ہوں اعلیٰ صلاحیت اور سوجھ بوجھ میں پختگی، اور تیری نعمتوں کے شکر کی اور حسن عبادت کی توفیق، اور طالب ہوں تجھ سے لسان صادق اور

قلب سلیم کا، اور تیری پناہ چاہتا ہوں ہر اس شر سے جس کا تجھے علم ہے اور سائل ہوں ہر اس خیر اور بھلائی کا جو تیرے علم میں ہے۔ اور معافی اور مغفرت چاہتا ہوں اپنے ان سب گناہوں سے جو تجھے معلوم ہیں، تو ساری پوشیدہ باتوں کو بھی خوب جانتا ہے۔ (جامع ترمذی، سنن نسائی)

(تشریح) اس دعا کے ایک ایک جز پر غور کیجئے، یہ ان تمام مقاصد پر حاوی ہے جو ایک مومن کو عزیز ہونے چاہئیں۔ اسی حدیث کو ابن عساکر نے بھی روایت کیا ہے اس کے آخر میں یہ اضافہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کو یہ دعا تلقین کرنے کے بعد فرمایا کہ

"اے شداد بن اوس جب تم دیکھو کہ لوگ سونے اور چاندی کو بطور خزانے کے جمع کرتے ہیں تو تم اس دعا کو اپنا خزانہ سمجھو۔"

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَجُلاً قَالَ يَا رَسُوْلَ اللهِ سَمِعْتُ دُعَاءَكَ اللَّيْلَةَ فَكَانَ الَّذِیْ وَصَلَ اِلَیَّ مِنْهُ اَنَّكَ تَقُوْلُ "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ ذَنْبِیْ وَوَسِّعْ لِیْ فِیْ دَارِیْ وَبَارِكْ لِیْ فِيْمَا رَزَقْتَنِیْ" قَالَ فَهَلْ تَرَاهُنَّ تَرَكْنَ شَيْئًا — رواه الترمذی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ رات میں نے آپ کو دعا کرتے سنا۔ اس دعا میں سے یہ الفاظ مجھے پوری طرح پہونچے، آپ اللہ تعالیٰ سے عرض کر رہے تھے "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ ذَنْبِیْ ... تا ... وَبَارِكْ لِیْ فِيْمَا رَزَقْتَنِیْ" (اے اللہ میرے گناہ معاف فرما دے اور میرے لیے میرے گھر میں وسعت عطا فرما اور جو رزق مجھے عطا فرمایا ہے اس میں میرے لیے برکت دے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے دیکھا ان مختصر لفظوں نے کچھ بھی چھوڑا۔ (جامع ترمذی)

تشریح: اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس بندے کے رزق میں برکت دی جائے، اس کو

رہنے بسنے کے لیے ایسا مکان عطا ہو جس کو وہ اپنے لیے کافی سمجھے اور اس میں وسعت محسوس کرے اور آخرت کے لیے اس کی لغزشوں گناہوں کی مغفرت اور معافی کا فیصلہ ہو جائے تو اس کو سب ہی کچھ مل گیا ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری جملہ (ھل تراھن تترکن شیئاً) کا مطلب یہی ہے کہ بندہ کو جو کچھ چاہیے وہ اس مختصر سی دعا میں سب آگیا ہے، چھوٹے چھوٹے ان تین کلموں نے کچھ بھی نہیں چھوڑا ہے۔

عَنْ طَارِقٍ الْاَشْجَعِیِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاَتَاہُ رَجُلٌ فَقَالَ کَیْفَ اَقُوْلُ حِیْنَ اَسْاَلُ رَبِّیْ قَالَ قُلْ "اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ وَعَافِنِیْ وَارْزُقْنِیْ" وَجَمَعَ اَصَابِعَہُ الْاَرْبَعَ اِلَّا الْاِبْھَامَ، فَاِنَّ ھٰؤُلَاءِ یَجْمَعْنَ لَکَ دِیْنَکَ وَدُنْیَاکَ۔

——— ——— رواہ ابن ابی شیبہ

حضرت طارق اشجعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص آیا اور اس نے پوچھا کہ مجھے بتا دیجئے کہ جب میں اپنے پروردگار سے مانگوں تو کس طرح عرض کروں اور کیا عرض کروں۔ آپ نے فرمایا یوں عرض کیا کرو "اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ وَعَافِنِیْ وَارْزُقْنِیْ" (اے اللہ میرے گناہ معاف فرما دے اور مجھے بخش دے، مجھ پر رحمت فرما، مجھے عافیت اور آرام چین نصیب فرما اور مجھے روزی عطا فرما) اس کے بعد آپ نے اپنے ہاتھ کی چاروں انگلیاں ملا کے ہم کا اشارہ کیا اور فرمایا کہ یہ چار کلمے تیری دینی اور دنیوی ساری ضرورتوں پر حاوی ہیں۔ (مصنف ابن ابی شیبہ)

(تشریح) بلاشبہ جس کو دنیا میں بقدر ضرورت روزی اور چین و آرام اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو جائے اور آخرت میں اس کے لیے مغفرت اور رحمت کا فیصلہ ہو جائے اسے سب کچھ مل گیا ـــ یہ دعا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم فرمائی ہوئی نہایت جامع اور مختصر دعاؤں میں سے ہے۔

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ جب کوئی شخص اسلام لاتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اس کو نماز کی تعلیم فرماتے اور اس دعا کی تلقین فرماتے۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ وَارْحَمْنِيْ وَاهْدِنِيْ وَعَافِنِيْ وَارْزُقْنِيْ ـ

عَنِ ابْنِ عُمَرَ (مَرْفُوْعًا) اَللّٰهُمَّ عَافِنِيْ فِيْ قُدْرَتِكَ وَاَدْخِلْنِيْ فِيْ رَحْمَتِكَ وَاقْضِ اَجَلِيْ فِيْ طَاعَتِكَ وَاخْتِمْ لِيْ بِخَيْرِ عَمَلِيْ وَاجْعَلْ ثَوَابَهُ الْجَنَّةَ ـــــــــ (رواه البیہقی فی السنن)

حضرت عبداللہ بن عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے۔ "اَللّٰهُمَّ عَافِنِيْ .... تا .... وَاجْعَلْ ثَوَابَهُ الْجَنَّةَ (اے اللہ مجھے اپنی قدرت سے عافیت عطا فرما اور مجھے اپنی رحمت کے سایہ میں لے لے اور میری زندگی اپنی طاعت و عبادت میں پوری کرا دے (یعنی میں زندگی کے آخری لمحہ تک تیری طاعت و عبادت کرتا رہوں) اور میرے بہترین عمل پر میرا خاتمہ فرما اور اس کے صلہ میں مجھے جنت عطا فرما)۔ (سنن کبریٰ بیہقی)

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ (مَرْفُوْعًا) اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْاَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ وَرَحْمَتِكَ فَاِنَّهٗ لَا يَمْلِكُهُمَا اِلَّا اَنْتَ ـــــــ (رواه الطبرانی فی الکبیر)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے "اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْاَلُكَ ..... تا ..... اِلَّا اَنْتَ" (اے اللہ میں تجھ سے تیرا فضل اور تیری رحمت مانگتا ہوں، بس تو ہی فضل و رحمت کا مالک ہے)۔ (معجم کبیر طبرانی)

(تشریح) اسی سلسلۂ معارف الحدیث میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو دنیوی اور مادی نعمتیں نصیب ہوں ان کو قرآن و حدیث کی زبان میں فضل سے تعبیر کیا جاتا ہے اور روحانی و اُخروی نعمتوں کو رحمت سے۔ اس بنا پر اس دعا کا مطلب یہ ہوا کہ اے اللہ دنیوی و اُخروی اور مادی و روحانی سب نعمتوں کا مالک تو ہی ہے، تیرے سوا کوئی نہیں، جو کچھ بھی دے سکے اس کے لیے میں تجھ ہی سے دونوں قسم کی نعمتوں کا طالب و سائل ہوں۔

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ (مرفوعاً) اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ عِیْشَةً نَقِیَّةً وَ مِیْتَةً سَوِیَّةً وَ مَرَدًّا غَیْرَ مُخْزِیٍ وَلَا فَاضِحٍ ۔

ــــــــ رواہ البزار والحاکم والطبرانی فی الکبیر

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے " اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ ..... تا ..... وَلَا فَاضِحٍ " (اے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں پاک صاف زندگی اور ڈھنگ کی موت (جس میں کوئی بدنمائی نہ ہو) اور (اصلی وطن آخرت کی طرف) ایسی مراجعت جس میں رسوائی اور فضیحت نہ ہو۔) (مسند بزار، مستدرک حاکم، معجم کبیر طبرانی)

(تشریح) آدمی کے لیے تین ہی مرحلے ہیں، ایک اس دنیا کی زندگی کا مرحلہ، دوسرا موت کا مرحلہ اور تیسرا دار آخرت کا مرحلہ، اس مختصر دعا میں تینوں مرحلوں کے لیے بڑے سادہ انداز میں بہترین دعا موجود ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ (مَرْفُوعاً) اَللّٰھُمَّ انْفَعْنِیْ بِمَا عَلَّمْتَنِیْ وَعَلِّمْنِیْ مَا یَنْفَعُنِیْ وَزِدْنِیْ عِلْماً اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی كُلِّ حَالٍ وَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ حَالِ اَهْلِ النَّارِ ــــــــ رواہ الترمذی وابن ماجہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی " اَللّٰھُمَّ انْفَعْنِیْ ..... تا ..... وَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ حَالِ اَهْلِ النَّارِ " (اے اللہ جو کچھ علم تو نے مجھے عطا فرمایا اس کو میرے لیے نفعمند بنا دے (یعنی مجھے اس پر عمل کرنے کی توفیق دے) اور مجھے وہ علم عطا فرما جو میرے لیے نافع ہو اور میرے علم میں اضافہ فرما، اللہ کے لیے حمد و ستائش ہے ہر حال میں اور میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں دوزخیوں کے حال سے) (جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

عَنِ ابْنِ عُمَرَ (مَرْفُوعاً) اَللّٰھُمَّ لَا تَكِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ طَرْفَةَ عَیْنٍ وَلَا تَنْزِعْ مِنِّیْ صَالِحَ مَا اَعْطَیْتَنِیْ ــــــــ رواہ البزار

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا

روایت کی ہے "اَللّٰهُمَّ لَا تَكِلْنِيْ ...... تا ...... مَا اَعْطَيْتَنِيْ" (اے اللہ مجھے پل بھر کے

لیے میرے نفس کے حوالہ نہ کر، اور جو کوئی اچھی چیز، (اچھا عمل یا اچھا حال) تو نے

مجھے عطا فرمایا ہے اس کو مجھ سے واپس نہ لے) (مسند بزار)

(تشریح) بندوں کے پاس جو کچھ خیر ہے وہ صرف اللہ کی توفیق اور اس کی عطا سے ہے، اگر اللہ تعالیٰ ایک لمحہ کے لیے بھی نگاہِ کرم پھیر لے اور بندہ کو اس کے نفس کے حوالے کر دے تو وہ محروم ہو کے رہ جائے گا۔ اس لیے ہر عارف بندہ کے دل کی یہ صدا ہوتی ہے کہ اے اللہ ایک لمحہ کے لیے مجھے میرے نفس کے حوالہ نہ کر، ہر دم میری نگرانی اور مجھ پر نظرِ کرم فرما۔

عَنْ عَائِشَةَ (مَرْفُوْعًا) اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ اَوْسَعَ رِزْقِكَ عَلَيَّ عِنْدَ كِبَرِ سِنِّيْ وَانْقِطَاعِ عُمُرِيْ" ——— رواہ الحاکم

اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دُعا روایت کی ہے "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ ...... تا ...... وَانْقِطَاعِ عُمُرِيْ" (اے اللہ میرے بڑھاپے کے دنوں میں اور میری عمر کے آخری حصہ میں میری روزی میں زیادہ سے زیادہ وسعت فرما) (مستدرک حاکم)

(تشریح) بڑھاپے میں اور عمر کے آخری حصہ میں رزق کی تنگی زیادہ تکلیف دہ ہو سکتی ہے۔ کیونکہ آدمی اس وقت دوڑ بھاگ اور جد و جہد کے قابل نہیں ہوتا، علاوہ ازیں وہ موت کے قرب کا زمانہ ہوتا ہے، اور ہر مومن کی آرزو یہ ہونی چاہیئے کہ اس زمانہ میں آدمی اللہ کی یاد اور آخرت کی تیاری کے لیے دوسری تمام فکروں سے فارغ اور آزاد ہو، اس لیے یہ مسنون دُعا ہر مومن کے دل کی دھڑکن ہونی چاہیئے۔ "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ اَوْسَعَ رِزْقِكَ عَلَيَّ عِنْدَ كِبَرِ سِنِّيْ وَانْقِطَاعِ عُمُرِيْ"۔

عَنْ اَنَسٍ (مَرْفُوْعًا) اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ خَيْرَ عُمُرِيْ آخِرَهٗ وَخَيْرَ عَمَلِيْ خَوَاتِمَهٗ وَخَيْرَ اَيَّامِيْ يَوْمَ اَلْقَاكَ فِيْهِ۔

——— رواہ الطبرانی

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دُعا روایت

کی ہے "اللّٰھُمَّ اجْعَلْ خَیْرَ عُمُرِیْ آخِرَہٗ ...... تا ...... یَوْمَ اَلْقَاکَ فِیْہِ" (اے اللہ میرے عمر کے آخری حصہ کو میری زندگی کا بہترین حصہ کر دے اور میرے آخری عمل میری زندگی کے بہترین عمل ہوں، اور میرا سب سے اچھا دن وہ ہو جو تیرے حضور میں میری حاضری کا دن ہو) (معجم کبیر طبرانی)

عَنْ عَائِشَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہَا (مَرْفُوْعًا) اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ الَّذِیْنَ اِذَا اَحْسَنُوْا اسْتَبْشَرُوْا وَاِذَا اَسَاؤُا اسْتَغْفَرُوْا۔

رواہ ابن ماجہ والبیہقی فی شعب الایمان

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرمایا کرتے تھے "اللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ ...... تا ...... اِسْتَغْفَرُوْا" (اے اللہ مجھے ان بندوں میں سے کر دے جن کا حال یہ ہو کہ جب کوئی اچھا اور نیکی کا کام کریں تو انھیں دلی خوشی ہو اور جب ان سے کوئی برائی ہو جائے تو انھیں (رنج ہو) اور وہ اللہ سے استغفار کریں اور معافی چاہیں۔ (سنن ابن ماجہ، شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) کسی بندہ کی سعادت اور اللہ کی نگاہ میں مقبولیت کی یہ خاص پہچان ہے کہ جب کسی اچھے کام کی توفیق ملے تو دل کو خوشی ہو اور اندر ایک نورانیت محسوس ہو، اور جب کوئی لغزش ہو جائے تو اندر ظلمت محسوس ہو اور اس کی وجہ سے رنج اور دکھ ہو اور پھر ندامت و استغفار ہو۔ اس دعا میں اللہ تعالیٰ سے یہی چیز مانگی گئی ہے۔ کتنے مختصر الفاظ میں کتنی عظیم نعمت مانگ لی گئی ہے!۔

یک دو ساعت صحبتے با اہلِ دل

مجلس حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی مدظلہ العالی

(مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

(پانچویں مجلس)

(۲۳ر شوال ۸۸ھ مطابق ۲۴ر جنوری ۶۹ء خانقاہ شریف بھوپال، حاضرین مجلس بکثرت وقت ۱۰ ½ بجے سے ۱۲ بجے تک)

فرمایا، میں آپ کے آنے سے پہلے ابھی تلاوت میں سورہ زمر پڑھ رہا تھا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ تنزیل الکتاب من اللہ العزیز الحکیم۝ انا انزلنا الیک الکتاب بالحق فاعبد اللہ مخلصا لہ الدین۝ الا للہ الدین الخالص۔ بس انہیں الفاظ پر ٹھٹھک کر کھڑے ہو جانے کو جی چاہتا ہے، ان مختصر الفاظ میں کیا کچھ فرما دیا گیا ہے۔ ایک ناواقف آدمی بیج دیکھتا ہے، اس میں اس کو کچھ نظر نہیں آتا، لیکن واقف آدمی اس کو دیکھ کر اس کے اندر پورا تناور درخت دیکھ لیتا ہے۔ اس کی بیسوں شاخیں، اس کے ہزاروں، لاکھوں پتے اس کے سیکڑوں پھل، سب اس کو نظر آجاتے ہیں، کہ یہ سب اسی چھوٹے سے خول میں ہیں،

لہ اس کتاب کو اتارا جانا اللہ عزیز و حکیم کی طرف سے ہوا ہے (اے پیغمبر) ہم نے یہ کتاب تمہاری طرف سچائی کے ساتھ نازل کی ہے، پس خدا کی عبادت کرو۔ اسی کے لیے عبادت خالص کر کے، خبردار، خالص عبادت خدا ہی کا حق ہے۔ "الفرقان"

مگر اس دین اور اس قرآن کی قدر تو انھیں لوگوں کو تھی، جنھوں نے اس کو بیابانوں کی خاک چھان کر اور حق کی تلاش میں سرگرداں رہ کر پایا تھا، ان میں سے بعض بعض ایسے تھے جو یہودیوں کی عبادت گاہوں، عیسائیوں کے کلیساؤں میں دین حق کی تلاش کے لیے گئے، اور وہاں کے عابدوں، اور راہبوں نے کہا کہ ہم تو اپنے چلتے ہوئے راستہ، اور روایتی دین پر ہیں، دین حق تو آنے والا ہے پھر جب ان کو اپنا گوہر مقصود نہ ملا، اور ان کا اخیر وقت آگیا تو انھوں نے بڑی حسرت سے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا "خدایا تو گواہ رہ کہ ہم اس دین حق کو مانتے ہیں، جو آنے والا ہے، اور ہم دین ابراہیمی پر جان دے رہے ہیں۔"

اس کی ایک چھوٹی سی مثال یوں سمجھیے کہ مئی جون کا روزہ ہو، آپ کی زبان خشک ہو، اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوں، آفتاب غروب ہونے والا ہو، آپ کسی ضرورت سے کسی کام کے لیے موٹر پر بیٹھ کر جائیں اور وہ کسی میدان میں پہونچ کر جہاں دور دور پانی نہ ہو فیل ہو جائے، اب افطار کا وقت آجائے اور پانی کا کہیں نام و نشان نہ ہو، اس وقت اگر آپ کو کوئی ایک گلاس پانی پیش کرے، تو آپ کی نگاہ میں اس کی کیا قیمت ہوگی، اور آپ اس کو کیسی بڑی نعمت اور آب حیات سمجھیں گے، دوسری مثال یوں سمجھیے کہ کسی شخص نے کسی عامی آدمی سے کہا کہ جو کلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا، وہ بجنسہ استنبول کے کتب خانہ میں موجود ہے، وہ شخص اسی وقت اس کی زیارت کے لیے رخت سفر باندھ لیتا ہے، ہزار دقتوں سے اس کو پاسپورٹ اور ویزا ملتا ہے، پھر سمندر کے سفر کی کلفتیں، اور مصارف، غرض وہ سراپا اشتیاق بنا ہوا قسطنطنیہ کے ساحل پر اترتا ہے، جس وقت اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اس سرزمین پر ہے جہاں وہ کلام موجود ہے جو خدا کے آخری رسول پر نازل ہوا تھا، وہ پھولے نہیں سماتا، وہ اپنی قسمت پر ناز کرتا ہے، اور اس پر ایک عالم بے خودی طاری ہو جاتا ہے، پھر وہ ہمہ تن شوق و انتظار بنا ہوا اس کتب خانہ کے دروازہ پر پہونچتا ہے، جہاں یہ گوہر نایاب موجود ہے، اب آپ ہی اندازہ کیجیے کہ وہ کن نگاہوں سے اس کو دیکھے گا، کن ہاتھوں سے اس کو مس کرے گا، اور اس کی یہ تمنا پوری ہوگی تو اس کا کیا حال ہوگا، اس لیے کہ اس نے اس کے لیے اتنا طویل سفر اختیار کیا، اور بڑی سے بڑی مشقتیں برداشت کیں، اب اس کی مراد پوری ہونے کا وقت

آیا، یہی کلام الٰہی ہے جس کو ہم پانچ روپے، دس روپے خرچ کر کے بازار سے لے آتے ہیں۔ آج قرآن مجید کے ان نسخوں سے مسجدوں کے طاق بھرے ہوئے ہیں اور کسی کو ان کی قدر و قیمت معلوم نہیں، ایک بزرگ فرماتے تھے کہ جب چھاپہ خانہ نکلا، اور قرآن مجید کی طباعت کا سلسلہ شروع ہوا، تو ایک بزرگ نے فرمایا، کہ میں نے قرآن کو اُٹھتے ہوئے دیکھا ہے، سارا معاملہ اہمیت، اور قدر و قیمت کا ہے، میں ایک رئیس کو جانتا ہوں، ایک صاحب نے عرض کیا کہ میں حج کو جا رہا ہوں، کوئی خاص توجہ نہیں ہوئی، پانچ دس روپے دے دیے، کسی نے ذکر کیا کہ ایک صاحب ولایت جانے والے ہیں، ان کو بلایا، استقبال کیا، اور بغیر انکی طلب ضرورت کے دو ہزار روپے پیش کر دیے، اصل یہ ہے کہ جس چیز کو آدمی دماغ میں پرورش کرتا ہے، وہی تناور درخت بن کر اپنے وقت پر پھل دینے لگتا ہے، درخت کی آدمی پرورش کرے، اور جب وہ پھول پھل دینے لگے تو اس پر اعتراض کرے یا تعجب، یہ کوئی عقل کی بات نہیں، یہی قرآن شریف ہے جس کی ایک آیت سُن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اونٹ سے گر گئے ایسے بیمار پڑے کہ کئی روز تک لوگ ان کی عیادت کو آتے رہے، یہی قرآن شریف ہے، جو ہم پڑھتے ہیں اور کچھ اثر نہیں ہوتا، ہماری اور قرآن کی مثال ایسی ہے، جیسے کسی شخص کے پاس کوئی آئینہ ہو، مدت سے وہ اس کے پاس رکھا ہوا ہے، لیکن وہ ہمیشہ اس کو اُلٹا کر کے دیکھتا ہے، اور اس کو کچھ نظر نہیں آتا، مشائخ مجاہدات کراتے ہیں، مراقبات بتاتے ہیں، مرغوبات چھڑاتے ہیں، انبیاء نے مراقبہ نہیں بلکہ مشاہدہ کرایا ہے، وہ صرف یہ کہتے ہیں، کہ آئینہ کو سیدھا کر کے دیکھو سب کچھ نظر آجائے گا "یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ و لتنظر نفس ما قدمت لغد" بس یہی آئینہ کو سیدھا کر کے دیکھنے کی تعلیم ہے۔

میرے ایک استاد تھے جن سے میں عربی زبان کی ابتدائی کتابیں پڑھتا تھا۔ ایک دن مجھے ایک کتاب کی فرہنگ اور شرح مل گئی، جس میں پوری کتاب کو حل کر دیا تھا، میں خوش

لہ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ہر نفس دیکھے اور سوچے کہ اُس نے آنے والے دن کے لیے (روز قیامت کے لیے) کیا کیا ہے؟ الفرقان

خوشی اس کو اپنے استاد کے پاس لے گیا، انھوں نے اس کو اٹھا کر پھینک دیا، میں نے کہا کیا ارشاد کہ اس میں کچھ غلطی ہے؟ کہنے لگے کہ غلطی؟ یہ اول سے آخر تک غلط ہے، کہنے لگے سب سے بڑی غلط بات یہ ہے کہ اس میں وہ لکھا ہے جو ہم بھی نہیں جانتے، ایسی کتاب کے ہوتے ہوئے ہم کو کون پوچھے گا، اور ہمارے پاس کون پڑھنے کو آئے گا۔ بس یہی قرآن مجید کا معاملہ ہے کہ وہ سب سے مستغنی کر دیتا ہے، لوگ کہتے ہیں کہ قرآن پاک کے لیے اتنے علوم درکار ہیں، ہم کہتے ہیں کہ جہالت درکار ہے، حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس راہ میں جہالت ذکاوت کا کام دیتی ہے، اس علم کا قاعدہ ہے کہ پڑھا تو قاعدہ سے جاتا ہے، پھر اس قاعدہ کو بھول کر اپنی اس طبعی روشنی سے جو اس علم سے حاصل ہوئی، کام لیا جاتا ہے، طب میں بھی یہی ہوتا ہے، اگر وہ روشنی یا ملکہ پیدا نہ ہو تو آدمی کچھ کام نہیں کر سکتا، اسلام جذبات کو مارنے اور آزادی کو سلب کرنے کی تعلیم نہیں دیتا، صرف ان کا وقت و محل بتاتا ہے، ہر چیز اپنے وقت پر سجتی اور زیب دیتی ہے۔

ریاست کروائی میں ایک مرتبہ نواب صاحب نے ایک صاحب کا تعارف کروایا، کہ یہ ڈاکٹر پنڈت یا صاحب ہیں، یہ کچھ سوال کرنا چاہتے ہیں، میں نے کہا کہ میں طالب علم ہوں، کوئی عالم نہیں ہوں، اگر جواب نہ دے سکوں تو یہ نہ کہیئے گا کہ میں نے ایک مسلمان عالم سے کچھ باتیں پوچھیں، وہ جواب نہ دے سکے، انھوں نے کہا کہ عرض کرنا یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کے وقت دنیا کے تعلقات کو الگ کر کے اللہ سے قرب حاصل کرتے ہیں، عیسائی گرجوں میں، ہندو مندروں میں اور مسلمان مسجدوں میں ان سب تعلقات سے الگ ہو کر اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور اس کا قرب تلاش کرتے ہیں، میں نے سنا ہے کہ آپ کے یہاں اعتکاف کا بھی طریقہ ہے، جس میں تمام تعلقات دنیاوی سے کچھ دیر کے لیے علیحدگی ہو جاتی ہے، یہ کیا طریقہ ہے کہ جنت میں شراب بھی ہے، حوریں بھی ہیں، اور اللہ کا قرب بھی، یہ تو دنیا میں بھی نہ ہوتا تھا، اور شراب تو ایسی بری چیز ہے کہ اس کا تو اس موقع پر قرآن شریف میں ذکر بھی نہ ہوتا تو اچھا تھا۔

میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب، میں آپ کے سوال سے بہت خوش ہوا، میں غور

اور تحقیق کرنے والوں سے بہت خوش ہوتا ہوں، جمود مجھے پسند نہیں، مگر میں آپ سے ایک بات
پوچھتا ہوں، آپ چونکہ ڈاکٹر بھی ہیں، اس لیے اور سہولت ہے، میں نے کہا کر ہمارے حکماء
بڑے بڑے قدحے پلاتے ہیں، لیکن ان میں وہ اثر نہیں ہوتا، جو آپ کی چھوٹی سی گولی میں
اثر ہوتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ آپ ہی بیان کریں گے، کہ اس گولی میں دوا کا
جوہر آگیا ہے، اور جتنا کسی چیز کا جوہر نکالا جاتا ہے، اور فاضل اجزاء کم کر دئیے جاتے
ہیں، طاقت بڑھتی جاتی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ انسان سب میں اشرف المخلوقات مانا
جاتا ہے، اور سب اشیاء اسی کے لیے پیدا کی گئی ہیں، انسان کامل کسے کہیں گے۔؟
اسی کو نا! جس میں کمالات انسانی مکمل طور پر موجود ہوں، لولا، لنگڑا، اندھا، اپاہج نہ ہو، اب یہ عرض
ہے کہ موت کے ذریعہ انسان کے ارضی اجزاء تو الگ ہو جاتے ہیں، اور اس کا جوہر رہ جاتا ہے، اس
سے اس کی قوت بہت بڑھ جاتی ہے، اور اس کے سب کمالات اور طاقتیں ترقی کر جاتی ہیں،
اب یہ تمام طاقتیں اور کمالات جنت میں موجود ہوں، اور محلِ صرف نہ ہو، تو یہ رحمت ہے
یا عذاب؟ کسی کو تخت حکومت و خزانہ، اور گھر کے لوگ دیے گئے ہوں، اور کہہ دیا جائے
کہ خبردار نظر اٹھا کر نہ دیکھنا، تو یہ اس کے حق میں رحمت ہے، یا اچھی خاصی سزا؟ یہی جنت
کی ان نعمتوں کی حقیقت و حکمت ہے، آپ جو بار بار شراب کو دہرا رہے ہیں، تو آپ کی کون
سی دوا شراب سے خالی ہے، محل بدل گیا، تو وہ اب اچھی چیز بن گئی، اور اس سے صحت
ہونے لگی، تو اس پر وہ خاموش ہو گئے۔

فرمایا مجھے بحث و مناظرہ کا یہی طریقہ پسند ہے، کہ بغیر دل آزاری، اور ضد و نفسانیت
کو ابھارنے والی باتوں سے پرہیز کرتے ہوئے اپنی بات سمجھانے، اور دل نشین کرنے
کی کوشش کی جائے، مناظرہ کا وہ طرز پسند نہیں جس کو "دندان شکن" کہا جاتا ہے، مع

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

فرمایا! مقصدِ تخلیق کو بھلا کر ایک ایسی تعلیم میں منہمک ہونا جو موت کے بعد کی زندگی میں کام آنے والی نہیں، لوگ بڑی عقلمندی اور ترقی سمجھتے ہیں۔ اس تعلیم میں کوئی حرج نہیں، ضرورت کے لحاظ سے اس کو اختیار کیا جا سکتا ہے، مگر اس کو کمال اور ترقی سمجھنا بے جا ہے، پاخانہ جانا ضروری کام ہے، مگر وہاں بیٹھ کر کوئی یہ نہیں کہتا کہ نعمت خانہ میں بیٹھا ہوں۔ کل ایک بچے نے دل خوش کر دیا، اس سے پوچھا، میاں کیا کر رہے ہو؟ اس نے کہا کہ "عمر ضائع کر رہا ہوں"۔ یہ احساس اور اعتراف بڑی چیز ہے، قاعدہ یہ ہے کہ جب چند آدمی کسی بات کو کہنے لگتے ہیں تو لوگ اس کو یقین کر لیتے ہیں، ایک کہے، دو کہے، جب متعدد آدمی ایک بات کو کہتے ہیں تو اچھے اچھے آدمیوں کو یقین آجاتا ہے، حالانکہ کسی کے کہنے سننے سے حقیقت نہیں بدلتی، ایک بزرگ نے بکری کا بچہ خریدا، دو تین ٹھگوں نے دیکھ لیا اور کہا کہ یہ بچہ ٹھگنا چاہیے، ان میں سے ایک نے اُس راستہ پر جس سے یہ بزرگ گزرنے والے تھے ایک درخت کے نیچے مصلیٰ بچھا کر تسبیح پڑھنی شروع کر دی، ثقہ صورت، لانبا کرتہ، نیچی داڑھی، جب وہ بزرگ پاس سے گزرے تو یہ حضرت لپک کر پہونچے، بڑے ادب سے سلام کیا، دست بوسی کی اور کہنے لگے کہ حضور! اس کے لب پلید ہیں، اس کے رونیں بھی ناپاک ہیں، آپ نے ضرور چوکیداری کے لیے اس کو خریدا ہوگا۔ اس کے لیے تو بے شک جائز ہے، انھوں نے جھڑک دیا کہ آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ یہ بکری کا بچہ ہے، آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ فوراً ہاتھ جوڑ کر معذرت کی اور کہا کہ یہ میری نگاہوں کا قصور ہے بھلا آپ جیسے بزرگ کتا کہیں خریدیں گے؟ آگے بڑھے تو ایک اور صاحب اسی طرح مقدس صورت بنائے ہوئے ملے، آگے بڑھے اور قدموں میں گر گئے، کہنے لگے کہ اچھے لوگوں کی زیارت بھی کفارہ ذنوب ہے۔ حضور نے کھیت کی حفاظت کے لیے اس کو لیا ہوگا، انھوں نے پھر ڈانٹا اور کہا کہ "آپ کو سجھائی نہیں دیتا کہ یہ بکری کا بچہ ہے یا کتا ہے۔" کہنے لگے "حضرت نے صحیح فرمایا۔ میں جھوٹا، میری نگاہیں جھوٹی۔" آگے بڑھے تو تیسرے صاحب ملے اور کہا کہ "حضرت یہ بڑی اچھی نسل کا معلوم ہوتا ہے تازی کتا ہے" اس پر وہ بھی شبہ میں پڑ گئے اور کہنے لگے ایک غلطی کر سکتا ہے، دو غلطی کر سکتے ہیں، اتنے آدمی

تو غلطی نہیں کر سکتے، مجھ ہی کو دھوکا ہوا ہوگا، انھوں نے بکری کے بچہ کو چھوڑ دیا اور چلے گئے، ٹھگوں نے اس کو ٹھگ لیا۔

فرمایا، اگلے مذاہب میں دواؤں کے اجزا بتا دیتے تھے اور نسخہ لکھ کر دیدیتے تھے، جاؤ تلاش کرو، اجزا فراہم کرو، اور دوا بنالو، آخر میں جو حکیم تشریف لائے (صلی اللہ علیہ وسلم) انھوں نے بنی بنائی دوا، اور تیار معجون دیدیا، جس میں اجزا کو جمع کرنے، چھاننے پیسنے، جوش دینے کی دردسری نہیں، اور فرمادیا کہ صبح آفتاب نکلنے سے پہلے کھالینا، پھر سورج ڈھلے کھانا، پھر عصر کو استعمال کرنا، پھر غروب آفتاب پر، پھر شفق ڈوبنے کے بعد[1]، اگر قوت ہو تو پچھلے کو اٹھ کر کھالینا ورنہ[2] آفتاب نکلنے سے پہلے پہلے، اس سے زیادہ آسان نسخہ کیا ہو سکتا ہے۔ اور فرمادیا:

"لایذوقون فیھا الموت" اس دوا کی تاثیر یہ ہے کہ دائمی اور حقیقی موت اور فنائے کلی کا خطرہ نہیں، حیات جاوید ضرور حاصل ہوگی۔

---

[1] فرض نمازوں کے اوقات خمسہ ۱۲ [2] تہجد کی نماز ۱۲

سراج الہند حضرت شاہ عبد العزیز محدّث دہلویؒ

مکتوبات، علمی و ادبی تبرّکات

مرتبہ ـ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

من رشحات اقلام قدوۃ الادباء الشیخ عبد العزیزؒ

ولمّا اتمّ تحرير الجواب و
حان تختم الكتاب دار
في خلدي ان اخبركم
ببعض النعم اللّتي انعم
الله عليّ وثبّت اساسها
واختار براسها الذي ـ
فمنها انّ سيّدي والدي
رضي الله عنه لمّا توفّي
والحق بالملاء الاعلى
تركني صغير السنّ الّا انّي
لَهٗ اُعادِر مع صغرِ سنّي

اب جبکہ جواب لکھا جا چکا اور مضمون
خط ختم ہو رہا ہے۔ میرے دل میں یہ
بات آئی کہ میں آپ کو اللہ تعالیٰ کی
بہت سی نعمتوں میں سے ان چند نعمتوں
سے مطلع کروں جو اس نے میرے
اوپر خاص طور پر کی ہیں ـ منجملہ ان
نعمتوں کے ایک یہ ہے کہ حضرت والد
ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے جب وفات پائی
اور ملاء اعلیٰ سے ملحق ہوئے انھوں نے
مجھے صغیر السن چھوڑا تھا، مگر میں نے
باوجود اپنی کم عمری کے ان کے علوم

علماً من علومہ وشاناً من
شیونہ إلّا و قد اَخذتُ منه
بجُملۃٍ کافِیۃٍ و تشبثتُ من
اذ یالہ بقطعۃٍ وافیۃٍ وذلك
من فضلِ اللهِ علینا وعلی
النّاسِ وکان من اسباب ذلك انّی
ما زلتُ مُنذُ اُمِیطت عن التمائم
ونیطت بی العمائمُ مَشغوفاً
بمصاحبتہٖ مولعاً بقربہٖ
ومجالستہٖ .... وبہا یظهر
محاسن المناسباتِ الروحیۃِ
والاستعدادیۃِ وتبرزُ
حسناتہا۔ وترك اِخوتی
کُلّهم لم یمصّوا ثدیٔ علومہٖ
الخاصۃ ولا اخذوا منه
مما یُعدّ هم لِاخذ علومہٖ
حتّٰی انّ اخی رفیع الدین
سلمہ الله کان مشغولاً بالفوائد
الضیائیۃ وتعلیقاتِ الکافیۃ
اذ هجمت هذہ الواقعۃ
التی اطارت الالبابَ واسالتْ
علی القلوب والاکباد
فوفّقنی الله تعالٰی ....

میں سے کوئی علم نہ چھوڑا جس کو حاصل
نہ کیا ہو۔ اتنی عمر میں میں نے ان سے
کافی استفادہ کیا۔ یہ محض اللہ کا فضل
تھا میرے اوپر اور تمام انسانوں پر۔
کم عمری میں استفادہ کرنے کے اسباب
میں سے ایک سبب ظاہر یہ بھی تھا کہ
میں نے جب سے ہوش سنبھالا برابر
حضرت والد ماجدؒ کی صحبت اقدس
میں رہنے اور ان کی مجلس اقدس میں
بیٹھنے کا بیحد شوق رکھتا تھا...صحبت
و مجالست سے مناسبات روحانی کے
محاسن اور استعداد علمی کے کمالات
جلوہ گر ہوا کرتے ہیں۔ والد ماجدؒ نے
میرے بھائیوں کو اس حال میں اور
اس عمر میں چھوڑا تھا کہ انھوں نے
حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے علوم خاصہ کو
بالکل بھی نہیں چھوا تھا، اور نہ مندرجہ
علوم میں سے اتنا پڑھا تھا کہ ان کے
علوم خاصہ کو حاصل کرنے کا ذریعہ بن
جاتے۔ حتیٰ کہ رفیع الدین سلمہٗ فوائد ضیائیہ
(شرح جامی) اور تعلیقات کافیہ پڑھ
رہے تھے کہ والد ماجدؒ کی وفات کا
حادثہ اور ہوش ربا واقعہ پیش آگیا۔

ودعیتهم إلیٰ هذا الشان و
حثثهم علیٰ تحصیل العلم و
اخذه بکل لسان - فاثر
ذلك فیهم واشتغلوا بقرأة الکتب
وسماعها علیٰ هذا الفقیر فجاءوا
الحمد لله کما تشتهیه القلوب
وتلذ الاعین اما رفیع الدین
فقد حفظ القرآن کله وفرغ
بحمد الله من تحصیل العلوم
کلها لاسیما الادبیة والفلسفة
والاصلین من العلوم الدینیة
بل اخذ من العلوم الغریبة
کالهیئة والنجوم والحساب
والهندسة وما یجری مجراها
من الرمل والجفر والتاریخ
وعلم الفرائض والشعر ورسائل
التصوف بحظ وافر وبقی له
العبور علی الصحاح الستة و
غیرها من کتب الحدیث
وعسی ان یوفقه الله تعالیٰ
لذلك ایضاً وهو بحمد الله
مشغول بتفسیر البیضاوی و
مشغوف بالتدریس......

اللہ تعالیٰ نے مجھے توفیق دی کہ میں نے
سب بھائیوں کو تحصیل علم اور ہر
رائج الوقت زبان سیکھنے کی ترغیب
دی، چنانچہ ان پر میری ترغیب کا
اثر ہوا اور وہ اس فقیر کے پاس کتابوں
کے پڑھنے اور سننے میں مشغول رہے
تا آنکہ الحمد للہ حسب دلخواہ ایسی استعداد
پیدا کی جس سے آنکھیں ٹھنڈی ہوتی
ہیں ۔ بہرحال رفیع الدین نے قرآن
مجید حفظ کر لیا ہے اور وہ بحمد اللہ تمام
علوم کی تحصیل سے فارغ ہو چکے ہیں
خاص طور پر علوم ادبیہ اور فلسفہ اور
علوم دینیہ کی دونوں اصلوں (قرآن و
حدیث) میں ان کو تخصص حاصل ہے۔
بلکہ انھوں نے علوم غریبہ بھی حاصل
کیے ہیں جیسے ہیئت و نجوم، حساب،
ہندسہ، رمل، جفر، تاریخ، علم الفرائض،
علم شعر، نیز رسائل تصوف بھی پڑھے
ہیں اور ان کو ان علوم میں پورا پورا
حصہ ملا ہے۔ ابھی ان کا صحاح ستہ
وغیرہ پر عبور یعنی دورۂ حدیث باقی ہے۔
امید ہے کہ اللہ تعالیٰ عنقریب توفیق
عطا فرمائے گا۔ . .

ولہ تعلیقاتٌ وتدقیقاتٌ تقرّ بہا العین وتسرّ بہا الصدرُ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

ولمّا عبد القادر فھو ایضاً فرغ بحمد اللہ من حفظ القرآن کلّہ واسمع فی التراویح مرّاتٍ وھو الآن مشغولٌ بالقطبی وحواشی السید علیہ۔

واما عبد الغنی فقد حفظ نصف القرآن وھو مشغولٌ بہ ۔۔۔۔۔۔۔

بحمداللہ فی الحال وہ تفسیر بیضاوی پڑھ رہے ہیں اور درس و تدریس سے بھی شغف رکھتے ہیں ۔۔۔۔ ان کے قلم سے تعلیقات اور تدقیقات بھی ہیں جن کو دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈک نصیب ہوتی ہے اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے۔

عبدالقادر بھی بحمداللہ حفظ قرآن سے فارغ ہو چکے ہیں اور کئی مرتبہ تراویح سنا چکے ہیں۔ اس وقت وہ قطبی اور اس کے حواشی سید پڑھ رہے ہیں — عبدالغنی نصف قرآن مجید حفظ کر چکے ہیں۔ ابھی اسی میں مشغول ہیں۔۔۔۔۔

من عبارات الشیخ الاجل فی تعریف الدھلی

الدھلی وما الدھلی۔۔۔ ھی خیر البلاد ومنفعۃ العباد یومّھا اھل الالباب من کلّ مکانٍ سحیق ۔۔۔ لیشھدوا منافع لھم ویاخذوا الادب فیھا ویخوضوا فی کلّ من العلم غور عمیق — اھلھا خیر

دہلی کیا ہے؟ دہلی ایک بہترین شہر ہے لوگوں کی منفعت کا مرکز ہے، عقلمند لوگ دور دور سے یہاں آتے ہیں تاکہ اپنے منافع کو پہونچیں اور یہاں علم و ادب سیکھیں اور یہاں رہ کر ہر علم کے اندر غور و خوض کریں یہاں کے باشندے بہترین آدمی ہیں

اھلٍ ولسانھا اسھل من کُلِّ
سھلٍ تری العربیَّ فیھا لا یتضجر
من لسانہ والاصفھانیَّ یظُنُّھَا
خیراً من اصفھانہ والتورانیَّ
قد اتَّخذ فیھا بجزانہ والافاغنة
من اقلّ عبیدھا والکشامرة
من طارفھا وتلیدھا تجِدُ
فیھا اشیاء لم تعرف لھا
اسماً وتنظر بھا رجالا لم
تدرك منھم رسماً لعمرك انّھا
زبدة جمیع الاقالیم ومسکن
ارباب الدولِ والنعیم المالُ
فیھا یمیل عنہ العیونُ بلْ
لا یدرکہٗ الظنونُ ـ والذھبُ
قد ذھب عن القیاسِ الفضّةُ
قد فضضت عقول الناسِ
والحریرُ تجاوز من الاحرار
الی العبید فالناظرُ یشبہ
کلَّ یومٍ فیھا بالعید فَ
والقرآن المجید لو اصغیتُ
الی محامدھا لتعجّبتَ وقلت
ذلك امر بعید متیٰ ما
خرجت الی سوقھا وتسلّلتَ

ان کی زبان بڑی سہل اور آسان ہو
عرب کے باشندے کو دیکھو گے کہ اپنی
زبان کی وجہ سے یہاں پریشان نہیں
ہوتا۔ اصفہانی اس شہر کو اپنے اصفہان
سے بھی اچھا سمجھتا ہے اور تورانی
نے تو اس کو اپنا وطن بنا لیا ہو۔
افاغنۂ دہلی کے ڈکراستہ کرنے کے
لحاظ سے خدام ہیں۔ اور کشمیری (اپنے
تعلق کی بنا پر) یہاں کا مال جدید و
قدیم ہیں۔ تم یہاں پر کچھ ایسی چیزیں
دیکھو گے جن کے تم کو نام بھی معلوم
نہیں اور ایسے اشخاص بھی یہاں
پاؤ گے جن کے رسم و رواج تک سے
تم واقف نہیں۔ بقسم کہتا ہوں کہ
یہ شہر تمام اقالیم میں (بعض لحاظ سے)
ایک عمدہ اور منتخب شہر ہے۔ یہ
ارباب دول و نعیم کا مسکن ہو۔ یہاں
مال اس کثرت سے ہے کہ نظریں اس
سے اعراض کرتی ہیں اور اس کی
مقدار سمجھ میں نہیں آسکتی۔ یہاں
سونا قیاس سے باہر ہے اور چاندی
کی فراوانی نے لوگوں کی عقلوں کو
حیران کر رکھا ہے۔ یہاں ریشم احرار

الی مجامعها لما ادبتت اتلك لفی خلق جدید - فینادی لك هاتف من فلك فکشفنا عنك غطاءك فبصرك الیوم حدید۔

سے متجاوز ہو کر ظلاموں تک پہونچ گیا ہے۔ ناظر کو روزانہ یہاں عید کا شبہ ہوتا ہے۔

قسم ہو قرآن مجید کی اگر تم اس شہر کی تعریفوں کی طرف کان لگاؤ گے تو تعجب کرو گے اور کہو گے کہ یہ امر بعید ہے، اور جب تم اس کے بازاروں اور مجموں کی طرف جاؤ گے تو تم کو بالکل شک نہ ہو گا کہ تم خلق جدید کے اندر ہو اس وقت فلک سے ہاتف غیبی تم کو ندا دے گا ــــ اور یہ آیت پڑھے گا۔

"ہم نے آج کے دن تیری آنکھوں سے پردہ ہٹا دیا۔ اب تیری نگاہ تیز ہے؟"

ایک اہم مکتوب اور اس کا جواب

خواجہ حسن مودودی لکھنوی ؒ نے حضرت شاہ عبدالعزیز ؒ کو ایک مکتوب فارسی زبان میں تحریر فرمایا جس کا ترجمہ بطور خلاصہ یہ ہے۔

حقائق آگاہ معارف پناہ جامع علوم یقینی وحاوی فنون رسمی مولانا مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب ـــ فقیر عاصی پر معاصی حسن مودودی عفا اللہ عنہ کی طرف سے بعد سلام ملاحظہ فرمائیں ـــ

کل، حافظ الملک نواب محمد خاں بہادر ابن حافظ الملک حافظ رحمت خاں بہادر شہید مغفور میرے پاس تشریف لائے تھے۔ اثنائے گفتگو میں انھوں نے فرمایا کہ آپ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کو لکھیں کہ انھوں نے اپنی کتاب مستطاب، تحفۂ اثنا عشریہ میں حضرات شیعہ کے اس اعتراض کا کوئی جواب

نہیں دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اکثر غزوات میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے علاوہ تمام خلفاء راشدین کو دوسرے امراء کا تابع کرکے روانہ فرمایا ہے حضرت علیؓ کو کسی کا تابع کرکے کسی لشکر میں نہیں بھیجا اس سے تینوں خلفائے راشدین کے مقابلے میں حضرت علیؓ کی ترجیح ثابت ہوتی ہے۔

اگر شاہ صاحب ایسا جواب تحریر فرمادیں جو تسکین بخش اور دافع خطرات و شبہات ہو تو بڑی مہربانی ہوگی۔ اسی واسطے میں خدمت عالی میں لکھ رہا ہوں۔ اگر آپ اس کا جواب عنایت فرمائیں گے تو باعث اجر ہوگا۔ اگرچہ میرے پاس بھی اس سوال کا جواب دلائل قویہ کے ساتھ موجود ہے، لیکن چونکہ نواب صاحب آپ ہی سے دریافت کرنا چاہتے ہیں میرے جواب سے ان کو تسکین نہ ہوگی اسی بنا پر میں نے ان کو خود اس کا جواب نہیں دیا۔

مولانا رفیع الدین صاحب، مولوی عبدالقادر صاحب سے سلام مسنون فرمادیں۔ حاجی شرف الدین خاں آپ تینوں حضرات کو سلام مسنون پہونچاتے ہیں۔

جواب از جانب حضرت شاہ عبدالعزیزؒ

...... خدمت سلالۃ الاسلاف الکرام ذنخبۃ الآباء العظام، سباق مضمار البلاغۃ واللسن المسمیٰ بالاسم الحسن المتخلق بالخلق الحسن مودود دینۃ الطریقۃ والنسب بصری الاسم والادب سلمہ اللہ تعالیٰ. از بندۂ فقیر بے ہیچ و ناچیز مسمیٰ بعبدالعزیز عفا اللہ عنہ تحیۃ الاسلام مقرون باشتیاق مالاکلام قبول فرمایند بعدہٗ آنکہ صحیفۂ شریفہ و نمیقۂ انیقہ	..... موصوف باوصاف حمیدہ مسمیٰ باسم حسن متعلق بخلق حسن۔ طریقت اور نسب میں مودودی، حسن بصریؒ کے ہم نام یعنی خواجہ حسن لکھنوی، فقیر بے ہیچ و ناچیز عبدالعزیز عفا اللہ عنہ کی طرف سے ایسا سلام مسنون قبول فرمائیں جو اشتیاق بے حد سے مقرون ہے۔ اس کے بعد واضح ہو کہ آپ کا مکتوب گرامی موصول ہو کر مسرت کا

در وقتے وصول عزت شمول آورد و
بہجت آمود فرمود اگرچہ بسبب امراض
گوناگوں و عوارض بوقلموں حواس خمسہ
ظاہری در انتشار و مدرکات باطنی در
مجاہدۂ اسقام و آلام گرفتار، مع ہذا
امتثالاً للامر الشریف، بتحریر جواب
سوال نواب حافظ الملک می پردازد،
در تحفۂ اثنا عشریہ، گفتگوئے شیعہ
و سنی است مبحث تفضیل در آں
اندراج ندارد و ایں سوال متوجہ
بر مسئلۂ تفضیل است لاجرم در تحفہ،
مذکور نشدہ۔

ازیں سوال دو جواب گفتہ اند۔
اول جواب اہل سیر و روایت است
و دوم جواب اہل بصر و درایت۔
حاصل جواب اول آنکہ از تتبع سیر
آنسرور معلوم است کہ آنسرور ہیچ
کس را از بنی ہاشم بلکہ بنی امیہ نیز او
اکثر اوقات، تابع دیگرے نفرمودہ
اند و دریں امر، حضرت حمزہؓ و ابو عبیدہ
بن الحارث بن عبدالمطلبؓ و حضرت
عباسؓ و حضرت جعفرؓ و حضرت
عقیلؓ و فضل بن عباسؓ و ابو سفیان

باعث ہوا۔ اگرچہ امراض گوناگوں
اور عوارض بوقلموں کی وجہ سے حواس
خمسہ ظاہری انتشار پذیر ہیں اور مدرکات
باطنی اسقام و آلام کی شقت میں
گرفتار ہیں۔ پھر بھی نواب حافظ الملک
(محبت خاں) کے سوال کا جواب
دیتا ہوں۔

(در اصل) تحفۂ اثنا عشریہ میں
بحث شیعہ و سنی ہے۔ تفضیل کا مبحث
اس کے اندر شامل نہیں ہے اور یہ سوال
مسئلہ تفضیل سے تعلق رکھتا ہے اسی
وجہ سے تحفہ میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔

اس سوال کے دو جواب دیے گئے
ہیں۔ پہلا جواب اہل سیر و روایت کا
ہے اور دوسرا اہل بصر و درایت کا۔
پہلے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ کتب
سیرت آنسرور صلی اللہ علیہ وسلم کے
مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے
کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
بنی ہاشم بلکہ بنی امیہ میں سے بھی
کسی شخص کو اکثر اوقات کسی
دوسرے خاندان کا تابع نہیں بنایا
اس معاملے میں حضرت حمزہؓ حضرت

بن الحارث رض و حضرت عثمان بن عفان رض
اموی و خالد بن سعید بن العاص اموی رض
شریک اند۔ اگر باین امتیاز رجحانے
ہست نیز ہمہ راست۔ وجہش آنست
کہ ایں ہر دو قبیلہ از قدیم، ریاست
قریش داشتند و بسبب قربت قرابت
اینہا با جناب رسول، شرف دیگر اینہا
را افزود ولنعم ما قیل ۔

کنند خویش نیاز تو ناز می زیبد
بحسن یک کس اگر یک قبیلہ ناز کند

پس اگر اینہا را تابع دیگرے می
فرمودند خیلے شاق و گران بر طبائع
و امزجۂ اینہا می آمد و نزدیک تکلیف
مالا یطاق می رسید و شارع حکیم است
بتیسیر در ہر تکلیف مراعات می فرماید۔
و ایں وجہ را کسانے کہ در خاندان
ریاست پیدا شدہ اند و اخوانِ دیگر اعمام
خود را تجربہ و امتحان نمودہ کما ینبغی
می فہمند — ع
حاجتِ تنبیہ نیست عارفِ آگاہ را
و حاصل جواب ثانی نیز موقوف بر تمہید مقدمہ
است و آں مقدمہ ایں است کہ سنت
اللہ جاری است کہ بوضع باقصی درجات

ابو عبیدہ بن الحارث بن عبد المطلب رض
حضرت عباس رض، حضرت جعفر رض، حضرت
عقیل رض، حضرت فضل بن عباس رض،
حضرت ابو سفیان بن الحارث رض، حضرت
عثمان بن عفان اموی رض اور حضرت
خالد بن سعید بن العاص اموی رض بھی
شریک ہیں۔ اگر اس امتیاز کی بنا
پر کسی کو ترجیح ہے تو ان سب کے
لیے ہے۔ ان دونوں قبیلوں کو کسی
کا تابع نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں
قبیلے قدیم سے قریش کی سرداری کے
وارث و حامل تھے، پھر آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کی قرابت قریبہ کی وجہ سے
ایک اور شرف بھی ان دونوں قبیلوں
کو حاصل ہو گیا۔ کسی شاعر نے کیا خوب
کہا ہے — کنند خویش نیاز تو ناز الخ
(یعنی اے محبوب تیرے خویش و اقارب
تیرے ناز کی بنا پر ناز کرتے ہیں۔ اگر کسی
ایک فرد کے کمال کی وجہ سے پورا قبیلہ
ناز کرے تو یہ بات ایک حد تک زیبا ہے)
اگر ان کو کسی دوسرے قبیلے کے کسی فرد
کے تابع بنایا جاتا تو اس کا امکان تھا
کہ مزاجاً اور طبعاً ان کو بہت شاق و

کمال بے طے مراتب تحتانی آں نمی شود وگر ابتداءً ہر شخصے را مرتبۂ علیا از کمال بہ القا کنند بے آنکہ طے مراتب سافلہ کردہ باشد حوصلہ اش تنگی می کند وعہدۂ آں مرتبہ کما ینبغی برنمی تواند آمد غیر از انبیاء ہر کس درین امر یکساں اند اولیاء تا وقتے کہ مشق از ادب اتباع پیغمبراں خود نکردہ بمرتبۂ ارشاد نرسیدہ و علماء تا وقتے کہ سالہا ئے خود با استاداں نگشتہ وگرد مدرسہ نخوردہ اند بمرتبۂ تدریس و تعلیم نرسیدہ اند۔ و ہمچنیں در فرقۂ امراء و دیگر اہل حرفت و صنائع مجرب و ممتحن است و قاعدۂ حکمیہ نیز ہمیں را اقتضاء می کند بر دو وجہ اول آنکہ بلوغ نفوس با قصیٰ کمال خود تدریجی است۔

دوم آنکہ ریاست متقاضی مروسیت است تا وقتیکہ شخصے مدتے ملازم مروسیت و تابع نشدہ باشد در وقت ریاست بحق الیقین نمی تواند کہ حسن معاملہ را با مروسین بفہمد و بداند کہ مروسین و رعیت را بکدام کدام سلوک

گزرے اور بات تکلیف مالا یطاق کی حد تک پہونچ جائے۔ شارع کے سارے اصول و قوانین مبنی بر حکمت ہیں۔ اور ہر تکلیف میں تیسیر کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ یہاں بھی یہی لحاظ رکھا گیا۔ اس بات کو وہ لوگ جو خاندان ریاست میں پیدا ہوئے ہیں اور اپنے سگے بھائیوں اور چچا زاد بھائیوں کا تجربہ و امتحان کیے ہوئے ہیں بدیہی طور پر سمجھ سکتے ہیں "عارف آگاہ کو تنبیہ کی ضرورت نہیں ہوتی"۔

دوسرے جواب کا حاصل ایک مقدمہ کی تمہید پر موقوف ہے وہ مقدمہ یہ ہو کہ سنت اللہ اس طرح جاری ہے کہ منتہائے کمال پر پہونچنا تحتانی مراتب کو طے کیے بغیر کما حقہٗ میسر نہیں ہوتا۔ اگر ہر شخص کو ابتدا ہی میں کمال کا مرتبۂ عالی دے دیا جائے بغیر اس کے کہ وہ نیچے کے درجات و مراتب طے کرے تو ایسی صورت میں اس کا حوصلہ تنگ ہو جائے گا اور اس مرتبے کی ذمہ داری سے کما حقہٗ عہدہ برآ نہ ہو سکے گا۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کے علاوہ تمام انسان اس امر میں مساوی ہیں، اولیاء کو دیکھئے

استمالت و جلبِ قلوب، تواں کرد و از کدام
کدام سلوک متنفر می شوند و رم می کنند پس
ریاست او علی جتہا ممکن نمی پذیرد و چوں
ایں مقدمہ ممہد شد می گویم کہ آنحضرت صلی
اللہ علیہ وسلم را چناں چہ از احادیث
بسیار مستفاد می شود خلافتِ ایں چہارِ
بزرگ علی ترتیبہا از غیب معلوم شدہ بود
و چوں خلیفہ رابع را تا بیست و چہار
سال مزد سیت و تبعیت د فرمان سہ
کس مختلف الامزجہ برداشتن مقدر
بود، حاجتِ مشق کنانیدن ایں کار بحضور
خود نبود و خلیفہ ثالث را کہ تا دوازدہ
سال مشقِ ایں کار، مقدر بود در زیرِ فرمان
دو کس ماندن، ایشاں ہم محتاجِ مشقِ
ایں کار نشدند بخلاف شیخین کہ اینہا را
بلا فصل بعد از وفاتِ آنجناب صلی اللہ
علیہ وسلم ریاست مقدر بود اینہا را
مشقِ ایں کار بحضور خود کنانیدن ضرور
افتاد زیرا کہ خلیفہ اول، بمجرد وفات
آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بر منصب
ریاست نشستند و خلیفہ دوم بفاصلہ
دو سال و سہ ماہ بحضور خلیفہ اول
من حیث المشورہ والوزارۃ شریک

جب تک انھوں نے ادب کا حق ادا کر کے اپنے
مرشدوں کی اتباع نہیں کی مرتبۂ ارشاد
کو نہیں پہونچے، اسی طرح علماء نے جب تک
سالہا سال اپنے اُستادوں کی ماریں
نہیں کھائیں اور مدتوں مدرسے کی خاک
نہیں پھانکی، تدریس و تعلیم کی مسند پر فائز
نہ ہوئے، یہی بات فرقۂ امراء اور دیگر اہلِ
حرفہ و اہلِ صنعت میں آزمائی جا چکی ہے۔
اور حکمت کا قاعدہ بھی اسی کا اقتضا کرتا
ہے دو سبب سے (۱) حدِ کمال تک نفوس
کا پہونچنا تدریجی ہے (۲) ریاست و سرداری
تابعداری سے وابستہ ہے۔ جب تک کہ
کوئی شخص طویل عرصے کسی کا تابع نہ رہا ہوگا
ریاست و سرداری کے منصب پر پہونچنے
کے بعد رعیت کے حقوق اچھی طرح ادا نہ کر
سکے گا اور نہ یہ سمجھ سکے گا کہ رعیت کے
دلوں کو کس کس طرزِ عمل اور تدبیر سے اپنی
طرف کھینچا جا سکتا ہے۔ اور کن کن باتوں
سے رعیت اپنے سردار سے متنفر ہو جایا
کرتی ہے۔ جب وہ اس گر کو نہ سمجھ سکے
گا تو اس کی ریاست بھی قوت نہیں پا
سکتی۔ جب یہ مقدمہ بطور تمہید لکھا جا
چکا تو اب میں کہتا ہوں کہ آں حضرت

خلافت بودہ اند۔ بلکہ از تتبع تواریخ معلوم
می شود کہ خلیفۂ اول را نیز بعد وفات آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کہ بر اتفاق جمیعت واقع
شدہ و خلیفۂ دوم را بیشتر تعینات واقع
تابعین دیگراں فرمودہ اند بنا بر آنکہ
مزاج خلیفۂ اول سہل الانقیاد بود و
ایشاں را مشق تبعیت چنداں ضرور
نبود بخلاف خلیفۂ دوم کہ در مزاج ایشاں
از قدیم باشتداد و حکمرانی مجبول بود
والطبیب یعالج الشیٔ بالضد۔ بنا
بریں امورات ایشاں را بحق الیقین
کیفیت تبعیت در زیر فرمان کسے بودن
چشانیدن ضرور افتاد۔ فما جیٔ شوعنہ الا
خالفا عیب از اصحاب ثلٰثہ کہ رابع
غیر منفک نیز ہمراہ دارند بحکم ما یکون
من نجوی ثلٰثۃ الآیۃ متصف اند۔

صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسا کہ احادیث سے
معلوم ہوتا ہے، چاروں خلفاء کی خلافت
ترتیب کے ساتھ غیب سے معلوم ہو گئی
تھی۔ خلیفۂ رابع (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)
کے لیے چونکہ چوبیس سال تک تین مختلف
المزاج خلفاء کے تابع رہنا مقدر تھا
اس لیے ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے اپنی حیات ظاہری میں کسی کا تابع بننے
کی مشق کرانی ضروری نہیں سمجھی۔ خلیفۂ ثالث
(حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ) جن کو بارہ سال تک
شیخین رضی اللہ عنہما کے تابع رہنا مقدر تھا۔ وہ
بھی چنداں اس مشق کے محتاج آں حضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نہیں ہوئے
بخلاف شیخین رضی اللہ عنہما کے کہ ان کے لیے چونکہ بلا فصل
بعد از وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
خلافت و ریاست مقدر تھی۔ اس لیے ان
کو اس کام کی مشق اپنے سامنے کرانی ضروری

سمجھی کیونکہ خلیفۂ اول (حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات
کے فوراً بعد منصب خلافت و ریاست پر فائز ہوئے اور خلیفۂ دوم (حضرت فاروق
اعظم رضی اللہ عنہ) دو سال تین ماہ کے فاصلے سے اس منصب پر قائم ہوئے اور خلیفۂ اول
کی خلافت کے زمانے میں وہ مشیر و وزیر تھے اور شریک خلافت کی حیثیت رکھتے
تھے۔ خلیفۂ اول کو بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں کسی کی تبعیت
کا موقع کم ملا۔ البتہ خلیفۂ دوم منجانب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر و بیشتر دوسروں کے تابع

کیے گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خلیفہ اوّل کا مزاج قدرتی طور پر نرم اور تقلید پذیر تھا۔ اس لیے اُن کو تابعداری کی زیادہ مشق کی ضرورت تھی۔ بخلاف خلیفۂ دوم کے کہ ان کے مزاج میں پہلے سے شدت اور حکمرانی کا مادہ تھا اور طبیب علاج بالضد کیا کرتا ہے۔ اس بنا پر خلیفۂ دوم کو کیفیت تبعیت سے واقف کرانا اور دوسروں کے زیر فرمان رہنے کا مزہ چکھا دینا ضروری ہوا۔ حاجی شرف الدین خانصاحب کو ہم تینوں بھائیوں کا سلام پہونچے۔ ......

الفرقان
ملکیت اور دیگر تفصیلات
فارم نمبر ۴
دیکھیے رول (۸)

۱۔ مقام اشاعت ...... کچہری روڈ لکھنؤ
۲۔ وقفۂ اشاعت ...... ماہانہ
۳۔ پرنٹر کا نام ...... محمد منظور نعمانی
۴۔ پبلشر کا نام ...... "
۵۔ ایڈیٹر کا نام ...... محمد منظور نعمانی
۶۔ مالک کا نام ...... "
۷۔ شہریت ...... ہندوستانی
۸۔ پتہ ...... کچہری روڈ لکھنؤ

میں محمد منظور نعمانی اعلان کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین میں صحیح ہیں۔
——— محمد منظور نعمانی (پبلشر)

اسلام میں عقل کا کردار

(از ڈاکٹر سیّد محمد یوسف صدر شعبہ عربی کراچی یونیورسٹی)

[گزشتہ فروری میں راولپنڈی میں جو بین الاقوامی اسلامی کانفرنس ہوئی تھی اُس میں پیش کیا ہوا حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ کا مقالہ (تقسیم دولت کا اسلامی نظام) الفرقان کے گزشتہ دو شماروں میں شائع کیا جا چکا ہے۔

اسی کانفرنس میں کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے صدر ڈاکٹر سید محمد یوسف صاحب نے عربی زبان میں ایک بڑی اہم تقریر فرمائی تھی جس میں "عقل سلیم" اور "عقل مسلم" اور "وحی" اور "اجتہاد" کے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے اور اُن سب کے حدود کار متعین کرتے ہوئے ان مفلوجین علم و دانش کے طرز عمل پر بھی بڑی فاضلانہ اور عادلانہ تنقید کی تھی جو اسلام کے اصل مآخذ قرآن و حدیث اور انکی زبان عربی سے بے بہرہ ہونے کے باوجود محض اپنی عقل خام کے اندر سے یا چند انگریزی کتابیں پڑھ کے اپنے کو اجتہاد کا حقدار سمجھتے ہیں اور اسلام کا ایک نیا اڈیشن چالو کر دینا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر سید محمد یوسف نے اپنی تقریر میں جو خیالات ظاہر کیے تھے ان کو خود ہی اردو میں ایک مقالہ کی شکل میں قلمبند کر دیا ہے، اس کی غیر معمولی افادیت کے پیش نظر ہم اس کو "المعارف" لاہور سے لے کر ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں۔

اس کے بالکل ابتدائی تمہیدی حصے میں خاصکر "معجزات" سے متعلق بعض جملے اس طرح کے ہیں جن سے ناظرین کو توحش ہو سکتا ہے لیکن مقالہ سے ان کے خیالات معلوم ہو جانے کے بعد اطمینان ہو جاتا ہے کہ توحش کا باعث صرف تعبیر کا ایک خاص انداز ہے۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہو کہ اس کا مخاطب خواص کا وہ طبقہ تھا جو اس کا مفروضہ ہیں مغرب کے سامنے

تھا۔ بہر حال مقالہ نہایت قابل قدر اور بڑی افادیت کا حامل ہے۔ ادارہ]

اسلام کا اولیں تخاطب عقل سے ہے۔ بات اپنی جگہ بالکل صحیح ہے اگر آپ کسی انسان کو کسی بھی مسئلہ کی طرف دعوت دیں تو اس کی کون سی قوتوں اور صلاحیتوں کو مخاطب کریں گے؟ خدا نے انسان کو حواسِ خمسہ اور عقل ـــــ سادہ فطری عقل ـــــ کی ایک قدرِ مشترک سے نوازا ہے۔ حواسِ خمسہ فکر و نظر کا مواد مہیا کرتے ہیں، فکر و نظر کی دعوت عقل تک پہنچاتے ہیں اور عقل اس مواد سے کام لینے اور دعوت کو قبول یا رد کرنے کی ذمہ دار ہے۔ دعوت کا فکری طریقہ تو یہی ہے، لیکن اگر اس کے مقابلہ میں کوئی غیر فطری طریقہ نہ ہو تو پھر اسلام کی کوئی امتیازی شان باقی نہیں رہتی، عقل سے اسلام کا تخاطب جو اتنا واضح اور نمایاں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام عقل کو جگاتا ہے، بیدار کرتا ہے، گرد و پیش کے حقائق سے دو چار کرکے چونکاتا اور جھنجھوڑتا ہے۔ اس کے مقابلے میں کسی دوسرے سے اپنی بات منوانے کا ایک طریقہ وہ بھی ہے جسے "تنویم" کہا جاتا ہے، یعنی یہ کہ مخاطب کی عقل کو سلایا جائے، اس کی عقل کی مقاومت کو ختم کر دیا جائے تا آنکہ وہ اپنی عقل اور ارادہ سے کام لے کر دعوت قبول کرنے کے بجائے داعی کے ارادہ کا محض بے عقل تابع بن جائے۔ اسلام سے پہلے جو دین آئے ان کی طرف دعوت میں اس طریقہ سے احتراز نہیں کیا گیا۔ چنانچہ قرآن شاہد ہے کہ طفلِ گہوارہ کو بولتے دیکھ کر، مردہ کو زندہ کرتے دیکھ کر، چڑیوں کے منتشر اجزا کو یکجا ہوتے اور ان میں جان پڑتے دیکھ کر عقل مدہوش ہو جاتی ہے یہاں تک کہ جس دعوت کو سوچ سمجھ کر بحالت ہوش قبول کرنے کو تیار نہ تھی اسی دعوت کا بحالت مدہوشی اتباع کرنے لگتی ہے، مفتی عبدہٗ اس کو بجا طور پر "ادھاش" کا طریقہ کہتے ہیں[۵]۔ یہ طریقہ کچھ ایسا فرسودہ نہیں، آج بھی طرح طرح سے کارفرما نظر آتا ہے "تنویم مقناطیسی" "HYPNOTISM" اس کی

---

[۵] تفصیل کے لیے دیکھئے میری کتاب "جیتا جاگتا" (انجمن ترقی اردو کراچی)، باب "عقل نقل اور کشف"

بیشک غلط ہے جو صوفیہ اپنے ارادہ کی بنیاد کرامات پر رکھتے ہیں وہ اسی طریقہ سے کام لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے متبعین کو بے چون وچرا اطاعت پر آمادہ کر لیتے ہیں لیکن ان کے قوائے عقلی کو بیدار نہیں کرتے، چنانچہ ان کے حلقوں میں توحید اور شرک و بدعت گڈمڈ ہو کر بلا تمیز عقل بیک وقت قابل قبول بن جاتے ہیں۔ سماع۔ رقص اور بخور (خوشبو کا دھواں) منزلات ہیں جو عقل کو سلانے میں مدد دیتی ہیں۔ صوفیہ کا وجد اور حال مجازی معنی میں نہیں بلکہ حقیقت میں شراب کے نشہ، مدہوشی اور قوائے عقلی کے تعطل کا مرادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیہ کا جذب اور حال عمل کا موجب نہیں بنتا۔ عمل کا باعث یقین ہوتا ہے اور یقین علم کے اعلیٰ مدارج میں سے ہے۔ علم عقل و ہوش کی برتری سے نہ کہ جذب اور حال سے حاصل ہوتا ہے۔ یقین عقل و تمیز کی یکسوئی اور ارتکاز و استقرار کا نام ہے۔ سیاست اور حکمرانی کے میدان میں دیکھئے ایک آمر (ڈکٹیٹر) سب سے پہلے عوام کو اپنی شخصیت سے مرعوب کرتا ہے، اپنی اتفاقی کامیابیوں کو کرامات کا رنگ دیتا ہے پھر عوام سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی عقل بالائے طاق رکھ کر اس کی اطاعت میں لگ جائیں۔ مثلاً ایک آمر فوج کی مدد سے عوام کو ساتھ لیے بغیر ملوکیت کا خاتمہ کرتا ہے عالمی طاقتوں کی باہمی رقابت سے فائدہ اٹھا کر استعمار کے خلاف کامیابی حاصل کرتا ہے، اس کے بعد عوام سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اشتراکیت کو قبول کرلیں۔ جس کے معنی مفہوم، نظام اور فلسفہ سے وہ قطعاً ناآشنا ہیں۔ اشتراکیت کو منوانے کا یہ طریقہ وہی اوصاف کا طریقہ ہے۔

بسا اوقات یہ مدہوشی افراد اور مجموعہ افراد یعنی اقوام کی خود پیدا کردہ بھی ہوتی ہے۔ مثلاً ہم ایک قوم کو ہوائی جہاز بناتے، زندہ کا دل چیرتے اور چاند پر کمند پھینکتے دیکھتے ہیں اور ایسے مدہوش ہوتے ہیں کہ اس کا رقص، سرود، عریانیِ تن، طریقِ ازدواج، ہم آغوشیِ زن سب ہی کچھ اختیار کر لیتے ہیں۔ ہوش کے لمحات میں آپ جس سے بھی پوچھیں وہ سائنس کی ترقی اور معاشرت کے ان اطوار میں رشتہ قائم کرنے سے عاجز ہوگا۔ اس پر مزید قیاس کیجئے۔ زمانۂ حال کی تاریخ شاہد ہے کہ سائنس کی ترقی اور مادی خوشحالی

سرمایہ دارانہ نظام اور سودی بنک کاری کے ساتھ لازم و ملزوم نہیں۔ ایک نیا شیوعی نظام (کمیونزم) حریف بن کر اٹھا اور اس نے ایسی مادی طاقت پیدا کی کہ سرمایہ داروں کی نیند حرام ہو گئی۔ لیکن ہماری مدہوشی اور مرعوبیت کا یہ عالم ہے کہ "یک نشد دو شد" اب ہم اس بحث و تکرار میں الجھے ہوئے ہیں کہ ہماری ترقی کی راہ سرمایہ داری ہے یا شیوعیت۔ اگر عقل سے رجوع کیا جائے تو وہ کہے گی کہ جب ایک سرمایہ داری نظام لازمی نہیں ٹھہرا تو شیوعیت ہی پر کیا موقوف ہے اس کا بدل کوئی اور تیسرا بلکہ چوتھا یا پانچواں نظام بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمارے یہاں عقل کا کام یہ رہ گیا ہے کہ ہم مدہوشی کے عالم میں جس کامیاب نو دولت نظام کی طرف جھک پڑیں اس کی پیرایہ پوشی کے لیے اسلام میں جگہ نکالیں بلکہ بڑھ کر یہ کہ موجودہ دنیا کے ہر طاقت ور نظام میں سے کچھ اجزا لے کر ایک ملغوبہ تیار کریں اور اس طرح سارے ہی رقیبوں سے سرٹیفکٹ حاصل کریں:

رقیب سرٹیفکٹ دیں تو عشق ہو تسلیم

یہی ہے عشق تو اب ترک عاشقی اولیٰ (اکبر)

اسلام نے دعوت میں کہیں ادعاش کے طریقہ سے کام نہیں لیا۔ معجزات جو محمد صلعم کی طرف منسوب ہیں ان کے بارے میں جو بھی اختلاف ہو، اس پر تو سب کا اتفاق ہوگا کہ اسلام نے دعوت کی بنیاد معجزات پر نہیں رکھی۔ اگر ایسا ہوتا تو جس طرح قرآن کے صفحات موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کے معجزات سے بھرے پڑے ہیں۔ اسی طرح محمد صلعم کے معجزات بھی مذکور ہوتے۔ عملی طور سے بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ایسی کوئی مثال نہیں کہ کوئی دعوت سے انکار کرتا ہو تو محمد صلعم نے معجزہ دکھا کر اس کی عقل کو عاجز کیا ہو۔ یہ ضرور ہے کہ جو اصحاب ایمان کی دولت سے مالا مال تھے جیسے ابوبکرؓ وہ بلا تامل دل سے مانتے اور زبان سے کہتے تھے کہ محمد صلعم جو کچھ بھی فرمائیں وہ حق ہے خواہ عقل کے لیے معجز ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن جو لوگ دعوت پر ایمان نہیں لائے تھے انھوں نے دعوت قبول کرنے کے لیے جب کبھی معجز نمائی کی قید لگائی اور معجزہ صراحۃً طلب کیا تو ان کو ایک ہی جواب ملا اور وہ یہ کہ محمد صلعم کا معجزہ تو قرآن ہے۔ قرآن کوئی منتر، زمزمہ نہیں جس کا خطاب عقل

سے دیتا ہو، بلکہ سیدھی سادی، صاف سمجھ میں آنے والی عربی زبان میں ہے (بلسان عربی مبین) اور اسی لیے ہے کہ تم اسے عقل سے سمجھو (لعلکم تعقلون) چونکہ دعوت اسلام کی مخاطب عقل ہے اسی لیے قرآن میں عقل سلیم اور غیر سلیم کے فرق کو اتنا کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ اور ایسی عاجزی اور ترشی اور طنز کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ کسی اور مذہبی کتاب میں شاید ہی اس کی مثال پائی جاتی ہو۔ جب عقل کی بات کی جائے اور مخاطب عقل سلیم نہ رکھتا ہو تو ظاہر ہے کہ عقل کی بات کرنے والا خود ہی عاجز ہو جائے گا۔ دوسری شکل یہ ہو کہ وہ عقل کی بات چھوڑ کر معجزہ سے کام لے، ادھاش کا عمل کرے۔ اس سے اسلام کو صریح انکار ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کھلے الفاظ میں عقل غیر سلیم کے آگے اپنی عاجزی کا اعتراف کرتا ہے۔ ختم اللہ علی قلوبھم الآیۃ عقل غیر سلیم وہ ہے جو وحی کی برتری تسلیم کیے بغیر یا وحی سے رجوع کیے بغیر کوتاہ بین نفس حیوانی کے تقاضوں سے مغلوب ہو جسے "ھویٰ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کچھ لوگ وحی پر اس لیے کان نہیں دھرتے کہ وہ "تقلید آبا" میں جکڑے ہوتے ہیں۔ قرآن تقلید آبا کی مذمت کر کے انھیں غیرت دلاتا ہے۔ مگر یاد رہے کہ غیر عاقل یعنی غیر مسلم آبا کی تقلید مذموم ہے۔ عاقل یعنی مسلم آبا سے ہدایت نہ حاصل کرنا عقل کی نہیں، بلکہ اندھی عقل کی بات ہے، جیسا کہ ہر ناخلف کا شیوہ ہوتا ہے۔ اگر عالم باعمل آبا کی تقلید سے روگردانی اور بیزاری کو عقل کا معیار قرار دیا جائے تو پھر تو اسلامی معاشرہ میں "بیٹلز" اور "ہپیز" ہی پیدا ہوتے رہیں گے۔ کچھ ایسے ہیں جو وحی کی برتری کو مانتے ہیں اور وحی ان کے پاس موجود بھی ہے لیکن اس سے استفادہ نہیں کرتے۔ ایسے لوگ کمثل الحمار یحمل اسفارا، چارپایہ بر و کتابے چند، کے مصداق ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو صریح عناد رکھتے ہیں، ایسے لوگوں سے کوئی امید رکھنا عبث ہے۔

عقل سلیم رکھنے والا جو "ھویٰ" سے مغلوب نہ ہو اور عناد سے پاک ہو وہ اسلام کی دعوت قبول کرتا ہے اس لیے کہ اس کا مخاطب عقل ہی ہے۔ دعوت کے مرحلہ میں اسلام تفکیر فی الخلق پر اکساتا ہے۔ گرد و پیش کے طبیعی عجائبات اور تغیرات پر غور و فکر کرنا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اس غور و فکر سے عقل مطبوع میں جو سوالات ابھرتے ہیں اسلام

انھیں پر زور دے کر ان کے جوابات کی تلاش و جستجو کا مطالبہ کرتا ہے۔ ایک مرتبہ یہ تلاش و جستجو بیدار ہو جائے اور قوت پکڑے تو عقل انسانی از خود توحید کی دہلیز تک پہونچ جاتی ہے۔ اسلام ہاتھ پکڑ کر اللہ واحد کا وہ جلوہ دکھاتا ہے جو تشبیہ و تجسیم سے منزہ ہے۔ اسی طرح بنیادی طور پر نیک و بد کی تمیز عقل مطبوع کا خاصہ ہے چنانچہ نیکی کے حق میں اور بدی کے خلاف اسلام بجز اس کے اور کوئی دلیل نہیں لاتا کہ تمہاری عقل مطبوع، تمہاری فطرت اس کو نیک و بد بتاتی ہے۔ "معروف" و "منکر" کے معنی ہی ہیں تمہارے دل کی قبول کی ہوئی اور رد کی ہوئی چیز۔ نیک و بد کی بنیادی تمیز، جو عقل مطبوع کا خاصہ ہے، انسان کو ایک مکمل نظام اخلاق اور ضابطۂ حیات کی تلاش پر مجبور کرتی ہے لیکن اس تلاش میں عقل انسانی زمان و مکان کی قیود میں جکڑ بند ہونے کی وجہ سے مکمل نظام اخلاق و ضابطۂ حیات ت دو چار نہ ہاتھ لب بام رہ جاتی ہے نتیجہ یہ کہ جب وحی الٰہی اس کی دستگیری کرتی ہے تو وہ احسان مندی کے جذبہ کے ساتھ اس کے پیچھے ہو لیتی ہے اور اس کو اپنا مخالف یا غیر سمجھنے کے بجائے سچا معاون اور واقف کار رہبر جانتی ہے۔ جیسے ہی عقل وحی پر اعتماد کرتی ہے نبوت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ دعوت کے مرحلہ میں اسلام کا مخاطب تمام تر عقل مطبوع سے ہے۔ اللہ کے وجود اور وحدانیت کو پہچاننا اور اپنی کوتاہیوں کے پیش نظر وحی کی ضرورت کو محسوس کرنا خالصتہً عقل سلیم کا کام ہے۔ یہاں تک کہ اگر اسلام کی دعوت نہ بھی پہونچے تو اجمالی توحید اور نظام اخلاق کی تلاش کی حد تک عقل کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔

ایمان لانا عقل کا ذمہ دارانہ فعل ہے۔ اس کی نوعیت خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ ایمان لانے کے بعد عقل وحی کی برتری اور اس کی رہنمائی تسلیم کرتی ہے اب عقل اپنی مرضی اور اختیار سے اپنی تکمیل ذات اور فلاح دارین کی خاطر اپنے آپ کو کمالِ علم و قدرت رکھنے والی ہستی کے سپرد کر دیتی ہے اور اس کے اوامر و نواہی کی منتظر رہتی ہے، اسی کا نام اسلام ہے۔ اتنا تو ظاہر ہے کہ یہ عقل کی طرف سے ایک ضبط و نظم کا التزام ہے اور ضبط و نظم تکمیل ذات کے لیے ہوتا ہے، صلاحیتوں کو بے راہ روی سے

محفوظ کرکے انھیں ترقی دینے اور بروئے کار لانے کے لیے ہوتا ہے، عقل کی کوششیں بھی ضبط و نظم ہی سے بارآور ہوتی ہیں۔ اگر کوئی ایمان اور اسلام کو عقل کی آزادی پر قدغن اور اس کے لئے زنجیر پا سمجھتا ہے تو اس کو اختیار ہے کہ اس مرحلہ پر وحی کا جُوا اپنے سر سے اتار پھینکے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کرکٹ کا کھیل یا کوئی اور کھیل: کھیل کے قواعد و ضوابط کا پابند ہو کر ہی انسان اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکتا ہے اور اپنی مساعی کو بارآور بنا سکتا ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھے کہ قواعد و ضوابط کا التزام کرکے وہ اپنی آزادی مفت کھو رہا ہے تو اس کو چاہیے کہ کھیل میں شریک ہی نہ ہو اور بے قاعدہ اندھا دھند گیند اچھال کر اپنا دل خوش کرے اور بعد کو وقت گزرنے کے بعد اپنی صلاحیتوں کے ضائع جانے پر افسوس کرتا رہے۔ البتہ اس کی کسی کو اجازت نہیں ہوگی کہ قواعد و ضوابط کا التزام کرکے کھیل میں شامل ہو اور پھر اپنی عقل کے زعم میں ان قواعد و ضوابط سے سرتابی کرے یہاں تک ان قواعد و ضوابط میں مین میخ نکالے۔ ہم سب کا آئے دن کا تجربہ ہے کہ بعض پست ہمت اور خود غرض کھلاڑی اس قسم کی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ اردو کی مثل "ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا" انھیں لوگوں پر صادق آتی ہے۔

سب سے اہم اس فرق کو ملحوظ رکھنا ہے کہ دعوت کے مرحلہ میں اسلام کا خطاب "عقل سلیم" سے ہے اور قبول دعوت کے بعد خطاب "عقل مُسلم" سے ہے۔ دونوں میں بنیادی فرق ہے جسے بسا اوقات نظر انداز کر دیا جاتا ہے، اسی باعث بہت سے مغالطے اور الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ عقل سلیم کسی کی تابع نہیں ہوتی اپنی بھلائی، برائی خود سوچتی ہے۔ اسکے برخلاف عقل مسلم سے وحی کا انداز خطاب استعلا کے طریقہ پر ہوتا ہے، یوں کہنا چاہیے کہ عقل مسلم سے وحی اسی طرح مخاطب ہوتی ہے جس طرح استاد شاگرد سے۔ استاد شاگرد کے باہمی تعلقات کی اساس شاگرد کی جانب سے اس اعتراف پر اور استاد کی جانب سے اس شعور پر ہوتی ہے کہ شاگرد کی بھلائی اور تکمیلِ ذات کے طریقوں کو خود شاگرد کی بہ نسبت استاد بہتر سمجھتا ہے۔ شاگرد کی عقل کا کام یہ ہے کہ وہ استاد کے اوامر و نواہی پر غور کرے، استاد کی بتائی ہوئی راہوں پر چلے اور بالآخر ذکاوت، اخلاص اور کثرت ممارست سے وہ حس اور ملکہ پیدا

کرے کہ استاد کی عدم موجودگی اور سکوت کی حالت میں بھی استاد کی مرضی معلوم کر سکے اور اس کے بموجب عمل پیرا ہو۔ یہ کوئی ایسی مبہم، غیر یقینی یا نادر بات نہیں ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کا تجربہ ہوگا کہ صریح ہدایت نہ ہونے کے باوجود ہم جان لیتے ہیں کہ ہمارے استاد ہمارے لیے کیا پسند کرتے ہیں۔ بہت سے خادم اور ماتحت بھی یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے مخدوم کسی ایک نئی بات سے جو پہلے تجربہ میں نہ آئی ہو خوش ہوں گے یا ناخوش۔ حد یہ ہے کہ غیر مخلص، مطلب پرست چاپلوس اور خوشامدی بھی اس حس اور ملکہ سے خوب کام نکالتے ہیں۔ شرط صرف ایک ہے کہ اور وہ یہ کہ ہم اپنی عقل کو اپنے سے بلند ہستی کی وحی، توجیہ اور اشارے سمجھنے میں لگائیں نہ یہ کہ اپنی وقتی پسند، خوشی اور آسانی کے مطابق خود اپنی راہ نکالیں۔ بہ حیثیت استاد میرا تجربہ ہے اور دیگر اساتذہ میری تصدیق کریں گے کہ کبھی کبھی ایک طالب علم اپنی عقل سے یہ فیصلہ کر کے آتا ہے کہ اس کی بھلائی اسی سال امتحان دینے میں ہے۔ میں بحیثیت استاد اس سے یہ کہتا ہوں کہ تم اس سال امتحان نہ دو، تمہاری بھلائی اس میں ہے کہ ایک سال اور محنت کر کے اور اپنی خامیاں پوری کر کے آئندہ سال امتحان دینا۔ یہ طالب علم رسمی طور پر میرا شاگرد ہے، عقل بھی رکھتا ہے۔ میں خود اس کی تیزی اور ذہن کی کا معترف اور قدر دان ہوں لیکن وہ اپنی عقل کو میرے امر و نہی کے سمجھنے کے لیے وقف کرنے کے بجائے خود رائی کی تدابیر نکالنے میں صرف کرتا ہے۔ یہ مثال ہے عقل غیر مسلم کی۔ میں اپنے بعض رفقائے کار کو دیکھتا ہوں کہ وہ ایسی عقل غیر مسلم کی بغاوت سے ڈر کر اپنے امر و نہی میں ترمیم کر دیتے ہیں۔ یہ وہی چیز ہے جس سے آئے دن ڈرایا جاتا ہے کہ اگر مذہب میں ترمیم نہ ہوئی تو موجودہ نسل اور موجودہ نہیں تو آئندہ نسل تو ضرور دین و مذہب چھوڑ بیٹھے گی۔ اس کے برخلاف ایک دوسرا طالب علم ہے جو اپنی عقل سے کوئی فیصلہ کیے بغیر مجھ سے ہدایت لینے آتا ہے کہ ایسی صورت میں مجھے کیا کرنا چاہیے میں اسے جو ہدایت کرتا ہوں اسے کمال طاعت کے ساتھ گرہ میں باندھ لیتا ہے! اپنی عقل کو میری ہدایت پر غور و خوض میں لگا دیتا ہے یہاں تک کہ اس کی علت اور مصلحت کو خوب سمجھ لیتا ہے اور نہ صرف اس معینہ صورت میں اس پر عمل کرتا ہے بلکہ دیگر مماثل حالات میں بھی میری مرضی اور منشا کو پورا کرتا ہے اور خواہ دوسرے طالب علم اتفاقی طور پر زد و ترکامیابی حاصل

کرتے نظر آئیں اسے قلبی اطمینان ہوتا ہے کہ اس کی فلاح میری ہدایت پر چلنے میں ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "أیحسب الانسان ان یترک سدی" ـــــــ انسان کے شتر بے مہار کی طرح ہونے کے معنی یہی ہیں کہ وحی کو اوّلیت دیے بغیر تمام تر اپنی عقل پر بھروسہ کرے عقل ہی کو معیار قرار دے۔ ایسے انسان کو حقیقت میں وحی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا لیکن معاشرہ کے دباؤ اور اخلاقی جرأت کی کمی کے باعث وحی سے ناطہ توڑ بھی نہیں سکتا اس لیے عقل ہی کی ڈیری سے کام لے کر عقل کے فتویٰ کو مذہب پر نافذ کرنا چاہتا ہے۔ اس عقلِ بے مہار یا عقلِ بے عقال، کے مقابلہ میں "عقلِ مسلم" کا دائرہ عمل اور طریق کار دونوں بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ عقلِ مسلم کا دائرہ عمل صرف فقہ ہوتا ہے یعنی نصوص کا علم و فہم اور ان سے استنباطِ احکام مماثل حالات میں قیاس اور جہاں نص موجود نہ ہو وہاں دین کے اقتضا کی بابت تحرّی اور اجتہاد۔ یاد رہے کہ دین کے اقتضا کی بابت تحرّی اور اجتہاد محض عقلی کاوش سے بالکل مختلف ہے۔ اس کو یوں سمجھیے کہ ایک مسلم جسے سمت قبلہ معلوم نہیں وہ کیا کرے گا؟ اگر وہ ایسی صورت میں اپنے آپ کو آزاد سمجھتا ہے کہ جس سمت اس کا دل چاہے یا جس سمت کھڑا ہونا اس کو خوشگوار اور آرام دہ معلوم ہو اس سمت نماز پڑھ لے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ عقل نے رسی تڑا لی اور وہ پھر بے مہار ہو گئی۔ یہ تحرّر ہے۔ اور اگر وہ سمتِ قبلہ معلوم نہ ہونے کی صورت میں بھی اپنے آپ کو سمت قبلہ کا پابند سمجھتا ہے تو وہ اپنی مرضی اور آرام سے قطع نظر عقل کی کاوش اور کوشش اس میں صرف کرے گا کہ سمت قبلہ کس طرف ہو سکتی ہے۔ اس طرح عقل بدستور مسلم رہے گی اور اس کا نام "تحرّر" نہیں "تحرّی" اور اجتہاد ہوگا۔

یہاں جزئیات میں نہیں پڑنا صرف عام ذہنیت اور رجحانات سے بحث ہے۔ یہی رجحان جس کو ابھی "تحرّر" کا نام دیا گیا۔ اس کا ایک شاخسانہ یہ ہے کہ دین کے اداروں کی ہیئت ـــــــ مثلاً زکوٰۃ اور قطع ید کی ہیئت ـــــــ کبھی دیوارِ زنداں معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس ہیئت کی مخاطب صرف "عقلِ مسلم" ہے، اس کی مخاطب عقلِ محض ہو ہی نہیں سکتی جب یہ ہیئت دیوارِ زنداں معلوم ہونے لگے تو سمجھ لینا چاہیے کہ "عقلِ مسلم" معلق یا منسوخ کر دی گئی ہے اور عقلِ محض پس پردہ کارفرما ہے۔ یہ عقلِ محض ہی تو ہے جو یہ بتاتی ہے کہ موجودہ دنیا

میں غیر اسلامی افکار کے فیشن شو (Fashion Shows) میں شمولیت کے لیے ہیئت بدلنا ضروری ہے اور ہیئت میں رکھا کیا ہے؟ تمام اسلامی اداروں اور اسلامی احکام کے ساتھ وہی عمل کرو جو ایک ماہر کیمیا اپنی تجربہ گاہ میں کیا کرتا ہے۔ ان اداروں یا احکام سے ان کی روح آور ان کی اقدار کو جدا کرو اور پھر انھیں وہ شکل و ہیئت دیدو جو زمانہ حال میں مقبول ہو بس تم مسلمان کے مسلمان رہو گے اور "ماڈرن" بھی بن جاؤ گے، اپنے بھی خوش رہیں گے اور غیروں کی محفل میں بھی باریابی کا شرف حاصل ہوگا۔ یاد آیا کہ قدیم فلسفیوں کا ایک گروہ تھا جو اپنے وجود میں بھی شک کرتا تھا مسلم فلاسفہ ان سے تنگ تھے۔ خود اپنے وجود کی دلیل دوسروں سے مانگتے تھے اور جو بھی دلیل دی جائے اس کا انکار کر دیتے تھے۔ بالآخر ایک منچلے چلبلے نے یہ تجویز کی کہ انھیں خوب پیٹا جائے یہاں تک کہ یہ چلّا اٹھیں: "میں ہوں اس لیے کہ میں چوٹ کی تکلیف محسوس کرتا ہوں،' یہ علاج کہیں زیادہ کارگر تھا اس علاج بالنفس سے کہ "میں ہوں اس لیے کہ میں فکر کرتا ہوں۔" ان روح نکالنے والوں سے بھی کوئی پوچھے کہ اگر آپ کی روح آپ کی جسمانی ہیئت سے جدا کر دی جائے تو آپ کہاں رہیں گے؟ خیر! یہ تو مناظرانہ جواب تھا، ٹھنڈے دل سے کہنے کی بات یہ ہے کہ اسلام کی اقدار تو وہی کی وہی ہیں جو عقل محض، عقل سلیم (دعوت قبول کرنے سے قبل) سے ابھرتی اور ابھرتی ہیں، انسان کی فطرت میں خدا کی طرف سے ودیعت کی گئی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو اسلام اور عقل محض یا فطرت انسانی میں بھی ویسا ہی تصادم نظر آئے جس کی مثالیں بعض دوسرے مذاہب میں ملتی ہیں۔ مگر اسلام تو دین فطرت ہے "فِطْرَةَ اللهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا" اسلامی اقدار کا فطرت انسانی کے عین مطابق ہونا تو خود اسلام کے دعوے کے بموجب ضروری ہے۔ پھر اسلام کی ضرورت کیا ہے؟ عقل محض ہی کیوں کافی نہ ہو؟ یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام عقل انسانی کی جو مدد کرتا ہے وہ صرف اتنی ہے کہ ان اقدار کے لیے جو فطرت انسانی میں ودیعت کی گئی ہیں عمل کی ایک مخصوص شکل و ہیئت پیش کرتا ہے۔ اقدار تو عقل محض کے لیے اجنبی نہیں، یہ دوسری بات ہے کہ کسی کی گرفت ان پر نسبتاً مضبوط ہو اور کسی کی ڈھیلی۔ البتہ عقل محض ہمیشہ سے اسی میں سرگرداں اور ناکام رہی ہے کہ ان اقدار کو انسان کی

عبادات، معاملات اور پوری کی پوری ظاہری اور باطنی زندگی میں کیا منظم اور جامع شکل وہیئت دی جائے۔ مثال کے طور پر چوری عقل انسانی کے نزدیک قابل سزا ہے۔ جو چوری کرتا ہو وہ بھی اپنے آپ کو چور کہلانا پسند نہیں کرے گا۔ یہاں تک کہنا چاہیے کہ اسلام عقلِ سلیم کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔ جہاں عقل کے پر جلنے لگتے ہیں اور اسلام آگے بڑھتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مکمل ضابطۂ حیات میں اس جرم کی وضع، اس کا درجہ اور اس درجہ کے مطابق اسکی سزا اور سزا کی نوعیت اور سادہ اور عام فہم حد معین کرتا ہے۔ ایک اور مثال لیجیے۔ غنی کا زائد از ضرورت دولت سے فقیر کی حاجت روائی کرنا ایک فطری انسانی جذبہ ہے۔ عقل کے نزدیک مستحسن ہے، لیکن چونکہ عقل مکمل ضابطہ حیات میں اس کی شکل معین کرنے سے عاجز ہے، اسی لیے یہ جذبہ بسا اوقات عملی طور سے غیر فعال اور بے کار ہو جاتا ہے اور بہت نیچے دب کر جب پورے زور سے ابھرتا ہے تو کمیونزم جیسی شکلیں اختیار کر لیتا ہے، جسے کہنا چاہیے کہ اس انسانی جذبہ کی غلط تفسیر ہے۔ اسلام اس فطری جذبہ کو، اس انسانی قدر کو، اس عقلِ سلیم کے تقاضے کو ایک سادہ مگر نہایت ہی واضح اور عام فہم شکل وہیئت دیتا ہے، جس کی تعیین میں یہ امر ملحوظ ہے کہ جو سارے نظامِ حیات سے پوری طرح ہم آہنگ ہو۔ اب سوچیے کہ اعمال اور ضابطۂ حیات کی ہیئت اور شکل بدل دینے سے اسلام اور وحی کا حصہ تو ختم ہو گیا، باقی جو رہ گیا وہ عقلِ محض اور سادہ فطرت کا حصہ ہے، جو دین تو دین دنیا کی فلاح کے لیے بھی ناکافی ہے۔

ایک اور طریقہ سے دو ذہنیتوں کا فرق دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک ذہنیت صحابہ کی تھی جو ہر موقع پر کہا کرتے تھے، افسوس رسول اللہ سے یہ نہ پوچھ لیا وہ نہ پوچھ لیا، یعنی وہ اعمال کی ہیئات و اشکال کی تعیین میں وحی کی مدد کے مزید طالب تھے، دوسری ذہنیت اس بیسویں صدی کیا ہماری ہے کہ جو ہیئات و اشکال خدا کی طرف سے ہمیں دی گئی ہیں ان سے دل تنگ ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ ہیئات و اشکال بھی معین نہ ہوتیں اور اسلام کنفیوشس کی تعلیمات کی طرح صرف مبہم اقدار کا مجموعہ ہی رہتا تو کیا اچھا ہوتا، پھر ہم کیسے آزاد ہوتے۔ چونکہ ان ہیئات و اشکال کا تعین ثابت ہے اور تیرہ صدیوں نے ان پر اعتراف کی مہر ثبت کر دی ہے اس لیے اب ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہیئات و اشکال قرونِ اولیٰ کے لیے تھیں، ہمارے لیے نہیں۔ یہ

وہی "تحرک" ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ سارا عذر یہ ہے کہ ہمیں بیسویں صدی میں رہنا ہے اور اس زمانے کے رجحانات کا ساتھ دینا ہے۔ اچھا تو اس زمانے کے رجحانات کیا ہیں؟ سائنس کی ترقی، صنعت، تجارت۔ رہی جمہوریت تو اس کا بھاؤ تو آج کل گرا ہوا ہے، اس کی بھی قدر ہی قدر باقی رہ گئی ہے، شکل و ہیئت تو ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے مختلف ممالک میں بیسیوں بار بدلی اور اب بھی آئے دن بدلتی رہتی ہے، سوشلزم سے اس کی آنکھ لڑی ہے۔ "آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟" ـــــ اچھا تو کوئی بتلائے کہ سائنس کی ترقی کے لیے اسلامی نظام حیات کی کونسی اشکال و ہیئات میں تبدیلی ضروری ہے؟ سائنس علم ہے، علم کاوش چاہتا ہے، خدا ہمیں بھی توفیق دے، نظام چاہے امریکہ کا ہو، چاہے روس کا، چاہے ماؤزے تنگ کا ہو، چاہے چیانگ کائی شیک کا، اور ہاں چاہے میکاڈو کے جاپان کا، جس نے جتنی محنت کی اس نے اتنی علم میں ترقی کی، اگر آج ہم سائنس میں پیچھے ہیں تو اس کے ذمہ دار تمام تر ہمارے سائنس داں ہیں نہ کہ مولوی ملّا۔ تقریباً پندرھویں صدی تک سائنسی علوم کی مشعل ہمارے ہاتھ میں تھی اور اس وقت تک ہم نے اسلامی نظام حیات میں علوم کی ترقی کی خاطر کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ہمارے سائنس داں صرف ایک رخصت کے طالب ہو سکتے ہیں اور وہ یہ کہ انھیں اسلامی علوم سے، قرآن حدیث سے معاف کر دیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے انیسویں صدی کے لائق صد تعظیم و تکریم علماء[1] یہ رخصت دینے کو تیار نہ تھے لیکن انگریز نے نہ صرف سائنس دانوں کو بلکہ ہر "تعلیم یافتہ" مسلمان کو اسلامی علوم سے رخصت دلا ہی دی۔ سر سید کو صرف ایک فکر تھی اور وہ یہ کہ مسلمانوں کو حکومت اور سیاست میں وہ مقام مل جائے جو ایک مستقل قوم کے شایان شان ہو اور ان کے ساتھ

---

[1] یہ وہ علماء ہیں جنھوں نے انگریزی پڑھی، عبرانی پڑھی، توراۃ پڑھی، انجیل پڑھی اور علمی سطح پر عیسائی پادریوں کو شکست فاش دی۔ انھوں نے عملی سیاست میں گراں قدر حصہ لیا۔ دینی تعلیم اور اسلامی علوم کے حق میں جدید انگریزی تعلیم کے جن نتائج و عواقب کی انھوں نے پہلے روز پیشین گوئی کی تھی وہ سو فی صدی صحیح ثابت ہوئی۔

وہ سلوک نہ ہو جو ایک ناکارہ اور معاند اقلیت کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس مقصد کی خاطر انھوں نے بھی اسلامی علوم سے رخصت دینا گوارا کر لیا۔ ان کا خیال تھا کہ اسلامی علوم کی تلافی اسلامی تربیت سے ہو جائے گی۔ انھوں نے خلوص اور نیک نیتی سے جو چاہا تھا وہ تو اللہ نے پورا کر دیا، وہ علیگڑھ کی بدولت مسلمانوں کو حکومت میں مناصب ملے اور ریاست میں پاکستان ملا لیکن ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوا اور یہ سراسر غلط تھا ہی کہ علم کی تلافی کسی درجہ میں بھی تربیت سے ہو سکتی ہے۔ تربیت علم سے فائدہ اٹھانا سکھاتی ہے۔ علم کی جگہ تو نہیں لے سکتی، چنانچہ اسلامی علوم سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ محروم رہا۔ شبلی کو اس کا اندازہ تھا اور اکبر کی دوررس نگاہ تو وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی جو آج پیش آرہا ہے ؎

شکر ہے راہ ترقی میں اگر بڑھتے ہو — یہ تو بتلاؤ کہ قرآں بھی پڑھتے ہو ؟
دین کو سیکھ کے دنیا کے کرشمے دیکھو — مذہبی درس "العدیہ" ہو علیگڑھ تے ہو

یہ بات تو کھری ہو، ہرگز نہیں ہو کھوٹی — عربی میں نظم ملت بی۔ اے میں صرف روٹی
لیکن جناب لیڈر یہ شعر سن کے بولے — بندھوائیں گے یہ حضرت اس قوم کو لنگوٹی
اس بات کو خدا ہی بس خوب جانتا ہے — کس کی نظر ہے غائر، کس کی نظر ہے موٹی

الغرض ایک صدی سے زیادہ عرصہ ہو گیا کہ ہمارے سائنس داں علوم اسلامیہ سے بے بہرہ ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں قوم کا نقصان ہے یا فائدہ، لیکن اتنا تو ہے کہ اگر ہمارے سائنسداں کمال پیدا نہ کر سکیں تو ان کے لیے دین، مذہب یا مولوی ملا کے سر الزام دھرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ جب تک ہمارے سائنس دان علوم اسلامیہ سے بے بہرہ ہونے کے ساتھ ساتھ بے تعلق بھی تھے اسوقت تک کم از کم ان کی دیانتداری کا بھرم تھا، لیکن گزشتہ بیس سال سے یعنی قیام پاکستان کے بعد سے ہمارے سائنس دانوں کو بھی یہ شوق ہوا ہے کہ وقتاً فوقتاً اپنے عمل اور تجربہ گاہوں کے حدود سے نکل کر اسلام کی آبیاری اور سرپرستی کریں۔ دراصل پاکستان میں اسلام کی حیثیت ایک یتیم مگر مالدار بچے کی ہے جس کا متولی اور سرپرست بننے کا ہر ایک ہی خواہش مند ہے۔ لیکن اس دور میں سائنس دان کے شریک ہونے سے سائنس کے

وقار کو بٹہ لگتا ہے۔ ہم غیر سائنس داں سائنس کو احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں اس لیے کہ اس میں اٹکل پچو باتوں کی اور خیال آرائی اور لاف زنی کی گنجائش نہیں، اسی لیے ہم کبھی سائنس کی حدود میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کرتے اور اگر بے غیرتی لاد کر کبھی جرأت کر بھی بیٹھیں تو سائنس کے پاسبانوں سے امید نہیں کہ وہ ذرا بھی مروّت اور رواداری سے کام لیں گے۔ اس کے مقابلے میں جب سائنسداں اسلام کے حدود میں گشت کو نکل آتے ہیں تو انھیں دیکھ کر سب سے پہلے سائنس کے ساتھ ان کی وفاداری میں شک ہونے لگتا ہے۔ جو سائنس داں بغیر علم کے کسی بھی مسئلہ پر بولے اس کے متعلق یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس نے سائنس کا پہلا سبق بھی نہیں سیکھا۔ کہتے ہیں اور بار بار اسی کو دہراتے ہیں کہ اسلام مطالعۂ کائنات اور تسخیر کائنات پر زور دیتا ہے۔ ٹھیک ہے۔ توجیہ دعوت کے مرحلہ میں اسلام انسان کے اس فطری رجحان کا واسطہ دیتا ہو اور اس سے ہدایت کا راستہ نکالتا ہو۔ قبول دعوت کے بعد بھی اسلام انسان کے اس فطری رجحان کو آزاد چھوڑتا ہو اور چونکہ مادہ کوئی گھناؤنی چیز نہیں، دنیا کی آسائشیں اللہ کی نعمت ہیں اور اپنے جائز حدود میں تمتع بندہ کی طرف سے اللہ کے شکر کا موجب ہوتا ہو اور شکر اللہ کی طرف سے زیادتی کا ارمغان لاتا ہے، اسلیے اجازت ہو بلکہ پسندیدہ اور مستحب ہو کہ تسخیر کائنات کرتا چلا جائے، اور جہاں تک تسخیر کائنات سے پیدا ہونے والی فوجی مسلح طاقت کا تعلق ہے تو وہ تو فرض ہو کہ اس میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے لیکن مطالعہ کائنات اور تسخیر کائنات تو انسان کی فطرت میں ہے۔ اگر کوئی دین مذہب اس پر قدغن لگائے بھی تو انسان اس دین مذہب کے خلاف بغاوت کر دیتا ہے، پھر اس کے لیے عقل انسانی بالکل کافی ہے۔ وحی سائنس نہیں بلکہ مکارم اخلاق کی تتمیم اور تکمیل کے لیے آئی ہے۔ چنانچہ وحی مطالعۂ کائنات کی طرف شوق دلانے والے اور معنی خیز مفید مطلب اشارے کرکے آگے بڑھ جاتی ہو اور قبول دعوت کے بعد وحی تمامتر اہتمام کتاب اللہ کی تعلیم کا کرتی ہے جو کہ زندگی کی غایت اصلی ہے۔ قرآن کے مجموعی نظام میں کتاب فطرت کی حیثیت وہی ہے جو قصیدہ میں تشبیب کی ہوا کرتی ہے۔ کتاب اللہ کا درجہ مدح یا قصیدہ کے مقصد اصلی کا ہے۔ قبول دعوت گویا کہ مخلص یا گریز ہے چنانچہ جیسے ہی حسن فطرت کے ذکر سے سامع کی توجہ حاصل ہوتی ہے اس کے سامنے اللہ کا ذکر اور اس کا کلام رکھ دیا جاتا ہے اور یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ اللہ کے کلام کو پڑھے، اسے سمجھے، اس میں غور و فکر کرے، استنباط احکام کرے اور دنیا میں شریعت نافذ کرے۔ ہمارے

سائنس داں جو شنی سنائی ادھوری بات لے اڑتے ہیں۔ اس سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اللہ یہ تاکید کرنے کے لیے ہی نازل کی گئی تھی کہ کبھی کتاب اللہ نہ پڑھنا، سیرت کو سنوارنے کی فکر نہ کرنا، بس مطالعۂ کائنات اور تسخیر فطرت میں لگے رہنا۔ اللہ کی اطاعت صرف اس میں ہے کہ چاند پر پہونچ جانا، چاند پر قرآن لے کر جانے سے حاصل؟ کیا سائنس دانوں کی ساری جدوجہد اس لیے ہے کہ وہاں علمائے دین آباد کیے جائیں جو اس زمین پر بار دوش ہیں؟ کوئی میری باتوں کو ہذیان نہ سمجھے۔ سب کو یاد ہونا چاہیے کہ ہمارے متعدد سائنس دان متعدد بار منبرِ عام سے یہ کہہ چکے ہیں کہ اگر پاکستان کی فلاح مطلوب ہے تو نہ صرف اسلامی علوم بلکہ تمام آرٹس کے شعبوں میں تالے ڈال دینا چاہیے۔ یہ عقل کی رعونت بھی ہے اور بہانہ تراشی بھی۔ اس رعونت کیساتھ جب کوئی اپنے مقاصد کے لیے اسلام کو بیچ میں لائے تو اسے مصلحت پرستی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

اسی ذیل میں یہ کوشش بھی کی جاتی ہے کہ قرآن میں جو "الحکمۃ" کا لفظ استعمال ہوا ہے اُسے سائنس کے مرادف قرار دیا جائے۔ قرآن کو علوم طبیعیہ کی تعلیم سے کوئی سروکار نہیں، وہ قرآن تو کتاب کے ساتھ اخلاق کی عملی تربیت کا اہتمام کرتا ہے۔ "الحکمۃ" سے یہی مراد ہو سکتی ہے اور سب تو نہیں، بعض سائنس داں اور غیر سائنس داں ماہر تعلیم بھی اس پر اتر آتے ہیں کہ سائنس میں ترقی نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنا رکھا ہے۔ انگریزی کی جگہ لینے کے لیے جو بہت سی ملکی زبانیں تیار ہیں اور ہو رہی ہیں ان میں سے صرف اردو کو لیجئے۔ ہمارے بعض مصلحت پرست اور سیاست آشنا ماہر تعلیم جو خود کبھی اُردو کو ہلکی پھلکی جذباتی تقریروں کے علاوہ، علمی اغراض کے لیے استعمال نہیں کرتے وہ تو یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ اگر اردو کے اسلامی لٹریچر کو ایک پلڑے میں رکھا جائے اور عربی، فارسی، ترکی تینوں زبانوں کے مجموعی اسلامی لٹریچر کو دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو اردو کا پلڑا بھاری رہے گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جو کبھی اسلامیات کا ادنیٰ طالب علم بھی نہ رہا ہو اور جو عربی سے نابلد ہو وہ اس حد تک جرأت کرے اور جاہل عوام کا تو ذکر کیا، پڑھے لکھے سنجیدہ لوگ اسکی اجازت دیں اور خاموشی سے سنتے رہ سکتے ہیں کہ واہ واہ بھی ہوئی

ہو، تو سمجھ لینا چاہیے کہ ملک میں علمی قدریں بالکل ہی پامال ہو چکی ہیں[1] — ایں چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم

بہت زیادہ حسن ظن اور حسن تعلیل سے کام لیا جائے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ عربی قرآن ایک ہے اور ایک ہی رہے گا، اس کے مقابلہ میں اردو تراجم کے انبار کو رکھا جائے تو یقیناً اردو کا پلڑا بھاری رہے گا، اس سے قطع نظر یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہماری چودہ سو سالہ تاریخ میں ساڑھے بارہ سو سال تک عرب، ایران و ماوراء النہر اور ترکی کی علمی زبان عربی ہی رہی، مقامی زبانوں کو عربی سے انتساب پر فخر رہا۔ خود ہندوستان میں انگریزوں کی آمد تک اردو کسی مدرسہ میں پڑھی پڑھائی نہیں گئی، علم کی اور ساری نصابی کتب کی زبان عربی اور صرف عربی تھی۔ پھر یہ تو بدیہی بات ہے کہ اگر اسلامیات کی پشواز آماد کراسے "اسلامی نظریۂ حیات" کا سایہ[2] نہ پہنایا جائے تو قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر کی تعلیم عربی کے بغیر کسی اور زبان میں ہو ہی نہیں سکتی۔ جب اسلامیات کے بازار میں اردو کے سودیشی کھدر کا چلن ہوا اور کم نظروں کو آنکھیں لانے کا موقع ملا اس وقت اہل نظر نایاب اور معدوم نہ تھے۔ ملاحظہ کیجیے:

> "یہ آفت جو اس چند روزہ زمان میں تمام دیار ہندوستان خصوصاً شاہجہان آباد حرسہا اللہ عن الشرور والفساد میں شل ہوئے وبائی کے عام ہو گئی ہے کہ ہر عامی اپنے تئیں عالم اور ہر جاہل اپنے کو فاضل سمجھتا ہے اور فقط اسی پر کہ چند رسالہ مسائل دینی اور ترجمہ قرآن مجید کو اردو کی زبان اردو میں کسی نے استاد سے اور کسی نے اپنے ذہن طبیعت سے پڑھ لیا ہے، اپنے تئیں فقیہ و مفسر سمجھ کر مسائل و وعظ گوئی میں جرأت کر بیٹھتا ہے۔ ....
>
> (آثار الصنادید، حالات مولوی شاہ عبد العزیز)

اس سودیشی کھدر کا چلن محض افلاس علم کے سبب ہوا۔ بعد کو مغربی اثرات کے تحت غیر اسلامی قومیت نے جنم لیا تو ادعائے عقل نے افلاس علم کو سہارا دیا، اس وقت سے

---

[1] چند روز ہوئے ایک مشاعرہ میں محسن بھوپالی کا ایک شعر سنا تھا جو رہ رہ کر یاد آتا ہے:

محسن و رود کم نظراں سانحہ نہیں — یہ سانحہ کہ اہل نظر دیکھتے رہے

[2] پہنا لے سایہ مری جان تا در کہ پشواز — نہ نہ باتو تا ساز د تو با زمانہ بساز

کم نظر آنکھیں دکھانے لگے۔ اسی غیر اسلامی قومیت کے شاخسانہ کے طور پر گزشتہ ایک صدی کے دوران ایران اور ترکی میں زبان کے بارے میں جو تحریکیں چلیں وہ اب تاریخ کا جز بن چکی ہیں اور ان کے اسباب و محرکات اور عواقب و نتائج کا بآسانی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ پاکستان میں جو اس وقت یہ کہا جا رہا ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے اردو کا پلڑا بھاری ہے اور اس کو عربی پر فوقیت حاصل ہے، اس کا ان تحریکات سے مقابلہ کر کے دیکھ لیجئے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایران اور ترکی میں عربی سے نفرت کی وجہ وطن اور نسل تھی اور ہمارے یہاں عربی سے پیچھا چھڑانے کی وجہ اسلام بتائی جاتی ہے۔ پاکستان کا خمیر ایسا ہے کہ ہر اجنبی فکر یہاں داخل ہونے سے پہلے اسلام کا بھیس بدلنے پر مجبور ہے۔ یہ عقل کی روباہی اور عیاری ہے۔

عربی زبان کا چودہ سو سالہ ذخیرہ جو تمام عالم اسلام کی مختلف قوموں کی بہترین کوششوں کا مرہون ہے۔ اس کے مقابلہ میں صرف ایک سو سال میں اردو میں جو کچھ ہوا ہے اس میں قابل قدر انہی علماء کا کارنامہ ہے جن کی ثقافت عربی تھی۔ آخر آخر میں عربی سے بعض استغنا اور عناد کی جو کچھ پیداوار ہے وہ باعث شرم و باعث ننگ ہے۔ انگریز بھی کلاسیکی زبانوں کی اہمیت سے بخوبی واقف تھا، عربی فارسی کے ساتھ اس نے ہمیشہ وہ احترام ملحوظ رکھا جو کلاسیکی زبانوں کا حق ہے، اس کی قدر اس وقت معلوم ہوتی ہے جب ہم یہ دیکھیں کہ آزادی کے بعد سے ہم نے ان زبانوں کی کیا گت بنائی ہے۔ مختصر یہ کہ اقبال کی قدردانی اور وفاداری کا دم بھرنے کے باوجود اگر اردو کے طالب علم سے "اسرارِ خودی" پڑھنے کو کہا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قلعہ معلیٰ کی دیوار میں شگاف پڑ گیا۔ غالب کی عظمت پر کس کو ناز نہیں؟ جشن کی دھوم دھام قریب ہے۔ گستاخی معاف، کوئی پوچھے کہ اردو کے "موحدین"* میں کتنے ایسے ہیں جنھوں نے "نقشہائے رنگ رنگ" کی ایک جھلک بھی دیکھی ہے۔ جو ہیں وہ اسی عہد غلامی کے شاہکار ہیں جن کی طرف ابھی اشارہ ہوا۔ الغرض ایک طرف تو اردو کی جڑیں کاٹ کر اسے اس کی توانائی

---

* "موحدین" وہ جو اردو کے ساتھ عربی فارسی کو شرک سمجھتے ہیں۔ انگریزی دشمنی پر ان کی سیاست کی بنیاد ہے اور انگریزی کے ساتھ وفاع مشترک (Common Defence Treaty) کا معاہدہ کیا ہے۔

کے کلاسیکی سرچشموں سے جدا کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف اس سے ایک علمی زبان کی خدمت لینے کا منصوبہ بنایا جاتا ہے۔ یہ تضاد صرف ایک کوتاہ اندیش اور تنگ خیال قومیت کی سیاسی خود غرضیوں سے میل کھاتا ہے۔ اگر ہمارے سائنس دان کوئی مخلصانہ علمی نقطۂ نظر رکھتے ہیں تو انھیں یہ ماننا پڑے گا کہ اُردو کو علمی زبان اور اعلیٰ مدارج میں ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اُردو نہیں بلکہ عربی فارسی کی باقاعدہ تعلیم کو عام کیا جائے[1]۔ عقل کے کردار سے بحث کرتے وقت یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ تنہا عقل اندھی عصبیتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہاں تک کہ اہل علم کو غیر علمی موقف میں کھڑا کر دیتی ہے۔ عقل کو تعصبات سے (اور موجودہ دور کی قومیت سب سے بڑا تعصب ہے) بچانے کا صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ ہے دین یا رومی کی اصطلاح میں "عقلِ عقل"۔

(باقی)

---

[1] پاکستان میں جو لسانی رقابتیں بالائے سطح یا زیر سطح پائی جاتی ہیں ان کا واحد علاج یہ ہے کہ کلاسیکی زبانوں (عربی فارسی) کو اقتدار اعلیٰ بخشا جائے جو دین، ثقافت، تاریخ ہر لحاظ سے ان کا حق ہے۔

سید محمد عبد العزیز شرقی

حرمِ کعبہ میں

شرقی صاحب بہت قدیم اور مخلص ترین دوستوں میں ہیں، غالباً ہر سال اللہ تعالیٰ ان کے لیے حج وزیارت کی کوئی سبیل پیدا فرما دیتا ہے، جب کبھی حاضری ہوئی اُن سے ضرور ملاقات ہوئی۔ اس سال بھی موجود تھے، ذیل کے اشعار اسی سال کی حاضری کے موقع پر کہے اور الفرقان کے لیے مجھے عنایت فرمائے ——— نعمانی

تیرے گھر کی خیر یارب تیرے دیوانوں کی خیر
ذوق و شوقِ بندگی میں مست پروانوں کی خیر

شوق ایسا والہانہ ایک پر گرتا ہے ایک
جلوۂ شمعِ حرم کی اُس کے پروانوں کی خیر

توڑ کر سارے علائق مال و زر اولاد کے
تیرے در پہ آ پڑے ہیں ایسے مہمانوں کی خیر

لغزشوں سے بچ رہے ہیں مست ہیں ہشیار ہیں
بندگی کی حد پہ قائم ایسے فرزانوں کی خیر

گونجتی ہے کان میں اب تک براہیمی دعا
یا الٰہی غیرِ ذی زرع بیابانوں کی خیر

میٹھے میٹھے دردِ دل کی خیر ہو یارب مرے
چشمہائے ترکے ان لبریز پیمانوں کی خیر

یورشِ اعدائے دیں ہو تیرے گھر کی تاک میں
یا الٰہی تیرے گھر اُس کے نگہبانوں کی خیر

دشمنانِ دینِ حق کی نیتوں میں ہے فساد
خیر و بطحا کی اور اُن کے نگہبانوں کی خیر

قومیت باقی رہی اور قبلۂ اوّل گیا
خیر ہو اسلام کی سارے مسلمانوں کی خیر

وقت کے ایک اہم مطالبہ کا جواب

ہمارے اس زمانہ کا ایک اہم مطالبہ یہ تھا کہ اس بیسویں صدی کے نفسیات اور فکری رجحانات کو سامنے رکھ کر دینی تعلیمات کو براہ راست قرآن و حدیث سے اخذ کر کے ایسے سادہ، دلنشین اور آج کی علمی دنیا کے لیے قابل قبول انداز میں پیش کیا جائے کہ ذہن و دماغ بھی اُسے قبول کریں اور دل بھی متاثر ہوں۔

مولانا نعمانی نے اب سے تقریباً بیس سال پہلے اللہ کی توفیق سے اور اسی کے بھروسہ پر اس کام کو اپنا خاص موضوع بنایا اور خاموشی سے اپنے کو اس میں مصروف کر دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تنہا ان سے وہ کام لے لیا جو دراصل کسی ادارہ کے کرنے کا تھا۔ انھوں نے اس کے لیے کبھی قوم سے کوئی اپیل نہیں کی، کسی فرد سے کبھی کبھی کوئی اعانت اس سلسلہ میں طلب نہیں کی، خاموشی کے ساتھ خود ہی کتابیں لکھتے رہے اور ان کے چھپوانے کا اہتمام کرتے رہے۔

الحمد للہ معارف الحدیث کی چوتھی جلد چھپ جانے کے بعد یہ سلسلہ ایک حد تک مکمل ہو گیا ہے۔ اس کی دو جلدیں باقی ہیں ان کا کام جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ جلد ہی تکمیل کو پہنچائے۔

خدا کے فضل سے اس سلسلہ کی کئی کتابوں کے ترجمے بھی ہندوستان اور بیرون ہند کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں اور امید ہے کہ انشاء اللہ یہ پورا سلسلہ دوسری زبانوں میں منتقل ہو جائے گا۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کتابوں کی خصوصیت اور قدر و قیمت کو عام طور سے سمجھا جائے اور وسیع پیمانے پر ان سے وہ فائدہ اٹھایا جائے جس کی امید میں اللہ کے ایک بندہ نے اسی کی توفیق سے یہ کام کیا ہے۔

یہ اردو زبان میں مندرجہ ذیل چند کتابیں ہیں

۳	۲	۱
قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟	دین و شریعت	اسلام کیا ہے؟

۷	۶	۵	۴
چہارم	سوم	جلد دوم	معارف الحدیث جلد اول

کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

سیرت و سوانح

زاد المعاد (اُردو)

(از حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ پر جو کتابیں گزشتہ صدیوں میں لکھی گئی ہیں اُن میں علم و تحقیق کے لحاظ سے زاد المعاد کا خاص مقام ہے۔ یہ چار جلدوں میں ہے، اس کا اُردو ترجمہ بھی چار ہی جلدوں میں ہے۔

قیمت (مکمل سٹ) مجلد -/۴۸

اصح السیر: — مولانا عبد الرؤف صاحب دانا پوری مرحومؒ کی تالیف کردہ نہایت محققانہ اور مستند سیرتِ نبویؐ — قیمت -/۱۰

خطباتِ مدراس۔ حیاتِ نبویؐ کے مختلف پہلوؤں پر علامہ سید سلیمان ندویؒ کے خطبات جو مرحوم کے علم و تحقیق کا نچوڑ ہیں۔ قیمت: -/۳

رحمتِ عالم (از مولانا سید سلیمان ندویؒ)

یہ کتاب خاص طور سے مدارس اور اسکول کے طلباء کے لئے لکھی گئی ہے — قیمت ۱/۷۵

سیرتِ محمدیہ (از سر سید احمد خاں مرحوم)

صوبۂ یوپی کے ایک انگریز گورنر سر ولیم میور نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک کتاب "لائف آف محمد" لکھی تھی جو زہر افشانیوں اور افترا پردازیوں سے لبریز تھی سر سید مرحوم نے لندن میں بیٹھ کر اس کے جواب میں "سیرتِ محمدیہ" لکھی۔ تاریخی اور معرکۃ الآراء کتاب ہے۔

قیمت (مجلد) -/۱۲

ابوبکر صدیقؓ اور فاروقِ اعظمؓ

تاریخ انسانی کا معجزہ، ۱۲ سالوں میں دنیا کا رُخ بدلنے والے عہد کی تفصیلی داستان (طٰہٰ حسین مصری کے قلم سے) جس کا اُردو ترجمہ شاہ حسن عطا ایم۔ اے نے کیا ہے۔

قیمت ۴/۷۵

صدیقِ اکبرؓ (از مولانا سعید احمد اکبر آبادی)

مولانا شبلی مرحوم کے (الفاروق) کے بعد اُردو زبان میں سیرتِ صدیقِ اکبرؓ کا جو خلا محسوس ہوتا تھا اُس کو اِس کتاب نے کما حقہٗ پُر کر دیا ہے۔ قیمت -/۸

الفاروقؓ — علامہ شبلی مرحوم کا مشہور اور عظیم شاہکار۔ قیمت -/۴

سوانح ابوذر غفاریؓ از۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

صحابۂ کرامؓ میں حضرت ابوذر غفاریؓ کی ایک نرالی شان تھی۔ اُن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ: ابوذرؓ سے زیادہ سچے انسان پر آسمان نے سایہ نہیں ڈالا۔ مولانا نے انکی یہ سیرت بڑے فاضلانہ اور مجذوبانہ انداز میں لکھی ہے۔ قیمت ۴/۲۵

تاریخ ردہ

(از ڈاکٹر خورشید احمد صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی)

عہدِ صدیقی کی بغاوتوں اور عسکری سرگرمیوں کی مفصل تاریخ۔ قیمت: -/۴

عبد اللہ بن مسعودؓ اور انکی فقہ۔ قیمت -/۷

موجودہ قیمت 3/75

Regd. No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow

VOL. 36 NO. 3 JUNE 1968

[ربیع الثانی ۱۳۸۸ھ

مرتب
عتیق الرحمٰن سنبھلی

سالانہ چندہ		سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۷/۵۰	**الفرقان** لکھنؤ	غیر ممالک سے
پاکستان سے ۷/۵۰	ماہنامہ	۱۵ شلنگ
ششماہی		ہوائی ڈاک سے
ہندوستان سے ۴/-		مزید محصولڈاک کا
پاکستان سے ۴/-	فی کاپی ۰/۷۰ پیسے	اضافہ

جلد ۳۶ | بابتہ ماہ ربیع الثانی ۱۳۸۸ھ مطابق جولائی ۱۹۶۸ء | شمارہ ۴

اگر اس دائرہ میں ◌ سرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی اطلاع ۲۸ جولائی تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:- اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں۔ نئے خریدار بھی اسی طریقہ سے چندہ ارسال فرمائیں۔

نمبر خریداری:- براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۱۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۱۵ تاریخ تک آجانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

از عتیق الرحمٰن سنبھلی

۶۷ء کے الیکشن سے ملک کے سیاسی نظام میں جو انتشار اور عدم استحکام پیدا ہوا ہے اس نے جہاں مجموعی طور پر سارے ملک کو نقصان پہونچایا ہے وہاں مسلمانوں کے خصوصی مسائل بھی سنگین تر ہو گئے ہیں۔ مسلم دشمن طاقتوں کو زیادہ آزادی سے سرگرم ہونے کا موقع ملا ہے، ان کی طاقت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ وہ علاقے جہاں مسلم دشمن حلقے دکھائی نہیں دیتے تھے، ایسے کئی علاقوں میں بھی یہ وبا منظر عام پر آگئی ہے اور فسادات کے دور ہونے لگے ہیں۔ اس قسم کے لیڈروں کے حوصلے اتنے بڑھ گئے ہیں کہ جامعہ ملیہ جیسے اداروں کو پبلک جلسوں میں "احکام" دیے جاتے ہیں اور یہ ادارہ جسے اپنے تاریخی پس منظر کی بنا پر سب سے زیادہ جری ہونا چاہیئے تھا ان "احکام" سے متاثر ہونے لگتا ہے۔

حالات کا یہ انداز ذرا بھی نیا نہیں ہے بلکہ برسہا برس کے رُخ کا یہ بس ایک ارتقائی مرحلہ ہے۔ اور حالات کا دیرینہ رُخ مسلمانوں کو پہلے ہی اس نتیجہ پر پہونچا چکا ہے کہ وہ اتحاد کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے جو اُن کے دین کی بھی نہایت اہم تعلیم ہے۔ اس خیال کی پختگی نے مسلمانوں میں ایک پرجوش حرکت بھی پیدا کی اور اس حرکت نے اتحاد ملت کا ایک ڈھانچہ [illegible] کے کھڑا بھی کر دیا۔ مگر اتحاد بذات خود کوئی چارہ ساز طاقت نہیں ہے۔ متحد ہو جانے یا متحد ہو کر کوئی بھی راہ عمل اختیار کر لینے سے کسی قوم کے مسائل حل نہیں ہوتے۔ ضروری ہے کہ راہ عمل بھی صحیح اختیار کی جائے اور تدبیر وہ اپنائی جائے جس کے متعلق [illegible]

فیصلہ ہو کہ مسائل کا حل اس سے کس حد تک ممکن ہے۔ اتحاد کا کام صرف تدبیروں کو طاقت پہنچانا ہے
تدبیر کا جو اثر اس کی فطرت اور خارجی حالات کے ماتحت ہونا چاہیے اس میں کوئی تبدیلی
اتحاد سے نہیں ہو سکتی۔ تدبیر اگر کارگر ہونے والی ہوگی تو اتحاد اس کی کارگری میں اضافہ
کرے گا اور مضر ہونے والی ہوگی تو اسی تناسب سے اس کے مضر اثرات میں بھی اضافہ
ہو جائے گا —— ہاں اگر خدا نہ چاہے تو دوسری بات ہے۔

اس کے علاوہ اتحاد کی بقا اور بڑی حکمت اور بڑی دیکھ ریکھ چاہتی ہے۔ یہ اس قدر نازک
شیشہ ہے کہ ایک نوخیز ملت جو اختلاف و افتراق سے آشنا بھی نہ ہوئی ہو اسے پالی بیداوار کے
انداز پر اس کی تعمیر ہوئی ہو، اس کا اتحاد ٹوٹتے بھی کچھ دیر نہیں لگتی، جیسا کہ خود مسلمانوں کے دورِ
اوّل میں ہوا ہے۔ چہ جائیکہ ایک بری طرح منتشر اور متفرق قوم جو اپنے اختلافات کو ختم کیے
بغیر صرف ایک مشترک مصیبت کے تحت اتحاد کا فیصلہ کرے۔ ایسے اتحاد کی بقا، قدرتی طور پر،
بیحد احتیاط، بیحد باہمی لحاظ اور رد و رعایت کو چاہتی ہے۔

بے شک یہ بات غیر فطری ہے کہ کوئی مکتب خیال اس اتحاد کو اپنی راہ پر کھینچنے کی کوشش
نہ کرے۔ ہر خیال اپنا اتباع چاہتا ہے اور ہر مکتب خیال کی قدرتی امنگ ہوتی ہے کہ وہ
رہنمائی کا مقام حاصل کرے اور اس کے خیال کے مطابق قوم کو اس کی رہنمائی سے فائدہ پہونچے۔
لیکن اس میں صبر و احتیاط بہرحال لازم ہے۔ ایک وقت گزرنا چاہیے کہ ایک مکتب خیال اس
اتحاد کے اندر اپنا حلقہ اثر نہ صرف بہت وسیع کرلے بلکہ اسے اتنی مضبوطی اور پختگی کی منزل
تک بھی پہونچا لے کہ یہ (وسعت اثر) محض ایک وقتی اور جذباتی حمایت نہیں بلکہ فکر و نظر کی ایک
ٹھوس اور گہری وابستگی ثابت ہو سکے۔ صبر و احتیاط کے ساتھ یہ منزل طے کرلی جائے تو پھر کوئی
مضائقہ نہیں کہ یہ مکتب فکر پورے اتحاد کی عملی قیادت پر فائز ہونے کی کوشش کرے۔ اس
منزل پر دوسرے مکتب فکر یا تو اس سے مصالحت قبول کرلیں گے اور یا اگر تفرقہ ہوگا تو اس سے
مقصدِ اتحاد کو کوئی خاص نقصان نہیں پہونچے گا۔ بالفاظ دیگر یا تو اتحاد کا ڈھانچہ ٹوٹنے ہی نہ پائے
گا اور اگر ٹوٹے گا تو ایک زیادہ وسیع مگر کمزور اور کم نتیجہ خیز اتحاد کی جگہ نسبتاً ایک کم وسیع مگر مضبوط
اتحاد اصل مقاصد کو زیادہ بہتر طریقے پر پورا کرے گا۔

ان دونوں امکانات کی مثالیں انڈین نیشنل کانگریس میں موجود ہیں کہ آزادی تک اس میں ایک خاص مکتب فکر حاوی ہوتا چلا گیا مگر کوئی ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی اور آزادی کے بعد ٹوٹ پھوٹ ہوئی تو وہ کوئی خاص اثر نہیں ڈال سکی۔ لیکن اس صبر احتیاط کو چھوڑ کر اگر کسی اتحاد کی اکائیاں عجلت اور بے صبری کی راہ اپناتی ہیں تو اس اتحاد کا حشر وہ ہوتا ہے جو ۶۷ء میں قائم ہونے والی مخلوط حکومتوں کا ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں ہو چکا ہے کہ نہ یہ اتحاد باقی رہا اور نہ اس کی اکائیوں میں سے کوئی اکائی اس حال میں ہے کہ ۶۷ء والی عوامی حمایت کا بھی اسے اپنے لیے بھروسہ ہو ۔

مسلمانان ہند کا یہ اتحاد جیسے جوش، جذبے اور نیک آرزوؤں کے ساتھ وجود میں آیا تھا افسوس ہے کہ اس سنگین تر وقت میں اس کے صرف منہدم آثار دکھائی دے رہے ہیں اور جتنے دن اسے کام کرنے کا موقع ملا اس کا مسائل کے میدان میں کوئی اچھا نتیجہ بھی ہمارے سامنے نہیں ہے بلکہ مسائل کچھ پیچیدہ ہی ہوئے۔ ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اس صورت حال کے اسباب تلاش کرنے کی کوشش کی جائے تو شاید اس نتیجہ پر پہونچنا ہوگا کہ ایک طرف ہم نے بس اتحاد کو اصل چارہ ساز طاقت سمجھ لیا اور تدبیر و عمل کی خوبی و خامی کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ ہم نے کچھ ایسا سمجھا کہ ہمارے معاملات میں کمی بس اتحاد کی تھی۔ یہ کمی پوری ہو گئی تو اب ہم جس راہ پر بھی چل پڑیں، حالات ہمارے حق میں ہونے لگیں گے۔ حالانکہ تنہا اتحاد کبھی کوئی چارہ ساز طاقت نہیں رہی فکر و تدبیر کی صحت اسکے ساتھ شرط ہے۔ اس شرط کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری متحدہ قوت عمل نے کچھ کام بنائے نہیں بلکہ اور بھی پیچیدہ کر دیئے ـــــ دوسری طرف جو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس اتحاد کا ایک مکتب فکر تمام تر عوامی حمایت اپنے ساتھ کھینچ لینے کے باوجود یہ شکل نہیں پیدا کر سکا کہ ایک وسیع مگر ڈھیلے ڈھالے اتحاد کا چراغ اگر دھیما ہو گیا تو اس کی جگہ نسبتاً ایک چھوٹے مگر مضبوط اتحاد نے لے لی ہو اور اس سے وہ تمام مقاصد زیادہ تیزی کے ساتھ پورے کیے جا سکتے ہوں جو ابتدائی اتحاد سے اصل مقصود تھے۔ تو اس کی وجہ بھی طاقت سازی کے اسی قدرتی اصول کو نظر انداز کرنے میں پوشیدہ ہے کہ یہ معاملہ وقتی اور جذباتی حمایت حاصل کرنے کا نہیں بلکہ فکر و نظر کی ٹھوس وابستگی پیدا کرنے کا ہے۔

ہمیں اتحاد کی آج کل سے زیادہ ضرورت ہے اسکے لیے کوششوں میں کمی نہیں ہونی چاہیے مگر اس میں کامیابی اور نتیجہ خیزی کا راستہ وہی ہے جو قدرت نے مقرر کر رکھا ہے۔ ہم اس سے انحراف کر کے کبھی منزل نہیں پا سکتے۔

کتابُ الدَّعوات:

معارفُ الحدیث

(مُسلسل)

جامع اور ہمہ گیر دُعائیں:

[اس عنوان کے تحت احادیثِ نبوی ۳ قسطوں میں پہلے پیش کی جا چکی ہیں۔ چوتھی قسط اس شمارہ میں درج کی جا رہی ہے ــــ اس قسط کی زیادہ تر حدیثیں کنز العمال سے لی گئی ہیں]

عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ (مرفوعاً) "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَارْضَ عَنَّا وَتَقَبَّلْ مِنَّا وَاَدْخِلْنَا الْجَنَّةَ وَنَجِّنَا مِنَ النَّارِ وَاَصْلِحْ لَنَا شَأْنَنَا كُلَّهٗ" ــــ قِیْلَ زِدْنَا قَالَ اَوَلَیْسَ قَدْ جَمَعْنَا الْخَیْرَ كُلَّهٗ

ــــ رواہ احمد وابن ماجہ والطبرانی فی الکبیر

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے۔ "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا...... تا ... شَأْنَنَا كُلَّهٗ" (اے اللہ ہم کو بخش دے ہم پر رحمت فرما اور دوزخ سے ہمیں بچا لے، اور ہمارے حالات اور جملہ معاملات درست فرما دے) آپ سے عرض کیا گیا حضور ہمارے لیے اور زیادہ دعا فرمائیے! آپ نے فرمایا کیا (اس دُعا میں جو میں نے ابھی کی) ساری خیر کو ہم نے جمع نہیں کر دیا۔

(مسند احمد، سنن ابن ماجہ، معجم کبیر طبرانی)

(تشریح) اس دُعا میں اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور بخشش مانگی گئی ہے، رحمت مانگی گئی ہے۔

اللہ کی رضا اور قبولیت مانگی گئی ہے۔ جنت کا داخلہ اور دوزخ سے نجات مانگی گئی ہے اور سب سے آخر میں استدعا کی گئی ہے کہ ہمارے جملہ معاملات اور سارے حالات درست فرما دے (اَصْلِحْ لَنَا شَأْنَنَا كُلَّهُ) ظاہر ہے کہ اس کے بعد کوئی بھی انسانی حاجت اور ضرورت باقی نہیں رہتی، اس سے زیادہ جو کچھ مانگا جائے گا وہ اسی اجمال کی تفصیل ہوگی، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "أَوَلَيْسَ قَدْ جَمَعْنَا الْخَيْرَ كُلَّهُ" (یعنی اس دعا میں ہم نے وہ سب مانگ لیا ہے جو انسان کو دنیا اور آخرت میں مطلوب ہو سکتا ہے)

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُنْزِلَ عَلَيْهِ الْوَحْيُ يَوْمًا..... فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ وَرَفَعَ يَدَيْهِ وَقَالَ "اَللّٰهُمَّ زِدْنَا وَلَا تَنْقُصْنَا وَاَكْرِمْنَا وَلَا تُهِنَّا وَاَعْطِنَا وَلَا تَحْرِمْنَا وَاٰثِرْنَا وَلَا تُؤْثِرْ عَلَيْنَا وَاَرْضِنَا وَارْضَ عَنَّا"

(رواہ احمد والترمذی)

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی (اور اس وقت آپ کی وہ کیفیت ہوگئی جو نزول وحی کے وقت ہو جایا کرتی تھی۔ جب وہ کیفیت ختم ہوئی) تو آپ قبلہ رو ہو گئے اور ہاتھ اٹھا کے یہ دعا فرمائی "اَللّٰهُمَّ زِدْنَا..... تا ..... وَارْضَ عَنَّا" (اے اللہ ہماری تعداد میں زیادتی اور اضافہ فرما، کمی نہ فرما اور ہمیں عزت و کرامت عطا فرما، ہماری اہانت و ذلت نہ فرما، ہمیں اپنی ہر طرح کی نعمتیں عطا فرما، ہمیں محروم نہ فرما، ہمیں اپنا لے ہمارے مقابلہ میں دوسروں کو ترجیح نہ دے۔ ہم سے راضی ہو جا اور ہمیں خوش کر دے۔

(مسند احمد، جامع ترمذی)

(تشریح) اس حدیث میں آگے یہ بھی ہے کہ اس وقت آپ پر سورۂ مومنون کی ابتدائی دس آیتیں نازل ہوئی تھیں ان کا آپ کے قلب مبارک پر غیر معمولی اثر تھا، اسی تاثر کے ماتحت آپ نے خاص اہتمام سے اپنی جماعت اور امت کے لیے یہ دعا فرمائی، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کوئی دعا زیادہ اہتمام سے کرنی ہو تو بہتر ہے کہ قبلہ رو ہو کر اور ہاتھ اٹھا کر کی جائے۔

عَنْ ابْنِ مَسْعُوْدٍ (مرفوعا) اَللّٰهُمَّ اَصْلِحْ ذَاتَ بَيْنِنَا وَاَلِّفْ بَيْنَ
قُلُوْبِنَا وَاهْدِنَا سُبُلَ السَّلَامِ وَنَجِّنَا مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَ
جَنِّبْنَا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ اَسْمَاعِنَا
وَاَبْصَارِنَا وَقُلُوْبِنَا وَاَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ
التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ وَاجْعَلْنَا شَاكِرِيْنَ لِنِعْمَتِكَ مُثْنِيْنَ بِهَا قَابِلِيْهَا
وَاَتِمَّهَا عَلَيْنَا ——— رواہ الطبرانی فی الکبیر والحاکم فی المستدرک

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ
دعا روایت کی ہے "اَللّٰهُمَّ اَصْلِحْ ذَاتَ بَيْنِنَا ......تا...... وَاَتِمَّهَا عَلَيْنَا"
(اے اللہ ہمارے آپس کے تعلقات درست فرما دے اور ہمارے دلوں کو جوڑ دے۔
اور ہمیں سلامتی کے راستوں پر چلا اور ہر طرح کی گمراہیوں سے نکال کر ہمیں نور کی طرف
لا اور ظاہری و باطنی قسم کی ساری بے حیائیوں سے ہمیں بچا۔ اے اللہ ہماری سماعت
و بصارت اور ہمارے قلوب میں اور اسی طرح ہمارے بیوی بچوں میں برکت عطا فرما
اور ہماری توبہ قبول فرما کر ہم پر عنایت فرما تو بڑا عنایت فرما بڑا مہربان ہے اور ہمیں
اپنی نعمتوں کا شکر گزار اور ثنا خواں اور قدر کے ساتھ قبول کرنے والا بنا اور
ہمیں اپنی وہ نعمتیں بھرپور عطا فرما۔

(معجم کبیر طبرانی، مستدرک حاکم)

(تشریح) اس جامع ترین دعا میں سب سے پہلے آپس کے تعلقات کی درستی اور دلوں
کے جوڑ کی استدعا کی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر دلوں میں پھوٹ اور سینوں میں بغض و
عداوت ہو تو دین بھی برباد ہوتا ہے اور دنیا بھی، اللہ تعالیٰ کی دینی و دنیوی اور مادی و
روحانی ساری نعمتوں سے صحیح طور پر فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ معاشرہ بغض و
عداوت کے عذاب سے محفوظ ہو ـــــ علاوہ ازیں اہل ایمان کے دلوں کا باہمی جوڑ اور ان
کے تعلقات کی خوشگواری بجائے خود اہم مطلوبات میں سے ہے۔
آنکھوں، کانوں اور بیوی بچوں وغیرہ میں برکت کا مطلب یہ ہے کہ یہ نعمتیں بجائے

نصیب رہیں اور ان سے وہ فوائد و برکات حاصل ہوتے رہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان میں رکھے ہیں۔

نعمتوں کی قدر اور ان پر شکر و حمد کی توفیق بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ملتی ہے اور اس سے محرومی بہت بڑی محرومی ہے۔ اس لیے اس کو بھی اللہ سے مانگنا چاہیے اور ایک محتاج بندہ کی حیثیت سے ہر نعمت کے اتمام کی بھی اس سے استدعا کرنی چاہیے۔

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ (مرفوعًا) اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنِيْ لِمَا تُحِبُّ وَ تَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ وَالْفِعْلِ وَالنِّيَّةِ وَالْهُدٰى اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ ——— رواه الديلمي

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے "اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنِيْ..... تا..... اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ" (اے اللہ جو قول و فعل اور جو نیت و عمل اور جو طرز زندگی تجھے پسند ہو اور تو اس سے راضی ہو اسی کی مجھے توفیق دے، یقیناً تو سب کچھ کرنے پر قادر ہے۔

(مسند فردوس دیلمی)

عَنْ مُعَاذٍ (مرفوعًا) اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ لِفَاجِرٍ عِنْدِيْ نِعْمَةً اُكَافِيْهِ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ——— رواه الديلمي

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا بھی روایت کی ہے "اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ لِفَاجِرٍ عِنْدِيْ نِعْمَةً اُكَافِيْهِ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ" (اے اللہ کسی نافرمان اور بدکار آدمی کا مجھ پہ احسان نہ ہو جس کی مجھے مکافات کرنی پڑے دنیا یا آخرت میں۔

(مسند فردوس دیلمی)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا بڑا اہتمام فرماتے تھے کہ اگر کسی نے آپ کے ساتھ ذرا سا بھی اچھا سلوک کیا ہو تو اس کی مکافات فرمائیں اور مناسب سے مناسب شکل میں اس کا بدلہ دیں، ہر شریف آدمی کا یہی جذبہ اور رویہ ہونا چاہیے، اس دعا میں رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی ہے کہ مجھے کسی ایسے آدمی کا ممنونِ احسان نہ بنا جو تیرا نافرمان اور غلط کار ہو۔ اور مجھے دنیا میں یا آخرت میں اس کے احسان کا بدلہ چکانا پڑے۔

عَنْ عُمَرَ (مرفوعًا) اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَةَ فِیْ دِیْنِیْ وَدُنْیَایَ وَاَهْلِیْ وَمَالِیْ اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَتِیْ وَاٰمِنْ رَوْعَتِیْ وَاحْفَظْنِیْ مِنْ بَیْنِ یَدَیَّ وَمِنْ خَلْفِیْ وَعَنْ یَمِیْنِیْ وَعَنْ شِمَالِیْ وَمِنْ فَوْقِیْ وَاَعُوْذُ بِعَظَمَتِكَ اَنْ اُغْتَالَ مِنْ تَحْتِیْ۔

—————— رواہ ابوداؤد وابن ماجہ والنسائی

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دُعا روایت کی ہے "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ الْعَفْوَ...... تا ...... اَنْ اُغْتَالَ مِنْ تَحْتِیْ" (اے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں گناہوں کی معافی اور اپنے دین و دنیا، مال و منال اور اہل و عیال کی عافیت۔ اے اللہ میری شرم و عار والی باتوں کی پردہ داری فرما اور میرے خوف اور اندیشوں کو بے خوفی سے بدل دے اور میری حفاظت فرما، میرے آگے اور میرے پیچھے سے اور میرے دائیں اور میرے بائیں اور میرے اوپر سے۔ میں تیری عظمت و جلالت سے اس بات سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ اچانک کسی آفت میں مبتلا ہو جاؤں نیچے کی جانب سے۔

(سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ، سنن نسائی)

عَنْ اَنَسٍ (مرفوعًا) اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ اِیْمَانًا دَائِمًا وَهَدْیًا قَیِّمًا وَعِلْمًا نَافِعًا —————— رواہ ابونعیم فی الحلیۃ

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے: "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ.... تا .... عِلْمًا نَافِعًا" (اے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں وہ ایمان و یقین جو ہمیشہ رہے اور سوال کرتا ہوں تجھ سے سیدھی صالح سیرت کا، اور استدعا کرتا ہوں تجھ سے ایسے علم کا جو نفع مند ہو)

(حلیہ ابونعیم)

عَنْ عَائِشَۃَ (مرفوعاً) رَبِّ اَعْطِ نَفْسِیْ تَقْوَاھَا وَزَکِّھَا اَنْتَ خَیْرُ مَنْ زَکَّاھَا اَنْتَ وَلِیُّھَا وَمَوْلَاھَا ——— رواہ احمد

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے "رَبِّ اَعْطِ نَفْسِیْ ..... تا ..... اَنْتَ وَلِیُّھَا وَمَوْلَاھَا" (اے میرے رب میرے نفس کو تقوے سے آراستہ فرما اور (اس کی گندگیاں دور فرما کر) اس کو پاکیزہ بنا دے۔ تو ہی سب سے اچھا پاکیزہ بنانے والا ہے، تو ہی اس کا والی اور مالک ومولا ہے) (مسند احمد)

عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ (مرفوعاً) قُلْ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ نَفْسًا مُطْمَئِنَّۃً تُؤْمِنُ بِلِقَائِکَ وَتَرْضٰی بِقَضَائِکَ وَتَقْنَعُ بِعَطَائِکَ۔

——— رواہ الضیاء فی المختارۃ والطبرانی فی الکبیر

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ ..... تا ..... تَقْنَعُ بِعَطَائِکَ" (اے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں "نفس مطمئنہ" یعنی ایسا نفس جس کو تیری طرف سے اطمینان اور جمعیت کی دولت نصیب ہو اور مرنے کے بعد تیرے حضور میں حاضری کا اس کو کامل یقین ہو اور تیرے فیصلوں پر وہ راضی ومطمئن ہو اور تیری طرف سے جو کچھ ملے وہ اس پر قانع ہو۔ (مختارہ للضیاء المقدسی، معجم کبیر طبرانی)

(تشریح) "نفس مطمئنہ" وہی ہے جس میں یہ صفات پائی جائیں اور یہ وہ نعمت ہے جو خاص ہی خاص بندوں کو عطا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے نصیب فرمائے۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ (مَرْفُوعًا) اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ اَخْشَاکَ کَاَنِّیْ اَرَاکَ اَبَدًا حَتّٰی اَلْقَاکَ وَاَسْعِدْنِیْ بِتَقْوَاکَ وَلَا تُشْقِنِیْ بِمَعْصِیَتِکَ ——— رواہ الطبرانی فی الاوسط

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ ..... تا ..... وَلَا تُشْقِنِیْ بِمَعْصِیَتِکَ" (اے اللہ میرا

حال ایسا کر دے کہ تیرے حضور میں حاضر ہونے تک (یعنی مرتے دم تک) تیرے قہر و جلال سے میں ہر وقت اس طرح ترساں و لرزاں رہوں کہ گویا ہر دم تجھے دیکھ رہا ہوں، اور اپنے خوف و تقوے کی دولت نصیب فرما کر مجھے خوش بخت کر دے، اور ایسا نہ ہو کہ تیری نافرمانی کر کے میں بدبختی میں مبتلا ہو جاؤں، (معجم اوسط طبرانی)

(تشریح) غور کیا جائے مندرجہ بالا دعاؤں میں خاصکر اس دعا میں کتنے مختصر الفاظ میں کتنی عظیم نعمتوں کی استدعا کی گئی ہے۔ یہ دعائیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص میراث میں سے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ان کی قدر و قیمت کو سمجھیں۔

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ (مرفوعاً) اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيْ عَيْنَيْنِ هَطَّالَتَيْنِ تَسْقِيَانِ الْقَلْبَ بِذُرُوْفِ الدَّمْعِ مِنْ خَشْيَتِكَ قَبْلَ اَنْ تَكُوْنَ الدَّمُ دَمْعًا وَالْاَضْرَاسُ جَمْرًا ——— رواہ ابن عساکر

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے "اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيْ ..... تا ..... وَالْاَضْرَاسُ جَمْرًا" (اے اللہ مجھے وہ آنکھیں نصیب فرما جو تیرے عذاب اور غضب کے خوف سے آنسوؤں کی بارش برسا کر دل کو سیراب کر دیں، اس گھڑی کے آنے سے پہلے جب بہت سی آنکھیں خون کے آنسو روئیں گی اور بہت سے مجرمین کی ڈاڑھیں انگارہ بن جائیں گی۔)

(ابن عساکر)

(تشریح) جن کو اللہ نے حقائق کی معرفت دی ہے اُن کے نزدیک وہی آنکھ زندہ اور بینا ہے جو اللہ کے خوف سے روئے اور آنسوؤں کی بارش برسائے ان کے دل اسی بارش سے سیراب ہوتے ہیں، اس لیے وہ اللہ سے رونے والی آنکھیں مانگتے ہیں۔

عَنِ الْهَيْثَمِ الطَّائِيِّ (مرفوعاً) اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ الْاَشْيَاءِ اِلَيَّ كُلِّهَا وَاجْعَلْ خَشْيَتَكَ اَخْوَفَ الْاَشْيَاءِ عِنْدِيْ وَاقْطَعْ عَنِّيْ حَاجَاتِ الدُّنْيَا بِالشَّوْقِ اِلٰى لِقَائِكَ وَاِذَا اَقْرَرْتَ اَعْيُنَ اَهْلِ الدُّنْيَا مِنْ دُنْيَاهُمْ فَاَقْرِرْ عَيْنِيْ مِنْ عِبَادَتِكَ۔

رواہ ابونعیم فی الحلیۃ

ہیثم بن مالک طائی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دُعا روایت کی ہے " اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّکَ ..... تا ..... مِنْ عِبَادِکَ " اے اللہ ایسا کر دے کہ کائنات کی ساری چیزوں سے زیادہ مجھے تیری محبت ہو۔ اور ساری چیزوں سے زیادہ مجھے تیرا خوف ہو، اور اپنی ملاقات کے شوق کو مجھ پر اتنا طاری کر دے کہ دُنیا کی ساری حاجتوں کا احساس اس کی وجہ سے فنا ہو جائے اور جہاں تو بہت سے اہلِ دُنیا کو ان کی مرغوبات دے کر ان کی آنکھیں ٹھنڈی کرتا ہے تو میری آنکھیں طاعت و عبادت سے ٹھنڈی کر (یعنی مجھے عبادت کا وہ ذوق و شوق بخش دے کہ اس میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہو اور پھر مجھے عبادت کی بھرپور توفیق دے۔) (حلیہ ابی نعیم)

عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ مِنْ دُعَاءِ دَاوٗدَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَسْاَلُكَ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ يُّحِبُّكَ وَالْعَمَلَ الَّذِىْ يُبَلِّغُنِىْ حُبَّكَ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ اِلَىَّ مِنْ نَّفْسِىْ وَاَهْلِىْ وَمِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ قَالَ وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا ذَكَرَ دَاوٗدَ يُحَدِّثُ عَنْهُ قَالَ كَانَ اَعْبَدَ الْبَشَرِ ——— رواہ الترمذی

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے پیغمبر داؤد (علیہ السلام) جو دعائیں کرتے تھے ان میں ایک خاص یہ بھی تھی ـــ " اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَسْاَلُكَ حُبَّكَ ..... تا ..... وَمِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ " اے میرے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں تیری محبت (یعنی مجھے اپنی محبت عطا فرما) اور اپنے ان بندوں کی محبت بھی مجھے عطا فرما جو تجھ سے محبت کرتے ہیں اور ان اعمال کی بھی محبت مجھے عطا فرما جو تیری محبت کے مقام تک پہونچاتے ہوں۔ اے اللہ ایسا کر دے کہ اپنی جان اور اہل و عیال کی محبت اور ٹھنڈے پانی کی

چاہت سے بھی زیادہ مجھے تیری محبت اور چاہت ہو۔) ابوالدرداء رضی اللہ عنہ
یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت داؤد کا ذکر فرماتے
تو ان کے متعلق یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ وہ بہت ہی زیادہ عبادت گذار بندے تھے۔

(تشریح) حضرت داؤد علیہ السلام کی یہ دعا جو ان کے جذبۂ محبت اور عشق الٰہی کی آئینہ دار
تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت ہی پسند تھی۔ اسی لیے آپ نے خاص طور سے صحابۂ
کرام کو بتلائی۔

وصفِ نبوت اگرچہ تمام انبیاء علیہم السلام کا مشترک شرف ہے۔ لیکن اس کے علاوہ
بعض انبیاء علیہم السلام کے کچھ خصائص بھی ہوتے ہیں جن میں وہ دوسروں سے ممتاز ہوتے ہیں۔
اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کثرت عبادت حضرت داؤد علیہ السلام کی امتیازی خصوصیت تھی۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ يَزِيْدَ الْخَطْمِيِّ الْاَنْصَارِيِّ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ فِيْ دُعَائِهٖ اَللّٰهُمَّ
ارْزُقْنِيْ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ يَّنْفَعُنِيْ حُبُّهٗ عِنْدَكَ اَللّٰهُمَّ مَا
رَزَقْتَنِيْ مِمَّا اُحِبُّ فَاجْعَلْهُ قُوَّةً لِّيْ فِيْمَا تُحِبُّ وَمَا زَوَيْتَ عَنِّيْ
مِمَّا اُحِبُّ فَاجْعَلْهُ فَرَاغًا لِّيْ فِيْمَا تُحِبُّ ——— رواہ الترمذی

حضرت عبداللہ بن یزید خطمی انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم ایک دعا یہ بھی کیا کرتے تھے۔ "اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيْ ... تا ... فِيْمَا
تُحِبُّ"۔ (اے اللہ مجھے اپنی محبت عطا فرما اور اپنے ان بندوں کی محبت عطا فرما
جن کی محبت میرے لیے تیرے نزدیک نفع مند ہو۔ اے اللہ میری چاہت اور رغبت
کی جو چیزیں تو نے مجھے عطا فرمائی ہیں ان سے مجھے ان کاموں میں تقویت پہونچا
جو تجھے محبوب ہیں۔ اور میری رغبت و چاہت کی جو چیزیں تو نے مجھے عطا نہیں فرمائیں
(اور میرے اوقات کو ان سے فارغ رکھا) تو مجھے توفیق دے کہ میں اس فراغ کو
ان کاموں میں استعمال کروں جو تجھے محبوب ہیں۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) آدمی کو اس کی مرغوبات دے دی جائیں تو اس کا بھی امکان ہے کہ وہ ان میں

مست اور منہمک ہوکر خدا سے غافل ہوجائے یا وہ ان کو اس طرح استعمال کرے کہ معاذ اللہ خدا سے اور دور ہوجائے، اسی طرح مرغوبات نہ ملنے کی صورت میں بھی امکان ہے کہ وہ دوسری قسم کی خرافات میں اپنا وقت برباد کرے ــــ اس لیے بندہ کو برابر یہ دعا کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اگر اس کی مرغوبات عطا فرمائے تو اس کو اس کی بھی توفیق دے کہ وہ مرغوبات کو تقرب الی اللہ کا وسیلہ بنائے اور اگر مرغوبات نہ ملیں اور اس کی وجہ سے فرصت و فراغ حاصل ہو تو اس کو توفیق ملے کہ فارغ اور خالی وقت کو اللہ تعالیٰ کی مرضیات ہی میں لگائے ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر دعا اور اس کا ہر جز بلا شبہ معرفت کا خزانہ ہے۔

عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ قَالَ لِي النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: قُلِ اللّٰهُمَّ اَلْهِمْنِيْ رُشْدِيْ وَاَعِذْنِيْ مِنْ شَرِّ نَفْسِيْ۔

ــــــــ رواہ الترمذی

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ دعا تلقین فرمائی "اَللّٰهُمَّ اَلْهِمْنِيْ رُشْدِيْ وَاَعِذْنِيْ مِنْ شَرِّ نَفْسِيْ" (اے میرے اللہ میرے دل میں وہ ڈال جس میں میرے لیے بھلائی اور بہتری ہو اور میرے نفس کے شر سے مجھے بچا اور اپنی پناہ میں رکھ)

(جامع ترمذی)

عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ اَنَّ اَكْثَرَ دُعَاءِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ عِنْدَهَا يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ۔

ــــــــ رواہ الترمذی

ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ان کے پاس ہوتے تو اکثر یہ دعا کیا کرتے "يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ" (اے دلوں کو پلٹنے والے میرے دل کو اپنے دین پر ثابت و قائم رکھ)

(جامع ترمذی)

(تشریح) اس روایت میں آگے حضرت اُمّ سلمہ کا یہ بیان بھی ہے کہ میں نے ایک دن حضور سے عرض کیا کہ کیا بات ہے کہ آپ اکثر بیشتر یہ دُعا کرتے ہیں؟ حضرت ام سلمہ کا مطلب اس سوال سے یہی ہوگا کہ آپ تو لغزشوں سے محفوظ ہیں پھر آپ یہ دُعا کیوں کرتے ہیں؟۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ہر آدمی کا دل اللہ کے ہاتھ میں ہے، اسی کے اختیار میں ہے جس کا دل چاہے سیدھا رکھے اور جس کا چاہے ٹیڑھا کردے۔ آپ کے اس جواب کا مطلب یہ ہوا کہ میرا معاملہ بھی اللہ کی مشیت پر موقوف ہے اس لیے مجھے بھی اس سے دُعا مانگنے کی ضرورت ہے۔ بلاشبہ جس بندہ کو اپنے نفس کی اور ساتھ ہی اپنے رب کی معرفت نصیب ہوگی اس کا یہی حال ہوگا اور وہ کبھی اپنے کو مامون و محفوظ نہیں سمجھے گا۔ بندوں کے حق میں یہی بلندی اور کمال ہے۔ "قربیا نزا بیش بود حیرانی"۔

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ (مرفوعاً) اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ ضَعِیْفٌ فَقَوِّ فِیْ رِضَاكَ ضُعْفِیْ وَخُذْ اِلَی الْخَیْرِ بِنَاصِیَتِیْ وَاجْعَلِ الْاِسْلَامَ مُنْتَهٰی رِضَائِیْ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ ضَعِیْفٌ فَقَوِّنِیْ وَاِنِّیْ ذَلِیْلٌ فَاَعِزَّنِیْ وَاِنِّیْ فَقِیْرٌ فَارْزُقْنِیْ ——— رواہ الطبرانی فی الکبیر

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ ضَعِیْفٌ.... تا.... وَاِنِّیْ فَقِیْرٌ فَارْزُقْنِیْ" (اے میرے اللہ میں تیرا ایک کمزور بندہ ہوں تو اپنی رضا طلبی کی راہ میں میری کمزوری کو قوت سے بدل دے۔ (تاکہ میں پوری تندہی اور تیز رفتاری سے تیری رضا کے لیے کام کرسکوں) اور میری پیشانی پکڑ کے میرا رُخ خیر کی طرف کردے اور اسلام کو میرا منتہائے رضا بنادے (یعنی میری انتہائی خوشی یہ ہو کہ میں پورا پورا مسلم ہو جاؤں) ۔ اے میرے اللہ میں ضعیف و ناتوان ہوں، تو میری ناتوانی کو توانائی سے بدل دے اور میں ذلت و پستی کے حال میں ہوں تو مجھے عزت بخشدے۔ اور میں فقیر و نادار ہوں تو مجھے میری ضروریات عطا فرمائے۔

عَنْ اِبْنِ مَسْعُوْدٍ (مرفوعاً) اِلَیْكَ رَبِّ فَحَبِّبْنِیْ وَفِیْ نَفْسِیْ لَكَ

فَذَلِّلْنِیْ وَفِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ فَعَظِّمْنِیْ وَمِنْ سَیِّئِ الْاَخْلَاقِ فَجَنِّبْنِیْ۔

ـــــــــ رواہ ابن لال فی مکارم الاخلاق

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے "اِلَیْکَ رَبِّ فَحَبِّبْنِیْ ..... تا ..... فَجَنِّبْنِیْ" (اے میرے پروردگار مجھے اپنا پیارا بنالے اور مجھے ایسا کردے کہ میں اپنے کو تیرے حضور میں ذلیل سمجھوں اور دوسرے بندوں کی نگاہ میں مجھے باعظمت بنادے، اور بُرے اخلاق سے مجھے بالکل بچادے اور دور رکھ۔ (مکارم الاخلاق لابن لال)

(تشریح) کسی بندے سے اللہ تعالیٰ کا محبت فرمانا عظیم ترین دولت ہے جسکی ہر مومن کو دلی آرزو ہونی چاہیے۔ اس دُعا میں سب سے پہلے یہی نعمت مانگی گئی ہے۔ اسی طرح یہ بھی بندہ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا انعام ہے کہ وہ خود کو تو ذلیل و حقیر سمجھے لیکن اللہ کے بندے اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور اس کا احترام و اکرام کریں ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دُعا پہلے گزر چکی ہے۔ "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ فِیْ عَیْنِیْ صَغِیْرًا وَّفِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ کَبِیْرًا"[1]

عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قُلْ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الْخَلَّاقُ الْعَظِیْمُ اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ، اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ۔ اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ الْجَوَادُ الْکَرِیْمُ فَاغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ وَعَافِنِیْ وَارْزُقْنِیْ وَاسْتُرْنِیْ وَاجْبُرْنِیْ وَارْفَعْنِیْ وَاھْدِنِیْ وَلَاتُضِلَّنِیْ وَاَدْخِلْنِیْ الْجَنَّۃَ بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ ـــــ تَعَلَّمْھُنَّ وَعَلِّمْھُنَّ عَقِبَکَ مِنْ بَعْدِکَ

ـــــــــ رواہ الدیلمی

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ دُعا تلقین فرمائی "اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الْخَلَّاقُ الْعَظِیْمُ ..... تا ..... بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ" (اے میرے اللہ تو خالقِ کل اور خلاقِ عظیم ہے، تو سمیع و علیم (سب کچھ سننے والا اور جاننے والا) ہے۔ تو غفور و رحیم (بخشنے والا

---

[1] اے اللہ مجھے اپنی نظر میں چھوٹا اور حقیر بنادے اور دوسرے لوگوں کی نگاہ میں بڑا کردے۔

اور نہایت مہربان) ہے۔ تو مالک عرش عظیم ہے، تو نہایت فیاض اور کریم ہے۔ اپنی ان عالی صفات کے صدقہ میں تو مجھے بخشدے، مجھ پر رحمت فرما، مجھے عافیت عطا فرما، مجھے رزق نصیب فرما، میری پردہ داری فرما، میری شکستگی کو جوڑ دے، مجھے عزت و رفعت عطا فرما، مجھے اپنی راہ پر چلا، مجھے گمراہی سے بچا، اور اے ارحم الراحمین (مرنے کے بعد آخرت میں) اپنی رحمت سے مجھے جنت میں داخلہ نصیب فرما)۔۔۔ (حضرت جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا تلقین فرمائی اور مجھ سے ارشاد فرمایا) اس کو سیکھ لو اور اپنے بعد والوں کو سکھاؤ۔

(مسند فردوس دیلمی)

(تشریح) کسقدر جامع دُعا ہے! اس کو نہ سیکھنا اور اس سے فائدہ نہ اٹھانا بلاشبہ بڑے خسارہ کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ان انمول جواہرات کی قدر نصیب فرمائے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی توفیق دے۔

یک زمانہ صحبتے با اولیاء

مجلس حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی مدظلہ العالی

مرتبہ: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

چھٹی مجلس

۲۴ شوال ۱۳۸۸ھ مطابق ۲۵ جنوری ۱۹۶۹ء خانقاہ شریف بھوپال

حاضرین مجلس بدستور

مولانا جمیل احمد صاحب حیدرآبادی نے ایک ایسے بزرگ کے متعلق دریافت کیا جو توحید وجودی کے بڑے داعی اور مبلغ تھے، فرمایا، کہ اس زمانہ میں (حیدرآباد میں) وحدۃ الوجود کا بڑا زور تھا، یہ حضرات صاف فرماتے تھے کہ وجود میں ایک ہی ہے، باقی سب ظہورات و تعینات ہیں، آپ کچھ ہی میں منشی ہیں، گھر [illegible] والد، اسی طرح محل کے اعتبار سے آپ کے نام بدلتے رہتے ہیں، باقی وجود ایک ہی ہے۔ دوسرا وجود ماننا شرک ہے۔ اس طرح کے عقیدے اور غلو کے ساتھ، پھر اللہ تعالیٰ کا خوف وہیبت، اور محرمات اور معاصی سے نفرت و وحشت نکل جاتی ہے کہ جب وجود ایک ہی ہے اور سب کچھ وہی ہے تو کیا گناہ اور کس کا گناہ؛ البتہ دل آزاری ان حضرات کے مذہب میں کفر ہے، کسی کا دل نہ توڑو، اور جو چاہو کرو۔ بالارادہ شراب نہ پیو، مگر شراب کی محفل میں ہو اور کوئی پلائے تو پی لو،

وہیں حیدرآباد میں ایک ملنگ تھے ، اگر کوئی ان سے مرید ہوتا تو اس کے چار ابرو کا صفایا کرتے تھے ، اس کو مردہ بناتے ، نہلاتے دُھلاتے ، تین لوٹے حضرت بھی ڈال دیتے ۔ جب تک یہ عمل رہتا "مُوتوا قبل اُن تموتوا" کا ورد رہتا ، پھر اس مرید کو سب کچھ اجازت تھی ، وہ کہتا حضور میں گانجا اور بھنگ پیتا ہوں ، فرماتے کہتا : وہ اپنا معمول بتاتا ، فرماتے اسکے کی اجازت ہے ، پھر اگر اس کو کوئی ٹوکتا تو کہتا کہ پیرو مرشد نے اس کی اجازت دی ہے ، اسی طرح بغیر جبر اور دلآزاری کے رشوت ملتی ہو اور کوئی اپنی خوشی سے دے تو لے لو ، انکار نہ کرو ۔

ایک دن بھوپال میں ایک جنازہ کے انتظار میں بیٹھا تھا ، ایک احرام پوش وارثی صاحب بھی تشریف لائے ، گفتگو شروع ہوئی تو فرمانے لگے کہ جس کو دیکھو منبر پر بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ قرآن میں یہ ہے ، حدیث میں یہ ہے ، کوئی درویشی کی بات بات نہیں کرتا ، میاں درویشی کی باتیں کرو ۔ ایک صاحب حیدرآباد میں حقہ پیتے رہتے اور دوسروں کو نماز کے لیے اٹھاتے ، ایک صاحب نے کہا کہ آپ خود نہیں تشریف لے جاتے ، فرمایا کہ پیالہ پی لو ، پھر اس کے بعد کہنا ۔ ایک دوسرے صاحب نے اپنے مرید کو مرشد کی قبر پر سجدہ کا حکم دیا ، انھوں نے انکار کیا کہ کفر و شرک ہے ، کہنے لگے جب تک کفر و شرک کے دریا میں نہ ڈوبو گے اسلام تک نہیں پہونچو گے ، یہ طریقت و حقیقت ہے ۔ میں نے تلاش کرا کے حیدرآباد میں ان حضرات کی کتابیں خرید کرلیں ۔ جواہر السلوک عقائد صوفیہ ، معلوم ہوا کہ قرآن شریف عقائد صوفیہ میں نہیں معاذ اللہ ۔ قرآن شریف میں تو ہے وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ[1] ، یہ اسلام سے الگ عقائد کیا ہیں ۔

فرمایا : صوفیہ سے جس قدر ضرر پہونچا ہے دوسروں سے نہیں پہونچا ، بہت سے حضرات ایسے ہیں کہ جہاں علم کا ذکر آیا کہنے لگتے ہیں کہ یہ تو ملا ہیں ، تصوف سے ان کو حصہ نہیں ملا ، یہ تو حضرت مجدد کا کارنامہ ہے کہ طریقت کو بالکل شریعت کے تابع بنا دیا ، فرماتے ہیں کہ

---

[1] اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی دین اپنائے وہ قبول نہیں کیا جائے گا ۔ — الفرقان

دوپہر کا قیلولہ سنت کی نیت سے رات بھر کی عبادت سے بہتر ہے۔ اصل یہ ہے کہ

ومن یعش عن ذکر الرحمٰن نقیض لہ شیطانا فھو لہ قرین[1]

فرمایا کہ میں نے آگرہ کی جامع مسجد میں ایک مولوی صاحب کو اس آیت پر وعظ کہتے سُنا،

قل ان کان آباءکم وابناءکم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال اقترفتموھا وتجارۃ تخشون کسادھا ومساکن ترضونھا احب الیکم من اللہ ورسولہ وجھاد فی سبیلہ فتربصوا حتیٰ یاتی اللہ بامرہ واللہ لا یھدی القوم الفسقین۔

(اے پیغمبر ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور کنبے قبیلے والے اور تمہارا مال و دولت جو تم نے کمایا ہے اور تمہارے کاروبار جن کی کسادبازاری کا تم کو خطرہ ہو، اگر یہ چیزیں تم کو زیادہ عزیز و محبوب ہیں اللہ اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تو ٹھہرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ نافذ کر دے۔ اور اللہ نافرمانوں کو ہدایت کی نعمت نہیں دیتا)

میں نے اس آیت پر بہت غور کیا، بھوپال پہنچ کر متعدد علماء سے پوچھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ان محبوبات طبعی کو آدمی ترک کر دے، اور ان سے دستبردار ہو جائے۔ کہنے لگے کہ شریعت بہت سی ایسی چیزوں کا حکم دیتی ہے جن میں طبیعت کے خلاف عقل کے فیصلہ پر عمل کرنا ہوتا ہے، لیکن مجھے اطمینان نہیں ہوا، میرے ذہن میں اس کی ایک توجیہ اور تشریح آئی اسکو آپ ایک قصہ سے سمجھیں گے۔

---

[1] اور جو اللہ کی یاد اور اس کی نصیحت سے غافل ہو کر زندگی گزارے اس پر شیطان مسلط کر دیا جاتا ہے پھر وہی اس کا رفیق و ہمدم ہو جاتا ہے ۱۲ — الفرقان

ایک بڑی بی ایک مکان میں رہتی تھیں، ایک صاحب ان کے پاس آئے، اور کہنے لگے کہ اماں! میں یہ مکان خریدنا چاہتا ہوں کتنے میں فروخت کردگی؟ انھوں نے کہا بیٹا! نام نہ لو، میں اس کو کسی دام بھی فروخت نہ کروں گی، یہ میرے بزرگوں کا مکان ہے، اس میں نہ معلوم کتنی پشتیں مریں، گزریں، میں بھی اسی میں مروں گی، انھوں نے بہت آمادہ کرنا چاہا مگر وہ سننے پر بھی تیار نہ ہوئیں۔ کچھ وقت دے کر وہ پھر آئے اور پھر وہی خریداری کی بات کی۔ ....

.... انھوں نے پھر کانوں پر ہاتھ رکھا اور سخت ناراض ہوئیں کہ میں کہہ چکی کہ میں کسی قیمت پر بھی اس کو دینے پر تیار نہیں، انھوں نے کہا کہ میں منھ مانگے دام دوں گا کچھ کہیئے تو، مگر انھوں نے ایک نہ سُنی۔ تیسری مرتبہ وہ خریدار پھر آئے۔ اس مرتبہ وہ بہت برافروختہ ہوئیں، بہت سخت سست کہا، لوگوں نے کہا بڑی بی خیریت ہے۔ یہ کون آدمی تھا؟ کہنے لگیں، پاگل ہے۔ دماغ ٹل گیا ہے، میرا مکان خریدنے کو کہتا ہے، میں نے کہا مجھے بیچنا نہیں، میرے پرکھوں کا مکان ہے، مگر کسی طرح نہیں مانتا، تین مرتبہ آچکا ہے، لوگوں نے کہا، "بڑی بی! پھر تھانہ میں رپٹ لکھوا دو کہ تنگ کرتا ہے۔" کہنے لگیں کہ نہیں! میں تھانہ وانہ نہیں جاتی، میں تو یہیں بیٹھی ہوں، ایک مرتبہ وہ صاحب پھر آئے، دیکھ کر ناراض ہونے لگیں۔ بات سننے کے لیے تیار نہ ہوئیں، ان صاحب نے موقع پاکر کہا کہ اماں! آپ نے فلاں باغ بنگلہ اور کنواں وغیرہ دیکھا ہے؟" ذرا رنگ بدلا، کہنے لگیں کیوں" انھوں نے کہا کہ سرکار کو اس مکان کی ضرورت ہے، یہاں سڑک نکلے گی یا کوئی سرکاری عمارت بنے گی، اسکے بدلے میں وہ باغ بنگلہ، اور کنواں ملے گا!" یہ کہہ کر وہ جانے لگے، کہنے لگیں "بیٹا بیٹھو، کبھی غریبوں کے یہاں کی چائے تو پیتے جاؤ!" انھوں نے کہا میں بازو والے سے بات کرتا ہوں، انھیں کا مکان لے لیا جائے، کہنے لگیں نہیں بیٹا! کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں، تم اسی مکان کا سودا کرادو!"

بس یہی قصہ ہماری مرغوبات طبعی اور تعلقات دنیاوی کا ہے، جب ان سے قیمتی اور بہتر چیز ہمارے سامنے لائی جائے گی تو ہم سب سے دست بردار ہونے کے لیے تیار ہوجائیں گے۔ اس سڑنے گلنے والے جسم، اس فانی اور مختصر زندگی کے مقابلہ میں حیات ابدی اور نعمائے اُخروی کا بھی معاملہ ہے۔ یہ جان اس جسم سے نکالی نہیں جاتی، اس سے بہتر جان اور باقی

ہے۔ موت و فنا کا تخیل ہی غلط ہے، وہ تو حیات ہے۔ بعض لوگوں کو جب کسی کا آنا اور دیکھنا ناگوار ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ "ملک الموت کی طرح آکر بیٹھ جاتے ہیں" نعوذ باللہ، ملک الموت تو فرشتۂ رحمت ہے، ملک الموت تو بڑے اشتیاق کی چیز ہے، اس کو عذاب کا فرشتہ اور فنا کا پیغامبر بنا دیا۔

یورپ کی قوموں نے ہمارا تخیل بدل دیا، ہمارے تخیلات پر قبضہ کر لیا۔ اس قبضہ کی وجہ سے ہر چیز ان کی ہو گئی، ان کا فلسفہ ہے کہ "کنجیاں ان کے ازار بند میں بندھی رہنے دو، مال پر قبضہ کر لو، اس کی مثال ایسی ہے کہ باپ تنخواہ لے کر گھر آتا ہے، بیٹا ضد کرتا کہ سب مجھے دے دو، وہ ساری تنخواہ اس کے سامنے ڈال دیتا ہے۔ پھر کہتا ہے بیٹا فلاں چیز گھر کے لیے لے آؤ، فلاں چیز خرید لو، سب اس کے ہاتھ سے روپیہ خرچ کرواتا ہے، اور سارے کام نکال لیتا ہے اور بچہ خوش ہے کہ میں روپے کا مالک ہوں۔

گرم پانی کی کوئی تعریف نہیں، وہ تو آگ اور گرمی کا کرشمہ ہو۔ جب گرمی کا اثر جاتا رہے گا پانی اپنی فطرت پر آجائے گا، قرآن نے فیصلہ کر دیا ہے۔ ما اصابك من حسنة فمن الله وما اصابك من سيئة فمن نفسك۔[1] گویا گرمی ہماری طرف سے ہے اور ٹھنڈک جو تمہاری فطرت ہے تمہاری طرف سے۔

یہاں ایک حکیم صاحب تھے، ان کا بچہ طبیہ کالج علی گڑھ میں پڑھتا تھا، کہیں ساتھیوں کے ساتھ کسی دریا پر گیا۔ سب بچے کود رہے تھے، اس نے بھی چھلانگ لگائی اور غائب ہو گیا حکیم صاحب کو جب اطلاع کا تار ملا تو دماغی توازن بگڑ گیا۔ علی گڑھ گئے اور وہاں سے آئے تو جنون کی کیفیت تھی۔ صرف میرے ہاتھ سے دوا پیتے تھے۔ بار بار مجھے بلایا جاتا تھا، ایک دن گیا تو اُن کے سدھی بیٹھے ہوئے تھے، جن کی بچی کے ساتھ اس لڑکے کی نسبت تھی، انھوں نے کہا "معاف فرمائیے گا میں نے آپ کو زحمت دی۔ خودکشی کیسی چیز ہے؟" میں نے کہا بہت عمدہ چیز ہے۔ انبیاء نے بھی خودکشی کی ہی تعلیم دی ہے" وہ میرا منھ دیکھنے لگے

---

[1] تمہیں جو بھلائی اور نعمت پہونچتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایت ہو اور جو برائی آتی ہو وہ تمہاری اپنی کمائی ہو۔ "الفرقان"

میں نے کہا پانچ وقت اپنے گلے پر چھری پھیرنے اور اپنی خودی کو فنا کرنے کا حکم ہے۔
مولانا رحمہ فرماتے ہیں :۔ ؎

چونکہ با تکبیر ہا مقرون شوید
ہمچو بسمل از جہاں بیروں شوید

کہنے والے نے یہ بھی کہا ہے ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اکثر ہرن تو وہ ہوتے ہیں کہ ایک گولی چلائی اور سب بھاگے، لیکن ایسے ہرن بھی ہیں جو شکاری کے انتظار میں رہتے ہیں ؎

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف
بہ امید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

یہ صحیح خودکشی ہے جس کی عارفین تعلیم دیتے ہیں۔ البتہ جہلا نے جس کو خودکشی کہا ہو وہ "خداکشی" ہے، خودکشی نہیں، اس لیے کہ یہ حاکم کے حکم کی خلاف ورزی ہے۔ اس پر حکیم صاحب نے خودکشی کا ارادہ تو ترک کر دیا اور نماز ایسی شروع کر دی کہ بیماری میں بھی نہ چھوڑی۔

فرمایا : بعض احباب مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے درس قرآن میں جاتے تھے، یہاں بھی آتے تھے، میں نے ایک صاحب سے ایک دن پوچھا کہ کہاں سے آرہے ہیں؟ کہا کہ "وعظ سے" میں نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ وعظ کی مثال کیا ہے؟ وعظ کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کسی نے ایک بچہ کو پانچ روپئے دے دیے، اس نے خرچ کر ڈالے، پھر دے دیے، پھر خرچ کر دیے۔ اس کی عادت بگڑ گئی، لیکن ملکہ پیدا کر دینا، وہ علم سکھا دینا جس سے قرآن و حدیث آدمی خود پڑھنے لگے، ہر وقت اس سے فائدہ اٹھا سکے، ایسا ہے کہ جیسے کسی کو بوریہ بنانا، چٹائی بنانا سکھا دیا۔ ایسا ہنر آگیا کہ اس سے اپنا پیٹ پال سکتا ہے۔

فرمایا کہ میں اس کا بہت لحاظ رکھتا ہوں کہ کسی برتن یا صراحی وغیرہ پر نام نہ لکھ لیا جائے، کہ یہ نام یا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموں میں سے ہوتے ہیں یا صحابۂ کرام کے، پھر ان برتنوں کو ادھر اُدھر ڈال دیا جاتا ہے اور بے ادبی ہوتی ہے، بعض لوگ لوٹے پر لکھوا لیتے ہیں، پھر وہ بیت الخلاء میں جاتا ہے، ایک صاحب نے اگالدان پر اپنا نام نقش کرا رکھا تھا ـــ دوسرے یہ کہ میں تعویذ یا قرآن مجید کی آیت یا اسماء حسنیٰ کو موم جامہ رکھ کر بازو پر باندھنے یا وقت پر اپنے پاس رکھنے کو بہت ناپسند کرتا ہوں، اس کی مثال تو ایسی ہے کہ کوئی اپنے پیر کی گردن میں رسّی باندھ کر لیے پھرے۔ کوئی پوچھے کہ ان کو کیوں باندھ رکھا ہے تو کہے کہ جس وقت ضرورت ہو ان سے دعا کرالوں ـــ اللہ کا نام اور آیات اس سے زیادہ ادب کی مستحق ہیں. لکھوا کر گھر میں رکھ لے ان کی برکت پہونچتی رہے گی، ایسے متعدد واقعات ہیں کہ ادب اور عقیدہ کے ساتھ ان چیزوں کو مناسب جگہ رکھنے سے گھر میں بڑی برکت اور روزی میں فراخی ہوئی.

فرمایا کہ قانون کی پابندی سب کو کرنی چاہیے، اس میں استثناء اور رعایت فساد کا موجب ہے۔ ایک مرتبہ میں کسی صاحب کو لینے یا کسی کو رخصت کرنے کے لیے اسٹیشن جانے لگا، اسٹیشن ماسٹر صاحب خانقاہ سے تعلق رکھتے تھے، کہنے لگے کہ پیر صاحب! آپ پلیٹ فارم ٹکٹ نہ لیجیے گا، میں نے کہا کیوں؟ آپ کو چاہیئے تھا کہ آپ مجھ سے دگنی تگنی قیمت دلاتے اس لیے کہ آپ ریلوے کے ملازم ہیں اور خیر خواہی و فرض شناسی کا تقاضا ہے کہ آدمی جس کا ملازم ہو اس کو فائدہ پہونچانے کی کوشش کرے۔ اسی طرح ایک مرتبہ میں نے دار العلوم تاج المساجد کے کتب خانے سے ایک کتاب مطالعہ کے لیے لینی چاہی، مولوی عمران خاں صاحب نے اس کے قانون و شرائط بتائے، میں نے بڑی خوشی سے ان کو قبول کیا، کہ اگر ہمیں ان قوانین کی پابندی نہ کریں گے تو کون کرے گا۔

سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ

مکتوبات، علمی و ادبی تبرکات

(۴)

مرتبہ ــــ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

ایک استفتاء کا جواب ایک سید صاحب نے حضرت شاہ صاحبؒ کو ایک مکتوب استفتاء کی شکل میں بھیجا تھا اس کا جواب مع ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ جواب کا کچھ حصہ آخر سے حذف کر دیا گیا ہے جس سے اصل مطلب و مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا ــــ استفتاء کرنے والے یہ سید صاحب کون ہیں؟ بیاض سے ان کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ جواب استفتاء کے آغاز میں ان کو حضرت شاہ صاحبؒ نے ان الفاظ سے مخاطب فرمایا ہے۔ سید صاحب عالی مراتب جامع الفضائل والمناقب الشدید فی دین اللہ کالسیف القاضب الخ۔

بعد السلام والتحیۃ المسنونۃ رقیمۂ کریمہ شرف ورود یافت حمد الٰہی بجا آوردہ شد کہ دریں زمانہ ہم حمیت دینی درمیانِ اکابر موجود است

بعد سلام مسنون واضح ہو کہ آپ کا مکتوب گرامی صادر ہوا۔ (اس کو پڑھ کر) اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا گیا کہ اس زمانے میں بھی بڑے

وشدت فی امر اللہ غیر مفقود زادہ اللہ امثالکم فی العالم ــــ

..... مہربان من! چند مقدمہ را اول خاطر نشین باید ساخت اول آنکہ تکفیر کلمہ گو امر یست ممنوع در صحیح وارد است کہ من قال لاخیہ یا کافر فقد باء بہ احدہما ــــ حتی المقدور اقدام براں نباید کرد ــ لہذا فقہاء باجمعہم چنیں قرار دادہ اند کہ ہرگاہ (کلام) را یک وجہ محتمل صحت باشد وچند وجہ دیگر محتمل کفر، آں کلام را برہماں محمل صحیح حمل باید نمود؛ ولہ، بتکفیر قائل نباید کشود دوئم آنکہ تکفیر، موافق قاعدہ متعلق بانکار ضروریات دین است بسبب سوء ادب یا استخفاف مجرد از انکار؛ یا فعل شنیع وارتکاب کبیرہ واختراع بدعت وتحلیل حرام مختلف فیہ وتحریم حلال مختلف فیہ کفر لازم نمی آید ــ زیراکہ تعریف ایمان ہمیں مقرر است کہ ہو تصدیق جمیع ما علم مجیئ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بہ ضرورۃ ــــ وشے را از ضروریات

لوگوں میں حمیت دینی اور اللہ کے احکام کے بارے میں مضبوطی موجود ہو ــــ اللہ تعالیٰ آپ جیسے حضرات کی تعداد دنیا میں اور زیادہ کرے ....

مہربان من! جواب سے پہلے چند مقدمات کو ذہن نشین کرلینا ضروری ہے۔

(۱) کسی کلمہ گو کی تکفیر ایک ممنوع امر ہے صحیح حدیث میں وارد ہے کہ جس کسی نے اپنے بھائی (کسی کلمہ گو) سے مخاطب ہو کر او کافر کہا تو یہ کلمہ ان دونوں میں سے کسی ایک کی طرف رجوع کرے گا (یعنی اگر مخاطب در اصل کافر نہیں ہے تو کہنے والے کی طرف یہ کلمہ پلٹے گا) ــــ حتی الامکان تکفیر میں پیش قدمی نہ کرنی چاہیئے ــ اسی لئے تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ جب کسی کے کلام کے اندر ایک صورت ایسی نکلتی ہے جس سے مطلب صحیح کا احتمال ہو اور چند صورتیں ایسی ہیں جو احتمال کفر رکھتی ہیں تو کلام کو اسی محمل صحیح پر رکھا جائے اور قائل کی تکفیر میں

قول اول کہ سب صحابہؓ کافر گردد
اگر خواہد از صحابہ جمیع صحابہ اند
حتیٰ خلفاء راشدین و ازواج
مطہراتؓ، پس این قول او
خطاء صریح است زیراکہ نزدِ
حنفیہ بجز سب شیخین و قذف عائشہ
صدیقہؓ کفر لازم می آید واگر
مرادِ او آنست کہ سبِ ہر صحابی
کفر نیست پس این خود خطاء
نیست زیراکہ فقہاء حنفیہ نیز
سبِ ہر صحابی را کفر نمی دانند
بلکہ بدعت و فسق می انگارند
و بحد کبیرہ می رسانند۔

و قولِ ثانیٔ او کہ ہر چند شخص
گناہ کند رحمت زیادہ گردد
خطاء فہمی است منشاء غلطِ او
آنست کہ بعضے لطیفہ گویان و
شاعراں در مقام دفع ناامیدی
خود باین لطیفہ تمسک کردہ اند
چنانچہ صاحب قصیدہ بردہ میگوید
یا نفس لا تقنطی من زلۃ عظمت
ان الکبائر فی الغفران کاللمم

انکار ہوگا تو کفر یقینی طور پر لازم ہوگا
مثلاً فرضیت صلوٰۃ و زکوٰۃ کا
انکار اور شراب کا حلال قرار دینا
اور (اسی طرح) بنیذ کا حرام
کردینا، یا شیخینؓ کی تحقیر کرنا وغیر
ذلک ——
(۳) تکفیر نہ کرنے اور تعدیل
کرنے یعنی عدالت کا حکم لگانے
(بالفاظ دگر عادل قرار دینے)
کے درمیان بہت سے درجے
اور کڑیاں ہیں اس لئے یہ نہ
سمجھنا چاہیئے کہ جس کسی پر ہم نے
حکم تکفیر نہیں لگایا تو اس کے قول
کو ہم نے پسند کرلیا یا اس کی بات
کو جائز کہہ دیا، بلکہ بسا اوقات
ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص ایک
قول سے کافر تو نہیں ہوتا البتہ
بدعتی و فاسق ہو جاتا ہے ——
اکثر ظاہر بین یہ سمجھ بیٹھتے ہیں
کہ جب علماء نے کسی کی تکفیر میں
سکوت کیا تو اس سے اس شخص
کے عقیدے کی تائید و تصویب
لازم آگئی۔ ایسا نہیں ہے۔ اس

دین شمردن موقوف بر تواتر و ثبوت
آں بالقطع است۔ پس ہر چہ
ازیں قبیل باشد مثل انکار
فرضیت صلوٰۃ و زکوٰۃ و تحلیل الخمر
وتحریم النبیذ و تحقیر الشیخین وغیر
ذالک، البتہ کفر است۔

سوم آنکہ در (عدم) تکفیر
و تعدیل یعنی حکم بعدالت کردن،
وسائط بسیار است این بنا بر
نہید کہ ہر کہ را حکم تکفیر نکردیم او را
پسند نمودیم۔ یا قول او را جائز
داشتیم، بلکہ اکثر اوقات شخصی
کافر نمیشود و مبتدع و فاسق می
گردد ۔۔۔ اکثر علماء ہمیں میدانند
کہ ہرگاہ از تکفیر کے علماء سکوت
کنند، تصویب عقیدۂ او لازم
آید، چنیں نیست۔ ایں قاعدہ
بوجہ احسن ملحوظ باید داشت۔
چوں ایں ہر سہ قاعدہ ممہد شد
حالا آنچہ از روئے دلائل قویہ
درحق ایں شخص کہ اقوال ....
او مرقوم قلم صواب رقم است،
ظاہر می شود، التماس می نماید

لب کشائی نہ کی جائے۔

(۲) قاعدہ سابقہ کے مطابق تکفیر
ضروریات دین کے انکار سے تعلق
رکھتی ہے لہٰذا محض سوء ادب
یا انکار سے جماعی، استخفاف کے
باعث یا کسی فعل بد اور ارتکاب
کبیرہ یا استخراج بدعت اور مختلف
فیہ حرام کے حلال کرنے یا مختلف
فیہ حلال کے حرام کرنے کے سبب
کفر لازم نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ
"ایمان" کی تعریف یہ کی گئی ہے
کہ ۔۔۔ جن احکام و ہدایات
کے متعلق بالیقین اور بداہت
یہ معلوم ہے کہ ان کو رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم لے کے آئے
ان سب کے ماننے اور ان کی تصدیق
کرنے کا نام ایمان ہے (اور انہی
چیزوں کو اصطلاح میں "ضروریات
دین" کہا جاتا ہے) اور کسی امر
کا ضروریات دین سے شمار کرنا
موقوف ہے تواتر اور ثبوت قطعی
پر ۔۔۔ جب اس قسم کے متواتر
اور قطعی الثبوت امور دینیہ سے

[illegible]

[illegible]

در معائے آنہا آنست کہ از
بزرگی گناہ خود نباید اندیشید
و نا امید نباید شد۔ زیرا کہ
رحمت الہی نیز بقدر عصیان
مقسوم است گناہ کبیرہ (را)
ازالہ بر رحمت کثیرہ تواند کرد این
شخص از غلط فہمی چنیں انگاشت
کہ عصیان سبب رحمت است
و ایں نفہمیدہ کہ اگر بالفرض
عصیان سبب رحمت ہم باشد
خاص یکنوع رحمت را سبب
خواہد بود کہ آن رحمت غفاریت
دیگر انواع رحمت بسیار
ازیں رحمت، بزرگتر و عالی
تر اند ہمہ آن از عاصی موقوف
خواہند شد مثل درجات
عالیات بہشت، و دخول
بلا حساب و سرخرو ئی
در عرصات ...... الحاصل
کہ از رحمت متقیاں و معصوما

بات کو اچھی طرح ملحوظ رکھنا چاہیئے۔

جب یہ تینوں باتیں بطور مقدمہ
و تمہید بیان ہو گئیں تو اب اس
شخص کے بارے میں جس کے اقوال
آپ نے تحریر فرمائے ہیں جوبات
ظاہر ہوتی ہے وہ ذیل کے ساتھ
لکھی جاتی ہے۔

قائل کا قول اول یہ ہے کہ
"سب صحابہ سے کوئی شخص کافر
نہیں ہوتا" —— غور طلب یہ امر
ہے کہ اسکی مراد کیا ہے؟ اگر صحابہ
سے جمیع صحابہ مراد ہیں حتیٰ کہ خلفاء
راشدین اور ازواج مطہرات
بھی —— اس صورت میں اس
کا یہ قول خطا صریح ہے، اسلئے
کہ نزد حنفیہ سب شیخین اور حضرت
عائشہ پر "بہتمت" دھرنے سے
کفر لازم آتا ہے اور اگر اسکی مراد
یہ ہے کہ سب ہر صحابی کفر نہیں ہو
تو یہ قول خطا صریح نہیں ہو اسلیئے
کہ فقہاء حنفیہ بھی سب ہر صحابی کو
کفر نہیں جانتے بلکہ بدعت و فسق
سمجھتے ہیں اور گناہ کبیرہ کی حد تک

و محظوظان بہرہ نیافت لیکن
این ہمہ غلط فہمی است تو بت
بکفر نمی رساند۔ تا آنکہ صریحاً
قائل، این کلام نگوید طاعت
و تقوی اصلا موجب رحمت
نیست و عصیان حقیقۃً سبب
رحمت است" و ظاہر است
کہ متکلم بکلمۂ اسلام تصریح
باین ہر دو مضمون نخواہد
کرد۔ و قول ثالث او کہ
حضرت ام المومنین حضرت
بی بی عائشہ صدیقہ رض علیہا چہ
.... ز و افتراے
محض است حاکم شرع
رامی باید کہ اول او را
از سند این افترا بپرسد
و ظاہر است کہ از بیان
سندش عاجز خواہد شد
و ہرگاہ عاجز شود او را
تعزیر بزدن سی دو تازیانہ
بکمال شدت وا یجاع
نماید و آیندہ از و توبہ
نصوح گیرد کہ این قسم

پہونچاتے ہیں۔ قائل کا دوسرا
قول یہ ہے کہ "جو شخص جتنا گناہ کریگا
اس پر رحمت زیادہ ہوگی" یہ قول
غلط فہمی کی بنا پر ہے اور اسکی غلطی
کی بنیاد اُن لطیفہ گو اور نازک خیالی
شعراء کا کلام ہے جنہوں نے بطور
لطیفہ گوئی و نکتہ سنجی اپنی مایوسی کو
دفع کرنے کے لئے اس بات کو ظاہر
کیا ہے۔ چنانچہ صاحب قصیدۂ بردہ
(علامہ بوصیری رح) کے بھی اسی مضمون
کے دو شعر ہیں ـــ (جن کا ترجمہ یہ ہے)

(۱) اے نفس اپنے گناہوں کے باعث
اگرچہ بہت بڑے ہیں مایوس ہو
کیونکہ اللہ تعالی کی رحمت و مغفرت
کے سامنے بڑے بڑے گناہ بھی چھوٹے
ہیں۔

(۲) جب اللہ تعالی کی رحمت اس
کی بارگاہ سے تقسیم ہوگی تو ممکن ہے
کہ رحمت، بقدر گناہ ہر ایک کے حصے
میں آئے ـــ

مدعا یہ ہے کہ گناہ کی بڑائی سے
اپنے کو فکر مند نہ کیا جائے اور ناامید
نہ ہوا جائے اس لئے کہ رحمت الٰہی

افترا بر بزرگان نکرده باشد حاصل آنکه مفاد این قول نسبت ظلم شنیع بجانب صدیقہؓ است ونسبت ظلم بغیر معصوم موجب کفر نیست آرے نسبت (بدی) بزرگان کہ عدالت وتقوی آنہا بثبوت پیوستہ، موجب فسق وضلالت است — واز باب قذف نیست کہ باجماع کفر است۔

وقول رابع کہ سید اگرچہ سابّ صحابہ باشد تعظیم او بر مردمان واجب است غلط محض است زیرا کہ سید چون مرتکب این قسم امر شنیع گردد تعظیم او واجب نمی ماند واصل اینست کہ در انکار بر منکر وامر بالمعروف واقامۃ حدود وگرفتن قصاص واداے شہادت واداے امانت وعدل در حکومت، تخصیص ہیچ

بقدرِ عصیان، معصوم ہو۔ گناہ کبیرہ کا ازالہ رحمتِ کثیرہ کے ذریعے کیا جاسکتا ہے۔

اس شخص نے اپنی غلط فہمی سے یہ تو سمجھ لیا کہ گناہ، سبب رحمت ہے مگر یہ نہ سمجھا کہ اگر بالفرض گناہ سبب رحمت بھی ہو تب بھی ایک نوعِ رحمت کا سبب ہے اور وہ "رحمتِ غفاری" ہے۔ (یعنی گناہ کی مغفرت والی رحمت) دوسری انواعِ رحمت بھی تو ہیں جو اس رحمت سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں وہ رحمتیں تو عاصی وگنہگار کو حاصل نہ ہوسکیں گی — مثلاً بہشت کے درجاتِ عالیات، بلا حساب کتاب جنت میں داخلہ اور میدان محشر میں سرخروئی حاصل ہونا وغیرہ۔

حاصلِ کلام یہ ہوکہ وہ رحمتیں جو اہل تقویٰ، معصومین، اور محفوظین کے واسطے مخصوص ہیں عاصی کا ان میں کوئی حصہ نہیں اور وہ بیچارہ ان کا حق دار نہ ہوگا

فرقہ در ہیچ قبیلہ نیست یزید وجوابہ
دریں امر بہ ایراد ہرگاہ
یزید بسبب سب صحابہ کافر
شد یزید نباشد لانہ لیس
من اہلک انہ عمل غیر صالح۔
آرے اگر یزیدے اتلاف
حق خاص ایں کس کند
عزیمت آنست کہ از و درگذرد
و ترک انتقام نماید۔ بقولہ
علیہ السلام۔ اقبلوا عن محسنہم
و تجاوزوا عن مسیئہم اما
اتلاف حقوق دینی پس دراں
تجاوز مقبول نیست۔ والحاصل
ایں قول او نیز خطا و بدعت
است اما نوبت بکفر نمی رساند
زیرا کہ ایجاب تعظیم بمعنی
محبت و ترک ایذا در حق
اہل بیت عموما وارد شدہ
و تخصیص ایں عام در ذہن
ایں قائل نگنجیدہ یا حقوق
دینی با حقوق انسانی باہم
اشتباہ پیدا کردہ ایں حکم
از زبان او بر آوردہ

مگر اس قسم کی تمام باتیں غلط فہمی
کی بنا پر کہی جاتی ہیں ان سے کفر تک
نوبت نہیں پہونچتی۔ جب تک صراحۃً
یوں نہ کہا جائے کہ طاعت و تقوی
بالکل موجب رحمت نہیں بس عصیان
و گناہ ہی حقیقۃً سبب رحمت ہو۔
ظاہر ہو کہ کلمۂ اسلام کا بولنے والا
کوئی آدمی اس طرح کی بات صراحت
کے ساتھ نہیں کہے گا۔

قائل کا تیسرا قول کہ ام المومنین
حضرت بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ
عنہا نے نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کی شان میں کوئی گستاخانہ
حرکت کی۔

یہ افترائے محض ہو حاکم شرع
کو چاہیئے کہ اول اس سے اس افترا
کی سند طلب کرے۔ ظاہر ہو کہ وہ
کوئی سند نہ پیش کر سکے گا، جب وہ
سند پیش کرنے سے عاجز ہو تو اس
کو انتالیس ۳۹ کوڑے کمال شدت
کے ساتھ لگوائے اور آئندہ کے
کے لئے اس سے توبۂ نصوح کرائے
کہ وہ اس قسم کے بہتان بزرگان

انکار صریح ضروریات دین دین پہ نہ لگائے گا۔ حاصل کلام
از یں کلمہ فہمیدہ می شود۔ یہ ہے کہ اس قول کا منشا حضرت
صدیقہ پر ایک ظلم شنیع کا الزام
لگانا ہے اور غیر معصوم کو ظلم کے ساتھ منسوب کرنا موجب کفر نہیں ہے البتہ ان بزرگوں کے حق میں ظلم کی نسبت کرنا جن کی عدالت اور جن کا تقویٰ ثابت ہو چکا ہے۔ موجب فسق و ضلالت ضرور ہے۔ یہ قول باب قذف سے بھی نہیں ہے۔ (آیات سورۂ نور کے نزول کے بعد حضرت صدیقہؓ پر) قذف باجماع، کفر ہے۔

قائل کا چوتھا قول کہ "سید اگرچہ صحابہؓ کو برا بھلا کہنے والا ہو بہرحال اس کی تعظیم لوگوں پر واجب ہے" یہ غلط بات ہے اس لئے کہ جب یہ سید اس قسم کی قبیح حرکات کا مرتکب ہوگا اس کی تعظیم واجب نہیں۔ اور اصل یہ ہے کہ نہی عن المنکر، امر بالمعروف اقامت حدود، قصاص، ادائے شہادت، ادائے امانت اور حکومت میں عدل و انصاف کے معاملے میں کسی طبقہ اور کسی قبیلہ کی تخصیص نہیں ہے ایک سید اور ایک نوریاف ان امور میں برابر و مساوی ہیں۔ جب کہ سید۔ سبّ صحابہ کے باعث کفر کا مرتکب ہو تو پھر سید کب رہا؟ وہ تو "غیر صالح عمل" کی وجہ سے "اہل" سے نکل گیا، و رلیس من اہلک کا مصداق ہو گیا۔ ہاں اگر کوئی سید اس شخص کا کوئی خاص دنیاوی حق ضائع کر دے تو عزیمت اور بلند کرداری کی بات یہ ہے کہ اس سے درگزر کرے اور انتقام نہ لے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی درگزر کے لئے فرمایا ہے۔ لیکن اگر حقوق دینی تلف کئے جائیں وہاں درگزر اور چشم پوشی معقول و جائز نہیں ہے خلاصہ یہ ہے کہ قائل کا یہ قول بھی خطا و بدعت ہے اس بات کے کہنے سے کفر تک نوبت نہیں پہونچتی اس لئے کہ اہل بیت کے حق میں تعظیم بمعنی محبت کا واجب ہونا

اور ان کو ابتداءً نہ دینے کا حکم عموماً وارد ہوا ہے قائل کے دماغ میں اس عام کی تخصیص نہیں آئی کہ اس نے صحابۂ کرام کو برا بھلا کہنے والے سید کے لئے بھی تعظیم واجب قرار دیدی۔ یا حقوق دینی اور حقوق انسانی میں باہم اس کو اشتباہ ہو گیا۔ اور اس نے دونوں قسم کے حقوق میں فرق نہ کر کے یہ بات کہدی —— بہر حال ضروریاتِ دین میں سے کسی بات کا انکار اس قول سے مفہوم نہیں ہوتا۔

اسلام میں عقل کا کردار

(از ڈاکٹر سید محمد یوسف صدر شعبۂ عربی کراچی یونیورسٹی)

—— گزشتہ سے پیوستہ ——

صنعت، حرفت اور تجارت کوئی نئی چیز نہیں، ہمیشہ سے رہی ہے اور برابر ترقی کرتی آئی ہے۔ ترقی کے بالکل ابتدائی درجہ میں جوں ہی انسان نے تمدن و حضارت کی راہ لی "تمویل" کا مسئلہ پیش آیا۔ یعنی یہ کہ ایک فرد کے بس کی یہ بات نہیں رہی کہ صنعت، حرفت اور تجارت کو اعلیٰ سے اعلیٰ پیمانے پر فروغ دینے کے لیے جتنے سرمایہ کی ضرورت پڑے وہ اس کی تن تنہا کفیل ہو جائے۔ لامحالہ اسے دوسروں سے مال کے حصص جمع کرنے پڑتے ہیں۔ انسان کی خود غرضی کا یہ حال ہے کہ اگر وہ دوسرے انسان کو اس کی ذاتی حاجت روائی کے لیے کچھ قرض دیتا ہے تو اس میں بھی "ربا" بڑھت کا طالب ہوتا ہے۔ تنہا عقل سے آج بھی پوچھ کر دیکھ لیجیے وہ اس میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتی پھر اگر "مُقرض" (قرض دینے والے) کو یہ معلوم ہو جائے کہ "مقترض" (قرض لینے والا) اس کا مال صنعت، حرفت یا تجارت میں لگائے گا تو بالطبع یہی چاہے گا کہ جتنا نفع ہو اس میں سے زیادہ سے زیادہ حصہ خود اس کو ملے اور مقترض کو زیادہ کم سے کم پر راضی ہو جائے۔ لیکن "خلق الانسان ھلوعا" انسان بڑا تھڑ دلا بھی واقع ہوا ہے، وہ صنعت، حرفت، تجارت کا نفع دیکھ کر منہ پھاڑتا ہے، لیکن نقصان میں شریک نہیں ہونا چاہتا۔ مقرض کو جو نقصان کا ڈر ہوتا ہے اور جس کی وجہ سے وہ سرمایہ لگانے سے ڈرتا بلکہ جھجکتا ہے اسے وہ مقترض کا رندہ بھانپ لیتا ہے [illegible] ایسا کامیابی پر

کسی حد تک بھی وثوق ہو۔ چنانچہ وہ مقرض سے کہتا ہے کہ تم منافع میں کم سے کم حصہ پر راضی ہو جاؤ تو میں تمہیں نقصان کے ڈر سے نجات دے دیتا ہوں۔ مقرض اپنی پست ہمتی کے باعث اس پر راضی ہو جاتا ہے اور اس طرح اس کا خود اپنا منصوبہ اُلٹ جاتا ہے بالآخر مقترض کاروندہ جو کچھ کماتا ہے اس میں سے بہت تھوڑا حصہ بطور سود کے مقرض کو دے دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مقترض کاروندہ مقرض کو جو بندھا ٹکا "سود" دیتا ہے وہ اس منافع کا بہت تھوڑا حصہ ہوتا ہے جو وہ مقرض کے مال اور اپنی محنت اور حسن تدبیر سے کماتا ہے۔ لطف یہ کہ مقترض کاروندہ تو خوش ہوتا ہی ہے، مقرض بھی یہ سمجھتا ہے کہ نقصان میں شریک نہ ہو کر اس نے مقترض کاروندہ کو بے وقوف بنایا اور خود بے وقوف بن کر خوش ہوتا ہے۔

اس کے باوجود بھی مقرض کو اطمینان نہیں ہوتا۔ وہ یہ ڈرتا ہے کہ مقترض کاروندہ نہ جانے کہیں دلائے اگر نقصان ہوا اور وہ دیوالیہ ہو گیا تو میرا مال ڈوب جائے گا پھر کیا ضمانت ہے کہ مجھے اپنا راس المال پورا پورا مع سود کے مل سکے گا۔ اور کہاں سے ملے گا، اور اس کے لیے مجھے کتنی جھنجٹ میں پڑنا ہوگا اور کتنی پریشانی اور کوفت اٹھانی ہوگی؟ اُدھر مقترض کاروندہ کی ضرورت اتنی بڑھی ہوئی ہوتی ہے کہ وہ زیادہ انتظار نہیں کر سکتا اور چھوٹے چھوٹے سینکڑوں مقرضین سے فرداً فرداً معاملہ کرنا اس کے لیے دشوار ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کوئی ایک بڑا سرمایہ دار ایسا مل جائے جو "سود" نسبتہً زیادہ لے تو لے اس کی تمام ضرورتیں وقت پر پوری کر دے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر زیرک بنک کار درمیان میں کود پڑتا ہے اور اپنی دوکان سجاتا ہے۔ ایک طرف وہ مقرضین کو اپنے وعدوں کی ہر مطلوبہ ضمانت پیش کرتا ہے، حکومت سے تصدیق اور یقین دہانی کراتا ہے یہاں تک کہ قرض دینے والے کو کوئی کھٹکا باقی نہیں رہتا۔ دوسری طرف وہ مقترض کاروندہ سے ایسی ضمانت لے لیتا ہے کہ اسے خود قرض دینے میں اپنے راس المال یا سود کے بارے میں کسی نقصان کا اندیشہ نہیں رہتا۔ پھر وہ ادھر ادھر چھوٹے چھوٹے مقرضین سے چھوٹی چھوٹی رقمیں قرض لیتا ہے اور بڑے بڑے مقترضین کو بڑی بڑی رقمیں کھٹا کھٹ قرض دیتا ہے۔ مقترضین سے زیادہ شرح سود لیتا ہے اور مقرضین کو بہت کم شرح سود دیتا ہے۔ سود لینے اور

سود دینے کی شرح کا فرق خود اینٹھ لیتا ہے۔ اس کے باوجود دونوں ہی اس کے شکر گزار اور احسان مند رہتے ہیں۔ بالآخر وہ تمویل کا مرجع بن کر صنعت، حرفت اور تجارت کی شہ رگ دبائے رکھتا ہے۔

ہو سکتا ہے کوئی اقتصادیات کا ماہر زیر لب مسکرائے اور کہے کہ آپ نے بھی سادگی کی حد کر دی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میرا اقتصادیات کا مطالعہ بہت سرسری ہے۔ لیکن شاید یہ صحیح ہو کہ شریعت میں اس مسئلہ کے جن پہلوؤں کی رعایت کی گئی ہے وہ یہی ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ اگر ایک انسان دوسرے انسان کو اس کی حاجت روائی کے لیے قرض دے تو اس پر "ربوا" زحمت کا طالب نہ ہو۔ جیسا کہ اوپر اشارہ گزرا تھا "تنہا عقل اس کو حماقت تبلائے گی۔ اس انسانی کردار کی عظمت کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے عقل کو دین سے مدد لینا ہو گی۔ جہاں تک تمویل کا تعلق ہے اسلام ایک نہایت سادہ، عام فہم اور قابل عمل اصول بتاتا ہے اور وہ یہ کہ مقرض اور مقترض دونوں نفع نقصان میں اور منافع میں برابر کے شریک ہوں۔ عقل اس کی مصلحت کو بآسانی سمجھ سکتی ہے اور وہ یہ کہ فریقین میں سے کوئی ایک دوسرے کا استغلال نہ کر سکے۔ تمویل کا یہ طریقہ سترھویں صدی تک جب مسلمان صنعت، حرفت اور عالمی تجارت میں ہزیمت خوردہ ہونے کے باوجود خاصے ممتاز تھے۔ تمدن و حضارت کی تمام ضروریات کے لیے کافی تھا۔ آج بھی مضاربت کا یہ طریقہ بالکل متروک نہیں ہوا ہے۔ اگر بنک کار مقرضین کی ہمت پست نہ کرے اور مقترضین کی بے جا حوصلہ افزائی نہ کرے تو یہ طریقہ بڑی سے بڑی صنعت اور تجارت کی صحت مند ترقی کا کفیل ہو سکتا ہے۔ بنک کاری کی طرح کے "وسطاء" (middle men) کا کردار بسا اوقات یہی ہوتا ہے کہ وہ بلا استحقاق اصلی فریقین سے اینٹھ لیتے ہیں اور مجموعی طور پر معاشرہ کے لیے مضر ثابت ہوتے ہیں۔

اس مثال سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ عقل کے نام پر تقلید غیر ہمارا شیوہ بن چکا ہے مغرب کی صنعت اور تجارت، سود اور بنک کاری کے نظام کے ساتھ ہمارے سامنے آئی اور ہم نے مدہوشی کے عالم میں جس کا اوپر ذکر گزرا، سود اور بنک کاری کے نظام کے لیے اسلام میں جگہ نکالنی شروع کر دی۔ آج تقریباً پچاس برس سے ہم اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں حالانکہ اگر ہم مدہوشی کی کیفیت سے نجات پالیں اور عقل و ہوش کی راہ پر چلیں تو صحیح

طریقِ کار یہ ہے کہ دیانت داری سے پہلے تو یہ معلوم کریں کہ ابتدائے اسلام سے عصرِ حاضر کے آغاز تک مسلمان کس اصول پر کاربند رہے اور اس کی بدولت ان کے اپنے زمانے میں کہاں تک سرخروئی یا رسوائی ہوئی، پھر یہ دکھائیں کہ اس اصول پر چل کر عصرِ حاضر میں ترقی خواہ وہ کسی قسم کی ہو، کیوں محال یا دشوار ہے، تب پھر اسلام میں تاویل، ترمیم یا اضافہ کی سوچیں۔ اس کے بجائے ہم کرتے یہ ہیں کہ اسلام میں تاویل، ترمیم اور اضافہ کی پہلے سوچتے ہیں، پھر دوسرے نقطہ سے بالکل آسان گذر جاتے ہیں اور بلا دلیل یہ فرض کر لیتے ہیں کہ عصرِ حاضر میں ترقی صرف انھیں اصولوں کو اپنانے سے ہو سکتی ہے جن پر ہم ترقی یافتہ قوموں کو کاربند دیکھتے ہیں۔ مسلمان چونکہ عصرِ حاضر میں ترقی یافتہ نہیں اس لیے اسلام عصرِ حاضر کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ اس کے بعد آخر میں دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں: یا یہ کہ عصرِ حاضر سے قبل سلف کے اصول بھی وہی تھے جو آج ترقی یافتہ قوموں کے ہیں یا یہ کہ سلف جن اصولوں پر کاربند تھے وہ ان کے زمانے کے لیے تھے، ہمارے لیے نہیں، ہمارے لیے اسلام کی رُوح کافی ہے نہ کہ وہ ہیئات و اشکال جو سلف کے زمانہ میں رائج تھیں۔ اسلام کو عصرِ حاضر کے مطابق ڈھالنے والوں کی تحریروں میں یا تو ہمیں یہ ملتا ہے کہ سود کی فلاں فلاں قسم سرے سے ممنوع ہی نہیں، فقہا اور علماء تیرہ سو برس تک غلطی پر رہے یا پھر یہ کہ عصرِ حاضر کی ترقیوں میں برابر کا حصہ لینا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ صرف اسلام کی رُوح پر اکتفا کرتے ہوئے ترقی یافتہ قوموں کے سارے نظام بلا تکلف اپنا لیے جائیں۔ لیکن یہ کوئی نہیں بتاتا کہ اسلام نے تمویل کا جو طریقہ معین کیا ہے اور جس پر مسلمان عصرِ حاضر کے آغاز تک کاربند رہے اور جو آج بھی کلیۃً متروک نہیں ہوا ہے بلکہ بڑی حد تک معمول بہ ہے وہ کیوں ترقی کے تقاضوں کو پورا کرنے سے عاجز ہے۔ ترقی کی خواہش، خواہ وہ مادی ترقی ہی کیوں نہ ہو کوئی بری چیز نہیں۔ کہنا صرف اتنا ہے کہ مادی ترقی کی خواہش روس کو بھی تھی۔ نیرنگئ احوال دیکھیے کہ شیوعی انقلاب اس ملک میں آیا جو صنعتی لحاظ سے بالکل ہی پس ماندہ تھا جب کہ قائدینِ انقلاب کی توقعات اور پیشین گوئیاں یہ تھیں کہ شیوعی انقلاب کا گہوارہ وہ ممالک ہوں گے جو صنعت میں آگے بڑھے ہوئے ہوں گے۔ بہرحال

مادی ترقی تو شیوعی نظام کا جزو نہیں بلکہ کل کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن اگر شیوعیت مادی ترقی کی خاطر اپنے آپ کو اس وقت کی ترقی یافتہ قوموں کے نظام سرمایہ داری کے مطابق ڈھال لیتی تو کہاں شیوعیت باقی رہتی اور کہاں شیوعیت کی رُوح ؟ روس نے مادّی ترقی حاصل کرلی لیکن شیوعیت کے حدود کے اندر رہ کر۔ اسی باعث تو آج ہمارے یہاں کچھ لوگ اس خیال کے ہیں کہ شیوعیت کے ساتھ خدا کو جمع کردو (شیوعیت + خدا) اسی طرح جیسے کہ ہم نے انگریزی نظامِ تعلیم کے ساتھ اسلامی نظریۂ حیات کو جمع کردیا ہے۔ دنیاوی مقاصد میں اسلام مددگار ثابت ہوگا اور اگر کوئی رندگستاخ آخرت کا ذکر چھیڑ دے تو اس کے لیے بھی اسلام کی روح (اسلامی شریعت نہیں اسلامی "نظریۂ حیات") کافی ہے۔ اب تک یہ طرز فکر معدوم ہے کہ زندگی کے مسائل سے کیا ڈرنا اور کیا ڈرانا۔ زندگی ایک ہے، زندگی کے مسائل ہر دین و مذہب اور نظامِ زندگی کے متبعین کے لیے یکساں ہوتے ہیں۔ ہر دین مذہب اور نظامِ زندگی کی امتیازی شان بلکہ اس کے وجود کا جواز ہی اس میں ہوتا ہے کہ وہ ان مسائل کا نیا حل پیش کرے جیسے کہ روس نے مادی ترقی اور خوش حالی کا ایک نیا حل پیش کیا۔ اگر سائل اپنے ساتھ بندھے ٹکے حلول لے کر ابھریں تو پھر تو سبھی انسان "ملۃ واحدۃ" میں ضم ہو جائیں۔ دین تو دین پھر عقل کی بھی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بالکل اسی انداز پر ہمیں اقتصادیات کے دوسرے ابواب میں سوچنا ہوگا۔ موجودہ نقد کے نظام کو لیجیے، جو تمام تر حکومتوں کے تصرف میں ہے، فطری عوامل بالکل معطل کر دیے گئے ہیں۔ اسلام کا موقف مختصراً یہ ہے کہ نقد کی مقررہ قیمت — (Face Value) وہی ہونا چاہیے جو اس کی ذاتی قیمت (Intrinsic Value) ہو۔ نقد بھی ایک جنس ہے اور فطری عوامل کے تحت اجناس کی قیمت میں جو اتار چڑھاؤ رہتا ہے۔ اس سے نقد کی قیمت کا متاثر ہونا بھی فطری ہے[2]۔ حمل ونقل کی سہولت کے لیے کاغذ کا نوٹ ایک نشانی (Token) ہے۔ یقین دہانی ہے۔ ایک "وعدہ" ہے کہ معین مقدار میں

---

[1] جو خدا سے بے نیاز ہیں ان کا ذکر ہی بے محل ہے ختم اللہ علی قلوبہم ...الخ۔ [2] چونکہ سونے چاندی کے گھریلو استعمال سے نقد کی قیمت متاثر ہوتی ہو اور اقتصاد پر اثر پڑتا ہو اسی لیے اس پر پابندیاں ہیں۔

زرِ نقد محفوظ ہے۔ اب اگر یہ وعدہ جھوٹا ہو تو؟ آخر جھوٹے سکہ اور جعلی سکہ پر پکڑ دھکڑ کیوں ہے؟

میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو بُرا لگتا ہے کیوں؟
ہیں سبھی تہذیب کے اوزار تو چھلنی میں چھاج

یہ جو موجودہ دنیا میں "ہتھیلی پر سرسوں جمانے" کا عمل جاری ہے اور اقتصاد کے جسم پر بادی گوشت چڑھنے لگتا ہے اور موٹاپے کے باعث حرکت قلب بند ہونے کا خدشہ ہوتا ہے اس میں بہت بڑا دخل اسی نقد کے نظام کے فساد کا ہے۔ نقد کے نظام میں "ملا غُب" اڈّ من مانی جو موجودہ دور میں حکومتوں کا حق سمجھا جاتا ہے۔ اسی سے یہ عبرت حاصل ہوتی ہے کہ عقل کو خود اپنی صحت برقرار رکھنے کے لیے وحی کے بتائے ہوئے اخلاقی سانچوں میں ڈھلنا چاہیے۔

یہ جو عقل والے اسلام سے کہتے ہیں: "زمانہ باتو نسازد تو با زمانہ بساز" اسے بڑی تقویت ایک لفظ "تشکیلِ نو" (Re-Construction) سے ہوتی ہے جو اقبال کے لیکچرز کا عنوان ہونے کے طفیل چل پڑا ہے۔ عام طور سے یہ مغالطہ ہوتا ہے یا جانتے بوجھتے ہوئے اقبال کے ساتھ عقیدت کا سہارا لے کر یہ مغالطہ دیا جاتا ہے کہ تشکیل نو یا تعمیر نو اس عمل کا نام ہے جو "ہدم و بنا ر" پر مشتمل ہوتا ہے، یعنی یہ کہ پہلی عمارت کو ہدم کردو، ڈھادو اور اس کی جگہ ایک نئی عمارت بنا کر کھڑی کر لو۔ اگر یہی ہے تو پھر تو "ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت" اسلام اگر نام کو رہا بھی تو ہمیشہ پھاوڑے کدال کی زد میں رہے گا۔ اقبال کے مجموعی فکر میں اس "ہدم و بنا ر" کی کوئی گنجائش نہیں[1]۔ یہ اقبال پر سراسر بہتان ہوگا۔

---

[1] اس میں شک نہیں کہ اقبال کے چھٹے لیکچر (The Principles of Movement) میں ہدم کی بہت سی مثالیں ہیں۔ لیکن اس سے صاف ظاہر ہے کہ فکر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے اور اقبال وقتی جذبات کی رَو میں بہہ گئے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے میرا مقالہ — A Study of Iqbal's Views on "Ijma" Iqbal Review, Karachi, October 1962

حتیٰ کہ اقبال کے فن شاعری کی بابت بھی کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے اردو شاعری کی قدیم عمارت ڈھاکر اس کی جگہ ترقی پسند ڈیزائن کی نئی عمارت کھڑی کی [۱] قبل اس کے کہ کوئی یہ کہے کہ اچھا تو پھر ایک مرتبہ اسلام کی جو عمارت بن گئی وہ مرور زمانہ سے بوسیدہ ہو کر اپنے آپ گر جائے گی اور اس کے مکین ویرانہ چھوڑ کر بھاگ جائیں گے ــــ قبل اس کے کہ کوئی یہ کہے میں کہوں گا کہ آپ جتنی بھی تجدید کریں، پتھر تو جماد ہے، اس کی تشکیل، تعمیر، تجدید ہمیشہ بانی کے تخیل، مرضی، پسند اور عمل کے مطابق ہوگی۔ اس کے برخلاف اسلام میں "نمود و افزودھار" ہے۔ وہ ایک نبات کی مانند بڑھتا ہے، اور بڑھتا ہی چلا جاتا ہے، پھلتا اور پھولتا ہے۔ یہ سب زور طبیعت کی بدولت اور اپنے مزاج اور فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔ جیسے زمانہ گزرتا جاتا ہے اس کی جڑیں ماضی میں اور زیادہ راسخ ہوتی جاتی ہیں، تنا اور زیادہ موٹا اور مضبوط ہوتا جاتا ہے، اس میں نئی نئی شاخیں پھوٹتی ہیں، نئے نئے پھول کھلتے ہیں اور پھل لگتے ہیں، لیکن نمو و افزودھار کے اس عمل میں اس کی اندرونی طاقتیں کارفرما ہوتی ہیں، اس کا ارتقا اس کے اپنے "نشاط روح (Elam vital) کا تابع ہوتا ہے۔ الغرض کسی باغبان کے تخیل یا مرضی اور پسند کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ باغبان کی عقل صرف اتنا کر سکتی ہے اسے کھاد، پانی دے اور طفیلی پودوں سے بچائے رکھے تاکہ وہ سوکھنے نہ پائے اور اس کی بڑھت نہ رُک جائے۔ کہنا یہ ہے کہ اگر اسلام کے باغبان اور چمن آرا اسلامی علوم کی آبیاری کریں اور انھیں تر و تازہ رکھیں تو اسلام کا تناور درخت طبعی تغیرات ــــ گرمی، سردی، آندھی، جھکڑ ــــ کی مقاومت کرتا ہوا اپنی فطرت کے مطابق خود بخود بڑھتا رہے گا۔ اپنے پتوں کی خود تجدید کرے گا اور ہر موسم میں نئے پھل دیتا رہے گا۔ کجا اسلامی علوم ــــ قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ ــــ اور کجا "اردو کا اسلامی لٹریچر" اور "اسلامی نظریۂ حیات" جن کی حیثیت "برگ حشیش" سے زیادہ نہیں۔ میرے پیش نظر اعلیٰ تعلیمی ادارے ہیں، اُن پڑھ اور اَدھ پڑھے عوام نہیں کہ انھیں جو میسر آجائے وہی بہتر ہے۔

---

[۱] دیکھیے میرا مقالہ "اقبال کے کلام میں روایت اور جدت"۔ اقبال ریویو، کراچی، جنوری ۱۹۶۱ء

"ہدم و بناء" کی خاطر باب اجتہاد پر یورش ہے۔ باب اجتہاد کھلا ہے اور ہمیشہ سے کھلا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے قانون، طب، ہندسہ اور ابحاث ذریہ (Atomic research) کا دروازہ کھلا ہے۔ صرف اتنا ہے کہ جب تک لوگ دیانتدار تھے وہ شرم و حیا کے ساتھ اپنے قصور علم کا اعتراف کرتے تھے اور بے جھجک نہیں داخل ہوتے تھے۔ کاش جو جد و جہد باب اجتہاد کے دروازے توڑنے میں کی جاتی ہے وہ اجتہاد کی تیاری میں صرف ہوتی۔ آخر یہ تو ضروری نہیں کہ جو دروازہ کھلا ہو اس میں ہر کس و ناکس گھستا چلا جائے۔ باب اجتہاد میں داخل ہونے کے آداب و شرائط کچھ اور ہیں اور حمام میں داخل ہونے کی ہیئت اور طریقے کچھ اور ہیں۔ اجتہاد کے آداب و شرائط تفصیل سے درج ہیں اور نہایت معقول ہیں۔ باجمال دو بڑے بڑے عنوانوں کے تحت آتے ہیں: ایک علم یعنی علم دین، دوسرے تقویٰ یعنی حسن نیت کے ساتھ اللہ کی مرضی کی تلاش۔ آخر ججوں سے بھی تو ان کے عہدہ کا حلف اٹھوایا جاتا ہے، پھر یہ تقویٰ کی شرط کیوں گراں گزرتی ہے؟ علم کے سلسلہ میں ایک بات ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اسلامی نظام تعلیم کی ایک نہایت قابل قدر روایت یہ تھی (اب یہ روایتیں کہاں؟ صرف حدیث کی حد تک خال خال ان کا لحاظ باقی رہ گیا ہے) کہ مصنف سے اس کی کتاب کی روایت کا سلسلہ چلتا تھا، اس طرح نہ صرف مصنف کے الفاظ بلکہ ان الفاظ سے اس نے جو معانی مراد لیے ہیں وہ اور ان کی تفسیر سلسلہ دار منقول ہوتی تھی اور کسی کو یہ حق نہیں ہوتا تھا کہ ڈکشنری کی ناقص مدد اور عقل کے زور سے الفاظ کو وہ معنی پہنائے جو مصنف کے ذہن میں نہ تھے۔ ادب میں بھی یہ ہے کہ جاہلی شعر کی جو قدیم شرحیں ہیں وہ قابل احترام ہیں اور ہمارے اپنے اجتہاد کی گنجائش بہت کم ہے۔ پھر کیا قرآن و حدیث کے سلسلہ میں یہ واجب نہیں کہ صحابہ اور تابعین نے جو مطلب لیا اور جو سمجھا اس کا ہم احترام کریں؟ یہ بھی کیا بات ہے کہ ایک مدرسی لغت لے کر بیٹھے، قرآن و حدیث کے الفاظ کے متعدد معانی میں سے ایک معنی چنا، اور اجتہاد کر ڈالا کہ ہمارے مفید مطلب اور عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق، فلاں آیت اور فلاں حدیث کا مفہوم یوں بنتا ہے!!! ادب میں اس قسم کے اجتہاد کی ایک دلچسپ مثال ابن سلام الجمحی کی طبقات فحول الشعرا کا وہ ایڈیشن ہے جو محمود محمد شاکر

میں شائع کیا ہے۔ انھوں نے جا بجا قدیم شعر سمجھنے میں قدیم شارحین سے ہٹ کر خود اپنا اجتہاد کیا ہے۔ بس یوں سمجھیے کہ دین میں اجتہاد کرنے والے اسلام کی روح کو جدید قالب میں ڈھالتے ہیں اور وہاں قدیم شعر کے قالب میں جدید روح پھونک دی گئی ہے[1]۔ ہمارے یہاں بھی کلام غالب کی ایسی شرحیں کم نہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنے بڑے ماہر اقتصادیات تھے! لغت کی رُو سے سب جو لیں برابر بیٹھتی ہیں۔

اگر کسی کو یہ دیکھنا ہے کہ کیسے کیسے لوگ ننگ دھڑنگ تفسیر و اجتہاد کے دروازہ میں گھس آتے ہیں تو دکتورہ بنت الشاطی کا وہ طویل مقالہ پڑھے جو انھوں نے مستشرقین کی بین الاقوامی کانگرس کے اجلاس میں شرکت کے بعد دہلی سے واپسی پر "الاہرام" مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۶۴ء میں شائع کیا تھا۔ لکھتی ہیں کہ جو عربی سے نابلد ہے وہ قرآن کا ترجمہ اور تفسیر کر ڈالتا ہے۔ آخر میں کہتی ہیں کہ گو ہمیں (مصریوں کو) یہ حق نہیں کہ دوسرے ممالک میں شائع ہونے والی کتابوں پر پابندی لگائیں لیکن اتنا تو ہو کہ چند علماء قرآن کی عزت و ناموس کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور اللہ کی کتاب کو "عبث الملترجمین دخطأ الشرّاح وعدوان المقتبسین" سے بچائیں۔

یہ حضرت عمرؓ کے سارے فقہی کارناموں کو چھوڑ کر صرف چند "اولیات عمرؓ" کیوں ہماری توجہ کا مرکز بنی ہیں؟ اسی لیے نا کہ "ہدم و بناء" کے پہلے جزو (ہدم) کی سند کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ کر نکالنی ہے؟ میں صرف دو مثالوں پر اکتفا کروں گا جو فی الواقع کسی حد تک جواب کی محتاج ہیں

پہلے "مولفۃ القلوب" کے مسئلہ کو لیجیے۔ اگر آج ہندوستان میں کوئی ہندو اسلام لاتا ہے یا قبول اسلام کا ارادہ کرتا ہے تو کتنی ہی مشکلات ہوں گی جو ایک کمزور ارادہ والے انسان کو باز رکھیں گی۔ اس کی جان، مال، نوکری سب خطرہ میں پڑ جائے گی۔ اس کے برخلاف اگر کوئی پاکستان میں اسلام لائے تو وہ تو ہو سکتا ہے مال و دولت ملازمت کی لالچ میں اسلام لائے۔ ایسی حالت میں ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ وہ اس ہندو کی جو مائل بہ اسلام ہے تالیف قلب کریں، پاکستان میں اس کی چنداں ضرورت نہیں پھر اگر وہ نو مسلم ہندوستانی مسلمانو

---

[1] دیکھیے میرا نقد اس کتاب پر ۔۔۔ مجلۃ "الکتاب" (القاہرہ) اپریل ۱۹۵۲ء

سے وظیفہ لینا اپنا حق سمجھنے لگے اور پاکستان آجائے تو یہاں کے مسلمانوں کی دیکھا دیکھی پڑھا چڑھا کر اس وظیفہ کا جھوٹا کلیم (claim) بھی داخل کر دے۔ اگر ایسا ہو تو عقل کیا کہتی ہے جو عقل کہتی ہے وہ قرآن و سنت کے عین مطابق ہے۔ حضرت عمرؓ نے صرف اتنا کیا تھا، ویسے مولفۃ القلوب کی مد آج بھی باقی ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے عراق کی زمینوں کو مقاتلین میں تقسیم نہیں ہونے دیا۔ اچھا تو یہ تقسیم کس آیت اور کس سنت کی رو سے فرض تھی؟ اس سب کا مدلل، عالمانہ، اور سنجیدہ جواب اس مقالہ میں موجود ہے جو حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی کے قلم سے معارف اعظم گڑھ اگست ۱۹۵۷ء و مابعد میں شائع ہوا۔ فتح عراق سے پہلے یہ صورت حال پیش ہی کب آئی تھی کہ اتنا رقبہ زمین ہاتھ آئے جو رضاکار فوجیوں کی خود کاشت کی ضرورت سے زیادہ ہو؟ پھر "جنود مرتزقہ" (Standing army) کا اس سے پہلے کسی کو خیال بھی آیا تھا؟ یہ خیال تو اس وقت آیا، اور اسی وقت آنا بھی چاہیے تھا، جب ایران کے مفتوحہ علاقوں میں چھاؤنیاں قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے جو کچھ کیا وہ اسلامی شریعت کا "نمو" ہے، نمو میں کچھ تغیر تو ہوتا ہے لیکن "ہدم" نہیں۔ اپنی جوانی کا مقابلہ اپنے بچپن سے کر کے دیکھیے۔ نمو کے عضوی (organic) تغیرات نظر آئیں گے۔ اسی طرح اجتہاد بھی قرآن و سنت کا عضوی نمو و ارتقا ہے۔ اسی کو فقہا و محدثین یوں کہتے ہیں کہ اجتہاد کی سند قرآن و حدیث سے ضروری ہے۔

خلاصہ یہ کہ ہماری عقلیں "مسلم" ہیں۔ جو عقل اسلام لا چکی ہو اسے "تحرد" زیب نہیں دیتا۔ "عقلِ مسلم" کا دائرۂ عمل فقہ دین ہے۔ اجتہاد اس کا سب سے اعلا درجہ ہے۔ اجتہاد کا شوق مبارک لیکن اجتہاد ثمرہ ہے علوم اسلامیہ کی ترقی کا۔ بغیر شجر کے ثمر کی توقع؟ قرآن و سنت سے رضائے الٰہی دریافت کرنا کم از کم اتنا علم چاہتا ہے جتنا ذرہ کا دل چیرنے کے لیے ایک سائنس دان کو درکار ہوتا ہے۔ اگر اجتہاد کی ضرورت ہے، اور بے شک ہے، تو اسلامی علوم کے ساتھ وہی اعتنا کیجیے، جو سائنس کے ساتھ کیا جاتا ہے، اور خدارا اسلام کو بہ حیثیت ایک علم کے سیاست سے بالکل منعزل (isolated) رکھیے۔ اتنا حق تو ہر علم کا تسلیم کیا جاتا ہے، پھر اسلام تو ایک مقدس علم ہے۔

تمام

جہاد اور ہجرت

سے متعلق سورہ نساء کی چند آیات

ہر اتوار کو مغرب سے عشاء تک، کچہری روڈ (لکھنؤ) کی اس مسجد میں جو "مرکز والی مسجد" کہلاتی ہے قرآن مجید کا درس ہوتا ہے، گزشتہ اتوار (۲۳ر جون) کو سورۂ نساء کی مندرجۂ ذیل آیات (۹۴ تا ۱۰۰) زیر درس تھیں۔ ایک عزیز نے اس درس کے مضامین کو قلمبند کیا ہے اور میری نظر سے گزرنے کے بعد اس کو ہدیۂ ناظرین الفرقان کیا جا رہا ہے ———— محمد منظور نعمانی

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یا ایھا الذین آمنوا اذا ضربتم فی سبیل اللہ فتبینوا ولا تقولوا لمن القی الیکم السلم لست مؤمنا ج تبتغون عرض الحیاۃ الدنیا فعند اللہ مغانم کثیرۃ ط کذلک کنتم من قبل فمن اللہ علیکم فتبینوا ط ان اللہ کان بما تعملون خبیرا ۝ لا یستوی القاعدون من المؤمنین غیر اولی الضرر والمجاھدون فی سبیل اللہ باموالھم وانفسھم ط فضل اللہ المجاھدین باموالھم وانفسھم علی القاعدین درجۃ ط وکلا وعد اللہ الحسنیٰ ط وفضل اللہ المجاھدین علی القاعدین اجرا عظیما ۝ درجٰت منہ ومغفرۃ ورحمۃ ط وکان اللہ غفورا رحیما ۝ ان الذین توفھم الملٰئکۃ ظالمی انفسھم قالوا فیم کنتم ط قالوا کنا مستضعفین فی الارض ط قالوا الم تکن ارض اللہ واسعۃ فتھاجروا فیھا ط فاولٰئک ماوٰھم جھنم ط وساءت مصیرا ۝ الا المستضعفین من الرجال والنساء والولدان لا یستطیعون حیلۃ ولا یھتدون سبیلا ۝ فاولٰئک عسی اللہ ان

يَعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (النساء ۹۴ - ۱۰۰)

(ترجمہ) اے ایمان والو جب تم خدا کی راہ میں (یعنی جہاد کے لیے) نکلا کرو تو (عملی اقدام اور حملہ سے پہلے) اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو۔ اور جو تمہیں سلام کرے (اور اپنا مسلمان ہونا ظاہر کرے) تو اس کو دنیوی زندگی کے سامان کی خاطر یہ نہ کہو کہ تو مومن و مسلم نہیں ہے، اللہ کے پاس غنیمت کے بڑے سامان ہیں (لہٰذا تم اسی کے فضل پر نگاہ رکھو) پہلے تم بھی ایسے ہی حال میں تھے، اللہ نے تم پر فضل و احسان فرمایا تو تم (ایسے موقعوں پر) تحقیق ضرور کر لیا کرو، تم جو کچھ کرتے ہو اور کروگے اس سے اللہ تعالیٰ اچھی طرح باخبر ہے (۹۴)

مسلمانوں میں اپنے جان و مال سے جہاد کرنے والے اور بغیر کسی عذر اور مجبوری کے بیٹھ رہنے والے (یعنی جہاد نہ کرنے والے) درجہ اور مرتبہ میں برابر نہیں ہیں، جو اہل ایمان اپنے جان و مال سے راہ خدا میں جہاد کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو جہاد نہ کرنے والوں پر ایک بڑے درجہ کی فضیلت بخشی ہے، یوں دونوں ہی طبقوں کے لیے (بشرطیکہ وہ ایمان میں مخلص ہوں) اللہ تعالیٰ کی طرف سے حسنِ انجام کا وعدہ ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے "مجاہدین" کو "قاعدین" پر ایک عظیم اجر کی فضیلت دی ہے (۹۵) — (ان کے لیے) اس کی طرف سے (بڑے بلند) درجات ہیں اور (خاص درجہ کی) بخشش و رحمت ہے اور اللہ غفور و رحیم ہے۔ (۹۶)

جن لوگوں کی روح فرشتے اس حال میں قبض کریں گے کہ انہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم ڈھائے ہیں (اور اللہ کے احکام و مطالبات کی

ادائیگی میں سخت کوتاہیاں کی ہیں) وہ ان سے پوچھیں گے کہ تم کس حال میں تھے؟
وہ کہیں گے کہ ہم اپنے وطن اور ماحول میں بالکل عاجز اور بے بس تھے (اس
لیے مسلمانوں والی زندگی نہیں گزار سکتے تھے) فرشتے کہیں گے کہ کیا خدا کی
زمین وسیع نہ تھی کہ تم کسی طرف ہجرت کر جاتے! ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے
اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ (۹۷) البتہ وہ عاجز و لاچار مرد اور عورتیں اور
بچے جو ان حالات سے نکلنے کی کوئی تدبیر نہیں کر سکتے اور کوئی راستہ نہیں
پا سکتے ہیں (وہ معذور ہیں) (۹۸)

توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرمائے گا اور اللہ معاف
فرمانے والا اور بخشنے والا ہے (۹۹)

اور جو کوئی راہ خدا میں ترک وطن کر کے نکلے (اس کے لیے اللہ کا
فیصلہ ہے کہ) وہ اللہ کی زمین میں رہنے بسنے کے لیے وسیع میدان اور پوری
گنجائش اور کشادگی پائے گا۔ اور جو کوئی چل نکلے اپنے گھر سے اللہ و رسول کے
لیے ہجرت کر کے پھر آجائے اس کو (راستہ ہی میں) موت تو صرف قدم اٹھانے
سے اس کا اجر و ثواب ثابت ہو گیا اللہ تعالیٰ کے ہاں اور اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے (۱۰۰)

تفسیر و تشریح :-

یہ آیتیں جس سیاق اور پس منظر میں سورۂ نساء میں وارد ہوئی ہیں پہلے اس کو سمجھ لینا چاہیئے۔
یہ بات آپ سب حضرات کو معلوم ہے کہ مسلمان اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکۂ معظمہ میں ۱۳ برس
تک دشمنان دین یعنی مکہ کے کفار و مشرکین کے ظلم و ستم سہتے رہے اور آپ نے اپنے اصحاب و رفقاء کو
مدافعت کے لیے بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں دی، بلکہ مدینۂ طیبہ ہجرت فرمانے کے بعد
بھی شروع شروع میں کچھ دنوں یہی رویہ رہا کہ جب کبھی بعض جوشیلے مسلمانوں نے دفاع
و مقابلہ کے لیے طاقت کے استعمال کرنے کی اجازت چاہی تو آپ نے ان کو اجازت نہیں دی

اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ مسلمانوں کو یہی ہدایت اور تلقین فرماتے رہے کہ

"کُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ" (سورۃ النساء آیت ۷۷)

یعنی صبر و برداشت سے کام لو، ہاتھ نہ اٹھاؤ، اور بس نماز و زکوٰۃ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط کرتے رہو اور اپنے نفس و روح کی تربیت کرتے رہو۔

اب سے دو تین ہفتے پہلے جب یہ آیت (کُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ) اسی سورۂ نساء میں زیر درس آئی تھی تو میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ نماز اور زکوٰۃ اگر صحیح طور پر ادا کی جائیں تو روح اور نفس پر ان کا کیا اثر پڑتا ہے۔ یہ بات مسلمات اور مجربات میں سے ہے کہ نفس کے تزکیہ اور روح کی تربیت اور اخلاص و للّٰہیت پیدا ہونے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی دو عمل ہیں۔ بشرطیکہ صرف ان کی صورت نہ ہو بلکہ حقیقت ہو، اسی لیے تمام آسمانی شریعتوں میں نماز اور زکوٰۃ کا حکم رہا ہے۔

بہر حال میں کہنا چاہتا تھا کہ ہجرت کے بعد بھی کچھ دنوں تک مسلمانوں کو یہی تاکید کی جاتی رہی کہ اپنی حفاظت اور مدافعت کے لیے بھی طاقت کا استعمال نہ کرو۔

کچھ عرصہ کے بعد وہ وقت آگیا کہ ظالموں کے مقابلہ کے لیے اور شرارت اور گمراہی کی قوتوں کو راستہ سے ہٹانے کے لیے طاقت کا استعمال کرنے کی اجازت مسلمانوں کو دیدی گئی اور جہاد و قتال کا حکم آگیا، اس وقت بعض ایسے مسلمانوں نے جن میں کچھ کمزوری تھی اس خیال اور آرزو کا اظہار کیا کہ ابھی کچھ دنوں اور یہ حکم نہ آیا ہوتا تو شاید بہتر اور قرین مصلحت ہوتا، تو قرآن پاک میں ان کو سخت سرزنش کی گئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا کہ آپ ان کی بالکل پرواہ نہ کیجئے اور اپنے اللہ پر بھروسہ کیجئے۔ (فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَکَّلْ عَلَى اللّٰهِ)

اس کے بعد آپ کو مخاطب فرما کر ارشاد فرمایا گیا۔

فَقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ — (اے پیغمبر! کوئی تمہارا ساتھ دے
لَا تُکَلَّفُ اِلَّا نَفْسَکَ وَ — یا نہ دے) تم بذات خود راہ خدا میں
حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَسَى اللّٰهُ — جہاد کرنے کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔)

اَنۡ يَّكُفَّ بَاۡسَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ؕ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاۡسًا وَّاَشَدُّ تَنۡكِيۡلًا ۝

(النساء - ۸۴)

تم پر صرف اپنی ذات کی ذمہ داری ہے اور ایمان والوں کو جہاد فی سبیل اللہ کی دعوت و ترغیب دو۔ توقع ہے کہ اللہ اپنی خاص مدد سے (تمہارے اور تمہارے ساتھ دینے والے اہل ایمان کے ذریعہ) کافروں کے دباؤ اور ان کے جنگی اقدامات کو روک دے اور اللہ بڑے زور والا اور (دشمنان حق کو) سخت عبرتناک سزا دینے والا ہے۔

آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس وقت کے مؤمنین صادقین کے دلوں میں اس آیت نے جہاد کا کیسا بے پناہ جوش بھر دیا ہوگا۔

اس آیت کے بعد آٹھ دس آیتوں میں بعض ان مسائل کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں جو جہاد کے سلسلے میں پیدا ہو سکتے تھے یا ان کا جہاد سے قریب یا دور کا تعلق تھا۔ ان ہی میں سے ایک مسئلہ یہ تھا کہ جہاد کے اقدامات میں اس کا بھی امکان تھا کہ دشمنوں کی کسی بستی پر حملہ کیا جائے اور وہاں کے کچھ لوگ یا ایک ہی آدمی دعوت اسلامی کو قبول کر چکا ہو اور خدانخواستہ وہ بھی حملہ کی زد میں آ جائے یا وہ مسلمانوں کے طریقہ پر سلام کر کے یا کلمہ توحید پڑھ کر اپنا مسلمان ہونا ظاہر کرے۔ اور اس وقت جہاد کے جوش میں اس پر اعتبار نہ کیا جائے۔ اور دشمن قرار دے کر اس کو بھی نشانہ بنا دیا جائے۔

آج جو آیتیں میں نے تلاوت کی ہیں، ان میں سے پہلی آیت (يَآ اَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا ضَرَبۡتُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوۡا) کا تعلق اس مسئلے سے ہے کہ اس میں مجاہدین کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ جب تم راہ خدا میں جہاد کے لیے نکلو اور دشمنوں کی کسی بستی یا علاقہ پر حملہ کا منصوبہ بناؤ تو امکانی حد تک اس کی پوری تحقیق کر لو کہ وہاں ایسا کوئی آدمی تو نہیں ہے، جس نے دعوت اسلامی کو قبول کر لیا ہو اور اگر کوئی شخص سلام کے ذریعہ یا کلمہ پڑھ کے یا کسی اور طریقہ پر اپنا اسلام اور اللہ و رسول کے ساتھ اپنی

وفاداری ظاہر کرے تو تمہیں حق نہیں ہے کہ تم اس کو منافق اور تقیہ باز قرار دے کر اس کے ساتھ دشمنوں والا معاملہ کرو ـــــــ اس ہدایت کے ساتھ فرمایا گیا ہے "تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا" یعنی ایسی حالت میں اس کو دشمن قرار دے کر اس پر بھی حملہ کر دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ تم دراصل اس کے مال و اسباب کے طالب ہو اور اس کو "غنیمت" قرار دے کر ہتھیا لینا چاہتے ہو۔ اس کے آگے فرمایا گیا ہے "فَعِنْدَ اللهِ مَغَانِمُ كَثِيرَةٌ" یعنی اللہ کے پاس غنیمت کے بڑے ذخیرے ہیں، تم اُن کے طالب بنو، اس کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے "كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوا"۔ مطلب یہ ہے کہ تم یاد کرو کبھی تم بھی ایسے ہی تھے، یعنی کافروں کے بیچ میں اور کافروں کی بستیوں میں رہا کرتے تھے۔ اس وقت اگر تم کو بھی کافروں اور دشمنوں میں سے سمجھ کر تمہارے ساتھ یہی معاملہ کیا جاتا تو تم پر کیا گزرتی اور تم اس کو کیا سمجھتے۔ اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان فرمایا تمہیں اس حالت سے نکال لیا، اس لیے اب تمہارا طریقہ کار یہ ہونا چاہیے کہ ایسے موقعوں پر پوری تحقیق سے کام لیا کرو، اللہ تعالیٰ ظاہر و باطن سب جانتا ہے۔ تم جو کچھ کرو گے اور جس نیت سے کرو گے وہ اس سے مخفی نہیں۔ وہ اسی کے مطابق تم کو جزا یا سزا دے گا۔ (إِنَّ اللهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا)

اس آیت میں "تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا" کا یہ جملہ بڑی معنویت رکھتا ہے اس میں صحابہ کرام کو بڑے ہی بلیغ اور موثر پیرایہ میں تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ ایسے موقع پر اسلام اور اللہ و رسول سے وفاداری کا اظہار کرنے والے شخص کی بات پر اعتبار نہ کرنے اور سہل انگاری اور بے احتیاطی سے اس کو دشمن قرار دے کر نشانہ بنا دینے کا منشا یہی ہوگا کہ تمہاری نگاہ اللہ کی رضا پر نہیں بلکہ اس بے چارے کے مال و اسباب پر ہے اور یہ بات جتنی دنی، جتنی گھٹیا اور شانِ ایمان سے جتنی دور ہے ظاہر ہے ـــــــ میرا خیال ہے کہ اس آیت نے صحابہ کرام کی روحوں پر یہ لرزہ طاری کر دیا ہوگا۔

احادیث و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض جنگی اقدامات میں اس طرح کے واقعات پیش آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن پر اپنی انتہائی ناراضی بلکہ غضب اور جلال کا اظہار فرمایا اور بعض موقعوں پر تو اس سلسلہ میں غلطی کرنے والوں کے

لیے دعائے مغفرت کرنے سے بھی انکار فرما دیا۔

صحیح بخاری اور جامع ترمذی وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہٗ کا یہ بیان مروی ہے کہ قبیلۂ بنو سُلیم کا ایک آدمی صحابہ کرام کے ایک عسکری دستہ کی زد پر آگیا چونکہ یہ پورا قبیلہ دشمن تھا، اس آدمی نے اپنا اسلام ظاہر کرنے کے لیے مسلمانوں کے طریقہ پر سلام کیا، انھوں نے سمجھا کہ یہ ہمیں دھوکہ دینے کے لیے اور جان بچانے کے لیے ایسا کر رہا ہے چنانچہ اس کو بھی نشانہ بنا کے ختم کر دیا اور اس کے سامان اور اس کی بکریوں کو مالِ غنیمت قرار دے کر اس پر قبضہ کر لیا اور لے آئے ——— حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ سورۂ نساء کی یہ آیت "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَتَبَیَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓی اِلَیْکُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا الخ" اسی واقعہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی تھی:

اور صحیح مسلم میں ایک واقعہ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دستہ کسی دشمن قوم کے مقابلہ کے لیے بھیجا، جس میں حضرت اسامہ بھی تھے۔ جب جنگ برپا ہو گئی تو دشمن کی طرف سے لڑنے والوں میں ایک آدمی تھا جو بڑا کا لڑنے والا تھا وہ جس مسلمان کی طرف رُخ کرتا اس کو ختم کر دیتا، اس طرح اس کے ہاتھ سے یکے بعد دیگرے کئی مسلمان شہید ہو گئے، حضرت اسامہ بن زید نے اس کو تاکا اور تلوار کے ساتھ اس پر جھپٹے، جیسے ہی وہ حضرت اسامہ کی زد میں آیا اُس نے کہا لا الٰہ الا اللہ لیکن اسامہ نے ہاتھ نہیں روکا اور یہ سمجھ کر کہ یہ جان بچانے کے لیے منافقانہ طور پر کلمہ پڑھ رہا ہے، وار کر دیا اور وہ ختم ہو گیا ——— واپسی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی بھی اطلاع دی گئی ——— آپ نے عتاب کے انداز میں حضرت اسامہ سے پوچھا کہ جب وہ کلمہ پڑھ چکا تھا تو تم نے اس کو کیوں قتل کیا؟ انھوں نے عرض کیا کہ حضرت اس نے ہمارے فلاں فلاں ساتھیوں کو شہید کر دیا اور جب اس نے میری تلوار اپنے سر پر دیکھی تو اس وقت اُس نے کلمہ پڑھا ——— آپ نے فرمایا "کَیْفَ تَصْنَعُ بِلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اِذَا جَاءَتْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ" کہ قیامت کے دن جب اس کا کلمہ لا الٰہ الا اللہ فریادی بن کر آئے گا تو تم کیا کرو گے اور کیا جواب دو گے؟ حضرت اسامہ نے عرض

کہا "یا رسولَ اللّٰہ اِسْتَغْفِرْلِیْ" (حضرت میرے لیے دعا کر دیجیے کہ اللہ تعالیٰ میرا گناہ معاف فرما دے اور بخش دے) اس کے جواب میں آپ نے یہی فرمایا "کیف تصنع بلا الٰہ الا اللّٰہ اذا جاءت یوم القیٰمۃ" (تم یہ بتاؤ کہ قیامت کے دن اُس کے لا الٰہ الا اللّٰہ کا تم کیا جواب دوگے؟) راوی کا بیان ہے کہ آپ بار بار یہی فرماتے تھے کہ "کَیْفَ تَصْنَعُ بِلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ اِذَا جَاءَتْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃ"۔

اور امام ابن جریر طبری نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر سے ایک اور واقعہ عہد نبوی کا نقل کیا ہے، وہ تو بہت ہی لرزا دینے والا ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب مُحَلِّم بن جُثّامہ کی سرکردگی میں کسی دشمن قبیلہ یا علاقہ کی طرف ایک دستہ بھیجا، ایک شخص عامر بن اضبط (جو غالباً کسی دشمن قبیلہ سے تعلق رکھتا ہوگا) وہ سامنے آگیا اور اُس نے اسلامی طریقہ پر سلام کیا (اور اس طرح اپنا مسلمان ہونا ظاہر کیا)، اور مُحَلِّم اور عامر ابن اضبط کے درمیان کبھی پہلے یعنی اسلامی دور سے پہلے زمانہ جاہلیت میں عداوت اور رنجش رہی تھی، مُحَلِّم نے (غالباً اس پرانی رنجش کی وجہ سے ہی) اُس کے اظہار اسلام کی پروا نہیں کی اور اُس کو اپنے تیر کا نشانہ بنا دیا اور وہ خاک و خون میں تڑپ کر ختم ہوگیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپ کو بے حد دُکھ ہوا، آپ نے مُحَلِّم کو طلب فرما کر سخت عتاب فرمایا، انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرے لیے مغفرت اور معافی کی دُعا فرما دیجیے ــــــ آپ نے انتہائی جلال کے انداز میں فرمایا۔

لَاغَفَرَ اللّٰہُ لَکَ اللہ تجھے معاف نہ کرے۔

وہ روتے ہوئے کھڑے ہوگئے اور تھوڑی ہی دیر کے بعد ان کا انتقال ہوگیا ــــــ آگے حضرت ابن عمر کی اسی روایت میں ہے کہ ــــــ ان کو قاعدہ کے مطابق دفن کر دیا گیا، لیکن زمین نے ان کی لاش کو باہر پھینک دیا ــــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ حضرت ایسا واقعہ ہوا ہے، کیا کیا جائے؟ ــــــ آپ نے فرمایا کہ یہ بات نہیں کہ یہ مُحَلِّم دنیا میں سب سے برا آدمی اور سب سے بڑا گنہگار تھا اس لیے زمین نے اس کو قبول نہیں کیا، زمین تو اس سے بہت زیادہ برون، بڑے سے بڑے ظالموں

احد کا فروں اور مشرکوں تک کو قبول کر لیتی ہے محلّم کے ساتھ ہی یہ واقعہ صرف اس لیے ہوا ہے کہ تم لوگ اس سے سبق لو۔ اس کے بعد محلّم کی لاش کو دو پہاڑیوں کے درمیان رکھ کر اس پر پتھر رکھ دیے گئے۔

جیسا کہ میں نے ذکر کیا امام ابن جریر طبری نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر سے اس واقعہ کی روایت کی ہے۔

ان احادیث و روایات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں کلمہ لا الٰہ اللہ کے نام کا اور اظہار اسلام کا کتنا احترام ہے اور جو شخص محض بدگمانی یا کسی بُرے جذبہ کی وجہ سے بلا دلیل ایسے شخص کو مسلمان نہ مانے اور اس کے ساتھ کافروں والا معاملہ کرے وہ اللہ کی نظر میں کتنا بڑا مجرم ہے۔

یہ بات بھی بالکل کھلی ہوئی ہے کہ خصوصاً جنگ کے موقع پر اس اصول پر عمل کرنا یعنی دشمنوں میں سے بھی جو اپنا مسلمان ہونا ظاہر کرے اس کو مسلمان مان لینا اور اپنا بھائی بنا لینا کتنا خطرناک ہو سکتا ہے اور اس سے کتنے بڑے بڑے نقصانات پہونچ سکتے ہیں اور دشمن کے جاسوسوں کے لیے ہماری صفوں میں آجانا کتنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود سورۂ نساء کی اس آیت اور اس کی تفسیر و تشریح کرنے والی ان احادیث و روایات کا مطالبہ مسلمانوں سے یہی ہے کہ ان خطرات کے باوجود وہ اسی پالیسی کو اپنائیں۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اسلام کا بنیادی نصب العین جہاد و قتال میں بھی بس یہ ہے کہ آدمیوں کو اللہ کا وفادار بندہ اور اپنا بھائی بنایا جائے اور یہ مقصد ہر دوسری مصلحت پر مقدم رہے۔

اس آیت ۹۴ میں جہاد کے موقع پر جس سخت احتیاط کا حکم دیا گیا ہے اور پھر اس بارہ میں غلطی کرنے والوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انتہائی سخت رویہ اختیار فرمایا اس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ خاص قسم کی طبیعت اور خاص مزاج کے کچھ لوگ جہاد نہ کرنے اور اپنے گھروں اور گوشوں میں بیٹھے رہنے ہی میں خیریت سمجھیں" اور اسی کو احتیاط و تقویٰ اور خدا ترسی کا ایک تقاضا سمجھ کر "تقاعد اور گوشہ نشینی" کا رویہ اختیار کر لیں، فارسی کا مشہور مصرعہ ہے۔

"کُنجے گرفت و ترس خدا را بہانہ ساخت"

اس لیے اس آیت کے بعد متصلاً جہاد و مجاہدین کی خاص فضیلت بیان فرمائی گئی اور بتایا گیا کہ جو اہل ایمان اپنے جان و مال سے راہ خدا میں جہاد کریں ان کا درجہ اللہ کی نگاہ میں ان لوگوں کے مقابلہ میں بہت بلند ہے جو بغیر کسی عذر اور مجبوری کے جہاد میں حصہ نہ لیں اور گھر میں بیٹھ کر طاعات و عبادات کرتے رہیں۔

بخاری شریف میں یہ حدیث روایت کی گئی ہے کہ کسی شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا "یارسول اللہ! ای الناس افضل؟" (حضرت! آدمیوں میں درجہ کے لحاظ سے کون لوگ سب سے افضل ہیں؟) آپ نے ارشاد فرمایا "مُؤْمِنٌ يُجَاهِدُ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ بِنَفْسِهٖ وَمَالِهٖ" (وہ ایمان والے بندے سب سے افضل ہیں جو اپنے جان و مال کے ساتھ راہ خدا میں جہاد کریں) پھر آپ سے دریافت کیا گیا "ثُمَّ مَنْ؟" (ان کے بعد کن لوگوں کا درجہ ہے؟) آپ نے فرمایا "مُؤْمِنٌ فِي شِعْبٍ مِنَ الشِّعَابِ يَتَّقِي اللّٰهَ وَيَدَعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّهٖ" (وہ ایمان والے جو معاشرہ کی برائیوں، گندگیوں اور گناہوں سے محفوظ رہنے کے لیے سب سے الگ تھلگ کسی گھاٹی میں قیام کریں، وہاں تقوے والی زندگی گزاریں اور کسی بندے کو ان سے کوئی تکلیف و ایذا نہ پہونچے۔) یہ حدیث گویا اسی آیت ۹۵ کی تفسیر ہے۔

اس آیت میں ایک بات یہ بھی فرمائی گئی ہے "وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى" یعنی جو اہل ایمان جہاد میں حصہ لیں اور جو جہاد میں حصہ نہ لیں اور گھر ہی پر اللہ و رسول کے حکم کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔ اگرچہ ان کے درجات میں بہت بڑا فرق ہے لیکن جنت اور جنت کی نعمتوں سے محروم ان میں سے کوئی بھی نہیں رہے گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دونوں ہی طبقوں کے لیے جنت کا وعدہ ہے ــــــ اس بارے میں بھی صحیح بخاری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صریح حدیث مروی ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ ــــــ

"جو کوئی اللہ و رسول پر ایمان لائے یعنی دعوتِ اسلام کو قبول کرے اور نماز روزہ وغیرہ احکام کی پابندی کرے تو خواہ وہ جہاد میں حصہ لے یا نہ لے اللہ تعالیٰ ایمان اور عمل صالح کے صلہ میں اس کو جنت ضرور نصیب فرمائے گا" ــــــ آگے اسی حدیث میں ہے کہ بعض

صحابہ نے اس پر عرض کیا کہ حضرت! جب معاملہ اتنا آسان اور ارزاں ہے تو ہم اس کا عام اعلان کیوں نہ کر دیں؟ ــــ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جنت ایک ہی درجہ اور ایک ہی قسم کی نہیں ہے اس کے سینکڑوں درجے ہیں۔ اور جو اہل ایمان جہاد میں بھی حصہ لیں گے وہی اس کے اعلیٰ درجات حاصل کر سکیں گے یعنی اعلیٰ درجہ کی جنت جو مجاہدین فی سبیل اللہ کے لیے تیار کی گئی ہے وہ جہاد کرنے والوں ہی کو مل سکے گی۔

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ عام حالات میں جہاد نماز وغیرہ کی طرح فرض عین نہیں ہے کہ اس کا ترک گناہ اور فسق ہو بلکہ وہ فرض کفایہ ہے اور سورۂ نساء کی اس آیت میں اسی کا یہ حکم بیان کیا گیا ہے لیکن کبھی ہنگامی اور غیر معمولی حالات ایسے بھی ہو سکتے ہیں کہ جہاد ہر اس مسلمان پر جو جہاد کے قابل ہو نماز کی طرح فرض ہو جاتا ہے جس کو نفیر عام کہتے ہیں اس صورت میں جہاد کے لیے نہ نکلنا سخت ترین گناہ ہے اور ایسے لوگوں کے لیے "وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى" کی بشارت ہرگز نہیں ہے۔

اس آیت میں "غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ" کا جو لفظ آیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کوئی بندہ بیماری یا کسی دوسری قسم کی معذوری اور مجبوری کی وجہ سے جہاد میں حصہ نہ لے سکے، مگر اس کی نیت اور آرزو ہو تو وہ جنت میں مجاہدین والے درجے بھی پائے گا ــــ بخاری شریف میں حضرت انس کی حدیث ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لشکر اسلام کے ساتھ غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لا رہے تھے تو راستہ میں آپ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ مدینہ میں تمہارے کچھ ایسے بھائی ہیں جو اس جہادی مہم میں کسی مجبوری کی وجہ سے ہمارے ساتھ نہیں جا سکے تھے، لیکن اللہ کی نگاہ میں وہ ہمارے ساتھ ہی رہے۔ ہم جس وادی یا گھاٹی سے گزرے یا جس منزل پر ہم اترے وہ ہمارے ساتھ رہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان کو وہی اجر و ثواب دے گا تو اس مہم میں ساتھ جانے والے تم لوگوں کو عطا فرمائے گا۔ غالباً آپ نے اس لیے فرمایا کہ ساتھ والے مجاہدین میں احساس برتری نہ پیدا ہو اور معذوری کی وجہ سے مدینہ میں رہ جانے والوں کو وہ اپنے مقابلہ میں کمتر نہ سمجھیں۔ واللہ اعلم۔

درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی کریمانہ قانون ہے کہ کوئی بندہ کسی بڑے سے بڑے

عمل کی آرزو رکھے اور مجبوری اور بے بسی کی وجہ سے اسے نہ کر سکے تو اللہ تعالیٰ صرف اس کی نیت اور صادق آرزو کی وجہ سے اس کو وہی اجر عطا فرماتا ہے جو عمل کرنے والوں کو ملتا ہے۔ یہ ایسا کیمیا کا نسخہ ہے کہ ہم اور آپ جہاد اور حج جیسے اعلیٰ سے اعلیٰ اعمال کا ثواب ان کی نیت اور سچی آرزو رکھ کر حاصل کر سکتے ہیں۔ انشاء اللہ آخرت میں ہم اور آپ دیکھیں گے کہ اللہ کے لاکھوں بندے جنھوں نے حج نہیں کیا اور جہاد فی سبیل اللہ اور شہادت کا جنھیں موقع نہیں ملا مگر وہ حج اور جہاد و شہادت کی صادق آرزو اور سچی نیت رکھتے تھے وہ جنت میں حجاج اور مجاہدین و شہداء کے ساتھ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قانونِ کرم سے فائدہ نہ اٹھانا بڑی محرومی ہے۔ ہاں صادق نیت شرط ہے۔

جہاد اور مجاہدین کی فضیلت سے متعلق ان آیتوں کے بعد پورا ایک رکوع ہجرت کے بارہ میں ہے۔ جو "اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ" سے شروع ہو کر وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝ پر ختم ہوا ہے۔

——— (باقی)

موجودہ قیمت 3/75

Regd. No. L-351

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow

VOL 36 NO 4 JULY 1968

الفرقان لکھنؤ

[جمادی الاول ۱۳۸۸ھ]

AUGUST 1968

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

موجودہ قیمت 5-00

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
مزید محصول ڈاک کا
اضافہ

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

فی کاپی ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۵۰/۷
پاکستان سے ۵۰/۷
ششماہی
ہندوستان سے ۴/-
پاکستان سے ۴/-

جلد ۳۶ | بابتہ ماہ جمادی الاول ۱۳۸۸ھ مطابق اگست ۱۹۶۸ء | شمارہ ۵

اگر اس دائرہ میں سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں۔ یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ اگست تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:- اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دیدیں۔ نئے خریدار بھی اسی طریقہ سے چندہ ارسال فرمائیں۔

نمبر خریداری:- براہ کرم خط وکتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت:- الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کردیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں اُنکی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

ظلم کی بہت سی قسمیں اور بہت سی شکلیں ہیں، لیکن سب سے بڑا ظلم اس دُنیا میں غالباً وہ ہے جو اولیاء کرام حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ، محبوب سبحانی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء دہلویؒ اور حضرت خواجہ علاء الدین صابر کلیریؒ جیسے بزرگانِ دین کی رُوحوں پر ان کے عرسوں کے نام سے ہوتا ہے۔

پچھلے مہینہ ربیع الاول کے وسط میں یہ عاجز شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا دامت فیوضہم و برکاتہم کی خدمت میں حاضری و زیارت اور ان ہی کے بیاں کی ایک مبارک تقریب میں شرکت کی نیت سے لکھنؤ سے سہارن پور کے لیے ۱۱ر جون کی شام کو دہرہ دون اکسپریس سے روانہ ہوا ــــ راستہ میں بعض مسافروں کی باتوں سے معلوم ہو گیا تھا کہ آج پیران کلیر شریف کے عرس کا آخری دن ہے۔ یہ لوگ خود وہیں جا رہے تھے، ۱۲ر جون کی صبح کو جب ٹرین رڑکی پہونچی جو پیرانِ کلیر کا اسٹیشن ہے، تو جس طرح ہمارے ملک میں بڑے میلوں کے موقعوں پر ریلوے پلیٹ فارموں پر بھیڑ ہوتی ہے، اسی طرح کی بے پناہ بھیڑ تھی۔ لوگ ٹرین میں اس طرح گھسے کہ مجھے اپنی سیٹ چھوڑ کر اوپر کی برتھ پر پناہ لینی پڑی ــــ لیکن اس سے بڑی آزمائش ان لوگوں کی وہ باتیں تھیں جو سہارن پور پہونچنے تک قریباً ایک گھنٹہ مسلسل سُننی پڑیں، موضوع صرف ایک تھا، یعنی "عرس شریف" کو زینت اور رونق بخشنے والی ممبئی اور جے پور اور خدا جانے کہاں کہاں کی طوائفوں اور ان کی جسمانی اور صوتی خصوصیات اور ان پر نوٹوں کی بارش کا تذکرہ، خدا ہی

جانتا ہے کہ یہ پورا گھنٹہ کیسی اذیت میں گزرا اور روح پر کیا گزر گئی ــــــ

اسی وقت اندازہ ہوا کہ جب مجھ جیسے گنہگار انسان کو ان باتوں کے صرف سننے سے اتنی روحانی اذیت ہو رہی ہے تو اللہ کے اُس مقبول بندہ کی روح پر کیا گزرتی ہوگی جس کے نام پر اور خاص جس کے مزار پر بدترین فسق و فجور کے یہ تماشے ہر سال ہوتے ہیں ــــــ حضرت خواجہ علاء الدین صابر کلیری قدس اللہ سرہٗ اگر اللہ کے متقی بندے، سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے پیرو اور اولیاء اُمت میں سے تھے (اور ہمارے نزدیک بلاشبہ ایسے ہی تھے) تو یقیناً ان کی مظلوم روح خاص کر عرس کے ان دنوں میں اس ظلم و ستم کے خلاف دربارِ خداوندی میں بڑی پر درد فریاد کرتی ہوگی ــــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض حدیثوں میں بتلایا گیا ہے کہ ایسی مظلومانہ فریادوں پر اللہ کا غضب و جلال حرکت میں آجاتا ہے اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا ــــــ

کیا عجب کہ دُنیا کے مسلمان خاص کر ہم ہندوستانی مسلمان جن آلام و مصائب میں گرفتار اور نصرتِ خداوندی سے محروم ہیں، اس کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہو ــــــ سُنا ہے کہ جب نادر شاہ کا لشکر عذاب بن کر دلی پر نازل ہوا اور اس کے ہاتھوں ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹے تو اس دور کے عارفِ کامل حضرت مرزا مظہر جان جاں رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا ــــــ "شامتِ اعمالِ ما صورتِ نادر گرفت"

ایک حدیثِ قدسی میں بھی اُمت پر آنے والے آلام و مصائب ہی کے بارے میں فرمایا گیا ہے "اِنَّمَا هِيَ اَعْمَالُكُمْ اُحْصِيْهَا لَكُمْ"

دوسرا رُخ :-

اوپر میں نے عرض کیا ہے کہ سہارن پور کے لیے میرا یہ سفر شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا مدظلہ کی زیارت اور انہی کے یہاں کی ایک مبارک تقریب میں شرکت کی نیت سے ہوا تھا، یہ تقریب نکاح، شادی، ولیمہ یا عقیقہ کے قسم کی کوئی تقریب نہیں تھی ــــــ اس تقریب

کی حقیقت اور خاص نوعیت بتلانے کے لیے مجھے یہ ظاہر کرنا ضروری ہے کہ حضرت ممدوح کو اللہ تعالیٰ نے جن عظیم نعمتوں سے نوازا ہے، ان میں سے ایک بڑی نعمت اس عاجز کے نزدیک یہ ہے کہ محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے آپ کی احادیث پاک کے ساتھ ممدوح کو خاص شغف بلکہ عشق ہے، ان کے اس شغف و عشق کی مقبولیت ہی کا غالباً یہ نتیجہ ہے کہ ان کی ذات کے لیے "شیخ الحدیث" کا لقب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخلوق میں ان کے نام سے زیادہ مشہور ہو گیا ہے اور یہ عاجز تو ان کی اسی خصوصیت کی وجہ سے ان کو شیخ الحدیث کہتا اور لکھتا ہے۔

ممدوح نے بالکل نو عمری میں جب ایک طالب علم کی حیثیت سے مشکوٰۃ شریف شروع کی تھی تو اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تھی کہ اب ساری عمر حدیث پاک سے تعلق نہ چھوٹے اور وہی میرا خاص مشغلہ رہے، چنانچہ رسمی طالب علمی کا سلسلہ جب تک جاری رہا۔ طالب علمانہ انداز میں علم حدیث اور کتب حدیث کے ساتھ اشتغال اور انہماک نصیب رہا، اس کے بعد سے اب تک مطالعہ، تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کی شکلوں میں حدیث پاک میں مشغولیت اور اس کی خدمت ہی ذکر و عبادات کے بعد زندگی کا وظیفہ اور روح کی غذا بنی ہوئی ہے۔

حدیث نبوی کی تصنیفی خدمت کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے جو خاص کام لیے وہ "شمائل ترمذی" کی شرح "خصائل نبوی" اور مؤطا امام مالک کی مبسوط شرح "اوجز المسالک" اور "الکوکب الدری علیٰ جامع الترمذی" کی شکل میں اہل علم کے سامنے اب سے بہت پہلے آ چکے ہیں، اس مقبول و مبارک سلسلہ کی آخری کڑی "لامع الدراری علیٰ جامع البخاری" کی تالیف ہے جو اللہ تعالیٰ کی عنایت و توفیق سے اب اختتام کو پہونچی ہے، حضرت شیخ الحدیث کے ہاں جس تقریب میں شرکت کے لیے میں نے یہ سفر کیا تھا، اس کا تعلق اسی کتاب کی تکمیل سے تھا ـــــ اس کے بارے میں ناظرین کو یہاں اتنا بتانا ضروری ہے کہ حضرت شیخ الحدیث کے والد ماجد حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے (جو بعد میں حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کے مجاز، خادم خاص اور معتمد رفیق ہوئے) اب سے ٹھیک ۸۰ سال پہلے ۱۳۱۳ھ ہجری میں قطب الارشاد حضرت گنگوہی قدس سرہ کے درس بخاری میں شرکت کی تھی اور حضرت کے خاص درسی افادات کو عربی میں قلمبند کر کے محفوظ کر لیا تھا، حضرت شیخ الحدیث نے

اس کو اصل بنیاد بنا کر بخاری شریف کی گویا ایک مستقل شرح اب سے تقریباً ۱۲ سال پہلے لکھنی شروع فرمائی تھی "لامع الدراری علی جامع البخاری" اسی کا نام ہے، اس کی پہلی دو ضخیم جلدیں (اول و ثانی) چھپ کر حدیث کے اساتذہ و طلبہ کے ہاتھوں میں اب سے کئی برس پہلے پہونچ چکی تھیں تیسری جلد جس پر کتاب ختم ہوتی تھی زیر تصنیف تھی اور حضرتِ ممدوح کو بعض خاص مخصوص کی بنا پر اس کی تکمیل و اتمام کا غیر معمولی اہتمام تھا۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت و توفیق سے گزشتہ مہینے ربیع الاول کے پہلے یا دوسرے جمعہ کو حضرت نے اس کے خاتمہ کی آخری سطریں لکھ کر حدیث کی تصنیفی خدمت کے سلسلہ کے بظاہر اپنے آخری کام کی تکمیل فرمائی، اور اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت کا اتمام ہوا فللّٰہ الحمد والمنۃ ــــــ حضرت شیخ کو قدرتی طور پر اس کے اختتام اور اس نعمت عظمیٰ کے اتمام سے بڑی روحانی مسرت اور شادمانی ہوئی۔

صحیح بخاری کی شرحوں میں سب سے زیادہ معروف و مقبول شرح آٹھویں اور نویں صدی ہجری کے حافظ حدیث ابن حجر عسقلانی کی "فتح الباری" ہے جو انھوں نے پچیس[۲۵] سال کی مدت میں تیرہ[۱۳] جلدوں میں لکھی تھی ــــ رجب ۸۴۲ھ میں جب وہ اس کی تصنیف سے فارغ ہوئے تو انھوں نے اس کی خوشی میں بہت بڑے پیمانہ پر دعوتِ ولیمہ کی، اس دعوت کی نوعیت اور وسعت کا کچھ اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اُن کے بعض شاگردوں کے بیان کے مطابق اُس زمانہ میں اس پر پانچسو اشرفیاں صرف ہوئی تھیں جن کی مالیت اور قوتِ خرید آج کے ایک لاکھ روپے سے کم نہ ہوگی ــــ پھر ہماری اسی صدی کے اور ہمارے ہی ملک کے ایک محدث اور حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے خاص استاد و مرشد حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری مہاجر مدنی نے جب سنن ابو داؤد کی شرح "بذل المجہود" مدینہ طیبہ میں ۱۳۴۵ھ میں مکمل فرمائی تو اس کی خوشی میں مدینہ منورہ کے تمام علماء و صلحا اور اکابر و اعیان کی دعوت کی اور یہ گویا "بذل المجہود" کا ولیمہ تھا ــــ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ نے بھی اپنے ان اسلاف کرام کے اتباع میں "لامع الدراری علی جامع البخاری" کی تکمیل کی خوشی میں ایک دعوت کا اہتمام فرمایا جیسا کہ اوپر عرض کیا، یہی وہ تقریب تھی جس کی شرکت کے لیے اس عاجز نے سہارنپور کا یہ سفر کیا تھا۔

یوں تو حضرت ممدوح کے دسترخوان پر روزانہ ہی اچھی خاصی وسیع دعوت کا سماں رہتا ہے اور کم دن ایسے ہوتے ہوں گے کہ مہمانوں کی تعداد چالیس پچاس سے کم ہو اور رمضان مبارک میں تو یہ تعداد کئی کئی سو تک پہونچ جاتی ہے۔ لیکن "لامع الدراری" کی اس دعوتِ ولیمہ میں جیسا کہ حضرت کے بعض خاص خدام سے معلوم ہوا مدعو تو بہت زیادہ لوگوں کو نہیں کیا گیا تھا مگر ہوا یہ کہ دو دو سو اور تین تین سو میل تک بھی جن خدام و محبین کو کسی طرح پتہ لگ گیا وہ اگر پہونچ سکتے تھے تو اس یقین و اعتماد کی بنا پر کہ حضرت کو ہمارے پہونچ جانے سے خوشی ہوگی، آپ سے آپ پہونچ گئے اور بہت سے تو ایک دو دن پہلے سے وارد ہو گئے تھے خود یہ عاجز ۳ دن پہلے ۱۲ جون ہی کی صبح کو پہونچ گیا تھا، ـــــ اپنے بندوں کے باطن کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے لیکن بظاہر یہ سارا مجمع جو ۱۴ جون بروز جمعہ اس مبارک و مسعود تقریب میں شرکت کے لیے سہارنپور میں جمع ہوا تھا علماء و صلحاء، ذاکرین و عابدین اور اہلِ دین کا مجمع تھا۔

حضرت کے خدام سے معافی مانگتے ہوئے عرض ہو کہ یہ بھی دراصل ایک بزرگ کا "عرس" ہی تھا ـــــ عرس عربی زبان کا لفظ ہے اس کے معنی شادی ہی کے ہیں، عروس دلہن کے معنی میں اردو میں بھی مستعمل ہے، اولیاء اللہ کے یوم وفات کا نام یوم العرس بھی اسی مناسبت سے رکھا گیا تھا کہ ان کا یوم وفات دراصل وصالِ محبوب کا دن اور ان کی مشتاق و بیتاب روح کے لیے سب سے زیادہ خوشی و شادمانی کا دن ہوتا ہے۔

یہ تو دراصل تمہید تھی جو ناگزیر طور پر طویل ہو گئی۔ ورنہ عرض یہ کرنا تھا کہ سہارنپور کے اس سفر میں ایک عرس والا مجمع اور اس کے کچھ مناظر اور مظاہر تو رڑکی کے اسٹیشن پر سر کی آنکھوں سے دیکھے اور کچھ کانوں سے سن کر دل کی اور تصور کی آنکھوں سے مشاہدہ میں آئے۔ اور ایک دوسرے "عرس" والا مجمع اور منظر سہارنپور پہونچ کر ۱۴ جون یوم جمعہ کو شیخ الحدیث کے ہاں دیکھا بلکہ اس میں شرکت کی سعادت بھی حاصل کی ـــــ اکثر ناظرین کو معلوم ہوگا کہ پیرانِ کلیر شریف سہارنپور ہی میں ہے۔ اور شہر سہارنپور سے قریب ہی ہے، اور حضرت شیخ الحدیث مدظلہ ہمارے اس دور میں سلسلہ چشتیہ صابریہ امدادیہ ہی کے شیخ اور نمائندے ہیں اور اسی سلسلہ کی امانت کے امین و وارث ہیں ـــــ

اس سلسلہ کے مؤسس حضرت خواجہ علاءالدین صابر کلیری قدس سرّہٗ جب ہماری اس دنیا میں رونق افروز تھے تو یقیناً ان کی خانقاہ طالبینِ حق، اتقیاء و صلحاء اور ذاکرین و عابدین کا مرکز و مرجع تھی، اور خالص توحید اور تزکیۂ نفس اور تقویٰ اور اتباعِ شریعت وہاں کا درس اور پیغام تھا۔ لیکن آج ان کے مزار و مرقد پر انہی کی عقیدت و محبت کے نام پر وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو شیطان چاہتا ہے اور جس پر یقیناً خدا کی، اس کے نبیوں اور فرشتوں کی اور اولیاء اللہ کی پاک روحوں کی لعنت ہے — لِلّٰہ سوچنے والے سوچیں کہ کیا گزرتی ہوگی حضرت خواجہ صابر کلیری قدس سرّہٗ کی روحِ پاک پر —

کتاب الدعوات

معارف الحدیث

(مسلسل)

دعوات استعاذہ:-

ذخیرۂ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو دعائیں ماثور و منقول ہیں جو آپ نے مختلف اوقات میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں خود کیں یا اُمت کو ان کی تعلیم و تلقین فرمائی، اُن میں زیادہ تر وہ ہیں جن میں اللہ تعالیٰ سے کسی دُنیوی یا اُخروی، روحانی یا جسمانی، انفرادی یا اجتماعی نعمت اور بھلائی کا سوال کیا گیا ہے اور مثبت طور پر کسی حاجت اور ضرورت کے لیے استدعا کی گئی ہے ـــــ ڈیڑھ سو سے کچھ اوپر جو دعائیں اس سلسلہ میں اب تک درج ہو چکی ہیں وہ سب اسی قبیل کی تھیں ـــــ ان کے علاوہ بہت سی ایسی دُعائیں بھی آپ سے مروی ہیں جن میں کسی خیر و نعمت اور کسی مثبت حاجت و ضرورت کے سوال کے بجائے دُنیا یا آخرت کے کسی شر سے اور کسی بلا اور آفت سے پناہ مانگی گئی ہے اور حفاظت و بچاؤ کی استدعا کی گئی ہے ـــــ پھر جس طرح پہلی قسم کی دُعاؤں کو مجموعی طور پر سامنے رکھ کر یہ کہنا برحق ہے کہ دُنیا اور آخرت کی کوئی خیر اور بھلائی اور کوئی حاجت و ضرورت ایسی نہیں ہے جس کی دُعا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے نہ کی ہو اور اُمت کو تلقین نہ فرمائی ہو۔ اسی طرح دوسری قسم کی دعاؤں کو پیش نظر رکھ کر یہ کہنا بھی بالکل صحیح ہے کہ دنیا اور آخرت کا کوئی شر، کوئی فساد، کوئی فتنہ اور کوئی بلا اور آفت اس عالم وجود میں ایسی نہیں ہے

جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی پناہ نہ مانگی ہو اور اُمت کو اسکی تلقین نہ فرمائی ہو ــــ غور کرنے اور سمجھنے والوں کے لیے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نہایت روشن معجزہ ہے کہ آپ کی دعائیں انسانوں کی دینوی و اخروی، روحانی اور جسمانی، انفرادی اور اجتماعی، ظاہری اور باطنی، مثبت اور منفی ساری ہی حاجتوں اور ضرورتوں پر حاوی ہیں اور کوئی خفی سے خفی اور دقیق سے دقیق حاجت نہیں بتائی جا سکتی جس کو آپ نے بہتر سے بہتر پیرایہ میں اللہ تعالیٰ سے نہ مانگا ہو اور اُمت کو اس کے مانگنے کا طریقہ نہ سکھایا ہو ــــ

ــــ قرآن مجید میں بھی ان دونوں ہی قسم کی یعنی مثبت اور منفی دعائیں موجود ہیں اور بالکل آخر کی دو مستقل سورتیں "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ" اور "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ" اوّل سے آخر تک منفی قسم کی دعا یعنی استعاذہ ہی پر مشتمل ہیں اور اسی لیے ان کو "معوذتین" کہا جاتا ہے، اور ان ہی پر قرآن مجید ختم ہوا ہے۔

قرآن پاک کے اس طریقہ ہی کی پیروی میں یہ مناسب سمجھا گیا کہ جو احادیث ایسی دعاؤں پر مشتمل ہیں جن میں شرور اور فتن اور بلایا سے اور برے اعمال و اخلاق اور ہر قسم کی ناپسندیدہ باتوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی گئی ہے۔ ان کو آخر میں درج کیا جائے اور ان ہی کو اس سلسلہ کا خاتمہ بنایا جائے ــــ اب ذیل میں وہی حدیثیں پڑھیے!

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ جَهْدِ الْبَلَاءِ وَدَرْكِ الشَّقَاءِ وَسُوْءِ الْقَضَاءِ وَشَمَاتَةِ الْاَعْدَاءِ۔

ــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ــــ اللہ کی پناہ مانگو بلاؤں کی سختی سے اور بدبختی کے لاحق ہونے سے اور بری تقدیر سے اور دشمنوں کی شماتت سے۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں بظاہر تو چار چیزوں سے پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی گئی ہے لیکن فی الحقیقت دنیا اور آخرت کی کوئی برائی اور کوئی تکلیف اور کوئی مصیبت اور کوئی پریشانی

ایسی نہیں سوچی جاسکتی جو ان چار عنوانوں کے احاطہ سے باہر ہو۔ ان میں سب سے پہلی چیز ہے "جَهْدُ الْبَلَاءِ" (کسی بلا کی مشقت اور سختی) بظاہر اس حالت کا نام ہے جو انسان کے لیے باعث تکلیف اور موجب پریشانی ہو اور جس میں اس کی آزمائش ہو، یہ دنیوی بھی ہو سکتی ہے اور دینی بھی، روحانی بھی ہو سکتی ہے اور جسمانی بھی، انفرادی بھی ہو سکتی ہے اور اجتماعی بھی ـــــ الغرض یہ ایک ہی لفظ تمام مصائب و تکالیف اور آفات و بلیات کو حاوی ہے ـــــ اس کے بعد دوسری چیز جس سے پناہ مانگنے کی اس حدیث میں تلقین فرمائی گئی ہے وہ ہے "دَرْكُ الشَّقَاءِ" (بدبختی کا لاحق ہونا) اور تیسری چیز ہے "سُوْءُ الْقَضَاءِ" (بری تقدیر) ان دونوں کی جامعیت بھی بالکل ظاہر ہے جس بندہ کو ہر نوع کی بدبختی سے اور بری تقدیر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ اور حفاظت حاصل ہو گئی بلاشبہ اسے سب کچھ مل گیا ـــــ آخری چیز جس سے پناہ مانگنے کی اس حدیث میں تلقین فرمائی گئی ہے وہ ہے "شَمَاتَةُ الْاَعْدَاءِ" یعنی کسی مصیبت اور ناکامی پر دشمنوں کا ہنسنا۔ بلاشبہ دشمنوں کی شماتت اور طعنہ زنی بعض اوقات بڑی روحانی تکلیف و اذیت کا باعث ہوتی ہے۔ اس لیے اس سے خصوصیت کے ساتھ پناہ مانگنے کے لیے فرمایا اگرچہ اس سے پہلے تین جامع عنوانات اس کو بھی حاوی تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تعمیل میں ان چار چیزوں سے پناہ مانگنے کے لیے صحیح اور مناسب الفاظ یہ ہوں گے۔

"اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ جَهْدِ الْبَلَاءِ وَدَرْكِ الشَّقَاءِ وَسُوْءِ الْقَضَاءِ وَ شَمَاتَةِ الْاَعْدَاءِ"	اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں بلا کی سختی سے اور بدبختی لاحق ہونے سے اور بری تقدیر سے اور دشمنوں کے ہنسنے اور ان کی طعنہ زنی سے۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحُزْنِ وَالْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَالْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَضَلَعِ الدَّیْنِ وَغَلَبَةِ الرِّجَالِ۔

ـــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح دعا کیا کرتے تھے "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ۔۔۔تا۔۔۔ غَلَبَةِ الرِّجَالِ" (اے میرے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں، فکر سے اور غم سے اور کم ہمتی اور کاہلی اور بزدلی سے اور بخیلی کنجوسی اور قرضہ کے بارے اور لوگوں کے دباؤ سے) (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اس دعا میں جن آٹھ چیزوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی گئی ہے۔ انہیں سے چار (فکر و غم، قرضہ کا بار اور مخالفین کا غلبہ) ایسی چیزیں ہیں جو حساس و صاحب شعور آدمی کے لیے زندگی کے لطف سے محرومی اور سخت روحانی اذیت کا باعث ہوتی ہیں اور اس کی قوت کار اور صلاحیتوں کو معطل کر کے رکھ دیتی ہیں جس کے نتیجہ میں وہ دنیا اور آخرت کی بہت سی کامیابیوں اور سعادتوں سے محروم رہ جاتا ہے اور باقی چار (کم ہمتی، کاہلی، کنجوسی اور بزدلی) ایسی کمزوریاں ہیں جن کی وجہ سے آدمی وہ جراُتمندانہ اقدامات اور محنت و قربانی والے وہ اعمال نہیں کرسکتا جن کے بغیر نہ دنیا میں کامرانی حاصل کی جاسکتی ہے اور نہ آخرت میں فوز و فلاح اور نہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا مقام حاصل ہوسکتا ہے ـــــــ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سب چیزوں سے اللہ کی پناہ چاہتے تھے اور اپنے عمل سے امت کو بھی اس کی تلقین فرماتے تھے۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْكَسَلِ وَالْهَرَمِ وَالْمَغْرَمِ وَالْمَاْثَمِ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابِ النَّارِ وَفِتْنَةِ النَّارِ وَفِتْنَةِ الْقَبْرِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْغِنٰى وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْفَقْرِ وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ اَللّٰهُمَّ اغْسِلْ خَطَايَايَ بِمَاءِ الثَّلْجِ وَالْبَرَدِ وَنَقِّ قَلْبِيْ كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْاَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ وَبَاعِدْ بَيْنِيْ وَبَيْنَ خَطَايَايَ كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ۔

——— — — — رواہ البخاری ومسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کیا کرتے تھے " اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْكَسَلِ...... تا ...... كَمَا بَاعَدْتَّ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ" اے میرے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں سستی کاہلی سے اور انتہائی بڑھاپے سے (جو آدمی کو بالکل ہی از کار رفتہ کر دے) قرضہ کے بوجھ سے اور ہر گناہ سے۔ اے میرے اللہ میں تیری پناہ لیتا ہوں دوزخ کے عذاب سے اور دوزخ کے فتنہ سے اور فتنۂ قبر سے اور عذاب قبر سے اور دولت و ثروت کے فتنہ کے شر سے اور مفلسی و محتاجی کے فتنہ کے شر سے اور فتنۂ دجال کے شر سے ـــ اے میرے اللہ میرے گناہوں کے اثرات دھو دے اولے اور برف کے پانی سے اور میرے دل کو گندے اعمال و اخلاق کی گندگیوں سے اس طرح پاک صاف کر دے جس طرح سفید کپڑا میل کچیل سے صاف کیا جاتا ہے اور مجھ میں اور میرے گناہوں کے درمیان اتنی دوری پیدا کر دے جتنی دوری تو نے مشرق و مغرب کے درمیان کر دی ہے (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اس دعا میں علاوہ اور چیزوں کے هَرَم یعنی انتہائی بڑھاپے سے بھی پناہ مانگی گئی ہے ـــ عمر کی اس حد تک درازی کہ ہوش و حواس صحیح و سالم رہیں اور آخرت کی کمائی کا سلسلہ جاری رہے۔ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ لیکن ایسا بڑھاپا جو بالکل ہی از کار رفتہ کر دے جس کو قرآن پاک میں "اَرْذَلُ الْعُمُر" فرمایا گیا ہے ایسی ہی چیز ہے جس سے اللہ کی پناہ مانگی جائے۔ هَرَم بڑھاپے کا وہی درجہ ہے۔

اس دعا میں "عذاب نار" کے ساتھ "فتنۂ نار" اور "عذاب قبر" کے ساتھ "فتنۂ قبر" سے بھی پناہ مانگی گئی ہے ـــ عذاب نار سے بظاہر دوزخ کا وہ عذاب ہے جو ان دوزخیوں کا ہوگا جو کفر و شرک جیسے سنگین جرائم کی وجہ سے دوزخ میں ڈالے جائیں گے، اسی طرح عذاب قبر سے مراد بظاہر قبر کا وہ عذاب ہے جو اسی طرح کے بڑے مجرموں کو قبر میں ہوگا ـــ لیکن، جو ان سے کم درجہ کے مجرم ہیں ان کو اگرچہ دوزخیوں کی طرح

دوزخ میں نہیں ڈالا جائے گا اور قبر میں بھی اُن پر درجہ اول کے ان مجرمین والا وہ سخت عذاب مسلط نہیں کیا جائے گا لیکن دوزخ اور قبر کی کچھ تکلیفوں سے ان لوگوں کو بھی گزرنا پڑے گا اور یہی سزا ان کے لیے کافی ہوگی، اس عاجز کے نزدیک "فتنۂ نار" اور "فتنۂ قبر" سے یہی سزا مراد ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "عذاب نار" اور "عذاب قبر" کے ساتھ اس "فتنۂ نار" اور "فتنۂ قبر" سے بھی پناہ چاہی اور اپنے عمل سے ہم کو بھی اس کی تلقین فرمائی ہے۔

دجال کا فتنہ بھی اُن عظیم ترین فتنوں میں سے ہے جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت پناہ مانگتے تھے اور اہل ایمان کو اس کی تلقین فرماتے تھے ـــ اللہ تعالیٰ دجالِ اکبر کے فتنہ جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے، اور ہر دجالی فتنہ سے اپنی پناہ میں رکھے اور مرتے دم تک ایمان و اسلام پر ثابت قدم رکھے۔

اس دعا میں دولتمندی کے فتنہ سے اور اس کے ساتھ فقر و محتاجی کے فتنے سے بھی اللہ کی پناہ مانگی گئی ہے۔ ـــ دولت و ثروت بذات خود کوئی بری چیز نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ اگر اس کا حق ادا کرنے اور اس کو صحیح طور پر استعمال کرنے کی توفیق ملے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی دولت ہی سے وہ مقام پایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے بارہ میں اعلان فرمایا کہ "عثمان اس کے بعد جیسے بھی عمل کریں ان پر کوئی عتاب نہ ہوگا اور اُن سے کوئی باز پرس نہ ہوگی (مَا عَلٰى عُثْمَانَ مَا عَمِلَ بَعْدَ هٰذِهٖ مرتین)[1] اسی طرح فقر کے ساتھ اگر صبر و قناعت نصیب ہو تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے لیے اور اپنے گھر والوں کے لیے فقر ہی کی زندگی پسند فرمائی، اور فقر اور اہل فقر کے بڑے فضائل بیان فرمائے۔ ـــ لیکن اگر بدقسمتی سے دولتمندی و خوش حالی تکبر و غرور پیدا کرے اور مال و دولت کے صحیح استعمال کی توفیق نہ ملے تو پھر وہ قارونیت ہے، اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے، اسی طرح اگر فقر و محتاجی کے ساتھ صبر و قناعت نہ ہو اور اس کی وجہ سے آدمی ناکردنی کرنے لگے تو وہ خود ایک عذاب ہے اور

---

[1] رواہ الترمذی

اور اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا" (محتاجی اور مفلسی آدمی کو کفر تک بھی پہونچا سکتی ہے) اس دعا میں غِنا اور فقر (دولتمندی اور ناداری) کے جس شر و فتنہ سے پناہ مانگی گئی ہے وہ یہی ہے، اور وہ ایسی ہی چیز ہے کہ اُس سے ہزار بار پناہ مانگی جائے۔

اس دُعا کے آخر میں گناہوں کے اثرات دھونے کی، اور دل کی صفائی کی، اور گناہوں سے بہت دور کیے جانے کی جو دُعا کی گئی ہے وہ اگرچہ بظاہر مثبت دعاؤں میں سے ہے لیکن غور کیا جائے تو وہ بھی ایک طرح کی سلبی دعا ہے اور گویا استعاذہ ہی ہے۔

عَنْ زَيْدِ بْنِ اَرْقَمَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَالْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَالْهَرَمِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ اَللّٰهُمَّ اٰتِ نَفْسِيْ تَقْوٰهَا وَزَكِّهَا اَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكّٰهَا اَنْتَ وَلِيُّهَا وَمَوْلَاهَا اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَا يَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَا تَشْبَعُ وَمِنْ دَعْوَةٍ لَا يُسْتَجَابُ لَهَا۔

رواہ مسلم

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دُعا کیا کرتے تھے

(اے میرے اللہ میں تیری پناہ لیتا ہوں کم ہمتی سے اور سستی کاہلی اور بزدلی سے اور بخیلی کنجوسی سے، اور انتہائی درجہ کے بڑھاپے سے اور قبر کے عذاب سے! اے میرے اللہ میرے نفس کو تقویٰ عطا فرما دے اور اُس کا تزکیہ فرما کے اس کو مصفّٰی بنا دے، تو ہی سب سے اچھا تزکیہ فرمانے والا ہے، تو ہی اُس کا والی اور مولا ہے، اے میرے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں اُس علم سے جو نفعمند نہ ہو اور ایسے دل سے جس میں خشوع نہ ہو اور اس (حرصناک) نفس سے جس کو سیری نہ ہو اور ایسی دعا سے جو قبول نہ ہو۔

(صحیح مسلم)

(تشریح) علم غیر نافع، قلب غیر خاشع، اور بھوکا نفس جس کی بھوک کبھی ختم ہی نہ ہو اور وہ دعا جس کی اللہ کے ہاں سماعت نہ ہو — ان چاروں چیزوں سے اللہ کی پناہ مانگنے کا مطلب یہی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ علم نافع عطا فرمائے، قلب کو خشوع کی صفت مرحمت فرمائے، نفس کو بھوکا پن سے پاک فرما کر اسکو قناعت سے آراستہ فرمائے اور دعاؤں کو قبولیت سے نوازے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ مِنْ دُعَاءِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ زَوَالِ نِعْمَتِكَ وَتَحَوُّلِ عَافِيَتِكَ وَفُجَاءَةِ نِقْمَتِكَ وَجَمِيْعِ سَخَطِكَ — رواہ مسلم

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں سے ایک یہ دعا یہ بھی تھی اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ ... تا ... وَجَمِيْعِ سَخَطِكَ" (اے میرے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں تیری نعمتوں کے زائل ہو جانے سے، اور تیری بخشی ہوئی عافیت کے چلے جانے سے، اور تیرے عذاب کے ناگہانی آ جانے سے اور تیری ہر قسم کی ناراضی اور ناخوشی سے۔ صحیح مسلم)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا سے بلکہ اس سلسلہ کی ساری ہی دعاؤں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نبوت و رسالت بلکہ مقام محبوبیت پر بھی فائز ہونے کے باوجود قضا و قدر کے فیصلوں سے آپ کتنے لرزاں و ترساں رہتے تھے اور اپنے کو اللہ تعالیٰ کی نگاہ کرم اور اس کی حفاظت و پناہ کا کتنا محتاج سمجھتے تھے — سچ ہے قربیاں را بیش بود حیرانی

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشِّقَاقِ وَالنِّفَاقِ وَسُوْءِ الْاَخْلَاقِ۔

——— رواہ ابو داؤد والنسائی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کیا کرتے تھے "اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشِّقَاقِ وَالنِّفَاقِ وَسُوْءِ الْاَخْلَاقِ" اے میرے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں۔ شقاق یعنی آپس

کے سخت اختلاف سے اور نفاق سے اور برے اخلاق سے۔

(تشریح) "شقاق" اس شدید اختلاف کو کہتے ہیں جس کے نتیجہ میں فریقین ایک دوسرے سے بالکل جدا ہو جائیں اور ان کی راہیں الگ الگ ہو جائیں۔ نفاق کے معنی ہیں ظاہر و باطن کا فرق، یہ اعتقادی نفاق کے علاوہ عملی زندگی میں منافقانہ رویہ کو بھی شامل ہے، یہ تینوں چیزیں جن سے اس دعا میں اللہ کی پناہ چاہی گئی ہے (یعنی خلاف و شقاق، نفاق اور برے اخلاق) آدمی کے دین کو بلکہ اس کی دنیا کو بھی برباد کر دیتی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ معصوم اور قطعاً محفوظ تھے لیکن اس کے باوجود ان مہلکات کی ہلاکت خیزی ہی کی وجہ سے ان سے اللہ کی پناہ مانگتے تھے، اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ان چیزوں سے اپنے کو محفوظ رکھنے کی اتنی فکر کریں جتنی ایک مومن کو ہونی چاہیے اور ہمیشہ ان سے اللہ کی پناہ مانگتے رہیں۔

عَنْ شَكَلِ بْنِ حُمَيْدٍ قَالَ قُلْتُ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ عَلِّمْنِي تَعَوُّذًا أَتَعَوَّذُ بِهِ فَأَخَذَ بِيَدِي وَقَالَ قُلْ اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ سَمْعِي وَمِنْ شَرِّ بَصَرِي وَمِنْ شَرِّ لِسَانِي وَمِنْ شَرِّ قَلْبِي وَمِنْ شَرِّ مَنِيِّي" ۔ ——— رواہ ابو داؤد والترمذی والنسائی

شکل بن حمید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے کوئی تعوذ تعلیم فرما دیجئے (یعنی کوئی ایسی دعا بتا دیجئے) جس کے ذریعہ میں اللہ سے پناہ و حفاظت طلب کیا کروں، آپ نے میرا ہاتھ اپنے دست مبارک میں تھام کر فرمایا، کہو "اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ سَمْعِي ...... تا .... وَمِنْ شَرِّ مَنِيِّي" (اے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں اپنے کانوں کے شر سے، اپنی نگاہ کے شر سے اور اپنی زبان کے شر سے اور اپنے قلب کے شر سے اور اپنے مادہ شہوت کے شر سے)

(سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی)

(تشریح) سمع و بصر اور زبان و قلب اور اسی طرح جنسی خواہش کا شر یہ ہے کہ

یہ چیزیں احکام خداوندی کے خلاف استعمال ہوں، جس کا انجام اللہ کا غضب اور اس کا عذاب ہے تو اس لیے ضروری ہے کہ اس شر سے محفوظ رہنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے اور اس کی پناہ مانگی جائے، وہی اگر بچائے گا تو بندہ بچ سکے گا ورنہ مبتلا ہو کر ہلاک ہو جائے گا۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ یَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْجُوْعِ فَاِنَّهٗ بِئْسَ الضَّجِیْعُ وَاَعُوْذُبِكَ مِنَ الْخِیَانَةِ فَاِنَّهَا بِئْسَتِ الْبِطَانَةُ

——— رواه ابو داؤد والنسائی وابن ماجه

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کیا کرتے تھے "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ ...... تا ...... بِئْسَتِ الْبِطَانَةُ" (اے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں بھوک اور فاقہ سے وہ بڑا تکلیف دہ رفیق خواب ہے اور خیانت کے جرم سے وہ بہت بری ہمراز ہے)

(سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) جب آدمی کو بھوک اور فاقہ کی تکلیف ہو تو نیند نہیں آتی بس اسی احساس کے ساتھ کروٹیں بدلتا رہتا ہے، اسی لحاظ سے بھوک کو "رفیق خواب" (یعنی بستر کا ساتھی) کہا گیا ہے، اور خیانت ہمیشہ چوری چھپے ہی کی جاتی ہے اور اس کا راز بس خیانت کرنے والے ہی کو معلوم ہوتا ہے، اس لیے خیانت کو "بِطَانَةٌ" (ہمراز) کہا گیا ہے

بھوک اور خیانت جیسی چیزوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پناہ مانگنا کمالِ عبدیت کا وہ آخری اور انتہائی مقام ہے جو بلاشبہ آپ کا طرۂ امتیاز ہے، اور اس میں ہمارے لیے بڑا سبق ہے۔

عَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ یَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْبَرَصِ وَالْجُذَامِ وَالْجُنُوْنِ وَمِنْ سَیِّئِ الْاَسْقَامِ ——— رواه ابو داؤد والنسائی

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا

کیا کرتے تھے "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ ...... تا .... وَمِنْ سَيِّئِ الْاَسْقَامِ" اے میرے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں، برص، جذام اور پاگل پن سے اور سب خراب بیماریوں سے)

(سنن ابی داؤد، سنن نسائی)

تشریح) برص، جذام، جنون اور اس طرح کی وہ سب بیماریاں جن کی وجہ سے لوگ مریض سے نفرت اور گھن کریں اور جن کی وجہ سے آدمی زندگی پر موت کو ترجیح دینے لگے ۔۔۔۔ بلاشبہ ان سے ہر آدمی کو پناہ مانگنی چاہیے، لیکن ہلکی اور معمولی قسم کی بیماریاں بعض پہلوؤں سے یقیناً خدا کی رحمت ہوتی ہیں۔

عَنْ اَبِی الْیَسَرِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ یَدْعُوْا اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْهَدْمِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنَ التَّرَدِّی وَمِنَ الْغَرَقِ وَالْحَرَقِ وَالْهَرَمِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ اَنْ یَّتَخَبَّطَنِیَ الشَّیْطَانُ عِنْدَ الْمَوْتِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ اَنْ اَمُوْتَ فِیْ سَبِیْلِكَ مُدْبِراً وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ اَنْ اَمُوْتَ لَدِیْغاً۔

—————— رواہ ابوداؤد والنسائی

ابوالیسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کیا کرتے تھے "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ .... تا .... وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ اَنْ اَمُوْتَ لَدِیْغاً" (اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں [اپنے اوپر کسی عمارت وغیرہ کے] ڈھے جانے سے، اور [کسی بلندی کے اوپر سے] گر پڑنے سے، اور [دریا وغیرہ میں] ڈوب جانے سے، اور آگ میں جل جانے سے اور انتہائی بڑھاپے سے اور تیری پناہ چاہتا ہوں اس بات سے کہ موت کے وقت شیطان مجھے وسوسوں میں مبتلا کر دے، اور تیری پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ میں میدان جہاد میں پیٹھ پھیر کر بھاگتا ہوا مروں، اور پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ کسی زہریلے جانور کے ڈسنے سے مجھے موت آئے۔

(سنن ابی داؤد، سنن نسائی)

(تشریح) کسی دیوار وغیرہ کے نیچے دب کر مر جانا اور اسی طرح کسی بلندی سے نیچے گر کر یا دریا وغیرہ میں ڈوب کے یا آگ میں جل کر یا کسی زہریلے جانور، سانپ وغیرہ کے ڈسنے سے ختم ہو جانا یہ سب صورتیں مفاجاتی اور ناگہانی موت کی ہیں ـــــ علاوہ اس کے کہ انسانی روح موت کی ان سب صورتوں سے فطری طور پر بہت زیادہ گھبراتی ہے، ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان صورتوں میں مرنے والے کو موت کی تیاری، تجدید ایمان اور توبہ و استغفار وغیرہ کا موقع نہیں ملتا جو موت کی دوسری عام شکلوں میں عموماً مل جاتا ہے اس لیے ایک مومن کو موت کی ان سب ناگہانی صورتوں سے پناہ ہی مانگنا چاہیے، اسی طرح اس سے بھی پناہ مانگنا چاہیے کہ میدان جہاد میں پیٹھ پھیر کر بھاگتے ہوئے موت آئے، اللہ کی نگاہ میں یہ نہایت سنگین جرم ہے، علیٰ ہٰذا اس سے بھی پناہ مانگتے رہنا چاہیے کہ موت کے وقت شیطان وسوسہ اندازی کے ذریعہ ہم کو گڑبڑا سکے اور گمراہ کر سکے ـــــ خاتمہ ہی کے اچھے یا برے ہونے پر سارا دار و مدار ہے۔

موت کی جن ناگہانی صورتوں سے اس دعا میں پناہ مانگی گئی ہے، دوسری حدیثوں میں اس قسم کے حوادث سے مرنے والوں کو شہادت کی بشارت سنائی گئی ہے اور ان کو شہید قرار دیا گیا ہے، ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد اور منافات نہیں ہے ـــــ اپنی بشری کمزوری کے لحاظ سے موت کی ان سب صورتوں سے ہمیں اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے، لیکن جب تقدیر الٰہی سے کسی بندہ کو اس طرح سے موت آ جائے تو ارحم الراحمین کی رحمت پر نگاہ رکھتے ہوئے توقع رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس مفاجاتی موت ہی کی وجہ سے اس کو "اعزازی شہادت" کا مقام عطا فرمائیگا اور اگر قواعد اعمال کے حساب سے کچھ بھی گنجائش ہو گی تو یقیناً رب کریم کی طرف سے ایسا ہی ہوگا اِنَّهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

عَنْ قُطْبَةَ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ مُنْكَرَاتِ الْاَخْلَاقِ وَالْاَعْمَالِ وَالْاَهْوَاءِ ـــــ رواہ الترمذی

قطبہ بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کیا کرتے تھے "اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ مُنْكَرَاتِ الْاَخْلَاقِ وَالْاَعْمَالِ وَالْاَهْوَاءِ" (اے میرے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں، برے اخلاق، برے اعمال اور بری

خواہشات سے۔ (جامع ترمذی)

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا عَمِلْتُ وَمِنْ شَرِّ مَا لَمْ اَعْمَلْ۔

رواہ مسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کیا کرتے تھے "اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا عَمِلْتُ وَمِنْ شَرِّ مَا لَمْ اَعْمَلْ (اے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں ان اعمال کے شر سے جو میں نے کیے اور ان اعمال کے شر سے جو میں نے نہیں کیے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) کسی برے عمل کا سرزد ہو جانا، اور اسی طرح کسی اچھے عمل کا فوت ہو جانا دونوں ایسی چیزیں ہیں جن کے شر سے ہم جیسے عامی اس کی پناہ مانگتے ہیں لیکن عارفین اچھے سے اچھے عمل کرنے اور برے اور گندے اعمال سے دامن بچانے کے بعد بھی ڈرتے ہیں کہ کہیں ہمارے اندر اس کی وجہ سے عجب و غرور اور نیکی و پاکدامنی کا پندار نہ پیدا ہو جائے (جو اللہ کی نگاہ میں جرم عظیم ہے) اس لیے وہ اپنے اچھے اعمال کے شر اور برے اعمال کے ترک کے شر سے بھی اللہ کی پناہ مانگتے ہیں ـــــ سچ ہے حسنات الابرار سیئات المقربین۔

بیماری اور برے اثرات سے تحفظ کے لیے استعاذہ:-

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَوِّذُ الْحَسَنَ وَالْحُسَيْنَ وَيَقُوْلُ اُعِيْذُكُمَا بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَّهَامَّةٍ وَمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَامَّةٍ" وَيَقُوْلُ هٰكَذَا كَانَ اِبْرَاهِيْمُ يُعَوِّذُ اِسْحَاقَ وَاِسْمٰعِيْلَ ـــــ

رواہ الترمذی و ابوداؤد

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اپنے دونوں نواسوں) حضرت حسن و حسین پر دم کیا کرتے تھے (یہ کلمات پڑھ کے دم

فرماتے تھے) "أُعِيذُكُمَا بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَّهَامَّةٍ وَّمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَامَّةٍ" (میں تم کو اللہ کے پورے پورے کلموں کی پناہ میں دیتا ہوں، ہر شیطان کے اثر سے اور ڈسنے والے ہر زہریلے کیڑے سے، اور لگنے والی ہر نظر بد سے)

(جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

(تشریح) یہ کلمات پڑھ کر بچوں پر دم کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور آپ سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بھی سنت ہے ——— بلاشبہ بڑے بابرکت ہیں یہ کلمات۔

عَنْ عُثْمَانَ بْنِ أَبِي الْعَاصِ الثَّقَفِيِّ أَنَّهُ شَكَىٰ إِلَىٰ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَعًا يَجِدُهُ فِيْ جَسَدِهِ مُنْذُ أَسْلَمَ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضَعْ يَدَكَ عَلَى الَّذِي يَأْلَمُ مِنْ جَسَدِكَ وَقُلْ بِسْمِ اللّٰهِ ثَلٰثًا وَقُلْ سَبْعَ مَرَّاتٍ أَعُوْذُ بِاللّٰهِ وَقُدْرَتِهِ مِنْ شَرِّ مَا أَجِدُ وَأُحَاذِرُ" ——— رواہ مسلم

حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنی تکلیف عرض کی کہ جب سے میں اسلام لایا ہوں جسم کے فلاں حصہ میں درد رہتا ہے ——— آپ نے فرمایا کہ جس جگہ درد ہے اُس جگہ اپنا ہاتھ رکھو اور تین دفع بسم اللہ پڑھ کر سات دفعہ کہو "أَعُوْذُ بِاللّٰهِ وَقُدْرَتِهِ مِنْ شَرِّ مَا أَجِدُ وَأُحَاذِرُ" (میں اللہ تعالیٰ اور اس کی قدرت کاملہ کی پناہ چاہتا ہوں اس تکلیف کے شر سے جو مجھے لاحق ہے اور اس سے بھی جس کا مجھے خطرہ ہے) (صحیح مسلم)

(تشریح) ہر جسمانی تکلیف کے لیے یہ عمل اور تعوذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص عطیہ ہے اور بہت مجرب ہے۔

یک دو ساعت صحبتے با اہل دل

مجلس حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی مدظلہ العالی

مرتبہ: مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

(ساتویں مجلس)

۲۶ر شوال ۱۳۸۶ھ مطابق ۴ر جنوری ۱۹۶۶ء خانقاہ شریف۔ ۱۱ بجے سے ۱۲ بجے تک

جدید حاضرین مجلس میں سے مولوی نظام الدین صاحب اصلاحی (رقیم جماعت اسلامی مدھیہ پردیش) محمود الحسینی صاحب، ایڈیٹر الحمرا، محمد صغیر صاحب علیگ، قاضی عبدالحمید صاحب اندوری وغیرہ۔

راقم سطور نے عرض کیا کہ ادھر کئی سال سے طبیعت تقریروں سے بالکل اُچاٹ ہے، تقریر کے نام سے بخار سا چڑھتا ہے، پہلے یہ کیفیت نہ تھی، فرمایا کہ لوگوں میں طلب و استقبال ہوتا ہے تو طبیعت میں انبساط و انشراح پیدا ہوتا ہے اور مضامین کی آمد ہوتی ہے، ورنہ انقباض پیدا ہوتا ہے، دراصل حاضرین مخاطبین ہی کا عکس متکلم پر پڑتا ہے۔

فرمایا، حیدرآباد میں ایک بزرگ تھے، بہت سے لوگ ان کے مرید تھے، میں بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، بہت شفقت و خصوصیت فرماتے تھے۔ ان کے ایک مرید اور خویش پولیس کے ایک بڑے افسر تھے، ان کی بیوی کا انتقال ہوا اس حادثہ سے وہ بہت متاثر تھے، تعزیت میں حضرت نے ان کو کوئی خط لکھا، ان کو بہت ناگوار ہوا، انھوں نے

ایک نامناسب خط لکھا جس میں ان بزرگ کے لیے بہت نامناسب اور بے ادبی کے کلمات تھے حضرت نے اس خط کی بہت سی نقلیں کروائیں، اور اپنے سب مریدین کے نام بھیج دیں، اور تحریر فرمایا کہ میں دراصل ایسا ہوں جیسا ان صاحب نے لکھا ہے، آپ لوگ مغالطہ میں تھے، اب میری حقیقت پہچان لیجئے، میرے پاس بھی اس کی ایک نقل آئی میں نے اس کے جواب میں عریضہ لکھا کہ ان صاحب کو تو آپ میں چند ہی عیوب نظر آئے ہیں، مجھے تو آپ سراپا عیب نظر آتے ہیں، جن لوگوں نے میرا یہ خط پڑھا، انھوں نے کہا، یہ کیا بے تمیزی اور گستاخی ہے، حضرت پڑھیں گے تو سخت ناراض ہوں گے، میں نے ان سے کہا کہ حضرت مجھ سے ناراض ہو جائیں تو پرواہ نہیں، میں حضرت سے ناراض نہ ہوں، یہ سارا مضمون لکھ کر میں نے حضرت کی خدمت میں بھیج دیا، اس سے کچھ عرصہ بعد میں حیدرآباد گیا، ایک مسجد میں میں نے نماز پڑھی، اس کے آس پاس حضرت کے کئی خدام اور مریدین رہتے تھے، ایک صاحب نے جن کا خاص تعلق تھا، مجھے دیکھا تو نماز پڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گئے، اور ایک طرف لے جا کر کہنے لگے کہ آپ نے حضرت کی خدمت میں کیا لکھا ہے؟ میں نے کہا کہ میں کم عقل آدمی ہوں، کم عقلی کی بات لکھ دی ہوگی، کہنے لگے کہ نہیں ہم لوگوں کے پاس اس خط کی نقل آئی ہے کہ اس خط کا ترجمہ کر دو کہ میاں یعقوب نے کیا لکھا ہے، کئی ماہ کے بعد حضرت کا تشریف لانا ہوا، میں بھی حاضر ہوا، فرمایا کہ میاں یعقوب میں نے تمہارا خط وظیفہ کی کتاب میں رکھ لیا ہے، میں نے کہا کہ یہ مضمون میرا نہیں ہے، یہ حضرت مرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ کا فیض ہے، فرمایا، کیا واقعہ ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ایک برہمن حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، وہ بڑی ریاضتیں اور نفس کشی کر چکا تھا، اور اس میں کشفی قوت پیدا ہو گئی تھی، ایک دن اس نے حضرت کو تنہا پا کر عرض کیا کہ ایک بات کہنا چاہتا ہوں، مگر کہنے کی ہمت نہیں ہوتی، حضرت نے کہا، بے تکلف کہو، اس نے کہا کہ آپ کا جسم نورانی نظر آتا ہے، لیکن قلب بالکل سیاہ ہے، حضرت نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، ذرا یہ تو بتاؤ کہ تم کو یہ مراتب کیسے حاصل ہوئے؟ اس نے کہا کہ ہمیشہ نفس کے خلاف کرنے سے، نفس نے جس چیز کا تقاضا کیا، میں نے اس کے خلاف ہی کیا، فرمایا مسلمان ہونے کو طبیعت چاہتی

ہے؟ کہا نہیں، فرمایا، پھر تو یہ طبیعت کے لیے بہت ہی ناگوار چیز ہے، اور اپنے قاعدہ کے موافق نفس کی مخالفت کرو، اور اسلام لے آؤ، اس نے کہا کہ جب میں اپنے گرو کی خدمت میں تھا تو وہ بھی کبھی کہتا تھا کہ مجھے تیرے جسم سے اسلام کی بُو آتی ہے، اس نے کلمہ پڑھا، حضرت نے فرمایا اب تو ذرا دیکھو، اس نے کہا، حضور اب تو آپ سرتاپا نورانی نظر آتے ہیں، فرمایا یہ تم اپنے کو دیکھتے تھے، اصل میں شیخ کامل آئینہ ہے، اور ہر شخص اس میں اپنی صورت دیکھتا ہے، آئینہ جتنا صاف ہوگا، عکس اس میں صاف آئے گا، اور میں نے یہ جو عرض کیا ہے کہ حضرت مجھ سے خفا ہو جائیں تو مجھے پرواہ نہیں، میں حضرت سے خفا نہیں ہوں، یہ بھی شیخ سعدیؒ کے کلام سے ماخوذ ہے، شیخ سعدیؒ نے ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ تمام رات مناجات و دعا میں مشغول رہے، صبح کو ایک غیبی آواز آئی کہ تم مردود بارگاہ ہو، تمہارا کوئی عمل قابل قبول نہیں، ان بزرگ کے چہرہ میں کوئی تغیّر نہیں ہوا، مریدوں نے کہا کہ کیا حضرت کے گوش مبارک میں یہ ندائے غیبی نہیں پہونچی؟ فرمایا کہ پہونچی، انھوں نے عرض کیا کہ پھر اس سے حضرت کی طبیعت مبارک پر کوئی اثر نہیں ہوا، انھوں نے کہا کہ ہمارا جو کام ہے، وہ ہم کر رہے ہیں، وہ چاہے مقبول کریں، چاہے مردود، اگر اس کا دروازہ ہمارے لیے بند ہے، تو ہم جائیں کہاں؟ اس کے دروازہ کے سوا کوئی دروازہ بھی تو نہیں، اس پر ارشاد ہوا کہ یہ ابتلا تھا، تم مقبول ہو، شیخ فرماتے ہیں: ؎

شبے تا سحر صالحے زندہ داشت سحر دستہائے دعا بر فراشت
یکے ہاتف انداخت در گوش پیر کہ بے حاصلی رو سر خویش گیر
بریں در، دعائے تو مقبول نیست بخواری برو یا بزاری بایست
شبے دیگر از ذکر و طاعت نخفت مریدے ز حالش خبر داشت گفت
چو دیدی کزاں روئے بستست در بہ بے حاصلی سعی چندیں مبر
بدیباجہ بر اشک یاقوت فام بحسرت ببارید و گفت اے غلام
مپندار اگر وے عناں بر شکست کہ من باز دارم ز فتراک دست
بنومیدی آنگہ بگردیدمے ازیں راہ کہ راہ دگر دیدمے

چو خواہندہ محروم گشت از درے | چہ غم گر شناسد در دیگرے
شنیدم کہ در اہم در یں کوئے غیست | ولے تیج راہے دگر روئے نیست
درین بود سر بر زمین فدے | کہ گفتند در گوش جانش ندے
قبولست گرچہ ہنر نیستبش | کہ جز ما پناہے دگر نیستش

تو حضرت مجدد راضی ہوا کریں، یہ حضرت کا فعل ہے، ہم حضرت سے ناراض نہ ہوں، ہمارا کام یہی ہے۔

فرمایا کہ قلوب کا قلوب پر بڑا اثر پڑتا ہے، اور صاحب امر اور صاحب اثر کا اور بھی اثر پڑتا ہے، اخلاق محسنی میں نوشیرواں کی حکایت لکھی ہے، کہ وہ ایک دن شکار کو گئے، جنگل میں ساتھیوں سے علیحدہ ہو گئے، ایک جھونپڑے میں چلے گئے، پیاسے تھے، پانی مانگا، ایک لڑکی گنّے کا رس لے کر آئی، اس میں کچھ کچرا پڑا ہوا تھا، بادشاہ نے پیا اور طلب فرمایا اور کہا کہ کچرا نہ ہو، اس نے کہا کہ میں نے یہ کچرا خود ڈال دیا تھا کہ آپ سخت پیاسے معلوم ہوتے تھے، اگر ایک دم سے سارا پی جاتے، تو نقصان ہوتا، اس مرتبہ لڑکی کو رس لانے میں بہت دیر لگی، اس عرصہ میں بادشاہ نے سوچا کہ اس کثرت سے یہاں گنّا پیدا ہوتا ہے، اور اتنا اس میں سے رس نکلتا ہے، اس پہ محصول بہت کم ہے، اس میں اضافہ ہونا چاہیے، لڑکی رس لے کر آئی، تو رس بہت تھوڑا تھا، بادشاہ نے سبب پوچھا، کہ اتنی دیر کیوں لگی اور اتنا رس کم کیوں لائی؟ اس نے کہا کہ میں پہلے ایک ہی گنّے کا رس لائی تھی، یہ کئی گنّوں کا رس ہے، اور بڑی مشکل سے نکلا ہے، معلوم ہوتا ہے، کہ بادشاہ کی نیت میں فرق آگیا ہے، نوشیرواں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، اور تیسری بار فرمائش کی، اور اپنی نیت درست کر لی، اور یہ ارادہ کر لیا کہ محصول میں کوئی اضافہ نہ ہوگا، لڑکی پیالہ بھر کر لائی، اور کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کی نیت ٹھیک ہو گئی، اس مرتبہ خوب رس نکلا۔

فرمایا کہ حاضرین کے قلوب کا اثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی پڑتا تھا، ارشاد فرمایا ہے، کہ میرے قلب پر کثافت سی آجاتی ہے " انہ لیغان علی قلبی " اس لیے میں ایک ایک مجلس میں ستر ستر بار استغفار کرتا ہوں،

فرمایا کہ بزرگانہ شکل و صورت سے کچھ نہیں ہوتا، کوئی لفافہ ہی دیکھ کر تعریف کردے کہ خط بہت اچھا ہے، اس سے کچھ نہیں ہوتا، جب تک خط کا مضمون نہ معلوم ہو، اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی، اس حقیقت کو قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے "افلا یعلم اذا بعثر ما فی القبور و حصل ما فی الصدور"٭ کوئی بادام کا چکنا چکنا چھلکا، اور بڑا سا دانہ دیکھ کر تعریف کرے تو اس کا کچھ اعتبار نہیں، اصل تو گری ہے اور اس میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس سے روغن بادام کتنا نکلتا ہے، اس مغز اور روغن کے اظہار کی جگہ تو قبر ہے، اس وقت معلوم ہوگا کہ بادام کڑوا ہے، یا میٹھا، تر ہے یا بالکل خشک، مولانا نے صحیح فرمایا ہے ؎

آدمیت مشکل است اے آدمی | چوں بری روز آوری ہائے غمی
آدمیت لحم و شحم و پوست نیست | آدمیت جز رضائے دوست نیست
آدمیت گر بقوت فی شدے | گاؤ خر از آدمی بہتر بُدے

اسی لیے حدیث میں "انما الاعمال بالخواتیم" آتا ہے،

فرمایا کہ عالی چیز کو حاصل کرنے کے لیے اسی کی شان کے مطابق موانع کو دور کرنا ہوتا ہے۔ نماز کے لیے ضرورت بشری کو پورا کرنا، اور طہارت و وضو ضروری ہے، اگر کوئی شخص کسی کو نماز کی دعوت دے، اور وہ یہ سنتے ہی بیت الخلاء کی طرف روانہ ہو جائے، تو یہ نماز کی تیاری ہے، نسخہ لکھتے وقت مریض پرہیز کو ضرور پوچھتا ہے، ابتدائی کتابیں پڑھ کر ہی بڑی بڑی کتابوں کو پڑھا جا سکتا ہے، لوگ وظائف تو بہت پوچھتے ہیں، لیکن انکے اثر و قبولیت کے لیے خدا کے نام جو عظمت، اور جس ایمان و یقین اور اعتماد کی ضرورت ہے، اس کی فکر نہیں کرتے، بہت سے لوگ اپنے بچوں کو حفظ کرا دیتے ہیں، اور اس کو فخریہ بیان کرتے ہیں، مگر اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ یہ بچہ اس دولت کی قدر و حفاظت بھی کر سکے گا، یا نہیں، حفظ کرانے کے بعد ایسی تعلیم دلاتے ہیں، کہ وہ اس سب محنت پر پانی پھیر دیتا ہے، اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی قورمہ اچھا تیار کرے، اور اس کو چینی کے پیالہ میں بڑے تکلف سے نکالے پھر گوبر یا کسی نجس چیز کو پیس کر اس پر چھڑک دے، تو کیا یہ سب غارت نہیں چلا جائے گا؟ حفظ قرآن کے بعد جو زندگی اختیار کی جاتی

٭ کیا انسان کو معلوم نہیں وہ وقت جب اٹھایا جائے گا قبروں سے اور نکال لیا جائے گا جو کچھ سینوں کے اندر ہے (القرآن)

ہے، اس کو اس سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی، اگر دل میں خدا کی نام کی عظمت ہو تو ایک آیت زندگی میں انقلاب برپا کرنے کے لیے کافی ہے، حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ جو پہلے ایک رہزن اور ڈاکو تھے، ان کی زندگی میں انقلاب اس سے آگیا کہ وہ کہیں واردات کرنے گئے تھے، کوئی شخص قرآن مجید پڑھ رہا تھا، ان کے کان میں یہ آیت پڑی "الم یأن للذین اٰمنوا أن تخشع قلوبھم لذکر اللہ ومانزل من الحق" (کیا ابھی ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر اور آیات حقانی سے لرز جائیں) کہنے لگے وقت آگیا، وقت آگیا، اور توبہ کی، ولایت کو پہونچ گئے۔

فرمایا، ارادوں کو قابو میں رکھ کر محل پر استعمال کرنا انسانیت ہے، ارادوں کے تابع تو جانور ہوتا ہے، جو اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکے، وہ جانور سے زیادہ مشابہ ہے، لوگ کہتے ہیں کہ ہم اپنے ارادوں اور جذبات کو قابو میں نہیں رکھ سکتے، میں کہتا ہوں کہ آپ شطرنج کھیلنے میں کیا کرتے ہیں، کیا آپ اپنے ارادوں اور خواہشات کو شطرنج کے اصول اور قاعدوں کے ماتحت نہیں رکھتے، پھر شریعت کے احکام کے بارے میں آپ کیوں مجبور ہو جاتے ہیں، بہت سے لوگوں نے شریعت ہی کے احکام میں ترمیم و انتخاب کر لیا ہے، اور اس کو اپنے مطابق بنا لیا ہے، ـــــ ایک بادشاہ نے کچھ لوگوں سے کہا کہ میرا یہ تخت اس کوٹھری کے اندر پہونچا دو، کوٹھری تنگ اور اس کا دروازہ چھوٹا تھا، ایک درباری نے کہا کہ حضور تخت بڑا ہے، اور کوٹھری چھوٹی، یہ تخت اس کوٹھری میں نہیں سما سکتا، بادشاہ بہت ناراض ہوا، اور کہا کہ یہ بے وقوف ہیں، یورپ سے کچھ سمجھدار لوگ آگئے، انھوں نے کہا کہ ہم ابھی اس تخت کو اس کوٹھری میں بچھا دیتے ہیں، یہ ناسمجھ لوگ ہیں، یہ ایسا نہیں کر سکتے، انھوں نے اوزار سے اس تخت کے کونے کاٹے، تھوڑا سا ادھر سے لیا، تھوڑا سا ادھر سے لیا اور تخت کو چھوٹا اور مختصر کر کے کوٹھری میں لے گئے، اور تخت کو تختہ کر کے رکھ دیا، اسلام بھی ایک تخت تھا، اس کی ایک کیل بھی نکالنے کی اجازت نہ تھی، لیکن انھوں نے اس تخت کو بھی تختہ بنا دیا، اور اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق کر لیا، حالانکہ ایک ایک پرزہ اپنی جگہ پر ہوتا ہے تو مشین

چلتی ہے، بعض لوگ نوافل اور سنن کو غیر ضروری سمجھتے ہیں، حالانکہ جب کوئی چپراسی غالباً اوقات میں کسی سرکاری افسر کے ذاتی اور گھریلو کام کر دیتا ہے تو افسر کے دل میں بڑی وقعت ہوتی ہے، اسی لیے فرمایا گیا " ولا یزال عبدی یتقرب الیّ بالنوافل" الحدیث۔ آپ کا ملازم آپ کے گھر گھی لے کر آئے اور کہے کہ میں گھر جا رہا تھا، ایک جگہ بڑا خالص اور سستا گھی بک رہا تھا، میں جلدی سے لیتا آیا، تو آپ کتنے خوش ہوں گے ـــــ بعض لوگوں کو اگر کسی شرعی امر کے لیے کہا جائے تو بہت دبی زبان سے کہتے ہیں، کہ سنّت ہے، یعنی کوئی ضروری اور اہم چیز نہیں، میں کہتا ہوں کہ یہ فعل تو سنّت ہے مگر یہ لہجہ کفر ہے، زور سے عظمت کے ساتھ کیوں نہیں کہتے کہ سنّت ہے، جو ہرِ ایمان اللہ اور اس کے رسول کی محبت اور عظمت ہے، گناہ اور سرکشی میں کیا فرق ہے؟ ایک کیوں آسانی سے معاف کر دیا جاتا ہے، اور دوسرا غضب اور عتاب کا موجب کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ پہلے میں قصداً مخالفت نہیں ہوتی، دوسرے میں مخالفت اور جرأت ہوتی ہے، آپ کوئی بہت پھٹا سا نوٹ جس کے کئی ٹکڑے ہو گئے ہوں صرف نمبر پڑھے جاتے ہوں، بنک کی کھڑکی پر لے کر جائیے، آپ کو اس کے بدلہ میں نیا نوٹ دے دیا جائے گا، لیکن اگر آپ ایک نوٹ بنک سے لیں، اور اس کو بنک کے افسر یا کلرک کے سامنے پھاڑ دیں، تو چاہے اس کے دو ہی ٹکڑے ہوئے ہوں، آپ سزا اور عتاب کے مستحق ہوں گے، اور سرکار کی توہین سمجھی جائے گی، اس لیے کہ پہلے میں ارادہ اور مخالفت کو دخل نہ تھا، اور یہ محض سرکشی اور جرأت ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں آتا ہے لیس علیکم جناح فیما اخطأتم بہ، ولکن ما تعمدت قلوبکم[1]

سہارن پور کے اسٹیشن کے قریب ایک مسجد میں گاڑی کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا، ایک مولوی صاحب وعظ فرما رہے تھے، ٹخنہ کے نیچے پاجامہ کی بڑی مذمت کر رہے تھے اور وعیدیں سنا رہے تھے، کہنے لگے کم از کم نماز کے وقت تو اونچا کر لیا کریں، میں نے

---

[1] تم سے جو خطا تصور غلطی اور بھول چوک سے ہو جائے، وہ گناہ نہیں لیکن دل کے عزم و ارادہ سے جو نافرمانی ہو وہ گناہ ہے (اور اس پر پکڑ ہوگی) الفرقان

کہا حضرت یہ تو گناہ کبیرہ ہے، اونچا کرنے والے کی نیت یہی ہوتی ہے کہ نماز کے بعد پھر اس کو نیچا کر دوں گا، تو جس گناہ کے کرنے کا عزم ہو وہ تو گناہ ہی میں داخل ہے، حدیث میں آتا ہے " ما العود جع " کیا خدا صرف نماز میں دیکھتا ہے، نماز کے باہر نہیں دیکھتا، یہ تو ایسی بات ہے کہ شراب کا شیشہ مسجد کے باہر رکھ دیا، جب نماز سے فراغت ہوئی تو جا کر پی لیا، جس گناہ کا عزم ہو اس کا نام طغیان ہے،

کسی بزرگ کا قصہ ہے کہ انھوں نے اپنے خادم سے کہا کہ چلم پینے کے لیے آگ لا، اس کو آگ نہیں ملی، تو کہا دوزخ میں سے لے آ، اس نے وہاں جا کر آگ مانگی تو مالک داروغۂ جہنم نے کہا کہ یہاں آگ واگ نہیں ہے، یہاں ہر شخص اپنی آگ اپنے ساتھ لاتا ہے، یہ ایک تمثیلی حکایت ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر شخص کی آگ اپنے ساتھ ہے۔ وہ ہمارے اعمال و اخلاق ہیں، قرآن شریف میں آتا ہے" ان الذین یاکلون أموال الیتامیٰ ظلماً إنما یأکلون فی بطونہم ناراً وسیصلون سعیراً شریعت کے احکام بہت سے لوگوں کو معلوم ہیں، عمل کرنے کے لیے عزم اور ارادہ کی ضرورت ہے، شکر و میوہ سب موجود ہے، چولھا سُلگ رہا ہے، اور آپ میرے یہاں حلوہ مانگنے آئے ہیں، البتہ آپ بارود میں بھی دیا سلائی رکھ دیں گے تو آگ نہیں جلے گی، جب تک دیا سلائی کو رگڑا نہ جائے، آگ نہیں پیدا ہوتی، ہم اپنی زبان کب تک جلائیں گے، آپ خود کیوں حلوہ نہیں پکا لیتے، جو چیز آپ میں بھی ہے وہ ہم میں بھی، قرآن و حدیث آپ کے گھر میں بھی ہے پھر کیوں نہیں رجوع کرتے۔

صفر ۱ھ کے شمارے میں ملفوظات کی جو قسط شائع ہوئی تھی اُس میں جگہ کی تنگی کی وجہ سے چند ملفوظات روک لیے گئے تھے ذیل میں وہ بھی درج کیے جا رہے ہیں۔

ؔ جو لوگ ظالمانہ طور پر یتیموں کا مال ہڑپ کرتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں صرف انگارے بھرتے ہیں اور یقیناً وہ دہکتی اور بھڑکتی ہوئی جہنم میں جائیں گے۔

دواؤں اور غذاؤں میں جو تاثیر و ذائقہ سینکڑوں برس پہلے تھا وہی آج بھی ہے نمک مرچ میں جو تیزی برسوں پہلے تھی وہی آج بھی ہے، آج بھی ان کو منہ میں رکھنے سے منہ کڑوا ہو جاتا ہے اور آگ سی لگ جاتی ہے، پھر نماز میں وہ تاثیر جو تیرہ سو برس پہلے تھی وہ آج کیوں نہیں ہے، کہا گیا تھا، ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر، یہ خاصیت اس میں آج بھی ہونی چاہیے۔

غیر مسلم بھی نماز اور مسجد کا مرتبہ جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ پاک چیزیں ہیں، یہاں ہماری مسجد میں ایک موذن تھے بیچارے اذان و نماز کے پابند تھے مگر اخلاق میں کوئی تبدیلی اور ترقی نہیں ہوئی تھی، مسجد کے پاس ایک پھول دار درخت تھا اس میں پھول بہت اچھے لگتے تھے، میں نے کہا تھا کہ دیکھو کوئی یہ پھول نہ توڑے ایک دن ایک اہیر کسی ضرورت سے پھول توڑنے لگا، انھوں نے گالی دی تو کہنے لگا میاں ابھی مسجد سے نکلے ہو گالی تو نہ بکو۔

فرمایا بعض اہل علم ایسے ہیں کہ ان کے گھروں میں فرائض و احکام کا ذکر ہی نہیں ہوتا اور ان کی اولاد تک موٹی موٹی باتوں سے بے خبر ہوتی ہے، ایک مولوی صاحب کے داماد ہمارے یہاں زیور و نقد امانت رکھا کرتے تھے، [illegible] رقم ہو جاتی تھی۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے کہا کہ کیا آپ اس مال کی زکوٰۃ بھی نکالتے ہیں، بہت سادگی سے کہا کہ اس کا تو کبھی گھر میں کوئی ذکر نہیں ہوا، زکوٰۃ، اور اس کا ان کے گھر میں ذکر ہی نہ ہو؟ اس پر مجھے یہ لطیفہ یاد آگیا کہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بمبئی کے ایک تاجر نے مسجد کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے بمبئی کی دعوت دی، والد صاحب کی طبیعت میں جہاں بہت جلال تھا وہاں سادگی بھی بہت تھی، بلا اطلاع تشریف لے گئے، ہم لوگ بھی ساتھ تھے، بمبئی میں ایک صاحب نے جو بھائی صاحب مرحوم کے سسرالی رشتہ دار ہوتے تھے اور عرصہ تک ہمارے گھر پر رہے تھے، انھوں نے دیکھ لیا، پیچھے پڑ گئے کہ ہمارے گھر تشریف لے چلیے، ہم کو گھر بیٹھے دولت

ؔلہ تمہارے لئے جنت میں وہ سب کچھ ہے جو تمہاری طبیعت چاہتی ہو اور جو تم مانگتے ہو۔

مل گئی ہے "آپ کہاں یہاں آتے اور ہمارے گھر تشریف لاتے، والد صاحب نے بہت عذر کیا کہ ہم کو فلاں صاحب نے بلایا ہے وہیں جائیں گے مگر وہ نہ مانے اور اصرار کیا کہ کم از کم ایک روز تشریف رکھیں، ہم لوگ گھر پہونچے سب چپ چاپ بیٹھ گئے، والد صاحب بھی مراقب وہ بھی مراقب، کھانے کا کوئی ذکر فکر نہیں جب بہت دیر ہو گئی اور بھوک لے ستایا تو والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بٹوہ سے ایک نوٹ نکال کر شفیع اللہ خاں صاحب کو جو ہمراہ تھے دیا کہ بازار سے کھانا لے آؤ وہ صاحب چونکے اور کہنے لگے کھانا؟ کھانے کا انتظام تو مجھے کرنا تھا میرا گھر تھا شفیع اللہ صاحب کچھ جھنکے والد صاحب نے فرمایا یہ تو بے وقوف ہیں، تم بے وقوف نہ بنو غرض کھانا آیا اور ان صاحب نے بھی بیٹھ کر کھایا، یہی قصہ زکوٰۃ کا ہوا کہ سب کچھ ہوتا رہا مگر اس کا ذکر ہی نہیں کیا، زکوٰۃ کا ذکر تو جب پیدا ہوئے تھے جبھی آ گیا تھا وہ تو کلمہ کے ساتھ ہی آ گیا تھا، ایک بزرگ جو رقم آتی تھی دے دیا کرتے تھے کبھی رکھتے نہ تھے، ایک مرتبہ رکھنا شروع کیا، خدام نے سمجھا مزاج بدل گیا ہے، جب مال زکوٰۃ کے قابل ہوا تو زکوٰۃ دے کر سب خیرات کر دیا، فرمایا میں زکوٰۃ ادا کرنے کی فضیلت سے محروم تھا، اتنا مال ہی جمع نہیں ہوتا تھا کہ زکوٰۃ مجھ پر فرض ہو، الحمد للہ ایک مرتبہ یہ سعادت بھی حاصل ہو گئی۔ پھر کبھی روپیہ جمع نہیں کیا۔ یہ ہے فرض کی ادائیگی کی فضیلت۔

درسِ قرآن

۲۳ر جون (یکشنبہ)

جہاد اور ہجرت

سے متعلق سورۂ نساء کی چند آیات

(۲)

جہاد سے متعلق سورۂ نساء کی آیات ۹۴، ۹۵، ۹۶ کی تشریح وتفسیر میں جو کچھ ۱۶ر جون کے درس میں بیان ہوا تھا وہ قارئین کرام پچھلے شمارہ میں پڑھ چکے ہیں ان کے آگے کی آیات ۹۷ تا ۱۰۰ جو ہجرت سے متعلق ہیں ان کی تشریح وتفسیر والا حصہ صفحات میں گنجائش نہ رہنے کی وجہ سے پچھلے شمارہ میں نہیں آسکا تھا، وہ اب ان صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے ــــ ان آیات کا ترجمہ اگرچہ گزشتہ شمارہ میں درج کیا جا چکا تھا لیکن آج وہ پھر پیش کیا جا رہا ہے تاکہ تشریحی بیان کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

"إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ .... وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝

سورۃ النساء آیت ۹۷ تا ۱۰۰

(ترجمہ) جن لوگوں کی روح فرشتے اس حال میں قبض کریں گے کہ انھوں نے اپنے نفسوں پر ظلم ڈھائے ہیں (اور دار الکفر میں پڑے رہنے کی وجہ سے اللہ کے احکام ومطالبات کی ادائیگی میں سخت کوتاہیاں کی ہیں) وہ ان سے پوچھیں گے کہ تم کس حال میں تھے؟ وہ کہیں گے کہ ہم اپنے وطن اور ماحول میں بالکل عاجز اور بے بس تھے (اس لیے

اسلامی احکام پر نہیں چل سکتے تھے اور مسلمانوں والی زندگی نہیں گزار سکتے تھے فرشتے کہیں گے کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم کسی طرف ہجرت کر جاتے ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے (۹۷)

البتہ وہ عاجز و لاچار مرد، عورتیں اور بچے جو ہجرت کی اور ان حالات سے نکلنے کی کوئی تدبیر نہیں کر سکتے اور کوئی راستہ نہیں پا سکتے ہیں (وہ عنداللہ معذور ہیں) (۹۸)

تو توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرما دے گا اور اللہ بہت معاف فرمانے والا اور بڑا بخشنے والا ہے (۹۹)

اور جو کوئی راہ خدا میں ترک وطن کر کے نکلے (اس کے لیے اللہ کا فیصلہ ہے کہ) وہ اللہ کی زمین میں (چلنے پھرنے اور رہنے بسنے کے لیے) وسیع میدان اور پوری کشادگی اور فراخی پائے گا۔ اور جو کوئی چل نکلے اپنے گھر سے اللہ اور رسول کے لیے ہجرت کر کے پھر آ جائے اس کو (راستہ ہی میں) موت تو (راہ خدا میں صرف قدم اٹھا دینے سے) اس کا اجر و ثواب اللہ کے ہاں ثابت ہو گیا اور اللہ غفور و رحیم ہے (۱۰۰)

تفسیر و تشریح :-

ان آیات کا مطلب اور موقع محل سمجھنے کے لیے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ نبوت ملنے کے قریباً ۱۳ سال بعد جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی اور مدینہ طیبہ گویا اسلام کا وطن اور آپ کی ہدایت و دعوت اور اسلامی تعلیم و تربیت کا مرکز بن گیا تو اس وقت مدینہ طیبہ کے سوا کوئی بستی روئے زمین پر ایسی نہیں تھی، جہاں اسلامی احکام کے مطابق زندگی گزاری جا سکے اور اسلامی زندگی دیکھی اور سیکھی جا سکے، اس لیے اسلام قبول کرنے والے ہر شخص کے لیے اُس وقت ضروری تھا کہ وہ اپنا کافرانہ و مشرکانہ ماحول اور غیر اسلامی وطن چھوڑ کر مدینہ ہی میں آ بسے ـــــ الغرض

اُس وقت ہجرت بھی نماز روزہ کی طرح ہر مسلمان پر فرض تھی بلکہ گویا ایمان و اسلام کی لازمی شرط تھی، صرف وہی لوگ اس سے مستثنیٰ تھے جو کسی وجہ سے ہجرت سے بالکل ہی مجبور تھے۔

یہ حکم فتح مکہ تک جاری رہا، ۸ھ ہجری میں جب مکہ معظمہ پر مسلمانوں کا اقتدار قائم ہوگیا جس کے بعد کفر کا زور سارے عرب میں ٹوٹ گیا اور ہر جگہ کے مسلمانوں کے لیے اسلامی احکام کے مطابق زندگی گزارنا اور اسلام کے داعیوں اور معلموں کا ہر جگہ آنا جانا آسان ہوگیا تو ہجرت کی فرضیت کا حکم منسوخ ہوگیا اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمادیا "لا ھجرۃ بعد فتح مکۃ" (فتح مکہ کے بعد ہجرت کی فرضیت ختم ہوگئی)

سورۂ نساء کی یہ چار آیتیں اِنَّ الَّذِیۡنَ تَوَفّٰىهُمُ الۡمَلٰٓـئِكَةُ ظَالِمِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ" سے لے کر "اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا" تک اُسی دور میں نازل ہوئی تھیں جب دارالکفر میں اسلام قبول کرنے والے ہر شخص کے لیے ہجرت کر کے مدینہ آجانا نماز کی طرح ایک دینی و ایمانی فریضہ تھا۔ ان آیتوں میں ان لوگوں کو جنہوں نے کافروں کے علاقہ میں رہتے ہوئے اسلام قبول کر لیا تھا اور ہجرت کے حکم پر ابھی تک عمل نہیں کیا تھا بلکہ اپنے علاقوں ہی میں وہ رہ بس رہے تھے، نہایت موثر انداز میں ہجرت پر ابھارا گیا ہے اور ہجرت نہ کرنیکے نہایت سخت انجام سے ان کو ڈرایا گیا ہے۔

پہلی آیت "اِنَّ الَّذِیۡنَ تَوَفّٰىهُمُ الۡمَلٰٓـئِكَةُ ظَالِمِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ قَالُوۡا فِيۡمَ كُنۡتُمۡ۔ الاٰیۃ" میں بتایا گیا ہے کہ موت کے فرشتے جب اُن لوگوں کی روح قبض کریں گے جو اسلام قبول کر لینے کے بعد بھی کفر و جاہلیت کے ماحول میں رہ کر غیر اسلامی زندگی گزار رہے ہیں تو ان سے بطور عتاب کے پوچھیں گے "فِيۡمَ كُنۡتُمۡ" (یعنی تم کس حال میں تھے اور کیسی زندگی گزار رہے تھے کیا اسلام والی زندگی جس کو تم نے قبول کیا تھا یا کافروں والی غیر اسلامی زندگی جو تمہارے علاقہ اور ماحول کی زندگی تھی؟ ——— تو فرشتوں کے اس سوال کے جواب میں یہ لوگ کہیں گے "كُنَّا مُسۡتَضۡعَفِيۡنَ فِى الۡاَرۡضِ" یعنی ہم اپنے ملک اور اپنے وطن میں بالکل دبے ہوئے اور بے بس تھے، وہاں کے حالات میں اسلامی زندگی گزارنے کی ہمارے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں تھی اس لیے مجبوراً اپنے اس غیر اسلامی

ماحول کے مطابق ہی زندگی گزار رہے تھے ــــ فرشتے ان کے اس عذر کو ناقابل قبول قرار دیتے ہوئے اسی عتاب آمیز انداز میں ان سے کہیں گے اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا کیا خدا کی زمین تمہارے لیے وسیع نہ تھی کہ تم کسی طرف کو ہجرت کر جاتے اور ایسی کسی جگہ چلے جاتے جہاں اسلامی طریقہ پر زندگی گزار سکتے؟

آیت کے اس جزو سے صاف ظاہر ہے کہ فرشتوں کا یہ عتاب آمیز سوال و جواب ان لوگوں سے ہوگا جن کے لیے ہجرت کے امکانات تھے لیکن انھوں نے اس لیے ہجرت نہیں کی کہ اس میں انھیں مال و جائداد کی جو قربانی دینی پڑتی اور ترک وطن کی وجہ سے جو تکلیفیں اٹھانی پڑتیں وہ ان کے لیے آمادہ نہیں ہوئے، یعنی ان کی عافیت طلبی اور مال و جائداد وغیرہ کی محبت نے انھیں ہجرت سے روکے رکھا، ورنہ اگر وہ مؤمنین صادقین کی طرح ان سب باتوں سے بے پروا ہو کر ہجرت کے لیے تیار ہو جاتے تو کر سکتے تھے ــــ آگے کی آیت میں ان لوگوں کا یہ انجام بتلایا گیا ہے "فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا" یعنی ان کے اس گناہ عظیم کی کہ انھوں نے امکان و استطاعت کے باوجود ہجرت نہیں کی اور دارالکفر کو اپنا وطن بنائے رکھا، آخرت میں سزا یہ ہوگی کہ معاذ اللہ جہنم ان کا ٹھکانا اور وطن بنے گا اور اس کا بے پناہ دکھ اور عذاب انھیں بھگتنا ہوگا۔

تنہا اسی ایک آیت سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اس دور میں ہجرت کی کتنی اہمیت تھی۔ بعض علماء اور مفسرین نے لکھا ہے کہ اس دور میں ہجرت فرض و واجب ہونے کے علاوہ اسلام کا شعار بھی تھی اور اسی لیے ہجرت کے بغیر کسی شخص کو قانونی طور پر مسلمان نہیں مانا جاتا تھا، لیکن اگر یہ نہ بھی کہا جائے تو اتنی بات تو اس آیت سے بالکل ظاہر ہے کہ اس وقت ہجرت نہ کرنا شدید ترین معصیت تھی۔ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا۔ ایسی وعید ہے کہ قرآن پاک میں زانیوں اور شرابیوں کو بھی غالباً اتنی سخت وعید نہیں سنائی گئی بلکہ قرآن پاک میں اکثر و بیشتر مقامات پر کافروں اور مشرکوں ہی کا یہ انجام بتایا گیا ہے

اسکے بعد والی آیات میں فرمایا گیا ہے کہ کسی کافرانہ علاقہ میں اسلام قبول کرنیوالے جو لوگ، مرد جو عورتیں بچے اپنے خاص حالات کیوجہ سے ہجرت کرنے سے فی الواقع بالکل ہی مجبور ہوں اور انکے لیے ہجرت کی راہیں بالکل ہی مسدود ہوں، وہ بے شک عند اللہ معذور اور قابل معافی ہیں۔ ارشاد ہے:

إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا ○

یعنی کفر و شرک یا الحاد کے ماحول میں دبے ہوئے جو مجبور و بے بس لوگ (مرد عورتیں اور بچے) واقعۃً اس حالت میں ہوں کہ وہ ہجرت کر ہی نہ سکتے ہوں اور اپنے علاقوں سے نکلنے کے راستے ان کیلئے بالکل ہی بند ہوں تو اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم سے امید ہے کہ ایسے مجبور لوگوں کے ہجرت نہ کرنے کو وہ معاف فرمادے گا کیونکہ قصوروں کو معاف کرنا اور مجرموں کو بخش دینا اس کی صفت اور شان ہے "وَعَسَى اللَّهُ أَنْ يَعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا"۔

اس آیت میں اگرچہ ان معذورین کو ہجرت نہ کرنے پر مواخذہ اور عذاب سے مستثنیٰ کیا گیا ہے لیکن اس استثناء کے لیے بھی انداز بیان ایسا اختیار کیا گیا ہے جس سے ہجرت کے حکم اور مطالبہ کی شدت اور اہمیت اور زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ ان معذورین کے لیے یہ نہیں فرمایا گیا کہ یہ لوگ اپنی مجبوری و بے بسی کی وجہ سے عند اللہ معذور ہیں بلکہ فرمایا گیا "عَسَى اللَّهُ أَنْ يَعْفُوَ عَنْهُمْ الآية" جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ قصوروں کو معاف کرنے والا اور گناہوں کو بخشنے والا ہے اور یہ اس کی خاص شان اور صفت ہے اس لیے اس سے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ ان معذورین کے ترک ہجرت کے قصور کو معاف کردے اور مواخذہ نہ فرمائے ــــ گویا ان معذورین کو بھی سمجھنا چاہیے کہ ہجرت نہ کرنے کی وجہ سے ہم قصوروار ہیں اور ہمیں اللہ تعالیٰ کے دامنِ عفو و مغفرت ہی میں پناہ مل سکتی ہے۔

اس کے آگے ہجرت کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ فرمایا گیا ہے اور گویا ضمانت دی گئی ہے کہ جب وہ اللہ کی رضا جوئی کے لیے اپنا کافرانہ وطن چھوڑ کر نکل کھڑے ہوں گے تو ان کو رہنے بسنے اور آزادی سے زندگی گزارنے کے لیے وسیع میدان بھی ملیں گے اور فراخی اور کشائش بھی نصیب ہوگی۔ یعنی چھوڑے

ہوئے کافر انہ وطن کی جگہ انہیں زیادہ اچھا اور وسیع وطن بھی ملے گا اور رزق وغیرہ اسباب حیات بھی فراوانی کے ساتھ عطا ہوں گے۔ ارشاد ہے "وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً" (اور جو کوئی راہ خدا میں ترک وطن کر کے نکلے اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ وہ اللہ کی زمین میں آزادی سے رہنے بسنے کے لیے وسیع میدان اور پوری فراخی اور کشادگی پائے گا۔)

اس کے بعد اس سلسلہ کی آخری آیت یہ ہے "وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا"

اس آیت میں مہاجرین کو ایک بڑی خوشخبری سنائی گئی ہے، اوپر والی آیت میں ان کے لیے دنیاوی خوش انجامی کی ضمانت کا ذکر فرمایا گیا تھا۔ اس آخری آیت میں اُخروی خوش انجامی کی بشارت سنائی گئی ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ ورسول کے لیے ہجرت کرنے والا صاحب ایمان بندہ جب ہجرت کی نیت سے پہلا قدم اٹھاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں مہاجر لکھ لیا جاتا ہے اور آخرت میں مہاجرین کے لیے جس ثواب عظیم اور جن بلند درجات کے وعدے ہیں ان کا مستحق ہو جاتا ہے، منزل تک پہونچنا بلکہ آدھا یا چوتھائی راستہ طے کرنا بلکہ میل دو میل بھی اپنے گھر سے نکل جانا شرط نہیں ہے، اگر بالفرض گھر سے نکلتے ہی وہ مہاجر بندہ کسی حادثہ کا شکار ہو جائے اور اس کی موت واقع ہو جائے تو اس کو آخرت میں وہ سب کچھ ملے گا جس کا مہاجرین کے لیے وعدہ ہے ــــــ مثلاً حدیث شریف میں ہے "اِنَّ الْهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهٗ" (یعنی ہجرت کے عمل کی برکت سے پچھلے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں) تو اس شخص کے بھی سارے گناہ معاف ہو جائیں گے، اسی طرح وہ اللہ تعالیٰ کی ان خاص الخاص رحمتوں اور عنایتوں کا مستحق ہوگا جو مہاجرین کے لیے مخصوص ہیں اگرچہ اللہ کے اس بندے کا دارالکفر ہی میں انتقال ہو گیا ہو اور وہ وہیں دفن کر دیا گیا ہو لیکن ہجرت کی نیت سے پہلا قدم اٹھانے کے بعد وہ اللہ کے یہاں مہاجر لکھ گیا اور قیامت میں وہ مہاجرین ہی کے زمرہ میں اٹھے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایسے بعض واقعات پیش بھی آئے تفسیر معالم التنزیل میں امام بغوی نے نقل فرمایا ہے کہ ایک صاحب جندعؓ ابن ضمرہ تھے۔ یہ مکہ معظمہ میں اسلام قبول کر چکے تھے اور بہت بوڑھے اور ساتھ ہی مریض بھی تھے۔ انھیں کسی طرح سورۂ نساء کی یہ آئتیں پہونچیں تو انھوں نے طے کر لیا کہ میں اب ایک رات بھی مکہ میں نہیں گزاروں گا اور اپنے گھر والوں سے کہا کہ مجھے اٹھا کے کسی بھی طرح یہاں سے لے چلو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ پہونچادو' ان کے گھر والوں کو شاید ان کی حالت پر رحم آیا اور وہ ان کو اسی بیماری کی حالت میں لے کر چل دیے تنعیم مکہ معظمہ سے قریباً دو ڈھائی میل ہے' مکہ معظمہ سے مدینہ طیبہ جانے کے لیے تنعیم ہی کی طرف سے راستہ تھا۔ یہ بڑے میاں تنعیم ہی تک پہونچے تھے کہ وہیں انتقال ہو گیا۔ اسی طرح کے اور بھی بعض واقعات نقل کیے گئے ہیں ـــــ اس آیت کی بشارت کے مطابق ایسے سب لوگ جو اس زمانہ میں ہجرت کے لیے نکلے اور مدینہ طیبہ پہونچنے سے پہلے ہی راستہ میں ان کا انتقال ہو گیا' اللہ کے یہاں مہاجرین میں ہیں۔

ابھی میں نے ذکر کیا تھا کہ ہجرت کی فرضیت کا حکم اس وقت ختم ہو گیا جب مکہ معظمہ پر مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو گیا اور اس کے بعد پورے ملک عرب میں کفر کا زور ٹوٹ گیا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اعلان فرما دیا "لَا هِجْرَةَ بَعْدَ فَتْحِ مَكَّةَ" (مکہ کے فتح ہو جانے کے بعد ہجرت کا حکم نہیں رہا) اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب قیامت تک کبھی اور کسی حال میں بھی ہجرت فرض نہیں ہو گی بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ فتح مکہ سے پہلے جو خاص حالات تھے اور ان حالات کی وجہ سے جو ہجرت کا حکم تھا' ان حالات کے خاتمہ کے ساتھ وہ حکم بھی اٹھا لیا گیا' لیکن اگر دنیا کے کسی حصہ میں وہاں کے رہنے والے مسلمانوں کے لیے کسی وقت ایسے حالات ہو جائیں کہ وہاں اسلامی طریقہ پر زندگی گزارنے کا امکان باقی نہ رہے تو وہاں کے مسلمانوں پر اسی طرح ہجرت فرض ہو گی جس طرح فتح مکہ سے پہلے مکہ وغیرہ میں اسلام قبول کرنے

والوں پر فرض تھی ـــــــ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہمعصر ہیں اور شاہ صاحب ان کو بیہقیؒ وقت فرمایا کرتے تھے، ان کی تفسیر مظہری "قدیم طرز کی تفسیروں میں بہترین تفسیر ہے اور اسی تفسیر سے اُن کے علمی تبحر کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے اپنے مرشد حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے نام نامی پر اپنی تفسیر کا نام تفسیر مظہری رکھا ہے، اسی تفسیر مظہری میں ہجرت سے متعلق سورۂ نساء کی آیت اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِھِمْ الآیۃ کی تفسیر فرماتے ہوئے حضرت قاضی صاحب نے لکھا ہے۔

ان الھجرۃ من دار الکفر علیٰ من قدر علیہا فریضۃ محکمۃ بالاجماع غیر منسوخۃ وھذہ الآیۃ دلیل علیٰ وجوب الھجرۃ من موضع لا یتمکن فیہ اقامۃ شرائع الاسلام	یعنی دار الکفر جہاں اسلامی احکام کے مطابق زندگی گزاری جا سکتی ہو، اس سے ہجرت کرنا فرض ہے، اس پر اجماع ہے، یہ حکم قطعی ہے اور منسوخ نہیں ہوا ہے۔ اور یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ جس ملک اور جس علاقہ میں احکام اسلامی پر نہ چلا جا سکے اور ان کے مطابق زندگی نہ گزاری جا سکے وہاں سے ہجرت کر جانا واجب ہے۔

اب سے قریباً ۵۰ سال پہلے جب روس میں بالشویک حکومت قائم ہوئی تھی تو وہاں کا حال مختلف ذریعوں سے ایسا ہی سنا جاتا تھا، بخارا وغیرہ کے لاکھوں مسلمان اسی لیے اپنے علاقوں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے، ان کی ایک بڑی تعداد ہندوستان بھی آئی تھی، اُن کے بیانات سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہاں کی بالشویکی حکومت میں اسلامی احکام کے مطابق زندگی گزارنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی، اور سب سے زیادہ مستند بیان اس سلسلہ میں مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کے رفیق خاص اور معتمد سکریٹری ظفر حسن ایبک کا ہے، جو اب سے ۴۵ سال پہلے مولانا مرحوم کے ساتھ ہی کابل سے روس گئے تھے اور دو سال تک وہاں رہے اور مولانا ہی کی ہدایت سے وہاں انھوں نے ایک سرکاری کالج میں داخلہ بھی لے لیا تھا، وہ الحمد للہ ابھی حیات ہیں، روس سے وہ ترکی چلے گئے

تھے جہاں مولانا سندھی مرحوم ان سے پہلے پہونچ چکے تھے، پھر مولانا مرحوم تو ترکی سے حجاز چلے گئے اور چند سال وہاں رہ کر غالباً ۱۹۳۹ء میں قریباً ۲۵ سال کی جلاوطنی کے بعد ہندوستان آئے اور چند سال کے بعد سندھ ہی میں انتقال فرما گئے، لیکن اُن کے یہ رفیق خاص اور سکریٹری ظفر حسن ایبک ترکی ہی میں رہ گئے اور وہاں کی شہریت حاصل کر کے فوج میں لے لیے گئے۔ انھوں نے اپنے اور مولانا سندھی مرحوم کے اس پورے مجاہدانہ سفر کی جو دراصل انگریزوں کے خلاف جہاد کے ایک منصوبہ کے تحت ۱۹۱۵ء میں شروع ہوا تھا مفصل سرگزشت "آپ بیتی" کے نام سے لکھی ہے، اس کی دو جلدیں حال میں شائع ہوئی ہیں، پہلی جلد میں انھوں نے اپنی پہلی منزل کابل کے سات سالہ قیام کی سرگزشت لکھی ہے جو بڑی ہی عبرت آموز ہے، دوسری جلد میں روس کے قیام اور پھر وہاں سے ترکی پہونچنے کا ذکر ہے۔ یہ کتاب اس لائق ہے کہ ہر اردو خواں خاص کر ہمارے عربی مدارس کے فضلاء، اور کالجوں کے گریجویٹ اس کو پڑھیں، میں خود اس کتاب سے بہت متاثر ہوا۔

خیر یہ چند جملے تو میں نے ظفر حسن ایبک اور ان کی "آپ بیتی" کے تعارف کے طور پر کہہ دیے، میں بتانا یہ چاہتا تھا کہ ظفر حسن ایبک نے روس میں اپنے زمانۂ قیام کے جو حالات لکھے ہیں، ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بے چارے نماز تک علانیہ نہیں پڑھ سکتے تھے اور کسی طرح چھپ کر پڑھتے تھے تو خطرہ رہتا تھا کہ کوئی جاسوسی نہ ہو جائے ——— مولانا سندھی مرحوم تو روسی حکومت کے سرکاری مہمان تھے، ان کے لیے تو کوئی پابندی نہیں ہو گی، لیکن ظفر حسن جنھوں نے مولانا کی ہدایت سے وہاں کے کالج میں داخلہ لے لیا تھا اور ہوسٹل میں قیام تھا، ان کے لیے اس کا امکان نہیں تھا کہ کھلے طور پر نماز پڑھ سکیں یا کوئی ایسا اسلامی عمل کر سکیں ——— مجھے تحقیق نہیں کہ اب وہاں کے حالات اس لحاظ سے کیسے ہیں، سنا ہے کہ اب وہ پہلے جیسی سختیاں باقی نہیں رہی ہیں، پالیسی کچھ ڈھیلی ہو گئی ہے واللہ اعلم۔

اسی طرح چین کے متعلق بھی یہی معلوم ہوا ہے کہ وہاں اسلامی زندگی گزارنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اب سے چند ہی سال پہلے جب کمیونسٹ چین نے تبت پر قبضہ

کیا تو وہاں کے دیندار مسلمانوں نے بھی یہی محسوس کیا کہ وہ چین کی کمیونسٹ حکومت میں مسلمان رہ کر زندگی نہیں گزار سکیں گے، چناں چہ انھوں نے بھی بخارا کے مسلمانوں کی طرح وطن کو خیرباد کہا اور زیادہ تر تو ہندوستان ہی آئے۔ کئی خاندان تو آپ کے شہر لکھنؤ ہی میں آ بسے تھے، لیکن بعد میں ان سے زیادہ تر حجاز وغیرہ چلے گئے۔ مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ خدا کے ان بندوں نے اپنی اس ہجرت کی وجہ سے بڑی تکلیفیں اٹھائیں، ان میں سے جو حجاز گئے، ان بیچاروں کو بھی بہت مشکل سے اور کئی سال کے بعد وہاں قیام کی قانونی اجازت مل سکی۔

میں نے اس وقت روس اور چین کا ذکر تو صرف مثال کے طور پر کیا ہے ورنہ میں کہہ رہا تھا کہ دین کے دوسرے احکام کی طرح ہجرت کا حکم بھی قیامت تک کے لیے ہے اور جب کبھی کسی ملک کے حالات ایسے ہوں کہ وہاں مسلمان اپنے دینی فرائض بھی ادا نہ کر سکیں اور مسلمانوں والی زندگی نہ گزار سکیں تو ان کے لیے وہاں سے ہجرت کرنا اسی طرح فرض ہو جائے گا جس طرح فتح مکہ سے پہلے مکہ سے ہجرت کرنا فرض تھا۔

ایک سوال اور اس کا جواب :-

اس موقع پر ایک صاحب نے اثناء درس ہی میں سوال کیا کہ ہمارے ملک ہندوستان کے بارے میں موجودہ حالات میں شریعت کا کیا حکم ہے۔ کیا یہاں سے ہجرت فرض نہیں ہے؟

———— مولانا نے فرمایا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہاں کے نظام حکومت سے ہمیں بہت سی شکائتیں ہیں اور ان میں بعض شکائتیں بڑی سنگین قسم کی ہیں اور ہم ان شکائتوں میں بالکل حق بجانب ہیں اور ہم حکومت کو قصوروار سمجھتے ہیں اور ہماری جدوجہد جاری ہے اور جاری رہے گی لیکن خود ہم سے بھی حق و انصاف کا یہ تقاضا ہے کہ ہم اس کو محسوس کریں اور اس کا اعتراف کریں کہ محدود ہی قسم کی جو آزادی خاص کر مذہبی امور کے بارے میں ہمیں یہاں اب تک حاصل ہے، آج کی دنیا کے بہت سے ان ملکوں میں بھی جو مسلمانوں کے ملک کہلاتے ہیں اُس سے زیادہ آزادی حاصل نہیں ہے۔ ابھی چند روز ہوئے ایک ایسے ہی ملک کے ایک عالم دین کا جو نہایت صالح اور دین کے مخلص خادم ہیں اور میرے

اور مولانا علی میاں کے خاص دوستوں میں ہیں' خط آیا تھا اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ آپ کے
ملک میں تو مسلمان مظلوم ہیں اور ہمارے ملک میں بے چارہ اسلام مظلوم ہے
اس سوال جواب کے بعد سلسلۂ درس جاری رکھتے ہوئے مولانا نے فرمایا

اب ہجرت کے سلسلہ میں مجھے صرف ایک بات اور ذکر کرنی ہے۔ اصل ہجرت اور حقیقی ہجرت تو وہی ہے جو کسی ایسے دار الکفر سے جہاں اسلامی زندگی نہ گزاری جا سکتی ہو کسی دوسرے ایسے علاقہ کی طرف کی جائے جہاں اسلامی ماحول ہو اور اسلامی زندگی گزارنے کی آزادی حاصل ہو' سورۂ نساء کی ان آیتوں کا تعلق اسی ہجرت سے ہے اور ظاہر ہے کہ ہمارے سامنے اس کا اس وقت کوئی سوال الحمد اللہ نہیں ہے ــــــ لیکن بعض احادیث سے علماء کرام نے سمجھا ہے کہ کسی بھی اچھے مقصد کے لیے وطن چھوڑ کر نکلنا اور سفر اور پردیس کی تکلیفیں برداشت کرنا یہ بھی ایک طرح کی ہجرت ہی ہے اور ان ہجرتوں کے راستے ہمارے اور آپ کے لیے آج بھی کھلے ہوئے ہیں۔

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ جن کا میں نے ابھی ذکر کیا تھا اور جو بہت بڑے عالم دین محدث اور مفسر ہونے کے ساتھ اپنے وقت کے عارف کامل بھی ہیں۔ انھوں نے ہجرت سے متعلق سورۂ نساء کی ان ہی آیات کی تفسیر سے فارغ ہو کر آخر میں لکھا ہے

قالو کل ھجرۃٍ لطلب علمٍ اَو حجٍّ او جہاد او فرارٍ
الی بلدٍ یزداد فیہ طاعۃً او قناعۃً او زھداً
او ابتغاء رزقٍ طیّبٍ فھی ھجرۃٌ الی اللہ و
رسولہ۔

مطلب یہ ہے کہ علم دین کی طلب میں یا حج کے لیے یا کسی دینی جدوجہد کے لیے وطن چھوڑ کر نکلنا بھی ہجرت الی اللہ و رسولہ میں شامل ہے۔ اسی طرح اپنا وطن چھوڑ کر دوسری کسی ایسی جگہ جانا جہاں رہنے سے طاعت و عبادت میں ترقی ہو اور قناعت اور زھد جیسے ایمانی اخلاق حاصل ہونے کی امید ہو (جیسے طالبین پہلے خانقاہوں

میں مشائخ سے تربیت حاصل کرنے اور تزکیۂ نفس کے لیے جایا کرتے تھے، الغرض اس طرح کے سارے سفر بھی ہجرت میں شامل ہیں اور آخری بات یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حلال روزی کی تلاش میں بھی اپنا گھر چھوڑ کر پردیس جائے اور اس کی نیت یہی ہو کہ وہاں جاکر حلال روزی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا تو فرماتے ہیں کہ یہ بھی ایک درجہ کی ہجرت ہے۔

الغرض کسی بھی ایسے نیک مقصد کے لیے جو اللہ و رسول کو پسند ہو دیس چھوڑ کر پردیس جانا اور سفر کی صعوبتیں اٹھانا "ھجرۃ الی اللہ ورسولہ" کے وسیع مفہوم میں شامل ہے ——— اور یہ ہجرت کی وہ شکلیں ہیں جن کے دروازے ہم سب کے لیے اس وقت بھی کھلے ہوئے ہیں۔ یہ بڑی محرومی کی بات ہے کہ جو نہ ہو سکتا ہو اس کی تو آرزو کریں اور جو ہو سکتا ہے اسے حقیر سمجھیں اور اس سے غفلت برتیں ——— اللہ تعالیٰ ہم سب کو عقل سلیم نصیب فرمائے۔

ہجرت سے متعلق ان آیات کے بعد پورا ایک رکوع سفر کی "نماز قصر" اور حالت جنگ کی "صلوٰۃ خوف" سے متعلق ہے۔ (باقی)

آخری قسط

سراج الہند حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی

مکتوبات، علمی و ادبی تبرکات (۵)

(مرتبہ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

حضرت شاہ صاحب کا عربی کلام

بیاض رشیدی میں، ۲ صفحات پر حضرت شاہ صاحب کا منظوم کلام درج ہے۔ میں نے اس حصۂ نظم میں سے دو نظمیں نقل کرلی تھیں ان نظموں کی فصاحت و بلاغت، سلاست و روانی، سوز و گداز اور کیف و دل آویزی ادب عربی سے ادنیٰ مناسبت رکھنے والے کو بھی محسوس ہو جائے گی۔ الفاظ کی بندش میں ترنم انگیزی اور وجد آفرینی کی کیفیت نمایاں ہے۔ کتنا کچھ کلام ہوگا جو دست برد زمانہ سے ضائع ہوگیا۔ اب جتنا بھی مل جائے غنیمت ہے۔ ترجمہ اشعار کے ساتھ لکھا جائے گا لیکن حق بات یہ ہے کہ اردو میں اس کلام کی پوری کیفیات منتقل کرنے میں کم از کم میں تو کامیاب نہ ہوسکوں گا۔ پہلی نظم عاشقانہ ہے اور مجازی رنگ میں ہے۔ کہیں کہیں حقیقت و معرفت کا رنگ بھی جھلک رہا ہے۔ دوسری نظم کے کچھ اشعار قصیدۂ نعتیہ کی تشبیب اور تمہید کے طور پر ہیں اس کے بعد نعتیہ اشعار ہیں۔ یہ نعتیہ قصیدہ یا تو لکھا ہی ختم ہوگیا اس کے اور اشعار بھی ہوں گے جو بیاض میں شامل نہیں کئے گئے۔

(۱) ایا نسیمَ الشمالِ ذکّر لقصةِ الشوقِ فی حماہٗ فانّ قلبی یذوبُ غمّا وحالُ جسمی کما تراہٗ

اے بادِ شمال تو میرا قصۂ شوق محبوب کی بارگاہ میں سنادے۔ میرا قلب غم سے پگھل رہا ہے اور میرے جسم کا جو حال ہے وہ تجھے نظر آہی رہا ہے۔

(۲) مُبیتُ جفنی بلا منامٍ وماءُ دمعی علی انسجامٍ ونارُ شوقی علی ضرامٍ ولیس لی مُنیة سواہٗ

میری پلکیں بغیر نیند کے رات گذارتی ہیں میرے آنسو چشم تر سے بہہ رہے ہیں میری آتش شوق بھڑک رہی ہے اور میری کوئی آرزو محبوب کے علاوہ نہیں ہے۔

(۳) اغوص بالدمع فی بحارٍ ومہجتی فی خلال نارٍ فکیف اشکوا الی عداہ علیٰ ما قد جنت یداہٗ

آنسوؤں کی کثرت کے باوجود میری جان آگ کے درمیان ہے۔ میں اس جور و ستم کا شکوہ کسی غیر سے کیسے کروں جو اس نے میرے اوپر روا رکھا ہے۔

(۴) اتی رسولی بلا جوابٍ ولا سلامٍ ولا خطابٍ فسار حالی کما بدا لی ولستُ ادری لقرار ما ہو

میرا قاصد بغیر جواب لئے اور اسکی جانب سے سلام و پیام کا تحفہ لئے بغیر واپس آگیا۔ میرا حال خود مجھ پر منکشف ہوا اور مجھے معلوم نہیں کہ قرار کیا ہوتا ہے۔

(۵) سلوہ عنی بایِّ ذنبٍ اباح قتلی وہتک ستری ولیس ذنبی سوی ہواہٗ ومذہبی غیر ان اراہٗ

اس سے دریافت کرو کہ اس نے میرے کس گناہ کی پاداش میں میرا قتل مباح کر دیا اور میرا راز فاش کر دیا۔ میرا گناہ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور اسکے دیدار کے علاوہ میرا کوئی مسلک نہیں۔

(۶) اقوم شوقاً اذا بدت لی کلابُ حیٍّ لہٗ مقامٗ ولو عدوی جری بغیہ لذیذ ذکرہ لثمت فاہٗ

میں کوئے محبوب کے کتوں کو بھی دیکھتا ہوں تو فرط شوق میں کھڑا ہو جاتا ہوں میرا دشمن بھی میرے محبوب کا ذکر شیریں کرے تو میں اس کا منہ چوم لوں۔

فلی غرام لہٗ دوام بلا تمام ولا انصرام و فی فوادی خیال وجہ تنوّر الکون من سناہ

میری شیفتگی دوامی ہے ختم ہونے والی نہیں ہے اور میرے دل میں ایک ایسے چہرے کا خیال ہے جس کی روشنی سے عالم کون و مکاں جگمگا گیا۔

الی متی الصبر فی صیاح و فی بکاء و فی نیاح ولا استماع ولا التفات ولا اعتذار ولا انتباہ

میں کب تک غم میں روتا، چیختا اور چلّاتا رہوں اور دوسری طرف سے استماع، التفات، اعتذار اور انتباہ کا معاملہ بالکل نہ ہو۔

---

(۱) الا یا عاذلی دُم فی ملامی فانّی لا احول عن الغرام

اے ملامت کرنے والے تو خوب ڈٹ کر مجھے ملامت کر لے۔ میں عشق و عاشقی سے باز آنے والا نہیں ہوں۔

(۲) فجفنی ساہرٌ ما دمتُ حیاً و قلبی ہائمٌ والدمعُ ہامِ

جب تک میں زندہ ہوں میری آنکھ انتظارِ دوست میں جاگتی رہے گی۔ میرا قلب حیران اور آنسو جاری رہیں گے۔

(۳) فیا ریح الصبا عطفاً و رفقاً الیٰ ذاک الحمیٰ بلّغ سلامی

اے بادِ صبا نہایت محبت اور نرمی کے ساتھ اس کی بارگاہ میں میرا سلام پہونچا دے۔

(۴) و قل یا اہل ودّی فی ہواکم مضیٰ شہری و ایامی و عامی

اور یہ بھی کہدے کہ اے دوستو تمہارے عشق و فراق میں میرے سال، ماہ اور دن گذر رہے ہیں۔

(۵) و صرت ببعدکم کالعود جسمی علیٰ نار و دمعی فی انسجام

میں تمہاری جدائی کے غم میں سوکھی لکڑی کے مانند ہو گیا ہوں، میرا جسم آتش سوزاں پر ہے اور میری آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں۔

(۶) فان عدتم بوصلی و التیام فاہلاً بالعناق و بالتزام

اگر تم اپنی ملاقات سے شاد کام کرتے ہو تو فبہا۔

(۷) وہاں جرتم تلتی ، فلی غیاث بباب المصطفیٰ خیر الانام

ورنہ اگر تم بدستور سابق میرے اوپر جدائی کا ظلم و جور جاری رکھنا چاہتے ہو تو میں خیر الانام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے باب عالی پر فریاد کروں گا۔

(۸) والیہ توجہی ولہ' استنادی وفیہ مطامعی وبہ اعتصامی

دراصل ان کی ذات عالی میری توجہ کا مرکز ہے اور وہی میرا سہارا ہیں اور انھیں سے مجھے غرض ہے اور انھیں کا دامن میرے ہاتھ میں ہے۔

(۹) ومَن لی بعد ما وہنت عظامی واشتدّ البلاءُ سواک حامی

اے سرکار رسالتمآب میری ہڈیاں جب کہ کمزور ہو گئیں اور مجھ پر سخت بلاؤں کا ہجوم ہے ایسے وقت میں میرا کون حامی ہو سوائے آپ کے۔

(۱۰) فان اکُ ظالماً عظمت ذنوبی فحبّک سیّدی ماحی الآثام

میں نے مانا کہ میں اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہوں اور میرے گناہ بہت بڑھے ہوئے ہیں مگر آپ کی محبت بھی تو گناہوں کو مٹانے والی ہے۔

فقد اعطیتَ ما لم یعط خلقٌ علیک صلوٰۃ ربک بالسلام

حضورؐ! آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ کچھ عطا کیا گیا ہے جو اولین و آخرین میں سے کسی کو نہیں دیا گیا۔ آپ پر (لاکھوں) درود اور (لاکھوں) سلام۔

مکتوب شاہ صاحبؒ بنام مولانا کفایت اللہ[۱] مرادآبادیؒ

مولوی صاحب عالی مراتب مولوی صاحب عالی مراتب مجمع حسنات

---

[۱] مولانا کفایت اللہ حنفی مرادآبادیؒ۔ ایک جید نعت گو عالم تھے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مجمع حسنات و مناقب مہربان فقراء
سلمہ اللہ تعالیٰ ـــــ وافاض علیکم
برکاتہا، بعد السلام والتحیۃ والادعیۃ
الصافیۃ الزکیہ مکشوف خاطر صفا
ذخائر باد کہ عنایت نامہ بہجت
شمامہ پس از وقوع فترات طویلہ
کہ اسباب آنہا را خود در رقیمہ کریمہ
تحریر فرمودہ اند وازیں طرف
نیز ہماں اسباب بعینہا صورت

مناقب مہربانِ فقراء ـــــ اللہ تعالیٰ
تم کو سلامت رکھے اور تم پر پے در پے
برکات نازل فرمائے۔ بعد سلام
وتحیۃ اور بعد دعائے مخلصانہ
واضح ہو کہ عنایت نامہ بہجت
شمامہ بڑی مدت کے بعد پہونچا۔
تاخیر تحریر کے جو اسباب تم نے
اپنے خط میں تحریر کئے ہیں۔ اس
طرف بھی بالکل ایسے ہی اسباب

(بقیہ حاشیہ ۴۷) نسیم خلد (شرح منظوم شمائل ترمذی) اور نسیم جنت (منظوم در فضیلت درود شریف) نیز ایک دیوان نعتیہ اور چند رسائل مدح رسولؐ اور ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اردو زبان کے اندر ان کی تصنیفات میں سے ہیں سنہ ۱۲۰۳ھ میں وفات پائی۔

(نزہۃ الخواطر جلد ہفتم بحوالہ مہر جہاں تاب) عام طور پر یہ مولانا کفایت علی کے نام سے مشہور ہیں کافی تخلص تھا ۱۸۵۸ء مطابق ۱۲۷۴ھ میں انگریز نے بغاوت کے جرم میں ان کو پھانسی دی ـــ تفصیلی حالات باوجود تفتیش کے معلوم نہ ہوسکے ـــ یہ مکتوب احقر نے مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی مرحوم کے ذخیرہ مخطوطات میں رکھے ہوئے ایک کاغذ سے نقل کر لیا تھا ـــ اس مکتوب کو بعض اور کتب خانوں میں بھی مجموعہ افادات شاہ عبد العزیزؒ میں دیکھ چکا ہوں۔ بیاض رشیدی کے مندرجات ختم کرنے کے بعد میں نے مناسب سمجھا کہ اس کو بھی یہاں تبرکات عزیزیہ میں شامل کر دوں ـــ ابھی تھوڑا سا یہ خلجان ہے کہ مولانا کفایت اللہ اور مولانا کفایت علی کافی مرادآبادی کہیں علیحدہ علیحدہ دو شخصیتیں تو نہیں ـــ ؟ اگرچہ صاحب نزہۃ الخواطر نے مہر جہاں تاب کے حوالے سے جو تحریر فرمایا ہے اس سے دونوں نام ایک ہی شخصیت کے معلوم ہوتے ہیں۔

تحقق گرفتہ۔ وصولِ عزت شمول نمود — بدریافت نویدِ عافیت کسبِ جمعیت کردہ — حق تعالےٰ مدام مشمولِ عافیت و انعامِ خود دارد بالنبی و آلہ الامجاد —

تحریرِ احوالِ مزاجِ فسادِ امتزاج و تزایدِ اعراض و استحکامِ امراض از انجا کہ مورثِ ملالِ خاطرِ محبّاں و مشفقاں است قلم انداز ساختہ عنانِ ادہمِ قلم بصوبِ مقصودِ اصلی معطوف می نماید۔ مہربانِ من وقتِ رویتِ ہلالِ شعبان تراکمِ ابرِ سخت و غلیظ رو دادہ بود لہٰذا بست و نہم رجب اتفاقِ رویتِ ہلالِ شعبان در شامِ آں روز علی العموم ممکن نشد۔ تا ششم شعبان بحسابِ آنکہ ماہِ رجب سلخ داراست، عدِّ تاریخ نمودند۔ مِن بعد بحضورِ بادشاہ ثابت شد کہ غرّہ شعبان روزِ پنجشنبہ بود یعنی ماہِ رجب بست و نہ روز شد بار سلخ نداشت — چنانچہ رسومِ شبِ برات روزِ چہارشنبہ در تمام شہر اتفاق افتاد — فقیر ہم

تم دو مانع تحریر بندہ ہے۔ عافیت کی خوشخبری پاکر اطمینان ہوا۔ حق تعالیٰ ہمیشہ تم کو عافیت سے رکھے اور اپنے انعامات سے نوازے بطفیل حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم و آل و اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

اب میں اپنے ناساز مزاج کے احوال اور زیادتی و استحکامِ امراض کے حالات اس بنا پر قلم انداز کرتے ہوئے کہ ان کو پڑھ کر سوائے اس کے کہ دوستوں کے قلب کو صدمہ ہو اور کچھ حاصل نہیں، اسپِ قلم کی لگام کو مقصدِ اصلی کی طرف موڑتا ہوں۔ مہربان من! رویت ہلال شعبان کے وقت یہاں (دہلی میں) ابر غلیظ محیط تھا ۲۹ رجب کو شام کے وقت رویت ہلال کا ہونا علی العموم ممکن نہ ہوا۔ ۶ شعبان تک اس حساب سے کہ ماہ رجب پورے تیس دن کا ہوا ہے تاریخ کا شمار کیا گیا۔ اس کے بعد بادشاہ کے سامنے یہ ثابت ہوگئی کہ رجب کا مہینہ ۲۹ دن کا تھا چنانچہ شب برات تمام شہر میں بدھ کے دن کی گئی —

فقیر نے بھی مزید تحقیق کے لیے ایک شخص کو اللہ بندہ کفش دوز

بنا بر مزید تحقیق، شخصے را نزد الله بندہ
نام کفش دوز ذکہ، بحضور بادشاہ
شہادتِ او گزشتہ بود فرستاد
۔ اوا قرار کرد کہ من بچشم خود،
ہلالِ شعبان را بشام چہارشنبہ
دیدہ بودم ۔ و مقارنِ ایں حال
شخصے دیگر ملا فنہ زادہ سکندر آباد
نیز بحضور برادرِ عزیز مولوی رفیع الدین
ہمیں نوع اقرار کرد و نصابِ
شہادت بکمال پذیرفت آما ہلالِ
رمضان پس شام جمعہ کشوف و
ظاہر و نمودار گشت و کسانیکہ غرّۂ
شعبان روز پنجشنبہ می گفتند حمل
بر تمامیٔ شہر نمودند یعنی سی روز
کامل بر آمد ۔ و کسانیکہ غرّۂ شعبان
روز جمعہ قرار دادہ بودند موافقاً
لتقادیم، ماہ شعبان را ناقص العدد
اعتبار کردہ اند ۔ غرضکہ پردۂ
ہر دو فریق فرد ہشتہ ماند و خطاءِ
کسے متعین نشد ۔ چوں بیشتر
کار ہمیں ماہ بود و دریں ہلال ارتفاع
شبہ مطلقاً بعد دیگر حاجت تفتیشِ
حالِ شعبان فضول نمود ۔

پاس بھیجا جس کی شہادت بحضور بادشاہ
گزری تھی، اس نے اقرار کیا کہ میں
نے بچشم خود ہلالِ شعبان بدھ کا دن
گزار کر شام کو دیکھا تھا ۔ اسی
زمانہ میں ایک شخص سکندر آباد سے
وارد ہوا اس نے برادرِ عزیز
مولوی رفیع الدین کے سامنے یہی
اقرار کیا (کہ میں نے بدھ کی
شام کو شعبان کا چاند دیکھا ہے)
اس طرح نصابِ شہادت کامل ہو گیا۔
بہر حال ہلالِ رمضان شام جمعہ کو
نمودار ہوا ۔ جو لوگ غرّۂ شعبان
بروز پنجشنبہ کہتے تھے انھوں نے
شعبان کو تیس دن پر محمول
کیا، اور جو لوگ جنتریوں کی
موافقت میں غرّۂ شعبان روز جمعہ
کو قرار دیتے تھے انھوں نے ماہ
شعبان کو ناقص العدد (یعنی ۲۹ دن
کا اعتبار کیا ۔ غرضکہ ہر دو فریق کا
پردہ ڈھکا رہا اور کسی کی خطا متعین
نہیں ہوئی ۔ چونکہ زیادہ کام اسی
ماہ (رمضان) سے تھا اور اسکے ہلال
میں شبہ مطلقاً اٹھ گیا تھا اس لیے

اما جواب مسئلہ مرقوم پس بالفعل فتویٰ
برین روایت است کہ رویت ہر بلد بر
مردم دیگر بلد لازم است، ہر گاہ خبر
رسد قضا نمایند — در فتاویٰ عالمگیری
می نویسند ولا عبرة لاختلاف
المطالع فی ظاهر الروایة
کذا فی فتاویٰ قاضی خان
وعلیہ الفتویٰ..... وبہ
کان یفتی شمس الائمة الحلوائی
قال لو رای اهلُ مغربٍ هلالَ
رمضان یجب الصومُ علی اهلِ
مشرق کذا فی الخلاصة
——— بعضے فقہاء حنفیہ ہم
موافقاً للشافعیہ اختلاف مطالع
را اعتبار کردہ اند و گفتہ کہ اگر
اہلِ دہلی ہلالِ رمضان را بہ بینند
و بآں حساب روزہ گیرند اہلِ
مرادآباد و رامپور را کہ ہلال ندیدہ
باشند بآں حساب روزہ گرفتن لازم
نیست بلکہ ایشاں را رویتِ خود
کافیست — لیکن ایں قدر ملاحظہ
(بایدہ) داشت کہ بلد مقدم الرویت
جانب مغرب باشد و بلد متاخر الرویت

حال شعبان کی مزید تحقیقات کرتی فضول
سمجھی گئی — (۲) جواب مسئلہ مرقومہ کا
پس اس کا مدار اس روایت پر ہے کہ
رویت ہر شہر کی دوسرے شہر والوں پر
لازم ہوتی ہو ..... فتاویٰ عالمگیری
میں ہے "اختلاف مطالع کا کوئی
اعتبار نہیں جیسا کہ فتاویٰ قاضی خاں
میں ہے .....اور اسی پر فتویٰ ہے.
شمس الائمہ حلوائی بھی یہی فتویٰ دیا
کرتے تھے — ان کا قول ہو کہ
اگر اہلِ مغرب رمضان کا چاند دیکھ
لیں تو اہلِ مشرق پر روزہ واجب
ہو جاتا ہے، جیسا کہ خلاصہ میں مرقوم
ہو" بعضے فقہاء حنفیہ نے شافعیہ کی موافقت
میں اختلاف مطالع کا اعتبار کیا ہو.
اور کہا ہے کہ اگر مثلاً اہلِ دہلی رمضان
کا چاند دیکھ لیں اور اس حساب سے
روزہ رکھیں تو اہلِ مرادآباد اور
اہلِ رامپور کو (جو مشرق میں ہیں) جنہوں
نے چاند نہیں دیکھا اس حساب سے
روزہ رکھنا لازم نہیں بلکہ ان کو اپنی
رویت کافی ہے — یہ بات ملحوظ
رکھنا چاہیے کہ وہ شہر جس میں رویت

جانبِ مشرق باشد........
.... زیرا کہ ہلال
جانب مغرب است پس ایں معنیٰ
ممکن نیست کہ مغربیاں نہ بینند و
مشرقیاں مشاہدہ نمایند دوم آنکہ
فاصلہ درمیان بلد مغربی و بلد مشرقی
بقدر تفاوت...... باشد تا تفاوتِ
اُفق بہم رسد و بدونِ ایں شرط
اختلافِ بلدان را اعتبار نیست و
قُریٰ و قصبات ہر شہر بالاجماع
تابع آں شہر اند..... صحیفۂ شریفہ
مولوی رعایت علی خاں بنام
نامی آں مہربان ورود یابد از
طرف فقیر ہم بکمالِ اخلاصِ دلی
سلام و دعا باید آورد والسلام علیکم۔

پہلے ہوئی ہے جانب مغرب میں ہو اور
وہ شہر جس میں رویت بعد کو ہوئی ہو
جانب مشرق میں ہو ۔۔ اس لیے کہ
ہلال جانب مغرب میں ہوتا ہے لہٰذا یہ
نہیں ہو سکتا کہ مغرب والے نہ دیکھیں
اور مشرق والے دیکھ لیں، دوسرے
یہ کہ فاصلہ بلادِ مغربی اور بلادِ مشرقی
کے درمیان بقدر (پڑھنے میں
نہیں آیا) ہو کہ تفاوتِ اُفق ثابت ہو سکے
بغیر اس شرط کے اختلافِ بلاد کا اعتبار
نہیں...... مولوی رعایت علی
خاں کا خط تمہارے پاس آتا ہے
فقیر کی طرف سے بھی ان کو بکمالِ
اخلاصِ دلی سلام و دُعا لکھ دینا۔
والسلام علیکم۔

اختلاف مطالع

رویتِ ہلال کے سلسلے میں اختلافِ مطالع کا مسئلہ ایک اہم اور قابلِ غور مسئلہ ہے ۔۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس مسئلے پر اپنے مکتوب گرامی کے اندر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی ہے ۔۔ اس مکتوب کا ایک جملہ پڑھا نہیں گیا۔ اور دو ایک جملے قصداً حذف کر دیے تاکہ ناظرین کو اصل مسئلہ سمجھنے میں دقت نہ ہو ۔۔ حضرت مولانا عبد الحئی فرنگی محلیؒ نے اس مسئلہ پر اپنے فتاویٰ میں کئی جگہ تفصیلی بحث کی ہے۔ ملاحظہ ہو مجموعہ فتاویٰ عبد الحئی جلد اول ص ۲۶۶ تا ۲۶۸ و ص ۲۷۳ ۔۔ مولانا فرنگی محلیؒ کے ایک جواب کا کچھ حصہ فارسی سے اردو میں ترجمہ کر کے یہاں پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

"اختلافِ مطالع کے بارے میں فقہاء حنفیہ چند اقوال پر مختلف ہیں۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اختلافِ مطالع معتبر ہے اور ایک شہر کی رویت کا اعتبار دوسرے شہر میں نہیں ہوتا بلکہ ہر شہر کی رویت اسی شہر کے لیے معتبر ہے اور اکثر مشائخ حنفیہ کے نزدیک ظاہر روایت کی رو سے اختلافِ مطالع کا مطلقاً اعتبار نہیں ہے پس ایک شہر کی رویت دوسرے شہر کی لیا گرچہ دونوں کے درمیان فاصلہ کثیر ہی کیوں نہ ہو ــــ معتبر ہوگی ــــ بشرطیکہ ثبوتِ شرعی بہم پہونچ جائے۔ لیکن محققین حنفیہ کے ایک گروہ کا یہ قول ہے کہ وہ دو شہر جو بحسب قواعد علم ہیئت اختلاف مطالع رکھتے ہیں یعنی ایک ماہ کی (پیدل) مسافت رکھتے ہیں اُن میں ایک جگہ کی رویت دوسری جگہ کے لیے معتبر نہ ہوگی۔ اس سے کم فاصلے میں معتبر ہوگی" (مجموعہ فتاویٰ عبد الحیٰ جلد اول ص۲۷۶)

مجموعۂ فتاویٰ مفتی محمد سہول بھاگلپوری (قلمی) میں ایک فتویٰ حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی کا اختلاف مطالع کے سلسلے میں درج ہے اس میں اکثر مشائخ حنفیہ کے اُس قول کو جو ظاہر روایت کے پیش نظر ہے مدلل طریقے سے قوت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ مولانا ناظر حسن دیوبندیؒ اور مفتی محمد سہول صاحب بھاگلپوریؒ کی اس فتویٰ پر تائید و تصویب ہے۔

مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ نے اپنے رسالے "دید ہلال رمضان وعید" میں دورِ حاضر کے شبہات و اعتراضات کو پیش نظر رکھتے ہوئے عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ ص۲۶ سے ص۵۵ تک اس مسئلے پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور آخر میں حضرت مولانا فرنگی محلیؒ کے اُس فتویٰ کا حوالہ دیتے ہوئے (جو اوپر نقل کیا گیا ہے) ــــ اور علامہ زیلعیؒ شارح کنز کا قول نقل کرتے ہوئے جس میں ممالک بعیدہ اور فاصلۂ کثیر کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ محدث کشمیریؒ کا یہ قول درج کیا ہے "واقعہ یہ ہے کہ علامہ زیلعیؒ کا قول ہی تسلیم کرنا ضروری ہے اس کے بغیر چارہ نہیں ہے۔"

مکتوب گرامی بنام سید امیر حیدر حسینی بلگرامیؒ

[دربارۂ امتیاز و اختصاص حجۃ اللہ البالغہ]

کتاب الحجۃ اللہ البالغۃ التی ھی عمدۃ تصانیف بقیۃ المحدثین حجۃ اللہ البالغہ بقیۃ المحدثین شاہ ولی اللہ دہلوی کی علم اسرار حدیث میں ایک

الشاہ ولی اللہ الدھلوی فی علم اسرار الشرائع
ولم یتکلم فی ھذا العلم احدٌ قبلہ علیٰ ھذا
الوجہ من تاصیلِ الاصول وتفریع الفروع
وتمھید المقدمات والمبادی واستنتاج
المقاصد منھا الی المجلس والنادی
وانما یستشم نفحاتٌ قلیلۃٌ من ھذا
العلم فی کتاب الاحیاء للغزالیؒ وکتاب
القواعد الکبریٰ للشیخ عزالدین عبدالسلام
المقدسی وربّما یوجد بعض فوائد ھذا العلم
فی مواضع من الفتوحات المکیّۃ للشیخ
الاکبرؒ والکبریت الاحمر للشیخ ابن عربی و
کذا فی مولفات تلمیذہ الشیخ الکبیر
صدرالدین القونوی قدس اللہ سرھما
وقد جمعھا الشیخ عبدالوھاب الشعرانیؒ
فی کتاب المیزان ع۵ـ

بہترین تصنیف ہے، اس علم کا انداز آپ سے
پہلے کسی نے اس انداز سے کلام نہیں کیا۔
اس کتاب میں تاصیل اصول، تفریع فروع،
تمہید مقدمات و مبادی اور پھر مقاصد کا
استنتاج و استخراج سب کچھ پایا جاتا ہے
اس علم کی کچھ خوشبو امام غزالیؒ کی احیاء
العلوم میں اور شیخ عزّ الدین عبدالسلام
مقدسی کی کتاب قواعد کبریٰ میں پائی
جاتی ہے۔ علم اسرار حدیث کے کچھ فوائد
شیخ اکبرؒ کی فتوحات مکیہ اور کبریت احمر
میں نیز شیخ اکبرؒ کے شاگرد شیخ کبیر ـــ
صدرالدین قونوی قدس اللہ سرہما کی
تالیفات میں چند مواضع میں پائے جاتے
ہیں جن کو شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ نے
کتاب المیزان میں جمع کر دیا ہے۔

ع۵ یہ مکتوب گرامی کتاب حجۃ اللہ البالغہ قلمی (کتب خانہ دارالعلوم دیوبند) نمبر ۵۷ ہ کے اول ورق
پر درج ہے وہیں سے نقل کیا گیا ہے۔ مکتوب کے آخر میں یہ عبارت ہے۔ جو غالباً مکتوب الیہ کے
قلم کی لکھی ہوئی ہے۔ ہذا ما کتبہ مولانا شاہ عبدالعزیز ابن الشاہ ولی اللہؒ للعبد الاحقر امیر حیدر حسینی
بلگرامی فی صحیفۃٍ محرّرۃٍ فی الحادی والعشرین من ذی القعدہ سنہ ۱۲۱۲ھ ـــ یعنی یہ مکتوب حضرت شاہ
عبدالعزیزؒ کا بعبد احقر امیر حیدر حسینی بلگرامی کے نام ہے جو ۲۱ ذی قعدہ ۱۲۱۳ھ کو تحریر فرمایا گیا ہے
نزہۃ الخواطر جلد ہفتم میں مکتوب الیہ کا تذکرہ درج ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔ المفتی امیر حیدر بن نور الحسنین
بن غلام علی الحسینی الواسطی البلگرامیؒ ـــ مشہور علماء میں سے ہیں۔ ۱۱۶۵ھ میں پیدا ہوئے۔
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مقالے سے متعلق چند ضروری باتیں

(۱) مقالے کی پہلی قسط میں سرّ الشہادتین کے متعلق غلطی سے تصنیفِ شاہ صاحبؒ ہونے میں شبہ ظاہر کیا گیا ہے، بعد میں یہ تحقیق ہوا کہ یہ کتاب حضرت شاہ صاحب ہی کی ہے، بڑا ثبوت یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگردِ رشید مولانا سلامت اللہ کشفی بدایونی ثم کانپوریؒ نے اپنے استاد کی تصنیف کی حیثیت سے اس کی شرح تحریر الشہادتین لکھی ہے جو شائع ہو چکی ہے۔

(۲) تصانیفِ شاہ صاحبؒ کے ضمن میں اسولہ و اجوبہ مرتبہ حاجی رفیع الدین مراد آبادیؒ کا ذکر آیا ہے — اس حیثیت سے کہ یہ شاہ صاحبؒ کے جوابات ہیں اس کو ان کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہو۔ یہ کتاب کئی کتب خانوں میں موجود ہے، اور اس میں دیگر فتاویٰ، مکتوبات وغیرہ بھی شامل کر لیے گئے ہیں — اب چاہے اس کو اسولہ و اجوبہ کہہ لیجئے یا افاداتِ عزیزیہ — بلکہ میرا خیال ہے کہ فتاویٰ عبد العزیز کو اسی قسم کے مجموعوں سے مرتب کیا گیا ہے — ایک صاحب نے معارف میں ایک مضمون کے ضمن میں یہ انکشاف کیا ہے کہ میں نے اس کتاب کا نام اسولہ و اجوبہ بتانے میں غلطی کی ہے اس کا اصل نام افاداتِ عزیزیہ ہے — اس کے جواب میں اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ انوار العارفین مولفہ صوفی محمد حسین مراد آبادیؒ میں ذکرِ حاجی رفیع الدینؒ کرتے ہوئے اس کتاب کا نام اسولہ و اجوبہ ہی لکھا ہے۔ بعد میں خود حاجی صاحب نے یا ان کے بعد والوں نے اس میں اضافے کئے، تو اس کا نام افاداتِ عزیزیہ پڑ گیا ہوگا —

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ

بعض کتب درسیہ اپنے وطن میں سید محمدؒ بن عبد الجلیل بلگرامیؒ سے پھر اپنے دادا علامہ غلام علی آزاد بلگرامیؒ کے پاس اورنگ آباد پہونچ کر اور ان کے زیر تربیت رہ کر تمام کتب درسیہ شیخ نور الہدیٰ بن قمر الدین حسینی اورنگ آبادیؒ سے پڑھیں۔ فنِ طب کی تحصیل حکیم عبد السلام برہان پوری سے کی۔ بعدہٗ کلکتہ چلے گئے وہاں منصبِ افتاء پر سولہ برس تک فائز رہے۔ پھر اپنے وطن بلگرام کا اشتیاق ہوا تو اثنائے سفر میں مرشد آباد پہونچ کر انتقال فرمایا۔ سنِ انتقال ۱۲۱۸ھ ہے۔ آپ کی چند تصنیفات بھی ہیں۔

غرضکہ افادات عزیزیہ نام کی نہ حاجی رفیع الدین مراد آبادی کی کوئی کتاب ہے اور نہ حضرت شاہ صاحبؒ کی کوئی مستقل تصنیف ہے۔

(۳) بیاضِ رشیدی میں ایک مکتوب حضرت شاہ اہل اللہؒ کا وہ ہے جس کو آثار الصنادید میں غلطی سے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔

سر سید احمد خاں مرحوم نے اس مکتوب کے درج کرنے سے پہلے لکھا ہے۔

"اگرچہ وہ نثر عربی جس کو آپ نے (شاہ عبدالعزیزؒ نے) دل لگا کر لکھا ہو راقم کو دستیاب نہیں ہوئی مگر دو چار رقعے جو آپ نے قلم برداشتہ نہایت سرسری طور پر لکھ دیئے تھے ہاتھ لگے ان میں سے ایک رقعہ تیمناً لکھ دیتا ہوں الخ"

(آثار الصنادید صفحہ ۵۲۰ و ۵۲۱ جدید ایڈیشن باہتمام سنٹرل بک ڈپو اردو بازار دہلی)

اس کے بعد حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا سمجھ کر وہ مکتوب یا رقعہ درج ہے جو بیاضِ رشیدی کی رو سے حضرت شاہ اہل اللہؒ کا ہے۔

(۴) بیاضِ رشیدی کے مندرجات میں کئی تحریریں وہ ہیں جو فتاویٰ عبدالعزیز (مطبوعہ) میں بھی ہیں۔ مطبوعہ فتاویٰ میں سائلین کے نام درج نہیں ہیں جو شاید قصداً ایسا کیا ہے۔ بہتر یہی تھا کہ سوال کے ساتھ ساتھ مستفتی کا نام بھی درج کیا جاتا۔

حضرت شاہ صاحبؒ سے سوال کرنے والے بعض بہت ہی اہم شخصیت رکھتے ہیں، میں یہاں چند ناموں کی نشان دہی کرتا ہوں۔

(الف) فتاویٰ جلد دوم صفحہ ۳۶ و ۳۹ پر ایک تحقیق بالعیلون محیط کی قرأت سے متعلق درج ہے جو ایک اہم اور معرکۃ الآرا تحقیق ہے مگر مطبوعہ فتاویٰ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ سوال کس نے کیا تھا۔ بیاضِ رشیدی سے معلوم ہوا کہ قاضی محمد اعلیٰ تھانویؒ مؤلف کشاف اصطلاحات الفنون نے یہ سوال کیا تھا۔

(ب) فتاویٰ جلد دوم صفحہ ۱۲۲ پر وضع میزان در محشر سے متعلق ایک تحقیق ہے۔ بیاضِ رشیدی سے معلوم ہوا کہ حاجی رفیع الدین مراد آبادیؒ کے سوال کے جواب میں یہ تحقیق ہے۔

(ج) فتاویٰ جلد دوم صفحہ ۱۲۳ پر حکم آراضی مددمعاش تحریر ہے۔ بیاضِ رشیدی کی رو سے اس سوال کو قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے لکھ کر بھیجا تھا اس کے جواب میں ارقام فرمایا گیا ہے۔

(د) فتاویٰ جلد دوم صفحہ ۔۔ پر مدت غلافت سے متعلق ایک تحقیق ہے۔ بیاضِ رشیدی سے معلوم ہوا کہ یہ تحقیق بھی قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کے جواب میں تحریر فرمائی گئی ہے۔

موجودہ قیمت 3/75

Regd. No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow

VOL. 36 NO. 5 AUGUST 1968

صرف ٹائیل پرنٹرس اینڈ پرنٹرس قطب الدین روڈ، لکھنؤ، ۳۔ میں چھپا۔

[جمادی الثانی ۱۳۸۸ھ]

SEPTEMBER 1968

مرتبہ

عتیق الرحمٰن سنبھلی

موجودہ قیمت 5-00

لکھنؤ

الفرقان

ماہنامہ

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک سے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

سالانہ چندہ
ہندستان سے...... ۵۰/۷
پاکستان سے...... ۵۰/۷
ششماہی
ہندستان سے...... ۴/-
پاکستان سے...... ۴/-

فی کاپی ..... ۷۰ پیسے

جلد ۳۶ | بابتہ ماہ جمادی الآخرہ ۱۳۸۸ھ مطابق ستمبر ۱۹۶۸ء | شمارہ (۶)

نمبر شمار	مضامین	مضامین نگار	صفحہ
۱	نگاہِ اوّلیں	محمد منظور نعمانی	۲
۲	معارف الحدیث	؍	۵
۳	یک دو ساعت صحبتے با اہلِ دل	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	۲۱
۴	انسانی قانون اور اسلامی قانون	مولانا امین احسن اصلاحی	۳۱
۵	اسلامی تاریخ کا ایک بہروپیا	ڈاکٹر خورشید احمد فارق	۳۶
۶	حالتِ سفر اور میدان جنگ میں نماز (درس قرآن)	محمد منظور نعمانی	۴۴

اگر اس دائرہ میں سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی اطلاع ۱۰ ستمبر تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی، پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دیدیں، نئے خریدار بھی اسی طریقہ سے چندہ ارسال فرمائیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۱۵ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، انکی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیئے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولانا) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

محمد منظور نعمانی

مشہور حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــــ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ تم مسلمان دوسری قوموں کے لیے لقمۂ تر اور نعمتِ یغما بن جاؤگے... عرض کیا گیا کہ کیا اسوقت ہم دنیا میں بہت تھوڑے رہ جائیں گے، اور قلتِ تعداد کی وجہ سے ہمارا یہ حال ہوگا؟ ـــــ آپ نے فرمایا، نہیں اُس وقت تم دنیا میں بہت بڑی تعداد میں ہوگے لیکن سیلاب کے کوڑے کرکٹ کی طرح بالکل بے وزن اور بے جان ہوگے، تمہارے دشمنوں کے دل سے اللہ تمہارا رعب اور تمہاری ہیبت نکال دے گا اور تمہارے دلوں میں وہن آجائے گا' ـــــ کسی نے عرض کیا کہ حضرت وہن کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے فرمایا "حُبُّ الدُّنْیَا وَکَرَاہِیَۃُ الْمَوْتِ" یعنی دنیا کی محبت اور موت کی ناخوشگواری۔

صادقِ مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے مستقبل بعید کے بارہ میں یہ خبر اُسوقت دی تھی جب مسلمان اپنی قوت ایمانی، تعلق مع اللہ، اور دنیا کے مقابلہ میں آخرت کی ترجیح کی وجہ سے ناقابل تسخیر طاقت بنے ہوئے تھے اور ان میں سے ایک ایک ہزاروں پر بھاری ہوتا تھا ـــــ کسقدر بعید از قیاس تھی اُس وقت یہ بات کہ یہی مسلمان کسی دن دنیا کی میزان میں اتنے بے وزن، ایسے بے جان اور دشمنوں کے لئے ایسا نرم چارہ بن جائیں گے جن کا نگلنا اُن کے لئے اتنا آسان ہوگا۔

لیکن آج ہم آپ سب ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس انتباہی اطلاع اور پیشینگوئی کو اپنی کھلی آنکھوں واقعہ کی شکل میں دیکھ رہے ہیں ـــــ پچھلے سال جون میں اسرائیل اور عربوں کے تصادم میں جو کچھ سامنے آیا وہ بین الاقوامی سطح پر اس کی آخری عبرتناک مثال تھی، اور ہم ہندوستانی مسلمان مقامی طور پر آئے دن اُن مسلم کش حملوں میں اس کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں جن کا اخباری عنوان "فرقہ وارانہ فسادات" تجویز کر لیا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انتباہی انداز میں اور ہوشیار اور خبردار کرنے ہی کے

لئے مسلمانوں کی ذلت ونکبت کی یہ خبر سنائی تھی تو ساتھ ہی یہ بھی واضح فرما دیا تھا کہ اس انتہائی گراوٹ وپستی اور ناطاقتی ودرماندگی کا سبب نہ اُن کی تعداد کی قلت ہوگی اور نہ کوئی اور اس قسم کی مادّی پسماندگی، بلکہ اسکی بنیاد بس دلوں کی یہ تبدیلی ہوگی کہ دنیا اور اُس کے عیش وعشرت کی محبت اور اُس سے وابستگی بڑھ جائے گی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مرنے کو جی بالکل نہ چاہے گا شوقِ شہادت سے بھی دل خالی ہوجائیں گے ۔

اگر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تشخیص پر اُس طرح یقین کریں جس طرح ایک سچے مومن کو کرنا چاہیئے تو قدرتی طور پر اس صورت حال کو بدلنے کے سلسلے میں ہماری سب سے بڑی فکر اور جدوجہد کا خاص الخاص ہدف یہ ہونا چاہیئے کہ دلوں سے دنیا کی وہ محبت نکلے جس نے واقعہ یہ ہو کہ خدا اور رسول کی محبت اور شوقِ جنت کی جگہ لے لی ہے اور پھر موت خاص کر شہادت کی موت صرف عقیدہ کے طور پر نہیں بلکہ ذوقی طور پر ہمارے لئے مرغوب اور محبوب ہو جائے ـــــ لیکن عرب پر بھی نظر ڈال لیجئے اور عجم پر بھی، سب سے پہلے اُس طبقہ کو دیکھئے جس کے ہاتھ پر قریباً سب ہی جگہ قوم کی قیادت کی باگ ہے اور جو ملت کی کشتی کا ناخدا بنا ہوا ہے ۔ کیا اُس کے سامنے کسی درجہ میں بھی مسئلہ کا یہ پہلو ہے؟ کون نہیں جانتا کہ اُن میں بہت سے تو اس حال میں ہیں کہ اگر اُن کے سامنے یہ بات کہی جائے تو وہ سکون وسنجیدگی سے اس کو سن بھی نہ سکیں گے اور اس "ملایانہ بیوقوفی" پر اپنے غصہ کو ضبط کرنا بھی اُن کے لئے مشکل ہوگا ـــــ اچھا ان بیچاروں کو چھوڑیئے، اس طبقہ میں تو زیادہ تر وہی ہیں جنھیں ان ایمانی حقائق سے آشنا ہونے کا کبھی موقع ہی نہیں ملا، انھوں نے جو کچھ سیکھا ہے مادہ پرست مغرب ہی سے سیکھا ہے ۔ لیکن ان میدانوں میں کام کرنے والے دین کے واقفین و حاملین بلکہ اُس کے نامور داعیوں تک میں بھی بڑی تعداد آپکو ایسے ہی حضرات کی ملے گی جو اگر خود دیانتداری سے اپنا اور اپنے طرزِ فکر کا جائزہ اس نقطۂ نظر سے لیں گے تو یقیناً محسوس کریں گے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس اہم بنیادی تشخیص کو سامنے رکھ کر اپنا لائحہ عمل اور راستہ طے نہیں کیا ہے بلکہ اس دور کی عام مادہ پرستانہ فضا میں جس طرح سوچنے والے عام طور سے سوچتے ہیں اُسی طریقہ پر اور اُسی کی روشنی میں انھوں نے بھی سوچا ہے ـــــ کاش وہ اپنے اُس

علم کو راہنما بنا کر سوچیں جس کو وہ میراث نبوت کہتے ہیں تو یقیناً ان کے غور و فکر اور ان کی جد و جہد کا راستہ دوسرا ہوگا ــــــ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ۔

ناظرین کرام کو رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی کی والدۂ ماجدہ کے سانحۂ وفات کی اطلاع اخبارات سے ہو چکی ہوگی۔ توالد و تناسل کے عام قانون کے تحت کسی کا اس دنیا میں آنا اور موت کے راستہ یہاں سے چلا جانا کوئی عجیب اور اہم واقعہ نہیں، روزانہ لاکھوں ہی یہاں سے آتے اور یہاں سے جاتے ہیں، لیکن اللہ کے بعض بندوں اور بندیوں کی زندگیاں غیر معمولی ہوتی ہیں اس لئے ان کا دنیا سے جانا بھی غیر معمولی قسم کا حادثہ ہوتا ہے اور قرآن مجید کے ایک اشارہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر زمین و آسمان بھی روتے ہیں ــــــ مولانا علی میاں کی والدہ ماجدہ مرحومہ کی خصوصیت یہی نہیں تھی کہ وہ ایسے نامور اور بافیض فرزند کی والدہ اور مربیہ تھیں ــــــ بلکہ وہ بذات خود ایک عابدہ زاہدہ اور صلاح و تقویٰ کے لحاظ سے مثالی خاتون تھیں۔

راقم سطور کی اہلیہ کبھی کبھی ان کی خدمت میں رہیں، انہوں نے اپنا تاثر یہی بتایا کہ وہ اس دور کی زاہدہ اور طبقۂ اناث کے لئے اعلیٰ نمونہ اور بہترین مثال ہیں ــــــ قرآن مجید کی حافظہ تھیں اور بہت اچھا یاد تھا جب تک طاقت و توانائی رہی اپنے گھر میں تراویح میں قرآن پاک سنانے کا معمول رہا۔

بالکل نوعمری میں ایک دفعہ خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئیں اور آپ سے بیعت کی، حضورؐ نے بیعت لی۔ اُن کے والد ماجد حضرت حافظ ضیاء الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ شیخ وقت تھے۔ جب بیٹی کا یہ خواب اُن کے علم میں آیا تو حضورؐ کی اس بیعت کے بعد ان کو خود بیعت کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اسی خوابی بیعت کو ان کے لئے کافی سمجھا، پھر اب سے ۲۶ سال پہلے (۱۳۶۲ھ) جب حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ اپنی جماعت کے ساتھ لکھنؤ تشریف لائے اور ایک دن کے لئے رائے بریلی بھی تشریف لے گئے تو محترمہ مرحومہ نے ان سے بیعت کی درخواست کی اور حضرتؒ نے بیعت لے لی اور اس کے ٹھیک ایک ہی سال بعد حضرت مولانا کا وصال ہو گیا تو حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی تجدید فرمائی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ مرحومہ کو خود باکمال خاتون سمجھتے تھے ــــــ جو لوگ حالات سے باخبر تھے وہ ان کو مستجاب الدعوات جانتے تھے ــــــ اللہ کے فضل و کرم سے ۹۰ سال سے زیادہ عمر پائی، بتایا گیا کہ آخری وقت ذکر جاری تھا، اور دیکھنے والوں کو محسوس ہوتا تھا کہ ارواح طیبہ اور ملائکہ سامنے ہیں ــــــ واللہ اعلم

اولاد میں رفیق محترم مولانا علی میاں اور ان کی محترمہ بہن امۃ اللہ تسنیم ہیں، ہمارے اکثر ناظرین اُن کی تصانیف "قصص الانبیاء" (اردو) اور امام نووی کی "ریاض الصالحین" کے ترجمہ "زاد سفر" وغیرہ اور رسالہ "رضوان لکھنؤ" کے ذریعہ ان سے واقف ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کے ساتھ مغفرت اور رحمت کا خاص الخاص معاملہ فرمائے اور درجات عالیہ سے نوازے۔ ناظرین کرام سے بھی دعوات صالحہ اور ایصال ثواب کی استدعا ہے۔

کِتَابُ الدَّعَوَات

مَعَارِفُ الحَدِیث

(مُسَلسَل)

اِسْتِغْفَار وَ تَوبَہ

دعا ہی کی ایک خاص قسم استغفار ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں اور قصوروں کی معافی اور بخشش مانگنا ـــــ اور توبہ گویا اس کے لوازم میں سے ہے، بلکہ یہ دونوں ہی آپس میں لازم و ملزوم ہیں ـــــ توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ جو گناہ اور نافرمانی یا ناپسندیدہ عمل بندہ سے سرزد ہو جائے اس کے بُرے انجام کے خوف کے ساتھ اس پر اسے دلی رنج اور ندامت ہو اور آئندہ کے لیے اس سے بچتے رہنے اور دور رہنے کا اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اس کی رضا جوئی کا وہ عزم اور فیصلہ کرے۔

ظاہر ہے کہ جب یہ توبہ والی کیفیت نصیب ہو گی تو جو گناہ سرزد ہو چکے ہیں بندہ اللہ تعالیٰ سے اُن کی معافی اور بخشش کی استدعا بھی ضرور کرے گا تاکہ ان کی سزا اور بُرے انجام سے بچ سکے۔ اور اسی طرح جب سزا اور عذاب کے خوف سے معافی اور بخشش مانگے گا تو اس کو گناہ پر رنج و افسوس اور آئندہ کے لیے اس کے پاس نہ جانے کا عزم بھی ضرور ہو گا ـــ اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ فی الحقیقت یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

توبہ و استغفار کی حقیقت اس مثال سے اچھی طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ کوئی آدمی مثلاً غصہ کی حالت میں خودکشی کے ارادہ سے زہر کھا لے، اور جب وہ زہر اندر پہونچ کر اپنا

عمل شروع کرے اور آنتیں کٹنے لگیں اور وہ ناقابلِ برداشت تکلیف اور بے چینی ہونے لگے جو زہر کے نتیجہ میں ہوتی ہے اور موت سامنے کھڑی نظر آئے تو اس کو اپنی اس احمقانہ حرکت پر رنج و افسوس ہو اور اس وقت وہ چاہے کہ کسی بھی قیمت پر اس کی جان بچ جائے اور جو دوا حکیم یا ڈاکٹر اسے بتائیں وہ اسے استعمال کرے اور اگر قے کرنے کے لیے کہیں تو قے لانے کے لیے بھی ہر تدبیر اختیار کرے ـــــ یقیناً اس وقت وہ پوری صدقدلی کے ساتھ یہ بھی فیصلہ کرے گا کہ اگر میں زندہ بچ گیا تو آئندہ کبھی ایسی حماقت نہیں کروں گا۔

بالکل اسی طرح سمجھنا چاہیئے کہ کبھی کبھی صاحبِ ایمان بندہ غفلت کی حالت میں اغواءِ شیطانی یا خود اپنے نفسِ امّارہ کے تقاضے سے گناہ کر بیٹھتا ہے۔ لیکن جب اللہ کی توفیق سے اس کا ایمانی حاسّہ بیدار ہوتا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ میں نے اپنے مالک و مولیٰ کی نافرمانی کر کے اپنے کو ہلاک کر ڈالا، اور اللہ کی رحمت و عنایت اور اس کی رضا کے بجائے میں اس کے غضب اور عذاب کا مستحق ہو گیا اور اگر میں اسی حالت میں مر گیا تو قبر میں اور اس کے بعد حشر میں مجھ پر کیا گزرے گی اور وہاں اپنے مالک کو کیا منہ دکھاؤں گا، اور آخرت کا عذاب کیسے برداشت کر سکوں گا ـــــ الغرض جب توفیقِ الٰہی سے اس کے اندر یہ فکر و احساس پیدا ہوتا ہے تو وہ یہ یقین و عقیدہ رکھتے ہوئے کہ میرا مالک و مولیٰ بڑا رحیم و کریم ہے، معافی مانگنے پر بڑے سے بڑے گناہوں قصوروں کو وہ بڑی خوشی سے معاف فرما دیتا ہے، وہ اس سے معافی اور بخشش کی استدعا کرتا ہے اور اسی کو گناہ کے زہر کا علاج سمجھتا ہے ـــــ نیز اس کے ساتھ وہ آئندہ کے لیے فیصلہ کرتا ہے کہ اب کبھی اپنے مالک کی نافرمانی نہیں کروں گا اور کبھی اس گناہ کے پاس نہیں جاؤں گا ـــــ بس بندہ کے اسی عمل کا نام استغفار اور توبہ ہے۔

توبہ و استغفار بلند ترین مقام:-

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ مقبولین و مقربین کے مقامات میں سب سے بلند مقام عبدیت اور بندگی کا ہے اور دُعا چونکہ عبدیت اور بندگی کا سب سے اعلیٰ مظہر ہے بلکہ ارشادِ نبوی کے مطابق وہی "مخ العبادہ" (یعنی بندگی اور عبادت کا مغز اور جوہر ہے)

اس لیے انسانی اعمال و احوال میں سب سے اکرم و اشرف دُعا ہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اپنے موقع پر درج ہو چکا ہے لیس شیئ اکرم علی اللہ من الدعاء (اللہ کے یہاں کوئی چیز دُعا سے زیادہ عزیز اور قیمتی نہیں ہے)

اور استغفار و توبہ کے وقت بندہ چونکہ اپنی گنہگاری اور تقصیر کے احساس کی وجہ سے انتہائی ندامت اور احساس پستی کی حالت میں ہوتا ہے اور گناہ کی گندگی کی وجہ سے مالک کو منہ دکھانے کے قابل نہیں سمجھتا اور اپنے کو مجرم اور خطاوار سمجھ کر معافی اور بخشش مانگتا اور آئندہ کے لیے توبہ کرتا ہے اس لیے بندگی اور تذلل اور گنہگاری و قصورداری کے احساس کی جو کیفیت استغفار و توبہ کے وقت میں ہوتی ہے وہ کسی دوسری دعا کے وقت نہیں ہوتی بلکہ نہیں ہو سکتی۔ اس بنا پر استغفار و توبہ دراصل اعلیٰ درجہ کی عبادت اور قرب الٰہی کے مقامات میں بلند ترین مقام ہے اور توبہ و استغفار کرنے والے بندوں کے لیے صرف معافی اور بخشش ہی کی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت و محبت اور اس کے پیار کی بشارت سنائی گئی ہے۔

وہ حدیثیں آگے آئیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت توبہ و استغفار کرتے تھے۔ اوپر کی سطروں میں توبہ و استغفار کے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا اس کی روشنی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کثرت استغفار کی وجہ آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے۔

دراصل یہ خیال بہت ہی عامیانہ اور غلط ہے کہ استغفار و توبہ عاصیوں اور گنہگاروں ہی کا کام ہے اور انہی کو اس کی ضرورت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے خاص مقرب بندے یہاں تک کہ انبیاء علیہم السلام جو گناہوں سے محفوظ و معصوم ہوتے ہیں ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی وہ محسوس کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کا حق بالکل ادا نہ ہو سکا۔ اس لیے وہ برابر توبہ و استغفار کرتے ہیں اور اپنے ہر عمل کو حتیٰ کہ اپنی نماز دل تک کو قابل استغفار سمجھتے ہیں۔ اس سلسلہ کی تیسری جلد "کتاب الصلوٰۃ" میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی حدیث گزر چکی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کا سلام پھیرنے کے بعد تین مرتبہ کہتے تھے، اَسْتَغْفِرُاللہ، اَسْتَغْفِرُاللہ، اَسْتَغْفِرُاللہ (یعنی اے اللہ میں تجھ سے بخشش و معافی چاہتا ہوں)

نماز کے بعد آپ کا یہ استغفار اسی بنیاد پر ہوتا تھا کہ آپ محسوس کرتے تھے کہ نماز کا حق ادا نہیں ہوا۔ واللہ اعلم

بہرحال توبہ و استغفار عاصیوں اور گنہگاروں کے لیے مغفرت و رحمت کا ذریعہ اور مقربین و معصومین کے لیے درجاتِ قرب و محبوبیت میں بے انتہا ترقی کا وسیلہ ہے اللہ تعالیٰ ان حقائق کا فہم و یقین اور ان سے استفادہ کی توفیق عطا فرمائے ـــــ

اس تمہید کے بعد استغفار و توبہ سے متعلق احادیث پڑھیے اور سب سے پہلے وہ احادیث پڑھیے جن میں توبہ و استغفار کے باب میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول ذکر کیا گیا ہے۔

توبہ و استغفار کے باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ:-

عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "وَاللهِ اِنِّي لَاَسْتَغْفِرُ اللهَ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ اَكْثَرَ مِنْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً" ـــــــــــ رواه البخاری

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، خدا کی قسم میں دن میں ستر دفعہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں توبہ و استغفار کرتا ہوں۔ (صحیح بخاری)

(تشریح) اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی اور جلال و جبروت کے بارہ میں جس بندہ کو جس درجہ کا شعور و احساس ہوگا وہ اسی درجہ میں اپنے آپ کو ادائے حقوق عبودیت میں قصوروار سمجھے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ یہ چیز بدرجۂ کمال حاصل تھی اس لیے آپ پر یہ احساس غالب رہتا تھا کہ عبودیت کا حق ادا نہ ہوسکا، اسی واسطے آپ بار بار اور مسلسل توبہ و استغفار فرماتے تھے ـــــ اور اس کا اظہار فرما کر دوسروں کو بھی اس کی تلقین فرماتے تھے۔

عَنِ الْاَغَرِّ الْمُزَنِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

يَاأَيُّهَا النَّاسُ تُوبُوا إِلَى اللّٰهِ فَإِنِّي أَتُوبُ إِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ مِائَةَ مَرَّةٍ ـــــــــــــــ رواہ مسلم

حضرت اغر مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگو اللہ کے حضور میں توبہ کرو میں خود دن میں سو سو دفعہ اس کے حضور میں توبہ کرتا ہوں۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) پہلی حدیث میں "أَكْثَرَ مِنْ سَبْعِينَ مَرَّةً" (ستر دفعہ سے زیادہ) اور اس حدیث میں "مِائَةَ مَرَّةٍ" (سو دفعہ) در اصل صرف کثرت کے بیان کے لیے ہیں، اور قدیم عربی زبان کا یہ عام محاورہ ہے، ورنہ حضورؐ کے استغفار و توبہ کی تعداد یقیناً اس سے بہت زیادہ ہوتی تھی جیسا کہ آگے درج ہونے والی حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ إِنَّا كُنَّا لَنَعُدُّ لِرَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَجْلِسِ يَقُولُ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَتُبْ عَلَيَّ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُورُ مِائَةَ مَرَّةٍ ـــــــــــ

ـــــــــــــ رواہ احمد والترمذی وابو داؤد وابن ماجہ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک نشست میں شمار کر لیتے تھے کہ آپ سو سو دفعہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کرتے تھے "رَبِّ اغْفِرْ لِي وَتُبْ عَلَيَّ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُورُ" (اے میرے رب مجھے معاف کر دے، بخش دے اور میری توبہ قبول فرما کر مجھ پر عنایت فرما، بے شک تو بہت ہی عنایت فرما اور بہت ہی بخشنے والا ہے) (مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے اس بیان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطور ورد و وظیفہ کے استغفار و توبہ کا یہ کلمہ ایک نشست میں سو دفعہ پڑھتے تھے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ مجلس میں تشریف فرما ہوتے، ہم

لوگ بھی حاضر رہتے، بات چیت کا سلسلہ بھی جاری رہتا اور آپ اسی درمیان میں بار بار اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوکر ان کلمات کے ساتھ استغفار و توبہ بھی کرتے رہتے اور ہم اپنے طور پر اس کو شمار کرتے رہتے تو معلوم ہوتا کہ ایک نشست میں آپ نے سو دفعہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں یہ عرض کیا۔ واللہ اعلم۔

عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ الَّذِیْنَ اِذَا اَحْسَنُوْا اِسْتَبْشَرُوْا وَاِذَا اَسَاؤُا اسْتَغْفَرُوْا

———— رواہ ابن ماجہ والبیہقی فی الدعوات الکبیر

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دُعا فرمایا کرتے تھے

"اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ الَّذِیْنَ اِذَا اَحْسَنُوْا اِسْتَبْشَرُوْا وَاِذَا اَسَاءُوْا اسْتَغْفَرُوْا"

اے اللہ مجھے اپنے ان بندوں میں سے کر دے جو نیکی کریں تو خوش ہوں اور ان سے جب کوئی غلطی اور برائی سرزد ہو جائے تو تیرے حضور میں استغفار کریں۔

(سنن ابن ماجہ، دعوات کبیر للبیہقی)

(تشریح) کسی بندہ کو ان اچھے اعمال کی توفیق ملنا جن کے صلہ میں جنت اور رضائے الٰہی کا وعدہ ہے اس بات کی علامت اور نشانی ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی نظرِ عنایت ہے اس لیے اس کا حق ہے اور اس کو چاہیئے کہ وہ اعمالِ حسنہ کی اس توفیق پر خوش ہو اور شکر ادا کرے، قرآنِ پاک میں ارشاد فرمایا گیا ہے" قُلْ بِفَضْلِ اللّٰہِ وَبِرَحْمَتِہٖ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا" (اللہ کے فضل اور اس کی رحمت و عنایت پر اس کے بندوں کو خوش ہونا چاہیئے) اسی طرح جب کسی بندہ سے کوئی چھوٹی بڑی معصیت یا لغزش ہو جائے تو اسے اس کا رنج اور دکھ ہونا چاہیئے اور فوراً اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنا چاہیئے —— جس بندہ کو یہ دونوں باتیں حاصل ہوں وہ بڑا خوش نصیب ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے لیے دعا فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی یہ دونوں باتیں نصیب فرمائے۔

گناہوں کی سیاہی اور توبہ استغفار سے اس کا ازالہ

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمُؤْمِنَ اِذَا اَذْنَبَ كَانَتْ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ فِیْ قَلْبِهٖ فَاِنْ تَابَ وَاسْتَغْفَرَ صُقِلَ قَلْبُهٗ وَاِنْ زَادَ زَادَتْ حَتّٰى تَعْلُوَ قَلْبَهٗ فَذٰلِكُمُ الرَّانُ الَّذِیْ ذَكَرَ اللّٰهُ تَعَالٰى كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ ——— رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مومن بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے نتیجہ میں اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے، پھر اگر اس نے اس گناہ سے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں معافی اور بخشش کی التجا و استدعا کی تو وہ سیاہ نقطہ زائل ہو کر قلب صاف ہو جاتا ہے اور اگر اس نے (گناہ کے بعد توبہ و استغفار کے بجائے مزید گناہ کیے اور گناہوں کی وادی میں قدم بڑھائے تو دل کی وہ سیاہی اور بڑھ جاتی ہے یہاں تک کہ قلب پر چھا جاتی ہے ——— آپ نے فرمایا کہ یہی وہ زنگ اور سیاہی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر فرمایا ہے "كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) قرآن مجید میں ایک موقع پر بد انجام کافروں کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے "كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝" جس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی بدکرداریوں کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ اور سیاہی آگئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مندرجۂ بالا حدیث سے معلوم ہوا کہ گناہوں اور بدکرداریوں کی وجہ سے صرف کافروں ہی کے دل سیاہ نہیں ہوتے بلکہ مسلمان بھی جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں بھی گناہ کی نحوست سے ظلمت پیدا ہوتی ہے لیکن اگر وہ سچے دل سے توبہ و استغفار کرلے تو یہ سیاہی اور ظلمت ختم ہو جاتی ہے اور دل

حسب سابق صاف اور نورانی ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر گناہ کے بعد توبہ و استغفار نہ کرے بلکہ معصیت و نافرمانی ہی کے راستہ پر آگے بڑھتا رہے تو پھر یہ ظلمت برابر بڑھتی رہتی ہے یہاں تک کہ پورے دل پر چھا جاتی ہے۔ اور کسی مسلمان کے لیے بلاشبہ یہ انتہائی بدبختی کی بات ہو کہ گناہوں کی ظلمت اس کے دل پر چھا جائے اور اس کے قلب میں اندھیرا ہی اندھیرا ہو جائے۔ اعاذنا اللہ منہ۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ بَنِيْ آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ

——— رواہ الترمذی و ابن ماجہ والدارمی

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر آدمی خطاکار ہے، (کوئی نہیں ہے جس سے کبھی کوئی خطا اور لغزش نہ ہو) اور خطاکاروں میں وہ بہت اچھے ہیں جو (خطا و قصور کے بعد) مخلصانہ توبہ کریں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو جائیں۔ (جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، سنن دارمی)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ خطا اور لغزش تو گویا آدمی کی سرشت میں ہے، آدم کا کوئی فرزند اس سے مستثنیٰ نہیں، لیکن وہ بندے بڑے اچھے اور خوش نصیب ہیں جو خطا و قصور اور گناہ کے بعد نادم ہو کر اپنے مالک کی طرف رجوع ہوں اور توبہ و استغفار کے ذریعہ اس کی رضا و رحمت حاصل کریں۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ۔

——— رواہ ابن ماجہ والبیہقی فی شعب الایمان

حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گناہ سے توبہ کر لینے والا گنہگار بندہ بالکل اس بندہ کی طرح ہے جس نے گناہ کیا ہی نہ ہو۔ (سنن ابن ماجہ، شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ سچی توبہ کے بعد گناہ کا کوئی اثر اور داغ دھبہ باقی نہیں

رہتا، اور بعض روایات میں ہے کہ آدمی گناہوں سے توبہ کے بعد ایسا بے گناہ ہو جاتا ہے جیسا کہ وہ اپنی پیدائش کے وقت بے گناہ تھا (کَیَوْمِ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ) اور وہ احادیث انشاء اللہ آگے درج ہوں گی جن سے معلوم ہو گا کہ توبہ کا نتیجہ صرف اتنا ہی نہیں ہوتا کہ گناہ معاف ہو جائیں اور معصیات کی ظلمت اور سیاہی کے داغ دھبے مٹا دیے جائیں بلکہ تائب بندہ اللہ کا محبوب اور پیارا بن جاتا ہے اور اس کی توبہ سے اس کو بےحد خوشی ہوتی ہے۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنَ التَّوَّابِيْنَ۔

غفاریت کے ظہور کے لیے گناہوں کی ضرورت:۔

عَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ اَنَّهٗ قَالَ حِیْنَ حَضَرَتْهُ الْوَفَاةُ كُنْتُ كَتَمْتُ عَنْكُمْ شَیْئًا سَمِعْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ سَمِعْتُهٗ یَقُوْلُ لَوْلَا اَنَّكُمْ تُذْنِبُوْنَ لَخَلَقَ اللّٰهُ خَلْقًا یُّذْنِبُوْنَ یَغْفِرُ لَهُمْ

رواہ مسلم

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے اپنی وفات کے وقت فرمایا کہ میں نے ایک بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی اور تم سے اب تک چھپائی تھی (اب جبکہ میرا آخری وقت ہے وہ میں تم کو بتاتا ہوں اور وہ امانت تمھارے سپرد کرتا ہوں) میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے سُنا، آپ فرماتے تھے کہ اگر بالفرض تم سب (ملائکہ کی طرح) بے گناہ ہو جاؤ اور تم سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو تو اللہ اور مخلوق پیدا کرے گا جن سے گناہ بھی سرزد ہوں گے پھر اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کا فیصلہ فرمائے گا (اور اس طرح اُس کی شان غفاریت کا ظہور ہو گا) (صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث سے یہ سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ کو معاذ اللہ گناہ مطلوب ہیں اور وہ گناہگاروں کو پسند کرتا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد کے ذریعہ گناہوں اور گناہگاروں کی ہمت افزائی فرمائی ہے، بڑی جاہلانہ غلط فہمی ہو گی، انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا

مقصد ہی یہ ہے کہ لوگوں کو گناہوں سے بچایا جائے اور اعمالِ صالحہ کی ترغیب دی جائے۔
دراصل حدیث کا منشا اور مدعا اللہ تعالیٰ کی شانِ غفاریت کو ظاہر کرنا ہے اور مطلب یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی صفتِ خالقیت کے ظہور کے لیے ضروری ہے کہ کوئی مخلوق پیدا کی جائے، اور صفتِ رزاقیت کے لیے ضروری ہے کہ کوئی مخلوق ہو جس کو رزق کی ضرورت ہو اور اللہ تعالیٰ اس کو رزق عطا فرمائے۔ علیٰ ہٰذا جس طرح اللہ تعالیٰ کی صفتِ ہدایت کے لیے ضروری ہے کہ کوئی مخلوق ہو جس میں ہدایت لینے کی صلاحیت ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو ہدایت ملے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی شانِ غفاریت کے لیے ضروری ہے کہ کوئی ایسی مخلوق ہو جس سے گناہ بھی سرزد ہوں پھر وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں استغفار کرے اور گناہوں کی معافی اور بخشش چاہے اور پھر اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت اور بخشش کا فیصلہ فرمائے ـــــ اس لیے ناگزیر ہے اور ازل سے طے ہے کہ اس دنیا میں گناہ کرنے والے بھی ہوں گے، اُن میں سے جن کو توفیق ملے گی وہ استغفار بھی کریں گے اور اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت کا فیصلہ بھی فرمائے گا اور اس طرح اس کی صفتِ مغفرت اور شانِ غفاریت کا ظہور ہوگا۔

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا .... اپنی زندگی میں اس خیال سے کبھی تذکرہ نہیں کیا کہ کہیں لوگ غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں پھر اپنے آخری وقت میں اپنے خاص لوگوں سے اظہار فرما کر امانت گویا ان کے سپرد کر دی۔

یہی مضمون الفاظ کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔

بار بار گناہ اور بار بار استغفار کرنے والے:۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ عَبْدًا اَذْنَبَ ذَنْبًا فَقَالَ رَبِّ اَذْنَبْتُ فَاغْفِرْهُ فَقَالَ رَبُّهُ

أَعَلِمَ عَبْدِي أَنَّ لَهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَيَأْخُذُ بِهِ غَفَرْتُ لِعَبْدِي ثُمَّ مَكَثَ مَا شَاءَ اللهُ ثُمَّ أَذْنَبَ ذَنْبًا قَالَ رَبِّ أَذْنَبْتُ ذَنْبًا فَاغْفِرْهُ فَقَالَ أَعَلِمَ عَبْدِي أَنَّ لَهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَيَأْخُذُ بِهِ غَفَرْتُ لِعَبْدِي ثُمَّ مَكَثَ مَا شَاءَ اللهُ ثُمَّ أَذْنَبَ ذَنْبًا قَالَ رَبِّ أَذْنَبْتُ ذَنْبًا آخَرَ فَاغْفِرْهُ لِي فَقَالَ أَعَلِمَ عَبْدِي أَنَّ لَهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَيَأْخُذُ بِهِ غَفَرْتُ لِعَبْدِي فَلْيَفْعَلْ مَا شَاءَ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ اللہ کے کسی بندے نے کوئی گناہ کیا پھر اللہ سے عرض کیا اے میرے مالک مجھ سے گناہ ہو گیا، مجھے معاف فرمادے! تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا کوئی مالک ہے جو گناہوں پر پکڑ بھی سکتا ہے اور معاف بھی کر سکتا ہے۔ میں نے اپنے بندہ کا گناہ بخش دیا اور اس کو معاف کر دیا —— اس کے بعد جب تک اللہ نے چاہا وہ بندہ گناہ سے رکا رہا اور پھر کسی وقت گناہ کر بیٹھا اور پھر اللہ سے عرض کیا میرے مالک مجھ سے گناہ ہو گیا تو اس کو بخش دے اور معاف فرمادے، تو اللہ تعالیٰ نے پھر فرمایا کیا میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا کوئی مالک ہے جو گناہ قصور معاف بھی کر سکتا ہے اور پکڑ بھی سکتا ہے۔ میں نے اپنے بندہ کا گناہ معاف کر دیا اس کے بعد جب تک اللہ نے چاہا وہ بندہ گناہ سے رکا رہا اور کسی وقت پھر کوئی گناہ کر بیٹھا اور پھر اللہ تعالیٰ سے عرض کیا اے میرے مالک و مولا مجھ سے اور گناہ ہو گیا تو مجھے معاف فرمادے اور میرا گناہ بخش دے! تو اللہ تعالیٰ نے پھر ارشاد فرمایا کیا میرے بندہ کو یقین ہے کہ اس کا کوئی مالک و مولا ہے جو گناہ معاف بھی کرتا ہے اور سزا بھی دے سکتا ہے، میں نے اپنے بندہ کو بخش دیا، اب جو اس کا جی چاہے کرے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار گناہ اور بار بار استغفار

کرنے والے جس بندہ کا واقعہ بیان فرمایا ہے بعض شارحین نے کہا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ وہ آپ ہی کا کوئی اُمتی ہو اور ممکن ہے کہ انبیاء سابقین میں سے کسی کا اُمتی ہو، لیکن اس عاجز کے نزدیک زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہ کسی خاص اور معین واقعہ کا بیان نہیں ہے بلکہ ایک کردار کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لاکھوں کروڑوں بندے ہوں گے جن کا حال اور کردار یہی ہے کہ اللہ اور آخرت پر ایمان کے باوجود ان سے گناہ ہوجاتا ہے اور پھر وہ نادم و پشیمان ہوکر اللہ تعالیٰ کے حضور میں استغفار کرتے ہیں، اور اس کے بعد بھی ان سے بار بار گناہ سرزد ہوتے ہیں اور وہ ہر بار سچے دل سے استغفار کرتے ہیں، ایسے بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہی کریمانہ معاملہ ہے جو اس حدیث میں بیان فرمایا گیا ہے۔

آخری دفعہ کے استغفار اور اس پر معافی کے اعلان کے ساتھ فرمایا گیا ہے "غَفَرْتُ لِعَبْدِیْ فَلْیَفْعَلْ مَاشَاءَ" (یعنی میں نے اپنے بندہ کو بخش دیا اب اس کا جو جی چاہے کرے)، اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اب اس کو گناہوں کی بھی اجازت دے دی گئی، بلکہ ان الفاظ میں بندہ کے مالک و مولا کی طرف سے صرف اس لطف و کرم کا اعلان فرمایا گیا ہے کہ اے بندے تو جتنی بار بھی گناہ کر کے اس طرح استغفار کرتا رہے گا میں تجھے معافی دیتا رہوں گا اور تو اپنے اس صادق و مومنانہ استغفار کی وجہ سے گناہوں کے زہر سے ہلاک نہ ہوگا۔ بلکہ یہ استغفار ہمیشہ تریاق کا کام کرتا رہے گا۔

اللہ تعالیٰ نے جن بندوں کو بندگی کا کچھ ذوق نصیب فرمایا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ مومن بندہ کے ضمیر پر ایسے کریمانہ اعلان کا کیا اثر پڑے گا اور اس کے دل میں مالک کی کامل وفاداری اور فرمانبرداری کا کیسا جذبہ اُبھرے گا۔

اس حدیث کی صحیح مسلم کی روایت میں تصریح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کا یہ پورا مضمون اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے بیان فرمایا ۔۔۔۔ اس روایت کی بنا پر یہ "حدیث قدسی" ہے۔

عَنْ اَبِیْ بَکْرِ الصِّدِّیْقِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا اَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ وَاِنْ عَادَ فِی الْیَوْمِ سَبْعِیْنَ

مَرَّةً ــــــــــــــــ رواہ الترمذی وابو داؤد

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بندہ (گناہ کر کے) استغفار کرے (یعنی سچے دل سے اللہ سے معافی مانگے) وہ اگر دن میں ستر دفعہ بھی پھر وہی گناہ کرے تو (اللہ کے نزدیک) وہ گناہ پر اصرار کرنے والوں میں نہیں ہے۔ (جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

(تشریح) گناہ پر اصرار یعنی بے فکری اور بے خوفی کے ساتھ گناہ کرتے رہنا اور اس پر دائم قائم رہنا، بڑی بدبختی اور بہت بُرے انجام کی نشانی ہے، اور ایسا عادی مجرم گویا اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مستحق نہیں ہے ـــ اس حدیث میں واضح فرمایا گیا ہے کہ اگر بندہ گناہ کے بعد اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے یعنی معافی مانگے تو پھر بار بار گناہ کرنے کے باوجود وہ "اصرار کرنے والوں" میں سے نہیں ہے، ـــ مگر ملحوظ رہے کہ استغفار صرف زبان سے نکلنے والے الفاظ کا نام نہیں ہے بلکہ وہ دل کی ایک طلب ہے زبان اس کی صرف ترجمانی کرتی ہے، اگر استغفار اور معافی طلبی دل سے ہو تو بلاشبہ ستر دفعہ بلکہ ستر ہزار دفعہ گناہ کرنے کے بعد بھی آدمی رحمتِ الٰہی کا مستحق ہے اور گناہ پر اصرار کرنے والے مجرموں میں سے نہیں ہے۔

کس وقت تک کی توبہ قابلِ قبول ہے :-

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُغَرْغِرْ۔

ــــــــــــــــ رواہ الترمذی وابن ماجہ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بندہ کی توبہ اس وقت تک قبول کرتا ہے جب تک غرغرہ کی کیفیت شروع نہ ہو۔ (جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) موت کے وقت جب بندہ کی رُوح جسم سے نکلنے لگتی ہے تو حلق کی

نالی میں ایک قسم کی آواز پیدا ہو جاتی ہے جسے عربی میں "غرغرہ" اور اردو میں "خرخرہ چلنا" کہتے ہیں، اس کے بعد زندگی کی کوئی آس اور امید نہیں رہتی، یہ موت کی قطعی اور آخری علامت ہے ۔۔ اس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ غرغرہ کی اس کیفیت کے شروع ہونے سے پہلے پہلے بندہ اگر توبہ کرلے، تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائے گا۔ غرغرہ کی کیفیت شروع ہونے کے بعد آدمی کا رابطہ اور تعلق اس دنیا سے کٹ کر دوسرے عالم سے جڑ جاتا ہے، اس لیے اس وقت اگر کوئی کافر اور منکر ایمان لائے یا کوئی نافرمان بندہ گناہوں اور نافرمانیوں سے توبہ کرے تو اللہ تعالےٰ کے یہاں قابلِ قبول نہ ہوگا، ہاں ایمان اور توبہ اسی وقت تک کی معتبر اور قابلِ قبول ہے جب تک زندگی کی آس اور امید ہو اور موت آنکھوں کے سامنے نہ آگئی ہو۔ قرآن پاک میں بھی صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّئَاتِ حَتّٰى إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّيْ تُبْتُ الْآنَ۔ (النساء ع ۳)	ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں جو برابر گناہ کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے سامنے موت آکھڑی ہو تو کہنے لگے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں۔

حدیث کے مضمون کا ماخذ بظاہر یہی آیت ہے اور اس کا پیغام یہی ہے کہ بندہ کو چاہیے کہ توبہ کے معاملہ میں ٹال مٹول نہ کرے، معلوم نہیں کس وقت موت کی گھڑی آجائے اور خدانخواستہ توبہ کا وقت ہی نہ ملے۔

مرنے والوں کے لیے سب سے بہتر تحفہ استغفار:۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا الْمَيِّتُ فِي الْقَبْرِ إِلَّا كَالْغَرِيْقِ الْمُتَغَوِّثِ يَنْتَظِرُ دَعْوَةً تَلْحَقُهُ مِنْ أَبٍ أَوْ أُمٍّ أَوْ أَخٍ أَوْ صَدِيْقٍ فَإِذَا لَحِقَتْهُ كَانَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا وَإِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى لَيُدْخِلُ عَلٰى أَهْلِ الْقُبُوْرِ مِنْ دُعَاءِ أَهْلِ الْأَرْضِ أَمْثَالَ الْجِبَالِ وَإِنَّ

هَدِيَّةُ الْاَحْيَاءِ اِلَى الْاَمْوَاتِ الْاِسْتِغْفَارُ لَهُمْ۔

رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قبر میں مدفون مُردے کی مثال بالکل اُس شخص کی سی ہے جو دریا میں ڈوب رہا ہو اور مدد کے لیے چیخ پکار رہا ہو، وہ بے چارہ انتظار کرتا ہے کہ ماں یا باپ یا بھائی یا کسی دوست آشنا کی طرف سے دعائے رحمت و مغفرت کا تحفہ پہونچے، جب کسی طرف سے اس کو دُعا کا تحفہ پہونچتا ہے تو وہ اس کو دنیا و مافیہا سے زیادہ عزیز و محبوب ہوتا ہے۔ اور دنیا میں رہنے بسنے والوں کی دعاؤں کی وجہ سے قبر کے مردوں کو اتنا عظیم ثواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتا ہے جس کی مثال پہاڑوں سے دی جاسکتی ہے۔ اور مُردوں کے لیے زندوں کا خاص ہدیہ ان کے لیے دُعائے مغفرت ہے۔

(شعب الایمان للبیہقی)

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ لَيَرْفَعُ الدَّرَجَةَ لِلْعَبْدِ الصَّالِحِ فِي الْجَنَّةِ فَيَقُوْلُ يَارَبِّ اَنّٰى لِيْ هٰذِهٖ؟ فَيَقُوْلُ بِاسْتِغْفَارِ وَلَدِكَ لَكَ۔

رواہ احمد

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت میں کسی مردِ صالح کا درجہ ایک دم بلند کردیا جاتا ہے تو وہ جنتی بندہ پوچھتا ہے کہ اے پروردگار! میرے درجہ اور مرتبہ میں یہ ترقی کس وجہ سے اور کہاں سے ہوئی؟ جواب ملتا ہے کہ تیرے واسطے تیری فلاں اولاد کے دُعائے مغفرت کرنے کی وجہ سے۔ (مسند احمد)

تشریح) اس حدیث میں اولاد کی دُعا سے درجہ میں ترقی کا ذکر صرف تمثیلاً کیا گیا ہے ورنہ دوسرے اہلِ ایمان کی دُعائیں بھی اسی طرح نفع مند ہوتی ہیں۔ زندگی

میں جس طرح سب سے بڑا حق اولاد پر والدین کا ہے اور ان کی خدمت و اطاعت فرائض میں سے ہے، اسی طرح مرنے کے بعد اولاد پر والدین کا خاص حق ہے کہ ان کے لیے رحمت و مغفرت کی دعا کرتے رہیں، مرنے کے بعد ان کی خدمت اور ان کے ساتھ حُسنِ سلوک کا یہی خاص راستہ ہے ــــ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما کی ان دونوں حدیثوں کا مقصد صرف ایک حقیقت کی اطلاع دینا ہی نہیں ہے بلکہ ایک بلیغ انداز میں اولاد اور دوسرے اقارب و متعلقین کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ مرنے والوں کے لیے مغفرت و رحمت کی دعائیں کرتے رہیں۔ ان کے یہ تحفے قبروں میں اور جنت تک مرحومین کو پہنچتے رہیں گے۔

راقم سطور عرض کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی کبھی اپنے بعض بندوں کو اس کا مشاہدہ بھی کرا دیتا ہے کہ کسی کی دعاؤں سے کسی بندہ کو اس عالم میں کیا ملا اور اس کے حال اور درجہ میں کیسی ترقی ہوئی ــــ اللہ تعالیٰ ان حقائق کا یقین نصیب فرمائے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی توفیق دے۔

یک ساعت صحبتے با اہل دل

مجلس حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی مدظلہ العالی

مرتبہ: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

(آٹھویں مجلس)

۲۷ شوال ۱۳۸۷ھ مطابق ۲۸ جنوری ۱۹۶۸ء خانقاہ شریف بھوپال، وقت ساڑھے دس بجے سے ساڑھے بارہ بجے تک۔

چونکہ اتوار تھا اس لیے مجمع بہت تھا، خانقاہ کے دالان و صحن سب بھرے ہوئے تھے، ایک جلسہ سا معلوم ہوتا تھا۔ حضرت نے کچھ دیر کے بعد کھڑے ہو کر تقریر فرمانی شروع کی۔ آواز بہت بلند تھی اور طبیعت میں جوش بہت تھا۔ تین مرتبہ ایسا ہوا کہ تقریر ختم کر دی اور بیٹھ گئے پھر کچھ یاد آیا اور طبیعت میں تقاضا پیدا ہوا اور تقریر فرمانی شروع کر دی۔ کسی قسم کا سہارا لینا یا کرسی پر بیٹھنا منظور نہیں فرمایا۔ تقریر بھی پوری مسلسل اور مربوط تھی۔ حاضرین ہمہ تن متوجہ اور بہت متاثر تھے۔ بعض حضرات پر رقت بھی طاری ہو جاتی تھی۔ شہر کے متعدد عمائد، افسران اور بڑے ملازمین، جدید تعلیم یافتہ اصحاب، کالجوں کے اساتذہ، طلباء اور شہر کے متعدد علماء بھی موجود تھے۔

فرمایا کہ اہل طلب کے آنے سے سینہ کھلتا ہے، ان کی وجہ سے مضامین کا ورود ہوتا ہے۔ آپ ٹونٹی کھولیں گے تو پانی نکلے گا آپ سمجھتے ہیں کہ ٹونٹی کا احسان ہے نہیں

بلکہ خوشی پر آپ کا احسان ہے، وہ تو گرم رہتی پانی نکلنے سے ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ پیر کون ہے معنیٰ مرید ہونے والا پیر ہے کیونکہ اس نے ترغیب دلائی کہ اللہ کا راستہ بتایا جائے۔ علم امانت ہے۔ علم و حکمت کی باتیں اللہ کے بندوں کو پہونچانا عالم کے فرائض میں سے ہے مولانا حسین احمد مدنی بھوپال تشریف لائے ہوئے تھے۔ تین روز کا قیام تھا۔ میاں (بڑے صاحبزادے مولوی محمد سعید صاحب) اور ان کے ساتھ خانقاہ تشریف لانے کی دعوت دینے کے لیے گئے مولانا نے معذرت فرمادی کہ سب اوقات گھر چکے ہیں اب کوئی وقت باقی نہیں ہے دونوں ناکام واپس آئے۔ میں نے کہا تم بچے ہو ابھی تمھیں کہنا نہیں آیا، میں گیا حضرت آرام فرما رہے تھے مجھے دیکھ کر اٹھنے لگے میں نے کہا نہیں آپ آرام فرمائیے۔ مجھے صرف ایک مسئلہ پوچھنا ہے میں یہ دریافت کرتا ہوں کہ ایک شخص نے مسجد بنائی وہ دروازہ پر کھڑا ہو جاتا ہے اور اندر آنے والوں کو روکتا ہے۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ جب وہ مسجد بنا چکا اور وقف کر چکا تو اب اس کو کیا حق ہے؟ میں نے کہا آپ بھی مسجد ہیں آپ نے اپنے آپ کو دین کے لیے وقف کر دیا ہے اب جو چاہے آپ سے فائدہ اٹھائے۔ فرمایا میں ضرور آؤں گا لیکن کھانے کے بجائے چائے پر اکتفا کریں میں نے عرض کیا مجھے تو دوسرا ہی فائدہ اٹھانا ہے میں پانی پلا کر رخصت کردوں گا۔ چنانچہ تشریف لائے میں نے نظر بچا کر ان کی جوتیاں سیدھی کیں کہ عالموں کا احترام اللہ و رسول کی محبت کی دلیل ہے اور وہ تو حدیث نبوی کے شیخ تھے۔ دیر دیر رات تک حدیث کا درس دیتے تھے۔ اہل دنیا کا حال ہے کہ ان کی محفل میں کوئی بڑا عہدہ دار آجاتا ہے تو مجلس میں کھلبلی مچ جاتی ہے اور کوئی دیندار آتا ہے تو کسی کو توجہ بھی نہیں ہوتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت نہیں۔

مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ دُنیا نے غور کرنے ہی سے ترقی کی ہے۔ پہلے ہمارے یہاں میٹھے تیل کا چراغ جلتا تھا۔ بارات میں مشعلیں لے کر لوگ چلتے تھے دنیا نے اس پر اکتفا نہیں کیا اور سوچتی اور تفکر کرتی رہی کہ اس سے آگے بھی روشنی ہونی چاہیے یہاں تک کہ آج اس بجلی کی روشنی تک پہونچ گئی۔ ایمان اور دین کے بارے میں یہی اصول ہونا چاہیے کہ جتنی روشنی ہمارے پاس ہے اس سے زیادہ کی طلب اور تلاش ہو کر ترقی کی انتہا نہیں ہے۔ اہل یورپ

زمین سے جب ترقی کر چکے تو انھوں نے اب آسمانوں سیاروں اور چاند کی طرف توجہ کی ہے۔ میرے نزدیک یہ فطرت کے عین مطابق ہے اور اسی سے کمالات حاصل ہوتے ہیں۔ دین کے بارے میں بھی یہی نظریہ ہونا چاہیے۔ شاعر نے ٹھیک کہا ہے ؎

ترقی طلب کیجئے ہر گھڑی
خدا بے نہایت ہے رہ اس کی بڑی

دنیا نے اپنی ترقی پر اکتفا نہیں کیا۔ دین والوں نے اپنی حالتوں پر کیوں اکتفا کر لیا۔ بات یہ ہے کہ جس طرح دنیا کی عظمت اور وفاداری ان کے خیال میں ہے اس طرح دین کی عظمت ہمارے خیال میں نہیں ہے۔ اگر میں بتا دوں کہ فلاں جگہ خزانہ ہے تو آپ اس کے لیے کیا کچھ نہ کریں گے۔ موجودہ ترقیات اور کمالات کی حقیقی ترقیات اور کمالات کے مقابلہ میں مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص اس پر فخر کرے کہ میں نے گوبر کے کنڈے (اُپلے) بہت تھاپ لیے ہیں بہت کام آئیں گے۔ یہ دراصل اس کے دماغ کی رکاکت اور پستی کی نشانی ہے۔ جن کے دل میں اللہ کی عظمت ہے وہ اس نظر سے ہم کو دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ؎

برعکس نہند نام زنگی کافور

جب ہم انتہائی تنزل میں آ گئے تو اس کو انتہائی ترقی کا نام دے دیا۔ دل کا سکون اور روح کا اطمینان بالکل غائب۔ زندگی ایسی ہو گئی ہے جیسے ریشمی چادر کو کانٹوں پر ڈال کر کھینچے جس طرح وہ چادر پھٹ جاتی ہے اس طرح ہماری زندگی پارہ پارہ اور تار تار ہے۔ میرے یہاں دو لڑکے مزدوری کرنے آئے۔ کپڑے بالکل پھٹے ہوئے تھے لیکن سارے دن ہنستے کھیلتے رہے۔ بات بات پر ان کی باچھیں کھل جاتی تھیں اور ٹھٹھے لگاتے تھے کام میں جٹے رہے۔ جب کھانے کا وقت آیا تو بھاجی اور سوکھی روٹی نکال کر کھانے بیٹھ گئے ایسے مست اور مگن تھے جیسے بڑی نعمت کھا رہے ہوں۔ یہ اسباب سے بالکل خالی تھے لیکن خوش تھے ان کو یہ فکر نہیں تھی کہ امریکا میں فلاں فلاں سامان ہیں ولایت میں فلاں سامان، اسی کو کہا گیا ہے خیر الغنیٰ غنی النفس (سب سے اچھی تونگری نفس کی تونگری ہے)

میں کلکتہ میں ایک ڈاکٹر کے بنگلہ میں بیٹھا ہوا تھا یہ وہ زمانہ تھا جب جاپان کے

کلکتہ پر حملہ کا خطرہ تھا۔ ٹیلیفون آیا اس کو سن کر سب ہنسنے لگے۔ میں نے پوچھا کہ کیا بات تھی کہنے لگے شہر کے بہت بڑے سیٹھ کا ٹیلیفون تھا کہ جب سے انھوں نے سنا ہے کہ جاپان کا ایک گولا فلاں مقام پر گرا ہے ان کو دست لگ گئے ہیں لوگ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہے تھے ان لڑکوں کو کیوں اتنی ہنسی آتی تھی اور وہ اتنے مست کیوں تھے۔ جوانی کا گرم خون، صحت اور بے فکری۔ اور حقیقت میں جان جتنی بڑی دولت ہے اتنی بڑی دولت کوئی نہیں۔ قرآن مجید حیات ابدی کا ضامن ہے لایمسھم فیھا نصب وماھم منھا بمخرجین (نہیں چھوئے گی جنت میں ان کو تھکن اور نہ وہ اس سے نکالے جائیں گے) بنی نوع میں کون ہے جو اس دولت کو نہ لے۔ اب اگر دنیا کی دولت اس کے مقابلہ میں چھوڑی تو کیا کمال کیا؟ اس حقیقی دولت کے مقابلہ میں وہ دولت کنڈے اور اُپلوں کی طرح ہے۔ جب وہ دولت چلی گئی تو سب کے سامنے جھکنے اور سجدہ کرنے لگے۔

آج میں دیکھتا ہوں کہ افسر کے نام سے کلیجہ لرز جاتا ہے اور اللہ اکبر کی آواز کا کوئی اثر نہیں پڑتا حالانکہ یہ افسر و حاکم خیالی اور خود ساختہ ہیں "ما انزل اللہ بھا من سلطان ان الحکم الا للہ" (نہیں اتاری ہے اللہ نے اس بات کی کوئی دلیل۔ حکمرانی تو بس اللہ ہی کا حق ہے)

لوگ فرمائش کرتے ہیں کہ وظیفہ بتا دیجئے۔ آج بیٹی ہے۔ عظمت تو دل میں حاکم کی بٹھالی ہے اب وظیفہ کیا اثر کرے گا۔ ایک بی بی تشریف لائیں۔ مصیبت بیان کی۔ میں نے لاحول ولا قوۃ الا باللہ کا وظیفہ بتایا کہا یہ تو میں پڑھتی رہی ہوں۔ میں نے کہا کہ آپ تشریف لے جائیے۔ اللہ کے رسولؐ نے تو فرمایا تھا کہ یہ عرش کے خزانوں میں سے خزانہ ہے اور آپ کے نزدیک کوئی بات ہی نہیں، اس کے مقابلہ میں ایک دوسرے صاحب تشریف لائے اپنی ایک پریشانی بیان کی میں نے لاحول ولا قوۃ الا باللہ کا ختم بتایا۔ انھوں نے کہا یہ تو بڑے حضور (حضرت پیر ابو احمد[1] صاحب) نے بتایا تھا۔ اس کے پڑھنے سے ایک شخص جس کو پھانسی کی

---

[1] صاحب ملفوظات حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی کے والد ماجد اور شیخ۔

سزا ہوئی تھی بری ہو گیا۔ انھوں نے عظمت کے ساتھ پڑھا اور غیبی طریقہ پر ان کی ایسی مدد ہوئی کہ حیرت ہو گئی۔ ایسے بہت سے واقعات پیش آئے ہیں۔ فائدہ اٹھانے والا اور بھگنے والا جب تک بری چیز کو اچھا کر کے نہ بتائے گا فائدہ نہ اٹھا سکے گا۔ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ والد نے ایک انگوٹھی بنا کر دی تھی، میں مکتب پڑھنے جاتا تھا۔ ایک عیار مجھے راستہ میں ملا اس نے مجھے ایک کھجور دی میں نے کھایا تو میٹھی تھی کہا کہ اب انگوٹھی چوس کر دیکھو میں نے چوسا تو پھیکی اور بے مزہ تھی۔ کہا کہ اب یہ پھیکی اور بے مزہ چیز مجھے دے دو اور میٹھی کھجور لے لو۔ اس طرح اس نے انگوٹھی ٹھگ لی۔ یہی ہماری مثال ہے لوگوں نے ہم سے کہا یہ کیا ہے؟ ہم نے کہا اس کا نام اسلام ہے۔ یہ باپ دادا سے چلا آرہا ہے یہ ہم کو بڑی تکلیف دیتا ہے۔ ہم کو میٹھی نیند نہیں سونے دیتا پچھڑیوں اور جوؤں کی طرح ہم کو کاٹتا ہے اور ہم کو اس کی وجہ سے صبح اٹھنا پڑتا ہے۔ انھوں نے کہا اس میں کچھ نفع بھی ہے؟ ہم نے کہا محض خیالی نفع ہے! انھوں نے کہا ہم کو یہ دے دو اور یہ دولت اور کرسیاں ہم سے لے لو، ہم جس پستی میں تھے اس پستی میں ہم کو اسلام پست اور بے کار نظر آتا تھا اور یہ دنیا کی دولتیں بلند دکھائی دیتی تھیں۔ ایک شخص کھائی میں پڑا ہوا ہے اوپر بلندی پر بلی ہے وہ کہتا ہے کہ بلی انسان سے اونچی ہوتی ہے اب جب تک اس بلی کو کھائی میں نہ لایا جائے یا اس شخص کو بلندی پر نہ بٹھایا جائے وہ اسی پر اصرار کرتا رہے گا کہ بلی انسان سے اونچی ہوتی ہے۔ یہی وہ حالت ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے "ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ" (پھر لوٹا دیا ہم نے اس کو پست سے پست تر حالت میں) اب اگر پوچھا جائے کہ کھائی میں سے نکلنے کا کیا راستہ ہے، کہا جائے گا ہاں ایک جو ہر ہے "الا الذین آمنوا وعملوا الصلحت فلھم اجر غیر ممنون" دہاں مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عملی کو اپنایا تو ان کے لیے ابدی اجر ہے) آج ہماری قوم اس پستی میں پہونچ گئی ہے کہ اسلام کا کوئی جوہر اس میں نہیں پایا جاتا نہ صداقت ہے نہ امانت۔ نہ اخلاق نہ عمل، ہر قسم کی بداخلاقیاں اور جرائم ان میں مل جائیں گے۔ چور، دغاباز، عیار، رہزن سب ملیں گے، نام عبدالرحمن محمد سلطان وغیرہ وغیرہ، جذبات پر قابو رکھنا اور غصہ کو دبانا تو آتا ہی نہیں، دو شخصوں میں ذرا گفتگو ہوئی اور ایک نے دوسرے کو چاقو مار دیا۔ غصہ کا محل

کیا ہے؟ اور خوشی کا محل کیا ہے؟ یہ جانتے ہی نہیں، ساتھی پر تو اتنا غصہ آیا اور نفس کی شرارتوں پر کبھی غصہ نہیں آتا، وجہ یہ ہے کہ ہم کو اپنی حقیقت معلوم نہیں" یا ایہا الانسان ما غرک بربک الکریم، قتل الانسان ما أکفرہ، من أی شئ خلقہ، من نطفۃ، خلقہ، فقدرہ ثم السبیل یسرہ ثم اماتہ، فاقبرہ ثم إذا شاء انشرہ (اے انسان تجھے کس چیز نے اپنے رب کریم کی بابت دھوکے میں ڈالا ہے ــــ اللہ کی مار ہو انسان پر وہ کیا ناشکرا ہے دیکھا نہیں کہ کس چیز سے اس کو پیدا کیا، نطفہ سے پیدا کیا اس کو، پھر اندازہ ٹھیرایا اسکا پھر آسان کیا راستہ پھر اسے موت دی، پھر قبر میں پہونچایا۔ پھر جب چاہے گا اسے قبر سے نکال کر کھڑا کرے گا)

اگر یہ غصہ کرنے والا اور اپنے ساتھی پر حملہ کرنے والا نفس کی ذلت کو سمجھ لیتا تو یہ نہ کرتا۔ شیخ سعدیؒ نے حکایت لکھی ہے کہ ایک آبرو باختہ شخص نے ایک بزرگ سے کچھ پیسے مانگے انھوں نے عذر کیا کہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ؎

طمع بردشوخے باصاحب دلے ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ بنود آں زماں درمیاں حاصلے

یہ سن کر وہ شخص جامہ سے باہر ہو گیا اور ان بزرگ کی کھڑے ہو کر ہجو بیان کرنی شروع کر دی، کہنے لگا کہ ان جیسے لوگوں کے دھوکہ میں نہ آنا یہ جس وقت مراقب اور سر بزانو ہوتے ہیں تو بڑے بزرگ معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ اپنے شکار کی تاک میں رہتے ہیں یہ مسجد اسی لیے آتے ہیں کہ یہاں بہت لوگ آتے ہیں کوئی موٹا سا شکار ہاتھ آجائے گا۔ ان کو گھر میں شکار نہیں ملتا تو خانۂ خدا میں شکار کرنے آتے ہیں۔ ؎

کہ چوں گربہ زانو بدل برنہند ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ وگر صیدے اُفتد چو سگ درجہند
سوئے مسجد آورد دکان شید ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ کہ در خانہ کمتر تواں یافت صید

کہنے لگا قافلہ پر تو شیر مرد ڈاکہ ڈالتے ہیں جو کھلے میدان میں اپنی شجاعت کا جوہر دکھاتے ہیں لیکن یہ درویش نما رہزن تو لوگوں کی جیب کاٹتے ہیں۔ یہ اپنی گدڑی میں سفید اور سیاہ پیوند لگائے ہوئے ہوتے ہیں لیکن وہ اس کے اندر سونا چھپائے ہوئے ہیں ؎

رہ کارواں شیر مرداں زنند ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ولے جامۂ مردم ایناں کنند
سپید و سیاہ پارہ بردوختہ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ لبالوس پنہاں زر اندوختہ

کہنے لگا کہ یہ عبادت میں تو بہت ضعیف اور سُست نظر آتے ہیں لیکن رقص اور حالت وجد میں بڑے جوان اور چُست بن جاتے ہیں ؎

مبیں در عبادت کہ پیران سُست — کہ در رقص و حالت جوانند چُست

یہ دیکھنے میں بڑے ضعیف و نحیف اور زار و نزار نظر آتے ہیں لیکن یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا ہیں جو اژدھوں اور سانپوں کو ہضم کر لیتا تھا اور ایسا ہی سوکھا کا سوکھا اور سونٹا بنا رہتا تھا ؎

عصائے کلیم اند بسیار خوار — پس آنگہ نمایند خود را نزار

نہ یہ متقی پرہیزگار ہیں نہ عالم و حکیم۔ بس صرف اتنی بات ہے کہ دین کے ذریعہ دُنیا کھاتے ہیں ؎

نہ پرہیزگار و نہ دانشور اند — ہمیں بس کہ دُنیا بدیں میخورند

اس نے کہا کہ تمام سنتوں میں سے انھوں نے دو ہی سنتوں کا انتخاب کیا ہے۔ ایک سنت قیلولہ اور ایک طعام سیر ؎

ز سنت نہ بینی در ایشاں اثر — مگر خواب پیشین و نان سحر

ان بزرگ نے جب اپنی یہ ہجو سنی تو فرمایا اس نے تو محض اپنے گمان و قیاس سے یہ باتیں کہی ہیں مجھے تو ان کا یقین حاصل ہے کیونکہ میں اپنے عیوب کا مشاہدہ کرتا ہوں ؎

ز روئے گماں بر من ایں ہا کہ بست — من از خود بیقیں می شناسم کہ ہست

اس بچارے کا تجربہ تو صرف ایک سال کا ہے کہ اس کی ملاقات کو اس سے زیادہ عرصہ نہیں ہوا اور مجھے تو اپنی عمر ستر سالہ کا حال معلوم ہے ؎

نے امسال پیوست با ما وصال — کجا داندم عیب ہفتاد سال

اگر میدانِ حشر میں یہی میرے خلاف گواہ گزرے گا تو مجھے بڑا اطمینان ہے کہ میرے ساتھ اچھا ہی معاملہ ہوگا۔ پھر مجھے دوزخ کا ڈر نہیں ؎

بحشر گواہ گناہم گر اوست — ز دوزخ نترسم کہ حالم نکوست

سعدی علیہ الرحمہ ایک دوسری حکایت سناتے ہیں کہ حضرت جنید بغدادیؒ عید کے روز حمام سے نہا کر اور صاف کپڑے پہن کر نکلے، ایک شخص نے کوٹھے پر سے ان پر کوڑا پھینک دیا۔

انھوں نے فرمایا میں تو اس قابل تھا کہ مجھ پر پتھر پڑیں تیری رحمت ہے کہ پتھر کو میرے لیے پھول بنا دیا۔

تقسیم کے بعد یہاں ہڑبونگ کا زمانہ تھا، مولوی نعمان صاحب جا رہے تھے ایک شخص نے پیچھے سے ان کے مکّا مار دیا انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور ایک لات ماری۔ وہ شخص گر گیا یہ آگے بڑھ گئے۔ اس کا ذکر خانقاہ میں ہوا، مولوی عبدالرشید صاحب بیٹھے تھے۔ کہنے لگے نعمان میاں کسی سے مار کھانے والے نہیں! میں نے کہا یہ مت کہیئے۔ ہم آپ کی بہادری جب سمجھتے کہ آپ پر رنگ اور گوبر ڈالا جاتا تو خاموش چلے آتے۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

چوں نہ داری ناخنِ درّندہ تیز — با بداں آں بہ کہ کم داری ستیز

نرم چیز جتنا عمدہ کام دیتی ہے سختی نہیں دیتی۔ بے وقت کی تیزی اور گرمی بنے بنائے کھیل بگاڑ دیتی ہے۔ جیسے اس قصہ میں مسلمانوں کا جیتا ہوا مقدمہ ہار گیا جس میں کلثوم بیا کی مسجد پر حملہ ہوا اور حکام کو مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی تھی۔ لیکن جامع مسجد میں کچھ لوگ جوابی کاروائی کرنے کے ارادے سے بیٹھے اور وہ گرفتار ہو گئے اور کھیل بگڑ گیا۔[1] اگر ایسے موقع پر بجائے جوابی کاروائی کے جس کا سوائے ذلت و پریشانی کے کوئی نتیجہ نہیں دو رکعت نماز پڑھ کر دعا کرتے اور کہتے اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَجْعَلُکَ فِیْ نُحُوْرِھِمْ وَنَعُوْذُ بِکَ مِنْ شُرُوْرِھِمْ تو بہتر تھا۔

دوسری قوم اتنی ذلیل نہیں ہوئی جتنا ہم ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ہم نے تم پر اتنے بڑے بڑے انعامات کیے لیکن تم نے نافرمانی کی۔ ومن یبدل نعمة اللہ من بعد ما جاءتہ فان اللہ شدید العقاب (اور جس نے بدل ڈالا اللہ کی نعمت کو تو اللہ بڑا ہی سخت سزا دینے والا ہے) ہم میں سے چور ڈاکو اور سب برائیوں والے موجود ہیں دوسری قوم والے کم ہوں گے۔ بیراگڑھ[2] میں ایک سندھی عورت نے کچھ رقم جمع کی تھی اس کو رات پڑ گئی ایک صاحب دیندار صورت کے یہاں جن کی نیچی ڈاڑھی تھی اس نے پناہ

---

[1] یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ ایک پچھلے ملفوظ میں آ چکا ہے۔ [2] بھوپال کا ایک نواحی محلہ جس میں دوسری جنگ کے موقعہ پر غیر ملکی قیدی اور نظر بند رکھے گئے تھے۔

لی کہ یہ مسلمان ہیں اور دیندار ہیں۔ انھوں نے رات کو اس کو قتل کر کے اس کی دولت پر قبضہ کر لیا۔ بالآخر گرفتار ہوئے اور اب بھی جیل میں پڑے ہوئے ہیں۔ مجھے رسالہ بین ؓ البدایہ والنہایہ میں پڑھ کر بڑا مزہ آیا کہ لوگ اسلام کا بڑا معجزہ اور صحابۂ کرام رضؓ کی بڑی کرامت یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ کا لشکر دریائے دجلہ کو گھوڑوں پر بیٹھ کر عبور کر گیا اور نہ کوئی ڈوبا اور نہ کسی کی کوئی چیز ضائع ہوئی۔ اسلام کا بڑا معجزہ اور صحابہ کرام کی اصل کرامت یہ تھی کہ دولت کے دریا امنڈ آئے اور قیصر و کسریٰ کے خزانے ان کے قدموں سے لگ گئے وہ اس دریا میں سے ہو کر صاف نکل گئے اور ان کا دامن بھی تر نہ ہوا۔

میں نے ایک دوست سے کہا کہ لوگ جنازہ میں شامل ہوتے ہیں۔ مجھے ایک بھی جنازہ میں شامل ہوتا نظر نہیں آیا۔ جنازہ میں صحیح شمولیت یہ ہے کہ آدمی یہ سمجھے کہ یہ جنازہ فلاں آدمی کا نہیں پڑا ہے دراصل میں مرا ہوں یہ نماز جنازہ میری نماز جنازہ کا ریہرسل ہے لیکن مجھے زندگی کی ایک مہلت مل گئی ہے۔ مجھ سے کسی نے کہا کہ فیض اللہ خاں نے جہانگیر آباد میں انتقال کیا۔ میں نے کہا غلط! صحیح یہ ہے کہ میں مرا ہوں یہ میرے انتقال کی خبر ہے۔ مجھے سمجھنا چاہیے کہ یہ میری ہی نماز پڑھائی جا رہی ہے اور پھر قبر دیکھ کر یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ سب ارادے اور آرزوئیں دفن ہو رہی ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف میں نے دیکھا ہے کہ نماز جنازہ کے بعد دعا کے لیے سب نے ہاتھ اٹھائے ایک صاحب سگریٹ پی رہے تھے اس کو ذرا جھکا دیا کہ بجھے نہیں اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے لگے پھر بدستور سگریٹ پینے میں مشغول ہو گئے۔ میں نے منشی حلیم الدین صاحب سے کہا کہ دیکھئے مردہ سگریٹ پی رہا ہے۔ قبر حجلۂ عروسی ہے کامیاب وہی ہے جو ایمان سلامت لے گیا۔ ؎[۲]

بیرونِ گور لاف کرامت چہ می زنی
ایماں اگر بگور بری صد کرامت است

---

[۱] راقم السطور کا ایک عربی رسالہ جو عرصہ ہوا شائع ہوا تھا۔ [۲] حضرت نے یہی لفظ استعمال کیا اور متعدد بار متعدد موقعوں پر یہ لفظ استعمال فرماتے رہے۔

اگر بارات بڑی دھوم دھام کی ہے اور بڑا تزک و احتشام ہے لیکن نوشہ اہل نہیں تو کچھ فائدہ نہیں۔

خدمت میں جو لطف ہے وہ مخدومیت میں نہیں۔ میری کسی نے خدمت کی تو معلوم ہوا کہ کھانا تو کھا رہا ہوں مگر پھیکا۔ اور میں نے جب کسی کی خدمت کی تو معلوم ہوا کہ میں نے نہایت لذیذ اور چٹ پٹی چیز کھائی۔ ایک بزرگ نے جب اپنے نفس پر غور کیا تو بہت موٹا پایا انھوں نے نفس سے کہا کہ میں نے اتنے مجاہدے کیے مگر تم موٹے کے موٹے ہو۔ یہ کیا ہے؟ نفس نے کہا کہ میرے موٹاپے کی وجہ یہ ہے کہ جو آپ کے پاس آتا ہے وہ جھکا ہوا آتا ہے لوگ بادشاہوں کی بھی ایسی تعظیم نہیں کرتے جیسی آپ کی۔ کوئی دست بوسی کرتا ہے۔ کوئی قدم بوسی وہ آپ جو کچھ کرتے تھے وہ آپ کے جسم کو پہونچتا تھا لیکن یہ تعظیم میری غذا تھی اسی وجہ سے میں موٹا ہوگیا ہوں۔ بالآخر انھوں نے اس کا علاج کیا اور ایسا سامان کیا کہ نفس پر ضرب لگی اور اس کا علاج ہوگیا۔ طویل قصہ ہے۔ کل ختم کے بعد میں نے کہا کہ فلاں کا نکاح ہوگا اور حضرت قدوۃ السالکین نکاح پڑھائیں گے۔ مطیع اللہ خاں صاحب نے کہا وہ کون ہیں؟ میں نے کہا یہی شاہ محمد یعقوب صاحب جو بیٹھے ہوئے ہیں۔ لوگ ایسے ایسے القاب لکھتے ہیں کہ نفس پھول جائے۔ مجھے تو اپنے ایک بچے کا یہ لکھنا بہت پسند آیا کہ میرے اچھے میاں۔ جس ہاتھ کو بوسے دیئے جاتے ہیں اگر احساس ہو تو اس میں زخم ہیں اور پھوڑے جن پر مرہم اور زندہ طلسمات ملنے کی ضرورت ہے۔

انسانی قانون اور اسلامی قانون

ایک اصولی موازنہ

(از مولانا امین احسن اصلاحیؒ)[1]

۱۔ انسانی قانون کے قانون ہونے کا تمام تر انحصار اس بات پر ہے کہ اس کو شیخ قبیلہ یا بزرگ خاندان کی منظوری حاصل ہے یا کسی عدالت نے اس پر عمل کیا ہے یا کسی حکومت نے اس کو تسلیم کیا ہے۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی چیز بھی اس کو حاصل نہ ہو تو پھر اس کی قانونیت ختم ہو جاتی ہے[2]۔ برعکس اس کے اسلامی قانون کی قانونیت ان چیزوں میں سے کسی چیز کی بھی محتاج نہیں ہے۔ وہ بہرحال قانون ہے۔ کوئی عدالت اس کو مانے یا نہ مانے اور کوئی حکومت اس کو تسلیم کرے یا نہ کرے وہ اس کائنات کے حقیقی مالک اور حکمراں کا قانون ہے، اگر کوئی عدالت یا حکومت اس کو تسلیم نہیں کرتی تو اس کے تسلیم نہ کرنے سے اس کی قانونیت متاثر نہیں ہوتی بلکہ خود وہ عدالت یا حکومت نافرمانی اور بغاوت کی مجرم ٹھہرتی ہے، چنانچہ اسی بنا پر قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔	جو لوگ اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی لوگ نافرمان ہیں۔

---

[1] مصنف کی کتاب "اسلامی قانون کی تدوین" سے ماخوذ۔

[2] ملاحظہ ہو سر جان سالمنڈؒ کی کتاب JURISPRUDENCE (اصول قانون) صفحہ [illegible]

اس حقیقت کا اظہار ان ناموں سے بھی ہوتا ہے جو اسلام نے اپنے قانون کے لیے اختیار کیے ہیں۔ اسلامی قانون کے لیے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان میں ایک لفظ کتاب ہے جس کے معنیٰ ہیں مَا کَتَبَہُ اللّٰہُ لَنَا (جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے) دوسرا لفظ سُنّت کا ہے جس کے معنیٰ ہیں مَا سَنَّہُ النَّبِی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ (جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے مقرر کر دیا ہے) تیسرا مشہور لفظ شریعت کا ہے جس کے معنیٰ ہیں مَا شَرَعَہُ اللّٰہُ لَنَا (جو اللہ نے ہمارے لیے ٹھہرا دیا ہے) اسی طرح دوسرے الفاظ سے بھی یہی حقیقت واضح ہوتی ہے۔

۲۔ انسانی قانون اپنے ساتھ احترام یا تقدیس کا کوئی پہلو نہیں رکھتا۔ وہ آدمی کے ایمان کا جزو نہیں ہوتا اس کے متعلق آدمی کا یہ تصور نہیں ہوتا کہ جس نے اس قانون کو دیا ہے وہ اس کی نافرمانی یا فرمانبرداری کو دیکھ بھی رہا ہے۔ اس کے بارے میں یہ عقیدہ بھی نہیں ہوتا کہ اس کی اطاعت سے جنت ملتی ہے اور اس کی خلاف ورزی سے آدمی دوزخ کے عذاب میں گرفتار ہوتا ہے۔

اس کے برعکس اسلامی قانون خدا کا قانون ہونے کے سبب سے نہایت مقدس و محترم مانا جاتا ہے۔ وہ ہر مسلمان کے ایمان کی بنیاد ہوتا ہے جس کو مانے بغیر اس کا ایمان ہی درست نہیں ہوتا۔ اس کے دینے والے کے متعلق ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ وہ دلوں کے بھیدوں اور خلوت خانوں کے رازوں سے بھی واقف ہے۔ اس کی کھلی ہوئی خلاف ورزی تو درکنار اگر دل کے کسی گوشے میں اس سے انحراف کا وسوسہ بھی موجود ہو تو وہ اس سے بھی باخبر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کے متعلق ہر مسلمان کا یہ عقیدہ بھی ہوتا ہے کہ خدا کی رضا اس کے مانے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کے اندر دنیا کی صلاح بھی ہے اور آخرت کی فلاح بھی۔

۳۔ انسانی قانون کا اصلی رول انسانی زندگی کے اندر صرف منفی قسم کا ہے۔ جو چیز اس کو وجود میں لائی ہے خود اس کے اپنے ماہرین کے بیان کے مطابق وہ یہ ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے پر تعدّی اور دست درازی سے روکا جا سکے۔ اگر انسان کے اندر یہ خرابی نہ ہوتی تو اس کی سرے سے کوئی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ برعکس اس کے اسلامی قانون اپنی ضرورت صرف تعدّی اور دست درازی کی روک تھام ہی نہیں بتاتا بلکہ اپنا کام انسان کی پیدائش

رہنمائی بتاتا ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی ــــ خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، کی تہذیب و تکمیل کے لیے اس کا محتاج ہے، اس کے بغیر اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کی صحیح تربیت ممکن ہی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی قانون صرف ہمارے مروّجہ ضابطۂ دیوانی یا ضابطۂ فوجداری کے قسم کی دفعات پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ طہارت اور عبادت کا ایک ضابطہ بھی ہے۔ تربیت اخلاق اور تزکیۂ نفس کے قواعد اور احکام بھی ہیں، اور اجتماعی و معاشرتی تہذیب و اصلاح کے اُصول و آئین بھی ہیں۔ انسانی قانون کے اندر اگر اس طرح کی کچھ چیزیں داخل ہوئی ہیں تو وہ بعد کی پیداوار اور اس کے اصلی مزاج کے خلاف ہیں۔ لیکن اسلامی قانون میں یہ ساری چیزیں اس کے اپنے مزاج کے اقتضاء سے داخل ہوئی ہیں۔ حالات زندگی کی اصلاح و تہذیب میں اس کا رول منفی سے زیادہ مثبت ہے۔ ایک اسلامی حکومت دوسری حکومتوں کے مقابلہ میں زیادہ وسیع ذمہ داریاں رکھتی ہے، اس کو عوام کی زندگی کے ان گوشوں پر بھی نگاہ رکھنی پڑتی ہے جو اس زمانہ میں حکومت کی نگرانی سے بالعموم الگ خیال کیے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ اسلامی قانون کی یہی وسعت اور ہمہ گیری ہے۔

۴۔ انسانی قانون کی اصل بنیاد، جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے، عرف و عادات اور رسوم و رواج پر ہے۔ خاندانوں اور قبیلوں میں جو باتیں رواج پکڑ گئیں انہی چیزوں نے ضرورت کے وقت قانون کا درجہ حاصل کر لیا۔ ان میں علمی اور فلسفیانہ نظریات کی آمیزش بعد میں زمانہ کی ترقی سے ہوئی ہے۔ اس کے ابتدائی مواد میں خاندانی اور قبائلی روایات و تعصبات کی تمام تنگ نظریاں ملی ہوئی ہیں۔ البتہ اب اس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جانے لگا ہے کہ اٹھارویں صدی کے اواخر سے اس کو رحم، عدل، مساوات اور انسانیت کی عالمگیر بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس کے معنیٰ دوسرے الفاظ میں یہ ہوئے کہ اس کے ماضی اور حاضر میں کوئی ربط نہیں ہے اور اس کے مستقبل کے بارہ میں بھی کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کیا شکل اختیار کرے گا۔

اس کے برعکس اسلامی قانون روز اول سے انسانی فطرت اور خدا کی دی ہوئی ہدایات پر مبنی ہے اس میں خاندانوں اور قبیلوں کے رجحانات و تعصبات کو کوئی دخل نہیں ہے، رسوم و

رواج اس میں اگر کوئی دخل رکھتے ہیں تو صرف ایک محدود گوشہ کے اندر رکھتے ہیں اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ وہ خدا اور رسول کی کسی ہدایت کے خلاف نہ ہوں۔ اس کے ماضی اور حاضر میں گہرا ربط ہے اور مستقبل میں اس کی ترقی کے خطوط بھی بالکل معین ہیں۔ انسانی قانون، عدل، مساوات اور رحم وانسانیت کی جس منزل تک اب پہونچنے کی آرزو کر رہا ہے۔ اسلامی قانون کا پہلا ہی قدم وہیں سے اٹھا ہے بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہیں ہے کہ اگر انسانی قانون اپنی اس معراج آرزو کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو جس دن اس کو یہ کامیابی حاصل ہوگی اسی دن وہ اسلامی قانون میں تبدیل ہو جائے گا۔

۵۔ قانون کے اندر وحدت ویکسانی ایک مطلوب شے ہے۔ اس کے بغیر اس کا اصلی مقصد قیام عدل پورا نہیں ہو سکتا۔ لیکن انسانی قانون کے متعلق اوپر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اس میں وحدت ویکسانی اول تو ہے نہیں اور اگر کسی حد تک ہے بھی تو وہ اس کے اپنے مزاج کے تقاضے سے وجود میں نہیں آئی ہے بلکہ اس کو مصنوعی طور پر ریاست نے اپنے مصالح کے تحت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اب بین الاقوامی ادارے ہیں جو اس بات کے لیے زور لگا رہے ہیں کہ قوموں قوموں کے قوانین میں جو اختلافات ہیں وہ دور ہوں اور ان کے اندر یک رنگی وہم آہنگی پیدا ہو۔

اس کے برعکس اسلامی قانون کا سرچشمہ چونکہ خاندانوں اور قبیلوں کی روایات اور ان کے رسوم وعادات نہیں ہے بلکہ اللہ وحدہٗ لاشریک کی شریعت ہے اس وجہ سے وحدت ویکسانی اس کی اپنی فطرت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام نبیوں کو ایک ہی قانون عطا فرمایا۔ اس میں اگر کوئی فرق تھا تو وہ محض ظاہری فرق تھا۔ قرآن نے اسلامی قانون کی اس یکسانی کی تصریح سورۂ شوریٰ کی آیت ۱۳ میں اس طرح فرمائی ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا	اور تمھارے لیے بھی اسی دین کو مشروع کیا ہے جس کی تعلیم نوح کو دی تھی۔ اور اے پیغمبر یہ دین بھی جس کی وحی ہم نے تمھاری طرف کی ہے وہی ہے اور یہی دین ہے جس کو تعلیم ہم نے ابراہیمؑ، عیسیٰؑ اور موسیٰؑ کو

تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ۵ دی تھی کہ اس دین کو قائم کرو اور اس میں
اختلاف نہ ڈالو۔

اس میں اگر اختلاف واقع ہوا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ یہ اختلاف اس کے اپنے مزاج کا تقاضہ تھا۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ قوموں نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی، تعصب اور تنگ نظری کے سبب سے اپنے اپنے دائروں کے اندر ہی اپنے کو محبوس کر لیا اور اسلامی قانون کی ترقی کے ساتھ ساتھ خود بھی آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کی۔ مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ نے اسلام کی جو مخالفت کی قرآن نے اس کو ان کی بغی یعنی ضد اور عداوت کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اگر ان کے اندر ضد اور تعصب کی جگہ حق پسندی موجود ہوتی تو وہ جس طرح حضرت ابراہیمؑ و حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا رسول مانتے تھے اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی خدا کا رسول مانتے اور تمام نبیوں کی تعلیم پر بغیر کسی امتیاز کے عمل کرتے۔

اِسلامی تاریخ کا ایک بہروپیا
مُختار بن اَبُو عُبید ثقفی

(از جناب ڈاکٹر خورشید احمد فاروق)

مختار بن ابی عبید الثقفی، اسلامی تاریخ کی ایک معروف شخصیت ہے۔ وہ ایک حوصلہ مند عرب تھا۔ یزید کی تخت نشینی کے بعد جب ملت اسلامیہ کے تفرقوں میں ایک نیا اُبال آیا تو اُس نے بھی اقتدار کا خواب دیکھا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت اور پھر یزید کی وفات نے اس کے لیے قسمت آزمائی کا میدان کھول دیا۔ وہ وابستگانِ اہل بیت میں سے تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ سے کوفہ میں رہا ہوا تھا۔ اور یزید کے زمانہ میں نکال دیا گیا تھا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد قصاص اہل بیت کا علم اٹھا کر اور حضرت محمد بن الحنفیہ کی خلافت کا ڈھونگ رچا کر وہ کوفہ پہونچا۔ اٹھارہ مہینے تک کوفہ اور اس کے ارد گرد اُس کا قبضہ رہا۔ اپنے اقتدار کے لیے اُس نے جو جو جتن کیے ان میں ایک مذہبی بہروپ بھی تھا۔

"حضرت عمر کے سرکاری خطوط" کے مرتب جناب خورشید احمد فاروق نے مختار پر اپنی مختصر کتاب "قرن اول کا ایک مدبر" میں مختار کے اس رُخ پر

بھی روشنی ڈالی ہے۔ حال ہی میں اس کتاب کے مطالعہ کا اتفاق ہوا اور اس میں جو چیز سب سے
زیادہ قابل عبرت نظر آئی یہی چاہا کہ اس سے استفادہ میں ناظرین الفرقان کو بھی شریک
کر لیا جائے ——— مرتب

مختار کو اپنی مقصد برآری کے لیے پرواہ نہ تھی کہ اُس کو کیا بننا پڑتا ہے۔ اس کی زندگی
کا انداز بھی اس قسم کی بہروپ کے لیے ساز گار تھا کیونکہ وہ اپنی روزمرہ زندگی میں ایک سنجیدہ
دیندار آدمی کی طرح رہتا تھا۔ وہ ہر اہم موقع پر مسجع الہامی زبان استعمال کرتا اور سامعین
کو اپنی لیاقت سے مرعوب کیا کرتا' قید سے پہلے' قیدخانہ کے اندر اور قصر امارت میں داخل ہونے
تک بھی اُس نے ایک مکمل الہامی شخص کی سیرت رکھی۔ محل کے محاصرہ سے پہلے گورنر کی فوج
سے جب اُس کا مقابلہ ہوا تو وہ روزہ رکھے ہوئے تھا۔ اُس کی فوج کے کچھ لوگوں میں اس موضوع
پر گفتگو ہوئی' ایک نے کہا: امیر روزہ نہ رکھتے تو فوج کی کمان زیادہ اچھی طرح کر سکتے' دوسرا
بولا: امیر معصوم ہیں اُن کے بارے میں ایسی بات نہ کہو' وہ اچھے برے کو تم سے بہتر جانتے
ہیں۔ ابن سبا کی تحریک کی بدولت حضرت علی کی غیب دانی اور الہامیت کے بہت سے قصے
کوفہ کے شیعوں اور ضعیف الاعتقاد موالی میں مشہور ہو گئے تھے' مثلاً صفین کو جاتے ہوئے
میدان کربلا میں حضرت حسین سے اُن کی یہ پیش گوئی کہ اس جگہ اہل بیت مارے جائیں گے'
یا پستان والے خارجی کے بارے میں اُن کی پیش گوئی اور نہروان کی جنگ میں اُس کا پورا
ہونا۔ مختار نے حضرت علی کے اس کردار کی نقالی کی' وہ بلند آہنگی سے مجمع میں مستقبل کے بارے
میں پیشن گوئیاں کرتا اور اپنے متبعین بالخصوص غلاموں اور موالی کو اُن کے ذریعہ خوشحالی
اور کامرانی کی بشارتیں دیتا اور اُن کے دلوں کو گرماتا۔

بہروپ میں توسیع

جب اس کو حکومت حاصل ہوئی اور کوفہ' شام اور حجاز میں دشمن سر اٹھانے لگے تو
اس کو اپنا بہروپ بڑھانا پڑا' دشمن کے مقابلہ میں اپنی فوجوں کا حوصلہ بڑھانے یا ان کی

اخلاق و توانائی برقرار رکھنے کے لیے وہ ظاہر کرتا کہ مافوق الانسان قوتیں اس کی تابع ہیں جن کی بدولت وہ ناقابل تسخیر ہے۔ اس کی روحانی قوت اتنی تیز ہے کہ غیب کے پردوں کو چیر کر مستقبل تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ کاہن کے درجہ سے ترقی کر کے نبی کے درجہ تک پہنچ گیا، اور اگرچہ اس نے اپنی نبوت کا کبھی برملا اعلان نہیں کیا وہ ہر نفسیاتی موقع پر ایسی تقریریں اور باتیں خوب کیا کرتا جو اس کی غیب دانی پر دلالت کرتیں، بعض راویوں نے تو اس بات کی بھی تصریح کی ہے کہ وہ اپنی لڑکی کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتا: صلی اللہ علی عیسی بن مریم، اس رمز کی تشریح کرتے ہوئے اس کے ایک رازدار نے بتایا کہ وہ کہتا ہے کہ میری لڑکی مسیح ابن مریم سے بیاہی جائیگی[1]

ایک کرسی

اس ہیر پھیر میں ایک کرسی بہت کام آئی۔ حضرت علی کی بہن کے پوتے کا بیان ہے کہ میرے پاس خرچ نہ رہا تھا اور مجھے روپیہ کی سخت ضرورت تھی، میں ایک دن گھر سے نکلا تو اپنے پڑوسی تیلی کے ہاں ایک کرسی دیکھی جس پر میل کچیل جما ہوا تھا، میں نے دل میں کہا کیوں نہ اس کے بارے میں مختار سے جا کر کوئی چال چلیں! میں گھر لوٹا اور تیلی کے گھر سے کرسی منگوائی، پھر مختار کے پاس گیا اور کہا: میں ایک بات آپ سے چھپاتا رہا ہوں لیکن اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس سے باخبر کر دوں، مختار نے پوچھا وہ بات کیا ہے، تو میں نے کہا: میرے پاس ایک کرسی ہے جس پر جعدہ بن ہبیرۃ (راوی کے والد اور حضرت علی کے بھانجے) بیٹھا کرتے تھے، لوگ کہتے ہیں کہ اس میں حضرت علی کا غیبی اور روحانی علم حلول کر گیا ہے" مختار نے کہا حیرت ہے تم آج تک اتنی اہم بات چھپاتے رہے، اس کو ابھی منگواؤ، ابھی منگواؤ۔" کرسی لائی گئی، اس کو دھویا جا چکا تھا، میل کچیل کے نیچے کی لکڑی تیل پینے سے خوب چمکدار ہو گئی تھی، اس پر کپڑا ڈال دیا گیا، مختار نے مجھے چھ ہزار روپے کا عطیہ دیا اور جامع مسجد میں کرسی رکھوا کر تقریر کی پچھلی

---

[1] انساب الاشراف ۵/۲۳۶

قوموں میں کوئی بات ایسی نہیں ہوئی جس کی نظیر ہمارے ہاں نہ موجود ہو، بنو اسرائیل کے ہاں تابوت تھا جس میں آلِ موسیٰ و ہارون کا باقی ماندہ علم حلول کر گیا تھا، ہمارے یہاں یہ کرسی تابوت کی طرح ہے[1]۔ یہ کہہ کر اس نے کرسی کا غلاف ہٹانے کا حکم دیا، جب کرسی کھلی تو سبائی ذہنیت کے لوگوں نے کھڑے ہو کر نہایت عقیدت سے ہاتھ اٹھا کر تین بار تکبیریں کہیں[2] کرسی پر ریشم کا غلاف چڑھا دیا گیا، وہ ایک مقدس ادارہ بن گئی، مختار کے بعض مقرب اس کے مجاور ہو گئے، مشہور صحابی ابو موسیٰ اشعری کے صاحبزادے اس کے ناظم امور مقرر ہوئے، یہ کرسی غیبی قوتوں کی سرچشمہ تھی، اس کا طواف کیا جاتا، ہر خطرہ اور مصیبت میں اس سے مدد مانگی جاتی، پانی اس کی معرفت برسوایا جاتا، جنگ میں اس سے نصرت طلب کی جاتی، جب مختار کی فوجیں لڑنے نکلتیں تو آگے آگے کوفہ سے کچھ دور تک ایک بھورے خچر پر یہ کرسی جاتی، اس کے دائیں بائیں مجاور بڑے احترام سے اس کو پکڑتے ہوئے چلتے۔ شہر سے کچھ دور نکل کر لوگ اس کے سامنے کھڑے ہوتے اور اس کی طرف ہاتھ پھیلا کر گڑگڑاتے اور دعائیں مانگتے اور اس کو خدا کی طرح مخاطب کرتے، ان مراسم کے بعد فوج آگے بڑھ جاتی اور کرسی کو پورے احترام کے ساتھ کوفہ واپس پہونچا دیا جاتا[3]۔ کرسی کے ظہور کے بعد مختار کی پہلی جنگ شام کی فوجوں سے ہوئی جو ابن زیاد کی قیادت میں عراق پر چڑھی آ رہی تھیں، مختار کی فوج کرسی سے استعانت لے کر گئی تھی، اتفاق کی بات کہ جنگ میں شامیوں کو شکست ہوئی اور ان کے بہت سے آدمی مارے گئے، اس واقعہ نے شیعوں کو کرسی کی کرامت

---

[1] تاریخ الامم، ۷/۱۴۱۔

[2] بعض مؤرخوں نے کرسی کا قصہ دوسرے انداز سے پیش کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ مختار نے کوفہ پر قابض ہونے کے بعد ایک دن جعدہ بن ہبیرہ (حضرت علی کے بھانجے) کے لڑکوں سے کہا: "علی ابن ابی طالب کی کرسی مجھے لا کر دو۔" انھوں نے کرسی کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی، مختار بولا: حماقت نہ دکھاؤ، کرسی لا کر دو، اس اصرار سے لڑکوں نے نتیجہ نکالا کہ وہ محض کرسی چاہتا ہے، اور جو کرسی بھی اس کو لا کر دی جائے گی وہ قبول کر لے گا، چنانچہ انھوں نے ایک کرسی لا کر دی، اور کہا کہ یہ وہی کرسی ہے جس پر حضرت علی بیٹھا کرتے تھے"۔
—— تاریخ الامم ۷/۱۴۱

[3] انساب الاشراف۔ ۵/۲۴۲۔

کو عید گاہ تک منتقل کر دیا، بعض اعیانِ شہر نے احتجاج کیا تو کرسی چھپا دی گئی لیکن بلاذری کے راوی کہتے ہیں کہ مختار کے ساتھی اس کے قتل تک کرسی سے رجوع کرتے رہے۔"

جبرئیل اور میکائیل

ایک بڑے عرب کا بیان ہے کہ میں مختار سے ملنے گیا تو دو تکیے اس کے سامنے رکھے تھے، مجھے دیکھ کر اس نے غلام کو آواز دی اور میرے لیے تکیہ منگوایا، میں نے پوچھا یہ تکیے کس کے لیے ہیں تو مختار بولا ایک سے ابھی جبرئیل اور دوسرے سے میکائیل اٹھ کر گئے ہیں۔[1]

میدانِ جنگ میں فرشتے

مختار کے خلاف غیر شیعی اکابر کوفہ کی بغاوت کے بعد ...... ایک مجرم قید ہو کر آیا، اور مختار کو خوش کرنے کے لیے کہنے لگا: اہل کوفہ سے آپ کی لڑائی کے دوران میں نے دیکھا کہ فرشتے ابلق گھوڑوں پر آپ کی طرف سے لڑ رہے ہیں۔" مختار واقعی مسرور ہوا اور اس نے مجرم کو حکم دیا کہ مسجد میں جا کر لوگوں کو اپنے تجربہ سے آگاہ کرے، اس انکشاف سے حامیانِ اہل بیت کے دلوں میں مختار کی عظمت اور زیادہ بڑھ گئی، مجرم کو معاف کر دیا گیا۔[3]

عرب و غیر عرب مختار کی غیب دانی کے قائل

امام شعبی نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیر عرب ہی نہیں بلکہ عرب بھی مختار کو غیب داں سمجھتے تھے، مختار کی فوجیں ابراہیم بن اشتر کی کمان میں عبیداللہ بن زیاد سے لڑنے گئی ہوئی تھیں، شہر میں یہ افواہ مشہور ہوئی کہ ابراہیم مارا گیا اور عبیداللہ فتح کا جھنڈا لہراتا ہوا کوفہ کی طرف چلا آ رہا ہے۔ مختار نے فوراً رسالے تیار کیے اور عبیداللہ سے لڑنے

---

[1] انساب الاشراف ۵/۲۴۲ [2] انساب الاشراف ۵/۲۴۲

[3] انساب الاشراف ۲/۲۴۴

نکلا۔ اس کی فوج ستانے اور رسد لینے مدائن میں خیمہ زن ہوئی شعبی کہتے ہیں کہ ایک دن مختار اپنی تقریر میں ہمیں تلقین کر رہا تھا کہ ہم دشمن کا بہادری سے مقابلہ کریں اور اہل بیت کے خون کا انتقام لیں کہ اس کو شامیوں کی شکست اور عبید اللہ کے قتل کی خبر موصول ہوئی، مختار نے باغ باغ ہو کر حاضرین سے کہا: خدائی فوجدارو کیا میں نے تم کو پہلے ہی اس فتح کی بشارت نہیں دے دی تھی، سب نے عقیدت اور جوش سے اقرار کیا، اس وقت قبیلہ ہمدان کا ایک شخص جو میرے پاس بیٹھا تھا بولا، شعبی اب بھی تم کو یقین نہیں آیا؟ میں نے پوچھا کس بات کا؟ ہمدانی عرب۔ "مختار کی غیب دانی کا۔" میں نے کہا: میں تو ہرگز باور نہیں کر سکتا، ہمدانی عرب۔ کیا انھوں نے پیشین گوئی نہیں کی تھی کہ شامی ہار جائیں گے، میں نے کہا: انھوں نے تو کہا تھا شامیوں کو نصیبین (جزیرہ کا شہر) میں شکست ہوگی، اور شکست ہوئی ہے۔ ان کو خازر (ضلع موصل) میں!" وہ عرب کھسیا کر کہنے لگا: بخدا تم اس وقت تک ایمان نہ لاؤ گے جب تک تم پر عذاب الیم نازل نہ ہوگا[1] یہ واقعہ ۶۷ھ کا ہے جب مختار کا آفتاب اقبال نصف النہار پر تھا۔

مسعودی لکھتا ہے: کوفہ میں مختار کی طاقت اور اس کے متبعین کی تعداد خوب بڑھ گئی۔ بہت سے لوگ اس کی تحریک میں داخل ہو گئے، وہ لوگوں کو ان کے عقیدہ اور رجحان کے مطابق دعوت دیتا، کچھ لوگوں سے کہتا کہ محمد بن حنفیہ امام ہیں اور میں ان کی خلافت کی مہم چلانے پر مامور ہوں۔ اور کچھ لوگوں پر ظاہر کرتا کہ میرے اوپر وحی آتی ہے اور جبرئیل مجھے غیب کی باتیں بتاتا ہے[2]"

مختار کا ایک خطبہ

بلاذری نے انساب الاشراف میں مختار کے متعدد مقفیٰ خطبے بیان کیے ہیں جو قرآنی یا الہامی اسلوب میں ہیں، جن کو وہ نفسیاتی موقعوں پر اپنے متبعین یا مخالفین کو مرعوب

---

[1] تاریخ الامم ۱۴۲/۱۰ و انساب الاشراف ۲۵۰/۵ [2] مروج الذہب مسعودی مصری حاشیہ تاریخ کامل ابن اثیر ۱۵۶/۱۰ نیز کتاب المعارف ابن قتیبہ مصری ۱۹۳۴ء ص ۱۴۴

دو ہوش کرنے کے لیے دیا کرتا تھا، ان میں سے ایک خطبہ جس میں اس نے اپنی پردماغی کی وضاحت بھی کی ہے، یہاں پیش کیا جاتا ہے:

"قسم ہے بلد امین کے رب کی اور طورسینین کی حرمت کی، میں کمینے شاعر کو قتل کر کے رہوں گا جس کا نام اعشیٰ ناعطین ہے، جو جلولا سے پکڑی ہوئی باندی کا لڑکا ہے، جس پر میں نے احسان کیا لیکن جس نے احسان فراموشی کی، پہلے میری پیروی کی پھر بے وفائی برتی اکل بھی ذکر اس کو ذبح کیا جائے گا، پھر وہ جہنم رسید ہوگا اور عذاب اکبر کا مزہ چکھے گا، تباہ ہو ابن ہمام لعین جس کا تعلق بنو اسد سے ہے جو شیطانوں کے دوست ہیں اور کافروں کے احباب، جنھوں نے میری طرف جھوٹی باتیں منسوب کی ہیں اور میرے اوپر بے ہودہ بہتان لگائے ہیں، جنھوں نے مجھے کذاب کا لقب دیا ہے حالانکہ میں سچا آدمی ہوں جس کی صداقت کی شہادت دی جا چکی ہے، وہ مجھے کاہن کہتے ہیں حالانکہ میں برے بھلے میں بڑا تمیز کرنے والا ہوں اور صاحب کرامات ہوں۔" وَرَبِّ البَلَدِ الامين وحرمة طورسينين لا قتلن الشاعر الهجين أعشى الناعطين وسوء برق البارقين، ابن الامة من جلولاء خانقين الذى مننتُ عليه فكفر وتابعنى فغدر وغدا أيلفى فيخر ثم يصير الى سقر فيذوق فيها العذاب الاكبر، وويلُ لابن همام اللعين وأخى الأسديين اولئك اولياء الشياطين وإخوان الكافرين الذين قرفوا عَلَىَّ الأَبَاطِيلَ وَتَقَوَّلُوا عَلَىَّ الاقاويل فسمونى كذابا وأنا الصادق المصدوق وكاهناً وانا العجيب الفاروق۔[1]

اعشیٰ ہمدان کوفہ کا ممتاز شاعر تھا، جس کی شاعری ہجو اور دوا نو نگاری کے لیے مشہور ہے، امام شعبی اس کے بہنوئی تھے، اس کا شمار کوفہ کے فقہاء اور قراء میں ہوتا تھا لیکن جب قرآن اور فقہ سے اس کی تمنائیں پوری نہ ہوئیں تو وہ شاعر ہوگیا، اور ہجو و تعریف کے ذریعہ عزت، دولت اور رسوخ حاصل کیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں وہ مختار کا منوب تھا لیکن بعد میں

[1] انساب الاشراف ۵/ ۲۳۵-۲۳۶

کسی وجہ سے ناراض ہوگیا اور اس کے بہروپ کا شعر میں مذاق اڑانے لگا۔ (اغانی ابو الفرج اصفہانی مصر ۵/۱۴۶)

ابن ہمام سلولی بھی کوفہ کا شاعر تھا جس کی وفاداریاں عثمان غنی اور ان کے خاندان سے وابستہ تھیں، پھر وہ ابن زبیر کا وفادار ہوگیا اور جب کوفہ میں ابن زبیر کی حکومت ختم ہوئی اور مختار کا تسلط ہو چکا تو اس نے مختار کی مدح میں قصیدہ لکھا اور انعام حاصل کیا، لیکن حمایتِ اہل بیت کی ایک جماعت اس کو منافق اور عثمانی ہی سمجھتی رہی اور اس کو ستاتا رہا کہ وہ بھاگ گیا اور مختار اور اس کے متبعین کی ہجو کی۔ (انساب الاشراف ۵/ ۲۲۹۔)

اپنے بارے میں مختار کا اعتراف۔

اس بات کا سب سے بڑا ثبوت کہ مختار ایمانداری سے نہ تو خود کو نبی سمجھتا تھا اور نہ کاہن بلکہ اپنی مقصد برآری کے لیے اور اپنے متبعین کی متلون مزاجی اور عدم اعتمادی کے پیش نظر کبھی اس کو کاہن، کبھی غیب داں اور کبھی نبی کا روپ بھرنا پڑتا، اس کا وہ اعتراف ہے جو مرنے سے کچھ پہلے اس نے اپنے مقرب سے کیا، یہ وہ موقع تھا جب مصعب بن زبیر (برادر ابن زبیر) کی فوجیں اس کے محل کا گھیرا ڈالے تھیں، اس کے اقبال کا آفتاب غروب ہو رہا تھا، اس کے بہروپ کا پول کھل چکا تھا، اس کے ساتھیوں کے حوصلے پست ہو چکے تھے اور ان کا دل جنگ و قتال سے اُچاٹ ہو چکا تھا، ایک ماہ سے زیادہ انتظار کرنے کے بعد بھی جب اُن کا جمود نہ ٹوٹا تو مختار اپنے جانثاروں کی ایک ٹولی کے ساتھ محل سے نکلا اور اپنے ایک مقرب سے جس کا نام سائب تھا کہنے لگا: کہو کیا رائے ہے؟ سائب: صوابدید تو آپ کی ہے، آپ اپنی رائے بتائیے، مختار: صوابدید میری یا خدا کی؟ ارے احمق میری حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ میں ایک بڑا عرب ہوں، میں نے دیکھا کہ ابن زبیر حجاز پر قابض ہو گئے۔ مروان شام پر، نجدہ (خارجی لیڈر) یمامہ پر، میں کسی سے کم نہ تھا میں نے ادھر کے علاقوں پر قبضہ کر لیا، اور ان کی طرح اقتدار حاصل کیا، ہاں یہ ضرور ہے کہ میں نے اہل بیت کے انتقام کا بیڑا اٹھایا جب کہ دوسرے عرب ادھر سے غافل رہے اور ان کے قتل کرنے والوں کو فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ (تاریخ الاسلام ۲/ ۲۰)

درس قرآن

۳۰ رجون ۱۹۶۸ء

حالتِ سفر اور میدانِ جنگ میں نماز

(حمد وصلوٰۃ، اور اعوذ باللہ اور بسم اللہ کے بعد)

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ إِنَّ الْكٰفِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُبِينًا ۝ .... الی قولہ تعالیٰ
إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتٰبًا مَوْقُوتًا ۝

(سورۃ النساء آیات ۱۰۱ تا ۱۰۳)

(ترجمہ) اور جب تم سفر میں نکلو تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم نماز میں قصر کیا کرو، (یعنی چار رکعت والی نماز دو رکعت پڑھو) اگر تمھیں یہ اندیشہ ہو کہ اہلِ کفر تمھارے ساتھ کوئی شرارت اور فتنہ پردازی کریں گے، بیشک یہ کفار تمھارے کھلے ہوئے دشمن ہیں (یہ ہر نا کردنی کر سکتے ہیں)[101] ـــــ اور اے پیغمبر جب تم (میدان جنگ میں) مجاہدین کے درمیان موجود ہو اور ان کو نماز پڑھاؤ (یعنی نماز میں ان کی امامت کرو) تو چاہیے کہ لشکرِ مجاہدین کا ایک حصہ (نماز پڑھنے کے لیے) تمھارے ساتھ کھڑا ہو جائے اور وہ اپنے اسلحہ ساتھ لے لے (یعنی پوری طرح مسلح ہو کر آپ کے ساتھ نماز میں شریک ہو) پھر جب یہ لوگ سجدہ کر لیں تو یہ تمھارے پیچھے ہو جائیں اور (ان کی جگہ) لشکر کا وہ دوسرا حصہ آ جائے جو نماز میں ابھی شریک نہیں ہوا تھا، وہ اب آپ کے ساتھ نماز میں شریک ہو جائے اور یہ بھی

(پورا) دفاعی سامان اور اپنے اسلحہ لے کر نماز میں شریک ہوں) ان کافروں کی یہ دلی تمنا ہے کہ تم اپنے اسلحہ اور سامان سے ذرا غافل ہو تو یہ تم پر ایک دم ٹوٹ پڑیں ــــ اور اگر (ایسی صورت ہو کہ) بارش (وغیرہ) کی وجہ سے یا بیماری کے سبب تمہیں تکلیف ہو (اور پورا سامان جنگ ساتھ لے کر نماز میں شرکت اور نقل و حرکت مشکل ہو) تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ (دشمن پر حملہ میں کام آنے والے اسلحہ) اتار دو (لیکن) دفاعی سامان ضرور ساتھ لے لو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کافروں کے لیے نہایت رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔(۱۰۲)

پھر جب تم نماز (اس طریقہ پر) ادا کر چکو تو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے کی حالت میں (یعنی ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے رہو (اور اس سے غافل نہ ہو) پھر جب تمہاری حالت اطمینان والی ہو جائے (یعنی دشمن کی طرف سے خطرہ نہ رہے) تو نماز کو (مقررہ طریقہ پر) خوب اچھی طرح اہتمام کے ساتھ پڑھو۔ نماز اہل ایمان پر وقت کی پابندی کے ساتھ فرض ہے۔(۱۰۳) (اس لیے عام حالات میں ٹھیک وقت پر پورے سکون و وقار اور دل کی توجہ کے ساتھ ادا کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے)

یہ سورۂ نساء کا پندرھواں رکوع ہے۔ اس سے پہلے رکوع میں ہجرت کی اہمیت بیان فرمائی گئی تھی اور اس کے بارے میں ہدایات دی گئی تھیں، اور اس سے پہلے جہاد کا بیان چل رہا تھا۔ اس رکوع میں پہلے تو صرف ایک آیت میں بحالتِ سفر نماز میں قصر کرنے کا حکم بیان فرمایا گیا ہے اور اس کے بعد خاص میدان جنگ میں جب دشمن کے حملہ کا خطرہ ہو، نمازِ باجماعت ادا کرنے کا ایک خاص طریقہ بتایا گیا ہے جس کو "صلوٰۃ الخوف" کہتے ہیں۔ آپ میں سے اکثر بھائیوں نے غالباً اس صلوٰۃِ خوف کا طریقہ نہ سنا ہوگا اور آپ کو تعجب ہوگا کہ کوئی نماز اس طرح بھی پڑھی جاتی ہے! ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیتوں کے نازل ہونے کے بعد مختلف غزوات میں اسی طریقہ پر نماز پڑھی اور پڑھائی۔ حدیثوں میں آپ کی ان نماز

کا تفصیل سے ذکر آتا ہے۔ یہ طریقہ کیا ہے، اس کو ان شاء اللہ آیات کی تشریح کے ضمن میں ہم بتاؤں گا، پہلے یہ عرض کرنا ہے کہ جہاد اور ہجرت کے بیان کے ساتھ سفر اور حالتِ جنگ کی نماز کے احکام اور طریقہ بیان کرنے کی کیا خاص حکمت ہے؟ ۔۔۔۔۔ اس کی مختلف حکمتیں بیان کی گئی ہیں لیکن میرے نزدیک سب سے بڑی حکمت اس کی یہ ہے کہ مسلمان اچھی طرح سمجھ لیں کہ اسلام کے نظامِ زندگی میں نماز اتنی اہم چیز ہے کہ سفر کی بے اطمینانی کی حالت میں اور خاص میدانِ جنگ میں بھی جب دشمن کے اچانک حملہ کا خطرہ ہو اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، بلکہ وہ وقت پر ادا کرنی ہوگی اور تا امکان جماعت کے ساتھ ادا کی جائیگی اور یہ اس لیے کہ اسلامی جہاد کا مقصد دنیا کی دوسری قومی اور ملکی جنگوں کی طرح یہ نہیں ہے کہ مسلمان قوم یا کسی مسلمان ملک کو غلبہ اور اقتدار حاصل ہو اور دنیا میں اُس کا بول بالا اور اُس کا جھنڈا اونچا ہو، بلکہ جہادِ اسلامی کا مقصد صرف یہ ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو، دنیا میں بندگی، خدا پرستی اور فرمانبرداری والی زندگی کا رواج ہو، شر و فساد ختم ہو، فسق و فجور کا خاتمہ ہو اور اس کی جگہ نیکی اور خدا ترسی کا دور دورہ ہو ۔۔۔۔ اس بارے میں خود مسلمانوں کے ذہنوں اور ان کے اندازِ فکر کو صحیح رکھنے کے لیے اور صحیح اسلامی لائن پر ان کی تربیت کے لیے یہ ضروری تھا کہ عین میدانِ جنگ میں دشمن فوج کے حملہ کے خطرہ کی حالت میں بھی نماز کا وقت آ جانے پر وہ نماز ادا کریں اور اُن کے دشمن بھی اُن کو اس حال میں دیکھیں کہ وہ میدانِ جنگ میں بھی اللہ سے غافل نہیں ہوتے، اُس کی عبادت کو ہر چیز پر مقدم رکھتے ہیں اور جب وقت آ جاتا ہے تو اُس کے حضور میں نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں اور رکوع و سجود کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کو دشمن کے حملہ کا خطرہ ہو۔

اس کے علاوہ یہ بھی امکان تھا کہ جن مجاہدین کی پوری تربیت نہ ہوئی ہو، شیطان انھیں سکھائے کہ وہ تو سر سے کفن باندھ کر خدا کی راہ میں نکلے ہوئے خدا کے سپاہی ہیں، اُن کا تو چلنا پھرنا، اُٹھنا، بیٹھنا حتیٰ کہ کھانا پینا اور سونا بھی عبادت ہے، ایسی حالت میں خاص کر جب لشکرِ اسلام ہتھیار بند ہو کر دشمن فوج کے سامنے صف بستہ ہو اور دشمن بھی کیل کانٹے سے بالکل تیار ہو تو ایسی صورت میں تو میدانِ جہاد کی یہ صف بندی نماز کی صف بندی کے قائم مقام ہو جانی چاہیے اور مجاہدین کو نماز میں مشغول ہونے کا حکم نہ ہونا چاہیے۔ یہ دفاع کی مصلحت کے بھی

خلاف ہے ــــ تو جہاد و ہجرت کی آیات کے ساتھ ہی ان آیات میں صلوٰۃ خوف کا بیان فرما کر اس طرح کے شیطانی وسوسوں کا بھی سدّباب فرما دیا گیا اور واضح کر دیا گیا کہ جہاد جب ہی جہاد ہے جب اس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ رابطہ قائم رہے اُس کے احکام کی فرمانبرداری ہو، خاصکر نماز کا اہتمام ہو جو خدا کی بندگی اور اطاعت و فرمانبرداری کا مظہر اور اس کی نشانی ہے۔ جو جنگ خدا کی رضا جوئی اور اُس کے نماز جیسے احکام سے بے پروا ہو کر اور اُنکو پامال کر کے لڑی جائے وہ اللہ کی نگاہ میں جہاد نہیں سراسر فساد ہے ــــ ان آیات کا یہ سبق نہایت اہم ہے اور اس سے اسلام کی روح، اس کے بنیادی نقطۂ نظر اور اس کے نصب العین کو سمجھا سکتا ہے ــــ

ہمارے مولانا علی میاں کے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب مرحوم کو آپ میں سے اکثر حضرات نے دیکھا ہوگا، بالکل فرشتہ صفت انسان تھے، وہ بیان فرماتے تھے کہ اسی لکھنؤ میں مسلمانوں کے کسی قومی اور ملی مسئلہ کے سلسلہ میں کوئی میٹنگ بلائی گئی، ڈاکٹر صاحب بھی مدعو تھے اور شریک ہوئے، نماز کا وقت آیا تو ڈاکٹر صاحب نے انتظار کیا کہ خود داعی صاحبان ہی نماز کے لیے میٹنگ ملتوی کرنے کا اعلان کریں گے، جب کسی نے اس سلسلہ میں کچھ نہیں کہا اور تاخیر زیادہ ہونے لگی تو ڈاکٹر صاحب نے خود ہی لوگوں کو توجہ دلائی، ایک صاحب نے بڑی بے تکلفی سے فرمایا یہ بھی تو نماز ہی کا کام ہو رہا ہے۔

در اصل ہماری بربادیوں کے اسباب میں ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اسلام کے نام پر اسلامی احکام کو پامال کیا جاتا ہے۔

اب میں ایک ایک آیت کا مطلب بیان کرتا ہوں

پہلی آیت ہے "وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ إِنْ خِفْتُمْ أَن يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنَّ الْكَافِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِينًا ۝"

اس کا سادہ ترجمہ یہ ہے کہ جب تم سفر میں نکلو تو تمہارے لیے اس میں کوئی گناہ اور مضائقہ نہیں ہے کہ نماز میں قصر "یعنی کمی اور تخفیف کر دو، اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ کفار تمہارے ساتھ

کوئی فتنہ پردازی اور شرارت کریں گے، یہ کفار تمہارے کھلم کھلا دشمن ہیں"

اس آیت میں بحالتِ سفر نماز میں قصر کرنے کا حکم بیان فرمایا گیا ہے، اس میں کئی خاص باتیں خاص طور سے تشریح طلب ہیں۔ پہلی بات یہ کہ اس میں سفر کی کوئی حد نہیں بیان کی گئی یعنی یہ نہیں بتایا گیا کہ کم سے کم کتنی دور کا سفر کرنے والے کے لیے یہ سہولت اور رخصت دی جا رہی ہے، اسی طرح یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ قصر کس طرح کیا جائے گا۔ اور نماز میں کیا کمی اور تخفیف کی جائے گی۔

قرآن مجید کا یہ عام قاعدہ ہے کہ اس میں بطور متن کے اصولی حکم بیان فرما دیا جاتا ہے اس کی تفصیلات امت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپ کے عمل سے معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً قرآن پاک میں جا بجا نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن اس کے بارے میں یہ تفصیل کہ نماز کیسے پڑھی جائے اور کن کن وقتوں میں پڑھی جائے، یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپ کے طرز عمل سے معلوم ہوا ہے، اسی طرح آپ کی احادیث اور آپ کے مستقل طرز عمل سے قصر کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ قصر کا مطلب صرف اتنا ہے کہ چار رکعت والی نمازیں (یعنی ظہر، عصر، عشاء) دو رکعت پڑھی جائیں، فجر اور مغرب میں کوئی تخفیف نہیں۔ اسی طرح آپ کے اشارات اور طرز عمل سے امت کے ائمہ اور علماء نے اپنے اپنے فہم کے مطابق یہ سمجھا کہ کم سے کم کتنی مسافت کے سفر میں قصر کیا جائے گا۔

اسی طرح کی ایک دوسری تشریح طلب بات یہ ہے کہ اس آیت میں لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ (گناہ ہے) کے لفظ سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ نماز میں قصر کرنے کی صرف اجازت اور رخصت ہے اور قصر نماز پڑھنے والے کو کوئی گناہ نہ ہوگا اور اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ بہتر یہی ہے کہ سفر میں بھی نماز پوری پڑھی جائے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے نازل ہونے کے بعد سفر میں ہمیشہ قصر ہی کیا، ایک دفعہ بھی آپ سے ثابت نہیں کہ سفر میں آپ نے ظہر، عصر یا عشاء کی چار رکعت پڑھی ہوں، پھر اسی کے مطابق تمام اکابر صحابہ کا عمل رہا اس لیے اکثر ائمہ کے نزدیک سفر میں ہمیشہ نماز قصر ہی پڑھی جائے اور وہی افضل ہے۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ کے بارے میں وہ حضرات فرماتے ہیں کہ اس آیت میں یہ لفظ بالکل اسی طرح استعمال ہوا ہے جس طرح سورۂ بقرہ کی آیت "إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ

مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا
میں لَا جُنَاحَ استعمال ہوا ہے۔ اس آیت میں حج اور عمرہ کرنے والے کے لیے کہا گیا ہے کہ "لَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا" یعنی کوئی گناہ اور مضائقہ نہیں ہے کہ وہ صفا اور مروہ کی سعی کرے، حالانکہ یہ سعی مناسک حج میں سے ہے اور ضروری ہے تو جس طرح اس آیت میں لَا جُنَاحَ فرما کر صفا اور مروہ کی سعی کا حکم بیان فرمایا گیا ہے جو بجائے خود ضروری ہے، اسی طرح سورۂ نساء کی اس آیت میں لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فرما کر سفر میں قصر کا حکم دیا گیا ہے اور حضور کے طرز عمل سے معلوم ہو گیا کہ سفر میں ہمیشہ قصر ہی کرنا چاہیے ____ اور ان دونوں حکموں کے لیے گناہ کی نفی کا انداز بیان اختیار کرنے میں ایک خاص نکتہ ہے جس کو عربی داں حضرات ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

اسی طرح کا ایک اشکال اس آیت کے بارے میں یہ ہے کہ آیت کے آخری الفاظ "اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" سے مفہوم ہوتا ہے کہ قصر کا حکم اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ کافروں کی طرف سے کسی شرارت اور فتنہ پردازی کا خطرہ ہو، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر مسافر کو سفر میں اس طرح کا کوئی خطرہ اور اندیشہ نہ ہو اور امن و امان کی فضا ہو تو نماز میں قصر نہیں کیا جائے گا، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کا مستقل عمل یہ رہا کہ امن و امان اور پورے اطمینان کی صورت میں بھی سفروں میں ہمیشہ قصر ہی کیا گیا اور مسلم شریف میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے ایک دفعہ حضور سے پوچھا کہ اس آیت کے ان الفاظ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قصر کا حکم اُسی صورت میں ہے جب کہ سفر میں دشمنوں سے خطرہ ہو، اور الحمد للہ اب خوف و خطر کا وہ زمانہ ختم ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے اسلام اور مسلمانوں کو غالب کر دیا تو اب کیا حکم ہے؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "صَدَقَةٌ تَصَدَّقَ اللّٰهُ بِهَا عَلَيْكُمْ فَاقْبَلُوْا صَدَقَتَهٗ" یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ کرم فرمایا ہے کہ حالتِ اطمینان میں بھی قصر ہی کا حکم ہے، تم اللہ تعالیٰ کی اس عنایت کو شکریہ کے ساتھ قبول کرو، یعنی امن و اطمینان کی حالت میں بھی سفر میں قصر ہی پڑھو۔"

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہمیشہ یہی رہا۔ حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں (جبکہ قریب قریب پورے عرب پر اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی) مدینہ سے مکہ اور مکہ سے مدینہ تک کا سفر ایسی حالت میں فرمایا کہ اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ تھا یعنی کسی دشمن کی طرف سے کوئی خطرہ اور اندیشہ نہیں تھا، آپ نے اس پورے سفر میں چار[1] رکعت والی نمازیں دو[2] ہی رکعت پڑھیں۔ بہرحال مسئلہ یہی ہے اور اس پر قریب قریب اجماع ہے کہ امن واطمینان کی حالت میں بھی سفر کی نمازوں میں قصر کیا جائے گا۔ "اِنْ خِفْتُمْ" کے الفاظ سے جو اشکال ہوتا ہے اس کا ایک جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ یہ شرط احترازی نہیں ہے بلکہ آیت کے نزول کے وقت چونکہ صورتِ حال ایسی ہی تھی اس لیے ان الفاظ میں اس صورتِ حال کا ذکر کر دیا گیا ہے خود قرآن مجید میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً فرمایا گیا ہے "لَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا" (نہ مجبور کرو اپنی باندیوں کو زنا کی کمائی پر اگر وہ پاکدامنی چاہیں) ظاہر ہے کہ "اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا" (اگر باندیاں پاکدامنی چاہیں) حکم کی شرط نہیں بلکہ صورتِ حال کی طرف اشارہ ہے۔ اگر اس کو شرط کہا جائے تو مطلب یہ ہو جائے گا کہ اگر باندیاں پاکدامنی نہ چاہیں تو ان کو زنا کی کمائی کے لیے مجبور کیا جا سکتا ہے حالانکہ ظاہر ہے کہ آیت کا مدعا ہرگز یہ نہیں ہے بلکہ "اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا" صورتِ حال کی طرف اشارہ ہے بس اسی طرح "اِنْ خِفْتُمْ" کی شرط کو سمجھنا چاہیے۔

بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ "اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" کا تعلق اگلی آیت سے ہے جس میں صلوٰۃ خوف کا بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تائید بعض روایات سے بھی ہوتی ہے اور حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری میں اس کے بارے میں لکھا ہے "وهذا إن كان بعيداً من حيث النظم لكنه قريب من حيث المعنى" یعنی یہ اگرچہ عبارت کے نظم اور نحوی ترکیب کے لحاظ سے بظاہر بعید ہے لیکن معنی کے لحاظ سے یہی قریب ہے کہ اس کو صلوٰۃ خوف کے حکم سے متعلق کیا جائے اور اسی کی شرط قرار دیا جائے۔

اس کے بعد دوسری آیت ہے "وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ

طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوٓا۟ أَسْلِحَتَهُمْ فَإِذَا سَجَدُوا۟ فَلْيَكُونُوا۟ مِن وَرَآئِكُمْ وَلْتَأْتِ طَآئِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّوا۟ فَلْيُصَلُّوا۟ مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا۟ حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ ۔ الآیۃ۔

اس میں میدان جنگ کی خاص نماز (صلوٰۃ خوف) کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ جنگ کے میدان میں جب آپ خود بنفس نفیس مسلمان مجاہدین کے ساتھ موجود ہوں اور نماز کا وقت آجانے پر ان کو نماز پڑھائیں تو لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اُن میں سے ایک حصہ اپنے پورے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر آپ کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہو جائے اور دوسرا حصہ دشمن کی فوج کے سامنے ہر خطرہ کے مقابلہ کے لیے تیار کھڑا رہے پھر جب آپ پہلی رکعت کا سجدہ کر کے ایک رکعت پوری کرلیں تو لشکر کے جس حصہ نے آپ کے ساتھ یہ رکعت ادا کی ہے یہ اُس جگہ سے ہٹ کر پیچھے کی جانب دشمن کے مقابلہ پر چلا جائے اور دفاع کی ذمہ داری سنبھال لے اور دوسرا حصہ جو نماز میں شریک نہیں ہوا تھا وہ اب آکر اُس کی جگہ کھڑا ہو جائے اور دوسری رکعت میں آپ کے ساتھ شریک ہو جائے اور یہ لوگ بھی اپنے پورے اسلحہ کے ساتھ نماز میں شریک ہوں۔

قرآن مجید میں صلوٰۃ خوف کے بارے میں بس اتنی ہی اصولی اور اجمالی ہدایت دی گئی ہے اس سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ لشکر کا ہر ایک حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف ایک ایک رکعت پڑھے گا اس طرح ہر ایک کو حضور کے ساتھ اور آپ کی اقتدا میں نماز پڑھنے کی سعادت حاصل ہو جائے گی اور دفاع کے فریضہ کی طرف سے غفلت بھی نہ ہوگی۔ قرآن مجید کی اس آیت سے یہ بات بھی واضح نہیں ہوتی کہ لشکریوں کی نماز ایک ہی رکعت ہوگی یا وہ بعد میں اپنی اپنی جگہ دوسری رکعت پڑھ کر اپنی نماز پوری کریں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی ہدایت کے مطابق مختلف غزوات میں اسی طرح لشکر کو تقسیم کر کے نماز پڑھائی ہے، کتب حدیث میں ان نمازوں کی پوری تفصیل موجود ہے، ان میں سے اکثر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ لشکریوں نے ایک رکعت تو آپ کے ساتھ اور آپ کی اقتدا میں پڑھی اور دوسری رکعت بعد میں الگ پڑھ کر اپنی نماز پوری کی۔
بعض تاریخی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضور کے بعد صحابہ کے دور میں بھی کبھی کبھی

اسی طریقہ پر صلوٰۃ خوف پڑھی گئی ہے، لیکن امام ابو حنیفہؒ کے مشہور شاگرد قاضی ابو یوسفؒ کا مسلک یہ ہے کہ اس طریقہ پر صلوٰۃ خوف کا حکم صرف ان جنگوں کے لیے تھا جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس شریک ہوئے تھے۔ آپ کے نہ ہونے کی صورت میں دو جماعتیں الگ الگ پڑھنی چاہیں اور آیت کے پہلے لفظ "وَإِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ" سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں آپ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ جب آپ مجاہدین کے ساتھ ہوں اور نماز پڑھائیں تو اس طریقہ پر پڑھائیں۔ ان الفاظ کا ظاہری تقاضا یہی ہے کہ یہ حکم آپ کے ساتھ مخصوص ہو۔ اور یہ اس لیے کہ آپ کے ہوتے ہوئے ہر مسلمان کی لازماً یہی خواہش ہوگی کہ وہ نماز آپ کی اقتدا میں پڑھے، کوئی بھی اس سعادت سے محرومی پر راضی نہ ہوگا، اس لیے ایسا طریقہ تجویز کر دیا گیا کہ ہر شخص آپ کے پیچھے نماز بھی پڑھ لے۔ اور دفاع سے غفلت بھی نہ ہو۔

قرآن مجید کی ان آیتوں میں میدانِ جنگ کی نماز کے بارے میں جو ہدایت دی گئی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح اس پر عمل فرمایا اس میں آپ کی اُمت کے لیے چند بڑے سبق ہیں میرے نزدیک پہلا اہم سبق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عالم کو عالم اسباب بنایا ہے اور ہمارے لیے جائز نہیں ہے کہ ہم توکل کا نام لے کر اسباب و تدابیر کی طرف سے غفلت برتیں ———— اگر اس کی ذرا بھی گنجائش ہوتی تو حکم یہ ہوتا کہ میدان جنگ میں بالکل اُسی طرح نماز ادا کی جائے جس طرح مسجد نبوی میں ادا کی جاتی تھی اور سارا لشکر ایک ساتھ حضور کی اقتدا میں نماز پڑھے کہا جاتا ـــ کہ دشمن ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، اللہ ہماری حفاظت کے لیے کافی ہے، ہمیں کسی حفاظتی فکر اور تدبیر کی ضرورت نہیں، ہم نماز پڑھیں گے تو آسمان کے فرشتے ہماری حفاظت کریں گے ———— لیکن یہ حکم نہیں دیا گیا بلکہ اسباب کی رعایت کرتے ہوئے جنگ کی ضرورت اور دفاع کی مصلحت سے نماز کا قانون بدل دیا گیا، نماز کے درمیان میں طویل نقل و حرکت کی اجازت دے دی گئی اور صراحت کیساتھ حکم دیا گیا کہ مجاہدین اپنے پورے اسلحہ سے مسلح ہو کر نماز میں شریک ہوں، وہ ہتھیار بھی جن سے دشمن پر حملہ کیا جاتا ہے اور وہ بھی جو دشمن کے حملہ سے بچاؤ کے لیے استعمال ہوتے ہیں (وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ)

جس اُمت کو یہ ہدایت دی گئی ہو اور جس کے پیغمبر نے اس کے مطابق عمل کیا ہو اور جس نے [illegible] ہو اس کے لیے کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ وہ اسباب و تدابیر سے غفلت برتے اور اس کا نام توکل رکھے ———— بہرحال یہ ان آیتوں کا پہلا اہم سبق ہے۔

دوسرا اصولی سبق صلوٰۃ خوف کی اسی ہدایت سے یہ ملا کہ دنیا کے مادہ پرستوں کی طرح اسباب و تدابیر ہی کو سب کچھ نہ سمجھا جائے بلکہ مناسب حد تک [illegible] اسباب و تدابیر کا لحاظ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور مشیت ہی کو فیصلہ کن سمجھا جائے اور اس کی نصرت اور رحمت کا استحقاق حاصل کرنے کی فکر و کوشش کو ہر چیز پر مقدم رکھا جائے ———— اگر یہ بات نہ ہوتی تو فوج کے کسی حصہ کو بھی دشمن کے سامنے سے ہٹا کر نماز میں مشغول ہونے کی اجازت نہ دی جاتی ———— اس معاملہ میں مسلمانوں کے بعض طبقے سخت افراط و تفریط میں مبتلا ہیں، اسلام کی روح اور اس کی تعلیمات سے مطابقت رکھنے والی بات وہی ہے جو صلوٰۃ خوف کے بارے میں قرآن مجید کی ہدایت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے معلوم ہوتی ہے۔

صلوٰۃ خوف کے اس حکم کا تیسرا اہم سبق یہ ہے کہ اسلام میں باجماعت نماز کی اتنی اہمیت ہے کہ میدان جنگ میں سنگین خطرہ کے وقت بھی مسلمانوں کو جماعت سے نماز ادا کرنے کا مکلف کیا گیا اور اس کی اجازت نہیں دی گئی کہ لوگ اپنی سہولت کے مطابق انفرادی طور پر ادا کر لیں۔

آگے ارشاد ہے "وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُم مَّيْلَةً وَاحِدَةً" اس میں بتایا گیا ہے کہ میدان جنگ کی نماز کا جو یہ خاص طریقہ مقرر کیا گیا اور نماز کی حالت میں بھی ہر طرح کے ہتھیاروں سے مسلح ہونے کی جو ہدایت کی گئی اس کا سبب یہ ہے کہ تمہارے دشمنوں کا یہ پلان اور منصوبہ ہے کہ تم اپنے ہتھیاروں وغیرہ سے اور دفاع کی طرف سے ذرا بھی غافل ہو تو وہ ایک دم تم پر ٹوٹ پڑیں اسی اندیشہ کی وجہ سے یہ احکام دیے گئے ہیں۔

آگے فرمایا گیا ہے "وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّن مَّطَرٍ أَوْ كُنتُم مَّرْضَىٰ أَن تَضَعُوا أَسْلِحَتَكُمْ وَخُذُوا حِذْرَكُمْ إِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ○

اس کا مطلب یہ ہے کہ بارش وغیرہ کی وجہ سے یا بیماری جیسی کسی مجبوری سے سارے ہتھیاروں کے بوجھ کے ساتھ نماز ادا کرنا اگر مشکل ہو تو اس کی اجازت ہے کہ حملہ میں کام آنے والے اسلحہ اتار کر نماز پڑھ لو لیکن دفاع اور بچاؤ والے ہتھیاروں سے بہرحال مسلح رہنا ضروری ہے، ان کو الگ رکھنے کی اجازت نہیں۔ "اِنَّ اللّٰہَ اَعَدَّ لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّھِیْنًا" آیت کا تتمہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے یہ دشمن اللہ کے دشمن ہیں۔ تم پوری ہمت کے ساتھ اُن کا مقابلہ کرو۔ اللہ دنیا میں تم کو ان پر غالب کرے گا اور آخرت میں ان کے لیے اُس نے رسوا کن عذاب تیار کیا ہے۔ آگے ارشاد ہے۔ فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوۃَ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِکُمْ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ۝ یعنی جب تم میدان جنگ میں اوپر بتلائے ہوئے طریقہ پر نماز ادا کر لو، تو اس کے بعد کھڑے بیٹھے اور لیٹنے کی حالت میں بھی یعنی ہر حالت میں اللہ کے ذکر کا خاص اہتمام کرو (یہ حکم اس لیے دیا گیا کہ جب نماز اس طرح پڑھی جائے گی جس میں خوب نقل و حرکت بھی ہوگی اور سارے ہتھیار بھی لگے ہوں گے تو قدرتی طور پر حضورِ قلب اور خشوع کی کیفیت میں بہت کمی رہے گی، اسی کسر کے جبر اور اسی کمی کے پورا کرنے کے لیے فرمایا گیا کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد ہر حالت میں اللہ کے ذکر کا زیادہ اہتمام کرو) آگے فرمایا گیا کہ پھر جب دشمن اور اُس کے حملہ کا کوئی اندیشہ باقی نہ رہے۔ امن و اطمینان کی فضا قائم ہو جائے تو پھر پورے اہتمام سے اور ظاہری و باطنی تمام آداب کی رعایت کے ساتھ ہر وقت کی نماز ادا کیا کرو۔ نماز اہل ایمان پر وقت کی پابندی کے ساتھ فرض کی گئی ہے اور وہ اللہ کا خاص الخاص فریضہ ہے اس لیے اس کا حق ہے کہ بندے اس کو اچھے سے اچھے طریقہ پر ادا کرنے کی کوشش کریں۔

اس آیت کے آخری جز میں فرمایا گیا ہے کہ مسلمانوں پر نماز اوقات کے تعین کے ساتھ فرض ہے، یعنی ہر نماز کا وقت معین اور مقرر ہے کہ فلاں وقت سے شروع ہوتا ہے اور فلاں وقت پر ختم ہوتا ہے ——— اس سے ایک اصولی بات یہ معلوم ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شریعت کے جو تفصیلی احکام بتائے ہیں، جو قرآن مجید میں بیان نہیں ہوئے ہیں، وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہیں، یہ بات اس

طرح معلوم ہوئی کہ نماز کے جن معین اوقات کا اس آیت میں حوالہ دیا گیا ہے وہ قرآن مجید میں کہیں بھی بیان نہیں ہوئے ہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپ کے طرز عمل سے معلوم ہوتے ہیں، اور قرآن مجید کی اس آیت میں انہیں اوقات کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ اس کی صریح دلیل ہے کہ آپ کے یہ احکام بھی گویا اللہ تعالیٰ ہی کے احکام ہیں۔

موجودہ قیمت 3/75

Regd. No. L-353
Monthly 'ALFURQAN' Lucknow
VOL. 36 NO. 6 — SEPTEMBER 1968

سرفراز قومی پریس اینڈ پرنٹرس، قطب الدین روڈ، لکھنؤ ۳ میں چھپا۔

مرتبہ

عتیق الرحمن سنبھلی

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ... ۷/۵۰
پاکستان سے ۷/۵۰
ششماہی
ہندوستان سے ۴/-
پاکستان سے ۴/-

خاص اس اشاعت کی قیمت
ایک روپیہ ۵۰ پیسے

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے
مزید محصول ڈاک کا اضافہ

جلد ۳۶	بابت ماہ ذیقعدہ و ذی الحجہ ۱۳۸۸ھ مطابق فروری مارچ ۱۹۶۹ء	شمارہ ۱۱-۱۲

اگر اس دائرہ میں (   ) سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ مارچ تک آجائے، ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:- اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دیدیں، ڈاک خانہ کی رسید بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:- براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت:- الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اسکی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانے کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولانا) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخنہائے گفتنی

اس شمارہ پر "الفرقان" کی عمر کے ۳۶ سال پورے ہوگئے اور اس کی چھتیسویں جلد مکمل ہوگئی ـــ اللّٰھم لک الحمد ولک الشکر ـــ

ان ۳۶ سالوں میں سے پہلے ۱۰ سالوں میں (یعنی ۱۳۶۳ھ تک) تحریر وادارت کی ذمہ داری اس عاجز ہی پر رہی ـ جو احباب میرے حالات سے اچھی طرح واقف ہیں وہ تو جانتے ہیں، لیکن دوسرے حضرات اس واقعہ کے اظہار کو شاید تصنع یا انکسار سمجھیں کہ مجھے فطری طور پر لکھنے سے مناسبت نہیں ہے۔ جو کچھ لکھتا ہوں بڑی مشکل سے اور گویا زبردستی لکھتا ہوں، اس لیے الفرقان کے ابتدائی ۱۰۔۔۲۰ سالوں میں بس گاڑی کسی طرح گھسیٹی جاتی رہی (اور صرف اسلئے گھسیٹتا رہا کہ میں اللہ کے بندوں کو اسکے ذریعہ بات پہونچانا چاہتا تھا) ـــ اسکے بعد مولوی عتیق الرحمٰن سلمہ اپنی تعلیم پوری کرکے آگئے اور انھوں نے اس کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اگرچہ عرصہ تک اسکے بعد بھی مدیر کی حیثیت سے اس پر میرا ہی نام رہا لیکن دراصل ادارت و تحریر کی پوری ذمہ داری بلکہ اسکے علاوہ بھی دوسری قسم کی اکثر اصولی ذمہ داریاں انھوں نے سنبھال لیں اور میں اسکی طرف سے بالکل فارغ اور سبکدوش ہوگیا: ناظرین کرام کو یاد ہوگا اکثر و بیشتر ایسا ہوتا تھا کہ میری زیر تصنیف کتاب "معارف الحدیث" کے چند صفحات کے سوا "الفرقان" میں میرا لکھا ہوا کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح اس کے مالی معاملات سے بھی میں بے تعلق ہوگیا ـــ لیکن اللہ کی مشیت اب سے ۵۔۶ سال پہلے (۱۳۸۳ھ میں عمر کے چھتیسویں ہی سال میں) انھیں شدید ضعف اعصاب کی شکایت لاحق ہوگئی اور اسوقت سے ابتک انکی صحت بحال نہیں ہوسکی کبھی کبھی مہینے اس حال میں گزر جاتے ہیں کہ ایک صفحہ بھی نہیں لکھ سکتے۔ ختم ہونیوالا یہ پورا سال (۱۳۸۹ھ) قریب قریب اسی حال میں گزر گیا اور مجھے وہ بوجھ پھر اٹھانا پڑ گیا جس کا میں بالکل عادی نہیں رہا تھا۔ اسی وجہ سے اس میں ہر لحاظ سے ضعف رہا، نظام اشاعت میں بھی ابتری رہی اور قدرتی طور پر اس کا اثر اشاعت پر بھی پڑا جسکی وجہ سے آمد و صرف میں وہ توازن نہیں (جو پرچہ کے زندہ اور جاری رہنے کیلئے عالم اسباب میں ضروری ہے)۔

مولوی عتیق الرحمٰن کی رائے اپنی معذوری کی بنا پر یہ ہوگئی تھی کہ فی الحال اسکی اشاعت بند کردی جائے اور خریداروں کا حساب بیباق کردیا جائے لیکن اس عاجز کا احساس یہ ہے کہ اسکے جو قدردان خریدار و ناظرین اسکو دین کا خادم اور داعی سمجھ کر معیار کے انحطاط اور نظام اشاعت کی ابتری کے باوجود اس سے اپنا تعلق قائم کئے ہوئے ہیں انکا یہ تعلق اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے جس کا شکر واجب ہے اور اس کا حق ہے کہ اسکو زندہ اور جاری رکھنے کیلئے ہر تکلیف بھی اٹھائی جائے، اپنے امکان کی حد تک اٹھائی جائے اور اللہ تعالیٰ سے امید رکھی جائے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے اس صورت حال کو جلد ختم فرمادے گا۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔

آئندہ کیلئے ایک نیا انتظام سوچا گیا ہے۔ امید کی جاسکتی ہے کہ شروع ہونیوالے سال ۱۳۹۰ھ میں اسکی حالت انشاءاللہ ہر لحاظ سے گزرنے والے سال ۱۳۸۹ھ سے بہتر رہے گی۔ والامر بید اللہ تعالیٰ ـــ ناظرین کرام سے استدعا ہے کہ مولوی عتیق الرحمٰن کی بحالی صحت کیلئے اور الفرقان کے حالات کی درستی کیلئے بھی دعا فرمائیں ـــ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

محمد منظور نعمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

سید منظر احسن گیلانی، حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی علیہ الرحمہ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ عثمانیہ یونی ورسٹی (حیدرآباد) کے شعبۂ معاشیات سے وابستہ ہیں — گزشتہ شمارہ کے ان ہی صفحات میں اسی عنوان کے تحت جو کچھ لکھا گیا تھا، اس کو پڑھ کے انھوں نے راقم سطور کے نام اپنے خط میں لکھا ہے۔

"آپ نے قرآنی آیات نقل کر کے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت دونوں میں اپنے ایمان والے بندوں کی مدد کرتا ہے، شرط یہ ہے کہ وہ صرف نام کے نہیں بلکہ اعمال و اخلاق کے لحاظ سے بھی ایمان والے ہوں، مگر ہم نے اپنی غفلت شعاری اور بد اعمالیوں سے اپنے کو نصرت الٰہی سے محروم کر رکھا ہے — افسوس قرآن پاک کے ایسے کھلے ہوئے وعدوں اور اعلانوں کے باوجود ملت ذلت اور پستی کی وادیوں میں بھٹک رہی ہے، عجیب بدقسمتی ہے — آج سے اکیس (۲۱) سال پہلے میرا ایک مضمون چھپا تھا، اس میں یہی بات کہی گئی تھی اور یہی قرآنی دعوت دی گئی تھی مگر جو حالات اس وقت تھے (۱۹۴۸ء) ان کے پیش نظر میں نے آخر میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے مسلمان بھائی اپنی فلاح و بہبود کے لیے سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہیں، مثلاً جلسے، جلوس، دستخطی مہم، پارٹی سازی، نعرے بازی، شور ہنگامہ وغیرہ وغیرہ۔ مگر نہیں کریں گے تو صرف ایک کام یعنی خدا کی طرف پلٹنا اور صلاح و تقویٰ والی زندگی اختیار کرنا — معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ ہم سب کچھ کر سکتے ہیں اور سب کچھ کریں گے، لیکن صرف یہ ایک کام ہم سے نہیں ہو سکے گا کہ اپنے کو احکام الٰہی کا فرمانبردار اور تابعدار بنا دیں، اور اگر فلاح و کامرانی اسی پر منحصر ہے تو پھر۔ ع

یہی ٹھہری جو شرطِ وصلِ لیلیٰ   تو استعفا مرا با حسرت و یاس

حالانکہ جیسا کہ آپ نے لکھا ہے قرآن پاک بھی پکار پکار کے کہہ رہا ہے اور ہماری تاریخ بھی بتا رہی ہے کہ حالات جب ہی بدلیں گے جبکہ ہم خود اپنے کو بدل لیں اور حضرت خداوندی کا استحقاق

پیدا کرلیں۔"

واقعی یہ بڑی عجیب بات ہے جس کی توجیہ مشکل ہے کہ جس ایمانی حقیقت اور تاریخی تجربہ کا اوپر کی سطروں میں ذکر کیا گیا ہے، ہمارے اس دور کے مسلمان خواہ وہ دنیا کے کسی بھی حصہ کے رہنے والے ہوں، بالعموم اس کا اقرار کرتے ہیں۔ کم از کم اس عاجز نے تو ساری عمر میں ایک مسلمان بھی نہیں پایا جو اس کا منکر ہو۔ لیکن یہ اقرار غالباً بس اقراری ہے، اس کے ساتھ وہ یقین و اعتماد نہیں ہے جو اس کو ہماری ملی پالیسی کی بنیاد بنانے کیلئے ضروری ہو، حالانکہ اصل طاقت اور کارفرمائی اس یقین ہی میں ہے۔

امت مسلمہ کی پوری تاریخ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے درخشاں اور کامیاب دور خلفائے راشدین کا اور ان میں سے بھی خاص کر صدیق اکبر و فاروق اعظم کا ہے (رضی اللہ عنہما) ان دونوں بزرگوں کی نظر میں سب سے اہم چیز یہی تھی کہ اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری اور تقوے کی پابندی کے ذریعہ اس کی حمایت و نصرت کا استحقاق پیدا کیا جائے اور اس کے غیبی لشکروں کی مدد حاصل کی جائے ـــــ وہ اپنی اسبابی جدوجہد کی روح بھی اسی کو یقین کرتے تھے اور پالیسی اور پروگرام کے بارے میں اسی کی بنیاد پر بڑے سے بڑے فیصلے کرتے تھے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اکابر صحابہ سے مشورہ کے بعد جب شام کی طرف فوجی مہم بھیجنے کا ارادہ کیا جو رومی حکومت کے زیر اقتدار تھا جو اس وقت دنیا کی نہایت ہی طاقتور حکومت تھی تو لشکر روانہ کرتے وقت آپ نے جو خطبہ دیا اس کے آخری الفاظ یہ تھے۔

وليحسن نيتكم وشربكم وأطعمتكم فان الله مع الذين اتقوا والذين هم محسنون۔
(کنز العمال ص۱۳۳ ج ۲)

ضروری ہے کہ تمہاری نیتیں نیک اور خالص ہوں (یعنی اس جنگ میں تمہارا مطمح نظر دنیا نہ ہو آخرت اور اللہ کی رضا ہو) اور تمہارا کھانا پینا پاک اور حلال ہو کیونکہ اللہ اپنی بندوں کی مدد کرتا ہے جو پرہیزگار اور نیکوکار ہوں۔

یرموک کی جنگ میں جب مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد شہید ہو گئی تو لشکر کے سپہ سالار نے صدیق اکبرؓ کی خدمت میں مزید فوجی کمک کے لیے خط لکھا، اسکے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا

إنه قد جاء في كتابكم تستمدونني وإني أدلكم على من هو أعز نصراً

تمہارا خط مجھے ملا۔ تم نے مجھ سے مزید فوجی کمک مانگی ہے، میں تم کو اس ذات کی طرف توجہ دلاتا ہوں جو [illegible]

واحضر جنداً الله عزو جل فاستنصروه فان محمداً قد نصر يوم بدر في أقل من عددكم

(كنز العمال ص۳۴۵ ج ۲)

ہوں جو تم کو بڑی طاقتور مدد دے سکتا ہو۔ اور جس کے بے پناہ لشکر ہر وقت حاضر و موجود ہیں یعنی اللہ عزوجل، بس اسی سے مدد مانگو اس نے جنگ بدر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت اپنی غیبی مدد سے دشمنوں کے مقابلہ میں کامیاب کیا تھا جب ان کے ساتھیوں کی تعداد تمہاری موجودہ تعداد سے بہت ہی کم تھی۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اس لشکر کے سپہ سالار تھے جو مصر بھیجا گیا تھا۔ یہ لشکر خلاف توقع طویل مدت تک مصر پر فتح حاصل نہ کر سکا۔ یہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت کا دور تھا۔ انھوں نے حضرت عمرو بن العاص کو لکھا۔

عجبت لابطائکم عن فتح مصر تقاتلونهم منذ سنین وما ذالك إلا بما أحدثتم وأحببتم من الدنیا ما أحب عدوکم وإن الله لا ینصر قوما إلا بصدق نیاتهم۔

(کنز العمال ص۱۵۱ ج ۲)

مجھے سخت تعجب ہے مصر کی فتح میں اتنی دیر کیوں لگی برس گزر گئے۔ میرے نزدیک اس کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ تم لوگوں میں تبدیلی آگئی اور نئی باتیں پیدا ہو گئیں اور جس طرح تمہارے دشمن دُنیا کی محبت اور طلب میں گرفتار ہیں تم بھی اس گندگی میں مبتلا ہو گئے (اسلئے اللہ کی مدد تم کو حاصل نہیں ہو رہی ہے) اللہ تعالیٰ کسی قوم کی مدد ان کی نیتوں کی پاکبازی ہی کی وجہ سے کرتا ہے۔

ہمارے دورِ اوّل میں یہی نقطۂ نظر تھا جس کی بنیاد پر سارے فیصلے کیے جاتے تھے۔ پھر جو نتائج ظاہر ہوتے تھے وہ بھی تاریخ میں محفوظ ہیں۔

جس نے اللہ کی کتاب پاک قرآن مجید کو اور اسکے رسول برحق سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو غور سے دیکھا اور سمجھا ہے اور اس پر ایمان لایا ہے اور ایک مومن کی نگاہ سے جس نے اس اُمت کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اس کے لیے اس میں ذرہ بھر شک کی گنجائش نہیں ہے کہ اس امت کی صلاح و فلاح کا ضابطہ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے یہی مقرر کیا ہے۔ و لن یصلح آخر هذه الامة إلّا بما صلح به اولها۔

كِتَابُ الْاَذْكَارِ وَالدَّعْوَاتُ

مَعَارِفُ الحَدِيث

(مُسَلسَل)

دُرُودْ شَرِیْفْ کے خَاصْ کلِمَاتْ

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجنے کا ہم بندوں کو حکم دیا اور بڑے مؤثر اور پیارے انداز میں حکم دیا، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف پیرایوں میں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے اس کے وہ برکات اور فضائل بیان فرمائے جو ناظرین کو مندرجہ سابق احادیث سے معلوم ہو چکے ہیں ——— پھر صحابہ کرام کے دریافت کرنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے درود و سلام کے خاص کلمات بھی تعلیم فرمائے ——— اپنے امکان کی حد تک کتب حدیث کی پوری چھان بین کے بعد اس سلسلہ کی مستند روایات جمع کر کے ذیل میں درج کی جا رہی ہیں ——— واللہ ولی التوفیق ———

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ لَیْلٰی قَالَ لَقِیَنِیْ کَعْبُ بْنُ عُجْرَةَ فَقَالَ اَلَا اُهْدِیْ لَكَ هَدِیَّةً سَمِعْتُهَا مِنَ النَّبِیِّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ بَلٰی فَاهْدِهَا لِیْ، فَقَالَ سَاَلْنَا رَسُوْلَ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللهِ كَیْفَ الصَّلٰوةُ عَلَیْكُمْ اَهْلَ الْبَیْتِ فَاِنَّ اللهَ

قَدْ عَلِمْنَا كَيْفَ نُسَلِّمُ عَلَيْكَ، قَالَ قُولُوا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ــــ

ـــــــــــ رواه البخاری ومسلم

مشہور جلیل القدر تابعی عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے روایت ہے بیان کرتے ہیں کہ میری ملاقات کعب بن عجرہ انصاری رضی اللہ عنہ سے ہوئی (جو اصحاب بیعت رضوان میں سے ہیں) انھوں نے مجھ سے فرمایا میں تمھیں ایک خاص تحفہ پیش کردوں (یعنی ایک بیش بہا حدیث سناؤں) جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے، میں نے عرض کیا مجھے وہ تحفہ ضرور دیجئے! ــ انھوں نے بتایا کہ ہم لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرتے ہوئے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ تو ہم کو بتا دیا کہ ہم آپ پر سلام کس طرح بھیجا کریں (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ نے ہم کو بتا دیا ہے کہ ہم تشہد میں "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ" کہہ کر آپ پر سلام بھیجا کریں) اب آپ ہمیں یہ بھی بتا دیجئے کہ ہم آپ پر صلوٰۃ (درود) کیسے بھیجا کریں، آپ نے فرمایا یوں کہا کرو۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ	اے اللہ اپنی خاص نوازش اور عنایت و رحمت فرما حضرت محمد پر اور حضرت محمد کے گھرانے والوں پر جیسے کہ تو نے نوازش اور عنایت و
اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ	رحمت فرمائی حضرت ابراہیم پر اور

وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

اور حضرت ابراہیم کے گھرانے والوں پر بیشک تو حمد و ستائش کا سزاوار اور عظمت اور بزرگی والا ہے۔ اے اللہ خاص برکتیں نازل فرما حضرت محمدؐ اور حضرت محمدؐ کے گھرانے والوں پر، جیسے تو نے برکتیں نازل فرمائیں حضرت ابراہیم پر اور حضرت ابراہیم کے گھرانے والوں پر، تو حمد و ستائش کا سزاوار اور عظمت و بزرگی والا ہے۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) حضرت کعب بن عجرہ نے عبدالرحمٰن ابن ابی لیلیٰ کو یہ حدیث جس طرح اور جس تمہید کے ساتھ سنائی اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس حدیث کو اور اس درود شریف کو کتنا عظیم اور کیسا بیش بہا تحفہ سمجھتے تھے ـــ اور طبری کی اسی حدیث کی روایت میں یہ بھی ہے کہ کعب بن عجرہ نے یہ حدیث عبدالرحمٰن ابن ابی لیلیٰ کو بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے سنائی تھی[۱]۔ اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں اس کی کتنی عظمت تھی۔

اسی حدیث کی بیہقی کی روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ صلوٰۃ یعنی درود کے طریقہ کے بارے میں یہ سوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس وقت کیا گیا جب سورۂ احزاب کی یہ آیت نازل ہوئی[۲] اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۝

اس آیت میں صلوٰۃ و سلام کا جو حکم دیا گیا ہے اس کے بارے میں تفصیل سے پہلے لکھا جا چکا ہے۔

۱، ۲ فتح الباری کتاب الدعوات۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سوال کے جواب میں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر
صلوٰۃ بھیجنے کا ہم کو جو حکم دیا ہے اس کا کیا طریقہ ہے اور کس طرح ہم آپ پر صلوٰۃ بھیجا
کریں یا صلوٰۃ کے جو کلمات اس حدیث میں اور اس کے علاوہ بھی بہت سی دوسری
حدیثوں میں تلقین فرمائے یعنی اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ..... الخ۔ ان سے معلوم ہوا
کہ آپ پر ہمارے صلوٰۃ بھیجنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اللہ ہی سے التجا اور استدعا کریں کہ وہ آپ پر صلوٰۃ
بھیجے اور برکتیں نازل فرمائے۔ یہ اس لیے کہ ہم خود چونکہ محتاج و مفلس اور تہی مایہ ہیں
ہرگز اس لائق نہیں ہیں کہ اپنے محسن اعظم اور اللہ کے نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ
میں کچھ پیش کر سکیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے حضور میں استدعا اور التجا کرتے ہیں کہ وہ
آپ پر صلوٰۃ اور برکت بھیجے یعنی آپ کی تشریف و تکریم، آپ پر نوازش و عنایت، رحمت
و رأفت، پیار و دلار میں اور مقبولیت کے درجات و مراتب میں اضافہ فرمائے۔ اور
آپ کو اپنی خاص برکتوں سے نوازے، نیز آپ کے گھر والوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ فرمائے۔

استدعاء "صلوٰۃ" کے بعد "برکت" مانگنے کی حکمت :-

صلوٰۃ کے بارے میں پہلے بقدر ضرورت کلام کیا جا چکا ہے اور بتایا جا چکا ہے کہ
اس کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے۔ تشریف و تکریم، مدح و ثنا، رحمت و رأفت،
محبت و عطوفت، رفع مراتب، ارادہ خیر، اعطاء خیر اور دعائے خیر سب ہی کو صلوٰۃ کا
مفہوم حاوی ہے۔۔۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی بندہ پر "برکت" ہونے کا مطلب
یہ ہوتا ہے کہ اس کے لیے بھرپور نوازش و عنایت اور خیر و نعمت کا اور اس کے دوام
اور اس میں برابر اضافہ و ترقی کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیصلہ ہے۔ بہرحال برکت کسی
ایسی چیز کا نام نہیں ہے جس کو "صلوٰۃ" کا وسیع مفہوم حاوی نہ ہو۔۔۔ اس لحاظ سے اللہ
تعالیٰ کے حضور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے صلوٰۃ کی استدعا کرنے کے بعد
آپ کے واسطے برکت یا رحمت کی دعا اور التجا کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی،
لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں دعا اور سوال کے موقع پر یہی مستحسن ہے کہ مختلف الفاظ

حاجات میں بار بار عرض معروض کی جائے، اس سے بندہ کی شدید محتاجی اور صدقِ طلب کا اظہار ہوتا ہے اور سائل اور منگتا کے لیے یہی مناسب ہے۔ اس لیے اس درود شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل کے لیے اللہ تعالیٰ سے صلوٰۃ کی استدعا کے بعد برکت کی التجا بھی کی گئی ہے۔ اور بعض دوسری روایات میں (جو عنقریب درج ہوں گی) صلوٰۃ اور برکت کے بعد ترحم کا بھی سوال کیا گیا ہے۔

درود شریف میں لفظ "آل" کا مطلب:۔

اس درود شریف میں 'آل' کا لفظ چار دفعہ آیا ہے، ہم نے اس کا ترجمہ "گھرانے والوں" کیا ہے ۔۔ عربی زبان اور خاص کر قرآن و حدیث کے استعمالات میں کسی شخص کی آل اُن لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اس کے ساتھ خصوصی تعلق رکھتے ہوں، خواہ تعلق نسب اور رشتہ کا ہو، جیسے اس کے بیوی بچے، یا رفاقت اور عقیدت و محبت، اور اتباع و اطاعت کا، جیسے کہ اس کے مشن کے خاص ساتھی اور محبین و متبعین[1] ۔۔ اس لیے نفس لغت کے لحاظ سے یہاں آل کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں ۔۔ لیکن اگلے ہی نمبر پر اسی مضمون کی حضرت ابو حُمید ساعدی کی جو حدیث درج کی جا رہی ہے اس میں درود شریف کے جو الفاظ ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "آل" سے گھرانے والے ہی مراد ہیں۔ یعنی آپؐ کی ازواجِ مطہرات اور آپؐ کی نسل و اولاد، اور جس طرح ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خصوصی قرابت و جزئیت اور زندگی میں شرکت کا خاص شرف حاصل ہے (جو دوسرے حضرات کو حاصل نہیں ہے اگرچہ وہ درجہ میں ان سے افضل ہوں)، اسی طرح یہ بھی ان کا ایک مخصوص شرف ہے کہ رسول اللہ

---

[1] امام راغب اصفہانی نے "مفردات القرآن" میں "آل" کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: ویستعمل فیمن یختص بالانسان اختصاصاً ذاتیا اما بقرابۃ قریبۃ او بموالاۃ قال عزوجل (وآل ابراھیم وآل عمران) وقال (ادخلوا آل فرعون اشد العذاب) صفحہ ۳۰

صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اُن پر بھی درود سلام بھیجا جاتا ہے۔ اور اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ ازواج مطہرات وغیرہ جو لفظ "آل" کے مصداق ہیں، اُمت میں سب سے افضل ہوں، عند اللہ افضلیت کا مدار ایمان اور ایمان والے اعمال اور ایمانی کیفیات پر ہے۔ جس کا جامع عنوان تقویٰ ہے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔

اس کو بالکل یوں سمجھنا چاہیئے کہ ہماری اس دُنیا میں بھی جب کوئی مخلص محب اپنے کسی محبوب بزرگ کی خدمت میں کوئی خاص مرغوب تحفہ اور سوغات پیش کرتا ہو تو اس کے پیش نظر خود وہ بزرگ اور ان کے ذاتی تعلق کی بنا پر ان کے گھر والے ہوتے ہیں اور اس مخلص کی یہ خوشی ہوتی ہے کہ یہ تحفہ ان بزرگ کے ساتھ ان کے گھر والے یعنی اہل و عیال بھی استعمال کریں، کسی کے ساتھ تعلق و محبت کا دراصل یہ فطری تقاضا ہے ——— درود شریف بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک تحفہ اور سوغات ہے اُسمیں آپ کے ساتھ آپ کے خاص متعلقین یعنی اہل و عیال کو بھی شریک کرنا بلاشبہ آپ کی محبت کا تقاضا ہے اور اس سے آپ کے قلب مبارک کا بہت زیادہ خوش ہونا بھی ایک فطری بات ہے ——— اس کی بنیاد پر افضلیت و مفضولیت کی کلامی بحث کرنا کوئی خوش ذوقی کی بات نہیں ہے ——— بہرحال اس عاجز کے نزدیک راجح یہی ہے کہ درود شریف میں آلِ محمد سے آپ کے گھر والے یعنی ازواج مطہرات اور ذریت مراد ہے اور اسی طرح سے آلِ ابراہیم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے گھر والے۔ قرآن مجید میں حضرت ابراہیم کی زوجہ سارہ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے رَحْمَةُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الْبَیْتِ اِنَّہٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ بلاشبہ آلِ ابراہیم وہی ہیں جن کو اس آیت میں اہل البیت فرمایا گیا ہے ———

درود شریف میں تشبیہ کی حقیقت اور نوعیت :-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تلقین فرمائے ہوئے اس درود شریف میں اللہ تعالیٰ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل پر صلوٰۃ اور برکت نازل کرنے کی درخواست کرتے ہوئے عرض کیا گیا ہے کہ ایسی صلوٰۃ اور برکت نازل فرما جیسی کہ تو نے حضرت ابراہیم

اور ان کی آل پر نازل فرمائی ــــ اس تشبیہ کے بارے میں ایک مشہور علمی اشکال یہ ہے کہ تشبیہ میں مشبہ مشبہ بہ کے مقابلہ میں کمتر ہوتا ہے اور مشبہ بہ اعلیٰ اور برتر ہوتا ہے۔ مثلاً ٹھنڈے پانی کو برف سے تشبیہ دی جاتی ہے تو پانی خواہ کتنا ہی زیادہ ٹھنڈا ہو ٹھنڈک میں بہرحال برف سے کمتر ہوتا ہے اور برف میں اس سے زیادہ ٹھنڈک ہوتی ہے ــــ اس اصول پر درود شریف کی مذکورۂ بالا تشبیہ سے لازم آتا ہے کہ حضرت ابراہیم اور آلِ ابراہیم پر نازل ہونے والی صلوات و برکات اُن صلوات و برکات سے اعلیٰ اور افضل ہوں جن کی اس درود پاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل کیلئے استدعا اور التجا کی گئی ہے۔

شارحینِ حدیث نے اس اشکال کے بہت سے جوابات دیے ہیں جو فتح الباری وغیرہ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس عاجز کے نزدیک سب سے زیادہ تسلی بخش جواب یہ ہے کہ تشبیہ کبھی صرف نوعیت کی تعیین کے لیے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی خاص قسم کے کپڑے کا ایک پرانا ٹکڑا لے کر کپڑے کی بڑی دوکان پر جاتا ہے کہ مجھے ایسا کپڑا چاہیے حالانکہ جس ٹکڑے کو وہ نمونے کے طور پر دکھا رہا ہے اور جو مشبہ بہ ہے وہ ایک پرانا اور بے قیمت ٹکڑا ہے اور اسی قسم کا جو کپڑا وہ دوکاندار سے چاہتا ہے وہ ظاہر ہے کہ نیا اور قیمتی ہوگا اور اس لحاظ سے نمونہ والے ٹکڑے سے بہتر ہوگا ــــ پس درود شریف میں تشبیہ اسی قسم کی ہے اور مطلب یہ ہے کہ جس خاص نوعیت کی صلوات و برکات سے سیدنا ابراہیم و آلِ ابراہیم کو نوازا گیا، اسی نوعیت کی صلوات و برکات سیدنا محمد و آلِ محمد پر نازل فرمائی جائیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تمام نبیوں بلکہ ساری مخلوق میں یہ امتیازات حاصل ہیں کہ اللہ نے ان کو اپنا خلیل بنایا (وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا)۔ اُن کو امامت کبریٰ کے عظیم شرف سے مشرف اور سرفراز فرمایا (اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا) اُن کو بیت اللہ کا بانی بنایا۔ ان کے بعد سے قیامت تک کے لیے نبوت و رسالت کا سلسلہ اُن ہی کی نسل اور اُن ہی کے اخلاف میں منحصر کر دیا گیا ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوا کسی پر بھی اللہ تعالیٰ کی یہ نوازشیں اور عنایتیں نہیں ہوئیں اور کسی کو بھی محبوبیت و مقبولیت کا یہ مقام عالی عطا نہیں ہوا۔ پس درود شریف میں اللہ تعالیٰ سے یہی دُعا اور التجا کی جاتی ہے کہ اسی قسم کی اور اسی نوع کی عنایتیں اور نوازشیں

ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل پر بھی بخیر اور محبوبیت و قبولیت کا دیا ہوا مقام انہیں بھی عطا فرما ـــــ بہر حال یہ تشبیہ صرف نوعیت کی تعیین اور وضاحت کے لیے ہے جس میں بسا اوقات مشبہ مشبہ بہ کے مقابلہ میں اعلیٰ اور برتر ہوتا ہے اور اس کی مثال وہ ہے جو اوپر لکھی گئی ہے۔

درود شریف کا اوّل و آخر اَللّٰھُمَّ ـــ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

درود شریف کو اَللّٰھُمَّ سے شروع کر کے اللہ تعالیٰ کے دو مبارک اور پاک ناموں حمید و مجید پر ختم کیا گیا ہے۔ بعض جلیل القدر ائمہ سلف سے نقل کیا گیا ہے کہ اَللّٰھُمَّ اللہ تعالیٰ کے تمام اسماءِ حسنیٰ کے قائم مقام ہے۔ اور اُس کے ذریعہ دُعا کرنا ایسا ہے جیسا کہ تمام اسمارِ حسنیٰ کے ذریعہ دُعا کی جائے۔ شیخ ابن القیم نے جلاء الافہام میں اس پر بڑی نفیس فاضلانہ بحث کی ہے جو اہلِ علم کے لیے قابلِ دید ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ یہ معنیٰ اَللّٰھُمَّ کی میم مشدد سے پیدا ہوتے ہیں اور اس کو فلسفۂ لغت سے ثابت کیا ہے۔ پھر اس دعوے کی تائید میں چند ائمہ سلف کے اقوال بھی نقل کیے ہیں۔ اور حمید و مجید اللہ تعالیٰ کے یہ دو مبارک نام اُس کی تمام صفاتِ جلال و جمال کے آئینہ دار ہیں۔ حمید وہ ہے جس کی ذات میں سارے وہ محاسن و کمالات ہوں جن کی بنا پر وہ ہر ایک کی حمد و ستائش کا مستحق اور سزاوار ہو ـــــ اور مجید وہ ہے جس کو ذاتی جلال و جبروت اور عظمت و کبریائی بدرجۂ کمال حاصل ہو۔ اس بنا پر اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ کا مطلب یہ ہوا کہ اے اللہ تو تمام صفاتِ جمال و کمال اور شانِ جلال کا جامع ہے اس لیے سیدنا محمد اور آلِ محمد پر صلوٰۃ اور برکت بھیجنے کی تجھ ہی سے استدعا ہے ـــــ قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے گھر والوں پر اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت و برکت کا جہاں ذکر کیا گیا ہے وہاں بھی یہی دو اسماءِ الٰہیہ

لے تقریباً ۲ صفحہ پر بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں" وھذا القول الذی اختر ناہ قد جاء عن غیر واحد من السلف قال الحسن البصری اللھم مجمع الدعاء وقال ابو رجاء العطاردی ان المیم فی قولہ اللھم فیھا تسعة وتسعون اسماً من اسماء اللہ تعالیٰ وقال النضر بن شمیل من قال اللھم فقد دعا اللہ بجمیع اسماءہ ـــ جلاء الافہام ص۳۲

کی اسی خصوصیت اور امتیاز کی وجہ سے انھوں کو یکجا اسی طرح خاتمہ کلام بنایا گیا ہے جیسے سورۂ ہود میں فرشتوں کی زبانی فرمایا گیا ہے رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ إِنَّهُ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ ۝

الغرض اَللّٰهُمَّ سے درود شریف کا آغاز اور إِنَّكَ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ پر اس کا اختتام اپنے اندر بڑی معنویت رکھتا ہے اور ان دونوں کلموں کی اس معنویت کا لحاظ کرنے سے درود شریف کا کیف بہت بڑھ جاتا ہے۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ إِبْرَاهِيْمَ إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ إِبْرَاهِيْمَ إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ۝

اس درود شریف کے الفاظ کی روایتی حیثیت :-

حضرت کعب بن عجرہ کی روایت سے درود شریف کے جو الفاظ اوپر نقل کیے گئے وہ ہیں جو امام بخاریؒ نے صحیح بخاری کی "کتاب الانبیاء" میں روایت کیے ہیں۔ (جلد اول ص ۴۷۷) اس کے علاوہ کم سے کم دو جگہ اور یہ حدیث امام بخاری نے روایت کی ہے۔ ایک سورۂ احزاب کی تفسیر میں (ص ۷۰۸ ج ۲) اور دوسرے کتاب الدعوات میں (ص ۹۴۰ ج ۲) ان دونوں جگہوں پر درود شریف میں "کما صلیت" اور "کما بارکت" کے بعد "علیٰ ابراہیم و علیٰ آلِ ابراہیم" کی جگہ صرف "علیٰ آلِ ابراہیم" روایت کیا ہے اور صحیح مسلم کی روایت میں بھی اسی طرح ہے، لیکن حافظ ابن حجرؒ نے اس حدیث کی صحیحین اور غیر صحیحین کی تمام روایات کو سامنے رکھتے ہوئے فتح الباری میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ کعب بن عجرہ کی روایت میں درود شریف کے پورے الفاظ یہی ہیں جو یہاں نقل کیے گئے ہیں۔ اور جن روایات میں صرف "علیٰ ابراہیم" یا "علیٰ آلِ ابراہیم" وارد ہوا ہے وہ ان بعض راویوں کے حافظہ کے فرق سے ایسا ہو گیا ہے۔[1] (فتح الباری جزء ۲۶ ص ۱۰۰)

[1] شیخ ابن القیمؒ کی کتاب "جلاء الافہام" کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔ یہ درود و سلام ہی کے [illegible]

حضرت کعب بن عجرہ کے علاوہ اور بھی متعدد صحابۂ کرام سے قریب قریب یہی مضمون اور درود شریف کے قریباً یہی الفاظ کتب حدیث میں روایت کیے گئے ہیں۔ وہ تمام روایات آگے پیش کی جا رہی ہیں۔

عَنْ اَبِیْ حُمَیْدِ نِ السَّاعِدِیِّ قَالَ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کَیْفَ نُصَلِّیْ عَلَیْكَ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قُوْلُوْا "اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاَزْوَاجِہٖ وَ ذُرِّیَّتِہٖ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ وَبَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ اَزْوَاجِہٖ وَ ذُرِّیَّتِہٖ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

―――――― رواہ البخاری

حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ حضرت! ہم آپ پر صلوٰۃ (درود) کس طرح پڑھا کریں؟ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ سے یوں عرض کیا کرو "اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی

(حاشیہ بسلسلۂ صفحہ گزشتہ) کے موضوع پر ان کی بہترین تالیف جو ان کے کمالِ علمی کی آئینہ دار ہے۔ لیکن درود شریف کے الفاظ کے بارے میں اس میں ان سے یہ بھول ہو گئی ہے کہ "کما بارکت علی ابراھیم و علی آل ابراھیم" کے بارے میں انھوں نے لکھ دیا ہے کہ یہ الفاظ کسی صحیح روایت میں وارد نہیں ہوئے۔ صحیح روایات میں یا صرف "علی ابراھیم" روایت کیا گیا ہے یا صرف "علی آل ابراھیم" (جلاء الافہام صفحہ ۲۳۰) ۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ الفاظ صحیح بخاری ہی میں کعب بن عجرہ کی اس روایت میں موجود ہیں جس کو امام بخاری نے کتاب الانبیاء میں روایت کیا ہے (صفحہ ۴۷۷) اور اسی طرح صحیح بخاری ہی کی ابو سعید خدری کی روایت میں بھی موجود ہیں (صفحہ ۹۴۰) ۔ درود شریف کے ان الفاظ کے بارے میں قریب قریب یہی سہو شیخ ابن القیم کے استاذ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کو بھی ہوا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "کما بارکت علی ابراھیم و علی آل ابراھیم" کی کوئی سند میرے علم میں نہیں (فتاویٰ ابن تیمیہ صفحہ ۱۹۱) ۔ اس طرح کے سہو بڑے بڑے اکابر سے ہو جاتے ہیں اور اس سے ان کی جلالتِ شان میں کوئی فرق نہیں آتا۔ سہو و نسیان سے پاک صرف ایک ہی ذات ہے "لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسٰی"

حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ وَذُرِّيَّتِهٖ ..... (ترجمہ) اے اللہ! اپنی خاص نوازش اور

رحمت فرما حضرت محمد پر اور آپ کی پاک بیبیوں اور آپ کی نسل پر جیسے

کہ آپ نے نوازش اور عنایت و رحمت فرمائی آل ابراہیم پر اور خاص برکت

نازل فرما حضرت محمد پر اور آپ کی (پاک) بی بیوں اور آپ کی نسل پر جیسے کہ

آپ نے برکتیں نازل فرمائیں آل ابراہیم پر، اے اللہ! تو ساری حمد و ستائش

کا سزاوار ہے اور تیرے ہی لیے ساری عظمت و بڑائی ہے۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں درود شریف کے جو الفاظ تلقین فرمائے گئے ہیں وہ کعب بن عجرہ والی پہلی حدیث سے کچھ مختلف ہیں۔ پہلی حدیث میں "اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ" اور "اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ" فرمایا گیا تھا۔ اور اس حدیث میں دونوں جگہ "وَعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ" کے بجائے "وَاَزْوَاجِهٖ وَذُرِّيَّتِهٖ" فرمایا گیا ہے، اسی بنا پر اس عاجز نے پہلی حدیث کی تشریح میں ان حضرات کے قول کو راجح قرار دیا تھا جنہوں نے کہا ہے کہ درود شریف میں آل محمد سے مراد ازواج مطہرات اور آپ کی ذریت طیبہ ہے۔ ایک دوسرا خفیف لفظی فرق یہ بھی ہے کہ پہلی حدیث میں "كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ" اور "كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ" فرمایا گیا تھا اور اس حدیث میں دونوں جگہ صرف "عَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ" ہے۔ اور حضرت ابو حمید ساعدی کی اس روایت کے علاوہ دوسرے اکثر صحابہ کی حدیثوں میں بھی جو آگے درج ہوں گی، اسی طرح صرف "عَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ" وارد ہوا ہے۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا یہ صرف لفظی فرق ہے۔ اس سے معنیٰ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ عربی محاورات میں جب کسی کا نام لے کر اس کی آل کا ذکر کیا جائے اور خود اس کا ذکر الگ نہ کیا جائے تو وہ بھی اس میں شامل ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے "اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ" (اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ساری قوموں میں

برگزیدہ کیا آدم کو اور نوح کو اور آلِ ابراہیم کو۔ ظاہر ہے کہ یہاں آلِ ابراہیم میں خود حضرت ابراہیم بھی شامل ہیں۔ اسی طرح "وَاَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ" اور "وَاَدْخِلُوْا آلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ" میں خود فرعون بھی شامل ہے۔

بہرحال ان دونوں حدیثوں میں درود شریف کے جو کلمات وارد ہوئے ہیں ان میں خفیف سا فرق صرف الفاظ میں ہے۔ اسی لیے علماء و فقہا نے تصریح کی ہے کہ ان میں سے ہر ایک درود نماز میں پڑھا جا سکتا ہے۔ اور اسی طرح دوسرے صحابۂ کرام کی روایتوں سے آئندہ درج ہونے والی حدیثوں میں درود شریف کے جو کلمات آرہے ہیں جن میں الفاظ کی کچھ کمی بیشی ہے، وہ سب بھی نماز میں پڑھے جا سکتے ہیں۔

عَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدٍ الْاَنْصَارِیْ قَالَ اَتَانَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ فِیْ مَجْلِسِ سَعْدِ بْنِ عُبَادَۃَ فَقَالَ لَہٗ بَشِیْرُ بْنُ سَعْدٍ اَمَرَنَا اللّٰہُ اَنْ نُّصَلِّیَ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ فَکَیْفَ نُصَلِّیْ عَلَیْکَ؟ قَالَ فَسَکَتَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَتّٰی تَمَنَّیْنَا اَنَّہٗ لَمْ یَسْأَلْہُ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قُوْلُوْا اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ وَبَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ فِی الْعَالَمِیْنَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ وَالسَّلَامُ کَمَا قَدْ عَلِمْتُمْ ـــــــ رواہ مسلم

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم کچھ لوگ سعد بن عبادہ کی نشست گاہ میں بیٹھے تھے، وہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے تو (حاضرین مجلس میں سے) بشیر بن سعد نے آپ سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو آپ پر صلوٰۃ بھیجنے کا حکم دیا ہے۔ (ہمیں بتائیے کہ) ہم کس طرح آپ پر صلوٰۃ بھیجا کریں؟۔ حدیث کے راوی ابو مسعود انصاری کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ دیر تک خاموش رہے اور آپ نے بشیر بن سعد

کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا (جس سے ہمیں یہ شبہ ہوا کہ شاید یہ سوال آپ کو اچھا نہیں لگا) یہاں تک کہ ہمارے دل میں آیا کہ کاش یہ سوال نہ کیا گیا ہوتا، پھر (کچھ دیر خاموشی کے بعد، اس سوال کا جواب دیتے ہوئے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یوں کہا کرو۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ فِى الْعَالَمِيْنَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ٥ــ وَالسَّلَام كَمَا قَدْ عَلِمْتُمْ ـ

اے اللہ اپنی خاص نوازش و عنایت اور رحمت فرما حضرت محمد پر اور ان کے گھرانے والوں پر جس طرح تو نے نوازش و عنایت اور رحمت فرمائی حضرت ابراہیم کے گھرانے پر اور اپنی خاص برکتیں نازل فرما حضرت محمد اور ان کے گھرانے پر، جس طرح تو نے برکتیں نازل فرمائیں حضرت ابراہیم کے گھرانے پر ساری دنیا میں تو حمد و ستائش کا سزاوار ہے اور تیرے ہی لیے ساری عظمت و بزرگی ہے ــ اور سلام اُس طرح جس طرح کہ تمہیں معلوم ہو چکا ہے۔

(صحیح مسلم)

(تشریح) حضرت ابو مسعود انصاری کی اس حدیث کی طبری کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ جب بشیر بن سعد نے آپ سے سوال کیا کہ ہم آپ پر کس طرح درود بھیجا کریں؟ تو آپ خاموش رہے۔ یہاں تک کہ آپ پر وحی آئی (فسکت حتی جاءہ الوحی) اس کے بعد آپ نے مندرجہ بالا درود تلقین فرمایا ــ اس اضافہ سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آپ کی خاموشی وحی کے انتظار میں تھی، اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ درود شریف کے کلمات آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم فرمائے گئے تھے ــ اور مزید یہ بھی معلوم ہو گیا کہ

درود کے بارے میں یہ سوال آپ سے پہلی دفعہ سعد بن عبادہ کی مجلس ہی میں کیا گیا تھا۔ جس کے جواب میں آپ کو وحی کا انتظار کرنا پڑا ــــ دوسرے بعض صحابہ (کعب بن عجرہ اور ابوحمید ساعدی وغیرہ) کی روایات میں جو اسی طرح کے سوال کا ذکر ہے وہ یا تو اسی مجلس کے واقعہ کا بیان ہے۔ یا مختلف حضرات نے مختلف موقعوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں سوال کیا تھا اور آپ نے جواب میں ان کو درود شریف کے وہ کلمات تلقین فرمائے جو ان کی روایات میں وارد ہیں۔ اکثر احادیث کے سیاق اور الفاظ و کلمات کے فرق سے اسی دوسرے احتمال کی تائید ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابو سعید انصاری کی اس حدیث کی امام احمد اور ابن خزیمہ اور حاکم وغیرہ کی روایات میں ایک اضافہ یہ بھی ہے کہ بشیر بن سعد نے درود بھیجنے کے بارے میں سوال کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا تھا

كَيْفَ نُصَلِّيْ عَلَيْكَ اِذَا نَحْنُ	ہم جب نماز میں آپ پر درود بھیجیں
صَلَّيْنَا عَلَيْكَ فِيْ صَلٰوتِنَا؟	تو کس طرح بھیجا کریں؟

اس سے معلوم ہوا کہ یہ سوال خاص طور سے نماز میں درود پڑھنے کے بارے میں کیا گیا تھا اور یہ درود ابراہیمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصیت سے نماز میں پڑھنے کے لیے تلقین فرمایا۔

حضرت ابو مسعود انصاری کی اس روایت میں بھی ابو حمید ساعدی کی حدیث کی طرح "كَمَا صَلَّيْتَ" اور "كَمَا بَارَكْتَ" کے بعد صرف "عَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ" روایت کیا گیا ہے اور آخر میں "اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ" سے پہلے "فِي الْعَالَمِيْنَ" کا اضافہ بھی ہے۔

عَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيْ قَالَ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هٰذَا السَّلَامُ عَلَيْكَ فَقَدْ عَلِمْنَا فَكَيْفَ نُصَلِّيْ عَلَيْكَ قَالَ قُوْلُوْا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَرَسُوْلِكَ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ

عَلٰى إِبْرَاهِيمَ وَآلِ إِبْرَاهِيمَ ——— رواہ البخاری

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہم نے عرض کیا کہ حضرت! آپ پر سلام بھیجنے کا طریقہ تو ہم کو معلوم ہوگیا (یعنی تشہد کے ضمن میں بتادیا گیا "السَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ"۔ اب ہمیں یہ بھی بتادیا جائے کہ ہم آپ پر "صلوٰۃ" کس طرح بھیجا کریں؟ ــــ آپ نے فرمایا ــــ اللہ تعالیٰ سے یوں عرض کیا کرو۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَرَسُوْلِكَ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيمَ وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيمَ، وَآلِ إِبْرَاهِيمَ۔

——— رواہ البخاری

اے اللہ اپنی خاص عنایت و نوازش اور محبت و رحمت فرما اپنے خاص بندے اور رسول (حضرت) محمد پر، جیسی تو نے نوازش و عنایت اور محبت و رحمت فرمائی (اپنے خلیل حضرت) ابراہیم پر اور خاص برکتیں نازل فرما حضرت محمد و آل محمد پر جس طرح تو نے برکتیں نازل فرمائیں حضرت ابراہیم و آل ابراہیم پر۔

——— (صحیح بخاری)

عَنْ طَلْحَةَ أَنَّ رَجُلًا قَالَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ نُصَلِّيْ عَلَيْكَ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ؟ قَالَ "قُوْلُوا اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيمَ إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ

——— رواہ النسائی

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ اے پیغمبر خدا ہم آپ پر کس طرح صلوٰۃ بھیجا کریں؟ ــــ آپ نے فرمایا یوں کہا کرو۔ اے اللہ نوازش و عنایت اور محبت و رحمت فرما محمد پر جیسی نوازش و عنایت اور محبت و رحمت فرمائی تو نے

ابراہیم پر، تو حمد و ستائش کا سزاوار ہے اور ہر طرح کی عظمت و بزرگی تیرے لیے ہے۔ (سنن نسائی)

عَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللهِ قَدْ عَلِمْنَا السَّلَامَ عَلَيْكَ فَكَيْفَ الصَّلٰوةُ عَلَيْكَ؟ قَالَ قُوْلُوْا اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ صَلَوَاتِكَ وَرَحْمَتَكَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا جَعَلْتَهَا عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ——— رواہ احمد

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہم لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت آپ پر سلام بھیجنے کا طریقہ تو ہمیں معلوم ہو چکا اب بتا دیجئے کہ آپ پر صلوٰۃ کس طرح بھیجی جائے؟ — آپ نے ارشاد فرمایا، اللہ کے حضور میں یوں عرض کیا کرو،

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ صَلَوَاتِكَ وَرَحْمَتَكَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّدٍ كَمَا جَعَلْتَهَا عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ○

اے اللہ اپنی خاص نوازشیں، عنایتیں اور اپنی مخصوص رحمت نازل فرما حضرت محمد اور ان کے گھر والوں پر، جیسے تو نے نازل فرمائیں حضرت ابراہیم پر، تو ہر حمد و ستائش کا مستحق و سزاوار ہے اور عظمت و کبریائی تیری ذاتی صفت ہے۔

(مسند احمد)

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَيَّ فَقُوْلُوْا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى آلِ اِبْرَاهِيْمَ وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى آلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ○ ——— رواہ احمد و ابن حبان والدارقطنی والبیہقی فی السنن

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم مجھ پر صلوٰۃ بھیجو تو اس طرح کہا کرو اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ وَبَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۝

(مسند احمد، صحیح ابن حبان، سنن دارقطنی، سنن بیہقی)

[چونکہ درود پاک کے ان کلمات کا ترجمہ بار بار کیا جا چکا ہے اس لیے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں سمجھی گئی]

(تشریح) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے روایت کردہ اس درود میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام پاک آپ کی امتیازی صفت اور خاص لقب "النَّبِیُّ الْاُمِّیُّ" کے اضافہ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، قرآن مجید میں آپ کی یہ صفت ایک خاص نشانی اور پہچان کے طور پر ذکر کی گئی ہے (اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ اَلَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَھُمْ فِی التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِیْلِ ــــ الاعراف) اس آیت میں اشارہ ہے کہ تورات وانجیل میں آپ کا ذکر اس صفت کے ساتھ کیا گیا تھا۔ "اُمّی" کے معنی ہیں "بے لکھے پڑھے" مطلب یہ ہے کہ جو علم و ہدایت آپ لے کر آئے وہ آپ نے کسی استاذ یا کتاب سے حاصل نہیں کیا ہے بلکہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی تعلیم سے حاصل ہوا ہے۔ لکھنے پڑھنے کے لحاظ سے آپ بالکل ویسے ہی ہیں جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ آپ کی اس صفت اور اس لقب میں ایک خاص محبوبیت ہے۔ اور اس چھوٹے سے لفظ میں آپ کی نبوت و رسالت کی ایک بڑی روشن دلیل پیش کر دی گئی ہے ؎

نگارِ من کہ بمکتب نہ رفت و خط نہ نوشت
بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ کا

اپنی وصایا اور نصائح کے آئینے میں

——— از مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی

قافلہ سالار سلسلۂ سہروردیہ قطب العارفین حضرت شیخ شہاب الدین ابو حفص عمر بن محمد صدیقی سہروردی رحؒ اپنے وقت کے امام طریقت اور پیشوائے راہ سلوک تھے۔ اخلاق و تصوف میں ایک بلند مقام رکھتے تھے۔ ان کی کتاب عوارف المعارف طالبین و سالکین کے لئے ایک رہنما مینار کی حیثیت رکھتی ہے۔ بعد کے ہر ہر سلسلے کے مشائخ نے اس سے استفادہ کیا۔ حضرت شیخ الاسلام بابا فرید الدین گنج شکر رحؒ اور حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء رحؒ جیسے اکابر طریقت کی خانقاہوں میں اس کتاب کے درس و تدریس اور مطالعہ و مذاکرہ کا سلسلہ جاری رہا۔ حضرت شیخ سعدی شیرازی رحؒ کی نصائح کا راز بھی غالباً اس خوش نصیبی میں مضمر ہے۔ کہ وہ "پیر دانائے مرشد شہاب" رحؒ کے مرید اور ان کے روحانی فیوض سے مستفیض تھے۔ انھوں نے گلستاں میں اپنے پیر و مرشد کی دو اہم نصیحتیں دو شعروں میں نظم کی ہیں جن کو انھوں نے براہِ راست سنا تھا اور جن کے متعلق ماہر رموز طریقت حضرت شاہ غلام علی نقشبند دہلوی رحؒ اور قاسم العلوم والمعارف حضرت نانوتوی رحؒ کی رائے یہ ہے کہ ان دونوں میں تصوف کا خلاصہ آگیا ہے۔

وہ دو شعر یہ ہیں ؎

مرا پیر دانائے فرخ شہابؒ   دو اندرز فرمود بر روئے آب
یکے آنکہ بر خویش خود بیں مباش   دوم آنکہ بر غیر بد بیں مباش

یعنی مجھ کو میرے مرشد حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ نے ساحل دریا پر (جبکہ وہ غالباً دریائی سفر کے لئے کشتی میں سوار تھے یا سوار ہونے والے تھے) مجھے یہ دو نصیحتیں فرمائیں:۔
(۱) خود بینی نہ کرنا یعنی اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر غرور و تکبر نہ کرنا (۲) دوسرے کو برا نہ سمجھنا۔ اور خواہ مخواہ اس کے عیب تلاش کرنے کا طریقہ اختیار نہ کرنا۔

مولانا علاء الدین صاحب صدیقی پھلتی مدظلہ، کی عنایت سے مجھے کتب خانہ مدرسہ مفیض العلوم پھلت کے ایک قلمی نسخے کے مطالعہ کا موقع ملا جو وصایائے قطب العارفین حضرت سہروردی پر مشتمل ہے۔ اور عربی زبان میں ہے۔ یہ وصایا متعدد مریدین متعلقین اور خلفاء کو کی گئی ہیں۔ ان میں عقائد و اخلاق اور اعمال و کردار کے سنوارنے کی باتیں بھی ہیں اور شریعت و طریقت کے اسرار و رموز بھی، سلوک و تصوف کی اہم اور ضروری ہدایات بھی ہیں اور سلسلۂ سہروردیہ کے خصوصی و امتیازی نشانات بھی ـــ میں نے مناسب سمجھا کہ ان وصایا میں سے بطور اقتباس و انتخاب ان کلمات کا ترجمہ ناظرین الفرقان کی خدمت میں پیش کردوں جن کو میں سمجھ سکا ہوں اور جن سے عمومی دینی فائدہ پہونچنے کی امید ہے۔

سب سے پہلے میں حضرت شیخ سہروردی رحمۃ کے حالات حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی رحمۃ کی کتاب نفحات الانس سے پیش کرتا ہوں۔

مختصر حالات حضرت شیخ شہاب الدین ابو حفص عمر بن محمد صدیقی سہروردیؒ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے۔ تصوف و سلوک میں آپ کا انتساب آپ کے چچا حضرت ابوالنجیب سہروردی رحمۃ کی طرف ہے، مرشد اعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ نے آپ سے فرمایا تھا کہ تم عراق کے مشاہیر میں آخری شخص ہو۔ اس طرح آپ کی بہت سی تصانیف ہیں۔ جیسے عوارف المعارف، رشف النصائح اور اعلام التقیٰ وغیرہ۔
عوارف کو مکہ معظمہ میں تصنیف کیا ہے، اثناء تصنیف میں جب کوئی اشکال پیش آتا تو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے اور طوافِ خانہ کعبہ کرکے طلب توفیق کرتے تھے تاکہ اشکال دور ہو اور حق واضح ہو جائے

آپ بغداد میں اپنے وقت کے شیخ الشیوخ تھے۔ دور ونزدیک کے ارباب طریقت آپ سے مسائل دریافت کرتے تھے آپ کو ایک شخص نے لکھا تھا — یا سیدی! اگر میں عمل چھوڑ دوں تو (ڈرتا ہوں کہ) تعطل و بیکاری کی طرف چلا جاؤں گا اور اگر عمل کروں تو (یہ ڈر ہے کہ) مجھ میں تکبر و غرور آجائے گا۔ (پھر میں کیا کروں) آپ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا۔

"(نیک) عمل کر اور تکبر و غرور سے استغفار کر"

رسالۂ اقبالیہ میں مذکور ہے کہ شیخ رکن الدین علاء الدولہ رح نے فرمایا ہے کہ شیخ سعد الدین حموی رح سے لوگوں نے دریافت کیا کہ شیخ محی الدین کو تم نے کیسا پایا؟ انھوں نے جواب دیا کہ وہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا ایک سمندر ہے جس کا کہیں کنارہ نہیں ہے۔ پھر ان سے دریافت کیا گیا کہ شیخ شہاب الدین سہروردی رح کو کیسا پایا؟ جواب دیا کہ متابعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور جو شیخ شہاب الدین سہروردی رح کی پیشانی میں چمک رہا ہے وہ چیز ہی کچھ اور ہے۔

آپ کی ولادت رجب ۵۳۹ھ میں اور وفات ۶۳۲ھ میں ہوئی۔ امام یافعی رح نے اپنی کتاب میں آپ کو مطلع الانوار، منبع الاسرار، دلیل الطریقۃ، ترجمان الحقیقۃ، قدوۃ العارفین عمدۃ السالکین، العالم الربانی وغیرہ القاب سے یاد کیا ہے۔ (نفحات الانس)

ایک وصیت۔ (جو جامع رسالہ نے حضرت سہروردیؒ کے قلم سے لکھی ہوئی تحریر سے نقل کی ہے)

جس کسی کا قلب، نور ایمان سے منور ہوگیا اور جس کو اسلام کے متعلق شرح صدر ہوگیا، اس کے تمام اعضاء و جوارح میں نور سرایت کر جاتا ہے اور وہ شرع کے دائرے میں اپنے آپ کو مقید کر دیتا ہے . . . . پھر وہ بندہ اس مقام پر ہو جاتا ہے کہ اس کی زبان میں نور پیدا ہو جاتا ہے، پس وہ حق بولتا ہے، . . . . صادقین کے قلوب اس کے قول کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اس کے قول اور نصائح سے راہ استقامت پر آجاتے ہیں . . . . انابت قلب اس کے اندر متحقق ہو جاتی ہے . . . . . اور جس کو انابت حاصل ہو جاتی ہے وہ ان وسوسوں کی نفی کرتا ہے جو دل میں گھومتے ہیں اور ان افکار کو دور کرتا ہے جو سویدائے قلب کو گھیرے رہتے ہیں۔ وہ "حدیث نفس" کو دور کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے مناجات اور اس کے سامنے تضرع و زاری

اس کے قلب کی عادت بن جاتی ہے ـــ بجائے "حدیث نفس" کے معانی قرآن اس کے قلب میں جاگزیں ہوتے ہیں۔ اور بسا اوقات کمالِ نورانیت قلب کے ساتھ ساتھ "معانی القرآن" اور مطالعۂ عظمتِ متکلم، بھی اس کے اندر جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ حال ہو جاتا ہے تو وہ قرآن کا بڑا حصہ بغیر وسوسہ اور بغیر حدیث النفس کے ـــ پڑھتا ہے ـــ ......

اللہ تعالیٰ کا یہ انعام ان رجالِ صدیقین اور مشائخِ صوفیہ کی صحبت کی برکت سے حاصل ہوتا ہے۔ جو ائمۃ المتقین اور صاحب احوال ہوتے ہیں اور جن کو علم دراستہ (علم ظاہر) پر عمل کرنے سے علمِ وراثت (علم حقیقی) حاصل ہو جاتا ہے ـــ اور جو صادقین کے قلوب اپنی جانب کھینچتے ہیں ـــ یہ حضرات، زمین پر اللہ کا لشکر ہیں ـــ احوال، اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں مگر یہ بطریقِ صحبت حاصل کیے جاتے ہیں، وجود الاحوال بطریقِ صحبت کی مثال ایسی ہے جیساکہ بیج کہ اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے اگنے اور سرسبز ہونے کی خاصیت رکھی ہے لیکن پہلے بیج بونے والا محنت کرتا ہے اپنی قوت کو فعل میں لاتا ہے ......

شکر، اشرف الاعمال ہے اور سب اعمال کے مقابلے میں کم پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وقلیل من عبادی الشکور (میرے بندوں میں شکر گذار بندے کم ہیں)

اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے کہ بندے کا قلب ان چیزوں میں مشغول ہو جن میں اعضاء و جوارح مشغول ہیں اس لئے کہ شکر (قلب کا) ایک مستقل عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اعملوا آل داؤد شکرا ـــ (اے داؤد کے گھر والو شکر کا عمل جاری رکھو)

اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ "ہمت" کو اسی کی طرف مجتمع رکھا جائے اور قلب کی توجہ اسی کی جانب ہو ـــ مراقبہ، مشاہدہ، اللہ تعالیٰ کی محبت اور یہ تصور کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ امور ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس امر سے چشم پوشی اور درگذر نہیں کرتا۔ کہ بندے کا قلب (کلیتہً) کسی چیز کے ساتھ ہو ـــ چاہیئے کہ اعضاء و جوارح کا عمل اپنے دائرہ تک محدود ہو اور قلب اللہ تعالیٰ کے ساتھ رہے۔ اس لئے کہ قلب اللہ تعالیٰ کے لئے ہے نہ کہ اس کے سوا کے لئے ـــ ...... قلوب، زمین پر اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں اور ان پر اللہ کی نظر ہے، پس ان کے بارے میں کوئی مسامحت اور کوتاہی نہ ہونے پائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے ارشاد فرمایا ہے کہ "اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں کی طرف نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے قلوب کی طرف نظر رکھتا ہے،، (الحدیث)

اگر بندہ (بالفرض) کسی مکروہ جگہ بھی ہو مگر اس کا قلب اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو تو وہ اللہ سے قریب ہے اور اگر وہ کعبہ میں ہو لیکن اس کا دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ نہ ہو تو وہ بعید ہے۔ میری عادت نہیں ہے کہ شطحیات (اخواہ مخواہ کی جذباتی اور جوشیلی باتیں) بیان کروں۔ میں یہ جو کہہ رہا ہوں بات کو اچھی طرح واضح کرنے کے لئے کہہ رہا ہوں۔

خیر! پورے طریقے پر "جمعیت" کے اندر ہے اور شر، کلی طور پر تفرقے میں ہے۔ بندہ جمعیت قلب کی طرف اسی وقت متوجہ ہو سکتا ہے جبکہ اس کو اتحادِ مقصود حاصل ہو۔ اور جب کسی کے مطلوبات، کثیر ہوئے تو اس کے افکار، متفرق ہو گئے۔ اور جب مطلوب میں اتحاد آیا تو نصب العین مجتمع اور متعین ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ اس قلب کو پسند نہیں کرتا جس میں تفرقہ ہو۔ دو ذکر ایک قلب میں جمع نہیں ہوتے۔ قلب کی وحدانیت وحدانیتِ رب کو پیش نظر رکھ کر ضروری ہے ...... بندے کے لئے زیبا نہیں ہے کہ اس کا مقصود سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی اور ہو اور یادہ کسی کی طرف سوائے اس کے متوجہ ہو۔ چاہیئے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے وہ کسی کا بھی مشتاق نہ ہو۔ اللہ کے ماسوا کی طرف نظر ڈالنے کو اچھا نہ سمجھے یہاں تک کہ اس کے سِرّ، قلب اور روح پر اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کی طلب غالب آجائے، اس کا کوئی سانس طلب حق کے بغیر نہ نکلے۔ یہ ادبِ انفاس ہے۔

طلب میں صدق کی علامت یہ ہے کہ کسی بچے کی زبان سے بھی کوئی کلمۂ نافعہ سنے تو اس سے روگرداں نہ ہو۔

...... اللہ تعالیٰ کے اولیاء، رجال ونساء (مرد وعورت) دونوں ہوتے ہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو صفات صاحبِ صدق مردوں کی بیان فرمائی ہیں وہی صاحبِ صدق عورتوں کی بھی بیان کی ہیں — میں اپنی پسماندگی اور اپنی تقصیر پر مقصر اور پسماندہ سے زیادہ دیکھتا ہوں، یہ بات تشریح کی محتاج نہیں،

اور یہ کوئی شطحیات کی قسم کی بات بھی نہیں کہہ رہا ہوں۔ شیخ ابو علی دقاق کا یہ ارشاد میرے حسب حال ہے

—— "میرا جی چاہتا ہے کہ ماتمی لباس پہن کر شہروں میں گھوموں اور اللہ کے بندوں میں آواز لگاؤں اور ان کو اطلاع دوں کہ کتنے حقوق ان سے فوت ہو رہے ہیں اور ان کے سامنے کیا کیا خطرات ہیں، اس کے ساتھ ہی ساتھ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میری تقصیرات کتنی ہیں"

وصیت۔ شمس الدین سمرقندی رح کو

طالب کو لازم ہے کہ اپنے نفس کے احوال کا خیال رکھے اور اس کی لغزشوں خواہشوں، اور اس کے اخلاقِ مذمومہ سے غافل نہ ہو—— اگر اس نفس کی طرف سے غفلت ہوئی تو یہ اپنی تمام صفات اور اخلاق کے ساتھ نمودار ہوگا۔ نفس کی صفات یہ ہیں۔ دنیا کی طرف متوجہ ہونا، حُبِ جاہ اور مخلوق میں رفعت و منزلت کی تمنا، نیز اس بات کا خیال رکھنا کہ مخلوق کس چیز کو اچھا سمجھتی ہے اور کس چیز کو بُرا (اس کا خیال نہ رکھنا کہ شرع کے نزدیک کونسی چیز اچھی اور کونسی بری ہے) موت کی یاد اور لزومِ خلوت وعزلت سے اس کا علاج ہو سکتا ہے۔ سوائے جمعہ اور جماعت کے لوگوں کے ساتھ اختلاط نہ رکھے، علاوہ ازیں بندے کو لازم ہے کہ اپنے اوقات کو غنیمت سمجھے اور اپنے ایّام و ساعات کو اوراد سے مزیّن کرے اس لئے کہ یہ طریقہ، واردات کو کھینچنے والا ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ریا، نِفاق، سُمعہ اور مخلوق کے سامنے سجاوٹ اور بناوٹ سے بھی اپنے آپ کو دور رکھے اس لئے کہ یہ طرزِ عمل، طریقِ صادقین میں شرک کی مانند ہے۔ پس لازم ہے کہ اس شخص کے پاس بیٹھے جس کے تقویٰ اور زُہد کا یقین ہو

وصیت۔ صفی الدین علی بن رشید کو

میں نے صفی الدین علی بن رشید کو ان کے وطن جانے کی اجازت دی تاکہ

وہ اپنے والدین کے حقوق ادا کریں۔ میں اللہ تعالیٰ سے امید کرتا ہوں کہ وہ مجھ کو اور ان کو قولِ ثابت پر جمائے رکھے گا اور شیطان اور اس کے لشکروں سے نیز نفس امارہ کے مکروفریب سے محفوظ رکھے گا۔ مشارٌالیہ کو لازم ہے کہ جب اپنے وطن جائیں تو حفظِ اوقات کی جانب متوجہ رہیں۔ بطالت و بیکاری کو ترک کردیں اور گوشۂ تنہائی کو غنیمت سمجھیں۔ نصب العین، عبودیت اور ضبط اوقات رہے۔ مخلوق کی جانب اس گمان سے نہ جھکیں کہ یہ اخلاق صحیحہ کا تقاضا ہے اور مدارات کی یہ ایک شکل ہے اور اس ظاہرداری اور میل ملاپ کو لوگوں کے قلوب کو اچکنے کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔.....

وہ عقل جو پختہ کار ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہے وہ دنیا اور دنیا والوں سے بے پرواہ رہنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ عاقل کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے قلب سے آخرت کی طرف متوجہ ہو۔ اسی کی طرف اس کا ٹھکانہ ہے۔ عاقل کو اس فانی دنیا کی ٹیپ ٹاپ غافل نہیں کرتی۔ دنیا کی چمک دمک تو بیوقوفوں کو متاثر کرتی ہے اور ان کی عقلوں پر چھا جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ان میں کا ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوتا جو اپنی توجہ کو کسی نہ کسی درجے میں جاہ و مال کے حصول کے اندر نہ لگائے ہو اور یہ دونوں (یعنی جاہ و مال) فانی ہیں۔ جس کے سامنے علم زہد آشکارا ہوا اور اس کے فائدے سے واقف ہوا وہ اپنے اعضاء و جوارح کو قابو میں رکھ کر ممنوعاتِ شرع سے بچنے کی صورت پیدا کرلیتا ہے۔ اس راستے سے نفس کا تزکیہ ہوگا اور جب تزکیۂ نفس ہوگا تو آئینۂ قلب روشن ہوجائے گا۔ اور اس کے اندر گناہ کی برائی ظاہر ہونے لگے گی نیز توجہ اِلیَ اللہ کا ارادہ قلب میں پیدا ہوجائے گا۔ وہ اللہ کے ماسوا کو نظرانداز کردے گا۔ اس وقت بدن بھی اسی طرح نرم ہوجائیں گے جس طرح دل نرم ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ"

(پھر ان کے بدن اور دل اللہ تعالیٰ کے ذکر کے وقت نرم ہوجاتے ہیں)

انسان اپنے اعضاء و جوارح پر پورا پورا کنٹرول اس وقت تک نہیں کرسکتا۔ جب تک قلب ایسا بیدار نہ ہوجائے جو برابر محاسبہ کرتا رہے۔......

وصیت

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔ اللّٰہ یجتبی الیہ من یشاء ویھدی الیہ من ینیب۔
(اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے چھانٹ لیتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی طرف دل سے متوجہ ہوتا ہے اس کو ہدایت دیتا ہے) انسان اپنے نفس امّارہ اور کھانے پہننے میں اس کی خواہشوں اور لذتوں کی رعایت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے محجوب اور بعید ہو جاتا ہے ۔ اور اس کے اوقات آپس کی (بے ضرورت) مخالطت و مجالست سے برباد ہوتے ہیں ۔ جس کے لئے اللہ تعالیٰ بخیریت چاہتا ہے اس کو رشد و صواب کا الہام کرتا ہے ۔ اور اس کے سامنے یہ امر واضح کر دیتا ہے کہ دنیا اور اہل دنیا عنقریب فنا ہونے والے ہیں اور سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی باقی رہنے والا نہیں ہے ۔ بندہ اپنی قبر میں اپنے اعمال کے ساتھ اپنے مولا و خالق کے سامنے ہوگا ۔ (یہ بات اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ذہن نشین ہو جاتی ہے تو) انسان غفلت کی نیند سے بیدار ہو جاتا ہے اور اپنے اوقات کو غنیمت سمجھنے لگتا ہے اور یہ جان لیتا ہے کہ وہ اپنے نفس پر اس وقت تک غلبہ حاصل نہیں کر سکتا جب تک اپنے اوقات کی حفاظت نہ کرے ۔ . . . . . .

دین کا معاملہ ، صنائع میں سے کسی صنعت سے کم نہ سمجھا جائے ۔ کوئی صنعت بھی بغیر استاد کے حاصل نہیں ہوتی (پھر دین بغیر سیکھے کیسے حاصل ہو سکے گا) . . . . . . آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "میری اُمت کے علماء انبیاء بنی اسرائیل کی مانند ہیں" اس ارشاد میں علماء سے مراد وہ علماء رباللہ ہیں جو متقی اور زاہد ہوں ـــــ جس کا قدم راہِ مشیخت میں صحیح اٹھا وہ نائبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے ـــــ وہ لوگوں کو اللہ کی طرف بصیرت کے ساتھ دعوت دیتا ہے ۔

جو شخص مخلوق سے اللہ کے لئے محبت کرتا ہے اس کے لئے لازم ہے کہ ایسے شیخ کی طرف متوجہ ہو جس کے متعلق اسے پورا اطمینان ہو کہ وہ مشیخت کا اور اللہ کی طرف دعوت دینے کا اہل اور مستحق ہے ۔ اگر وہاں کئی شخص ہوں جو مسندِ مشیخت پر بیٹھے ہوں اور یہ طالب یہ نہ جان سکتا ہو کہ ان میں کون صحیح طور پر مشیخت کا اہل ہے تو اس کو چاہیئے کہ توقف کرے جلدی نہ کرے

اس لئے کہ ممکن ہے وہ کسی مشیخت کے مدّعی کا قصد کرے اور وہ درحقیقت اس منصب کا اہل نہ ہو۔ ایسے شخص کا قول، طالب کو فتنے میں، مبتلا کر دے گا اور وہ طالب کے لئے راہزن ثابت ہوگا۔ ایسی صورت میں طالب اس طور پر برباد ہوگا کہ پھر صلاح پذیر نہ ہو سکے گا۔ پس اس حالت میں طالب اپنی روح کو اللہ کی طرف متوجہ کرے۔ اور اللہ کے سامنے خوب گریہ وزاری کرے اور یہ عرض کرے کہ اے میرے رب تو خوب جانتا ہے کہ میں تیری طرف چلنے کا قصد کر رہا ہوں اور یہ تو اپنے بندوں کو خوب جانتا ہے۔ میں ایک صاحب طریق اور ایسے شیخ کو چاہتا ہوں جس سے دینی و روحانی نفع حاصل کروں اور اس کے ذریعے تیری اطاعت و فرمانبرداری کی طرف ہدایت پاؤں۔ تو مجھے ایسا شخص بتا دے جو اس کام کی اہلیت رکھتا ہو۔ پس اللہ تعالیٰ اس کو خواب میں ایسا شخص دکھلا دے گا یا حالت بیداری میں اس کا سینہ کھول دے گا۔ اس کی آہ و بکا پر رحم اور اس کی دعا قبول فرمائے گا اور ایسے شخص کی جانب رہنمائی فرمائے گا جو اس وقت کا واقعی شیخ کامل ہو۔ جب اللہ تعالیٰ ایسے شخص کامل کی طرف رہنمائی فرما دے تو پھر یہ مرید اس کامل کے ساتھ عمدہ وطیرہ اختیار کرے اور پورے طریقے سے اس سے محبت رکھے۔

ایک شخص اس شیخ کامل سے بھی منتفع ہو سکتا ہے جس سے روزانہ ملاقات کر سکے اور اس سے بھی نفع حاصل کر سکتا ہے جس سے ایک ہفتہ یا ایک مہینہ یا ایک سال میں ملاقات کرے اور کبھی شیخ سے اس طرح بھی نفع حاصل کر سکتا ہے کہ اس سے اللہ کے لئے محبت کرے، اگرچہ اس سے ملاقات نہ کر سکے۔ مگر شیخ کا ارشاد اور عبادت کا طریقہ اور سلوکِ طریقِ حق اس تک پہونچا ہو اور وہ شیخ کے باطن سے ہدایت یاب ہوتا ہو، اس کا ادب اچھی طرح کرتا ہو۔ اور اس کے طریقے کی اقتدا کرتا ہو نیز شیخ کی محبت کی برکت سے اس کی جانبِ باطن میں، شیخ کے انوار سرایت کر جائیں۔ جس کی وجہ سے اس کا ظاہر و باطن مستفید ہو جائے اور آداب مع اللہ صحیح اور درست ہو جائیں، پس اس طرح سے بھی وہ طریقِ استقامت کی طرف ہدایت پا جائے گا۔

(باقی)

معارف الحدیث جلد پنجم

کتاب الاذکار والدعوات

جس کی متفرق قسطیں تین سال سے الفرقان میں شائع ہو رہی ہیں۔

الحمد للہ پریس میں طباعت کے آخری مرحلہ میں ہے

امید ہے کہ انشاء اللہ شروع اپریل میں شائقین و طالبین کو روانہ کی جا سکے گی۔

اُمت کو جو دینی اور روحانی نعمتیں اور دولتیں اللہ کے نبی اعظم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ملی ہیں اُن میں قرآن پاک کے بعد سب سے بلند درجہ ذکر اللہ کے اُن کلمات اور اُن دعاؤں کا ہے جو آپ نے تلقین فرمائیں اور جو آپ کے معمولات میں شامل تھیں۔

اللہ کے ذکر اور اُس کی حمد و تسبیح اور توحید و تمجید کے جو کلمے آپ نے تعلیم فرمائے اسی طرح آپ نے اُس کے جو اسماء حسنیٰ اور بابرکت نام بتائے اور مختلف احوال و اوقات اور مقاصد و حاجات کے لیے جو سیکڑوں دعائیں تلقین فرمائیں، اسی طرح ہر قسم کے شرور فتن اور آفات و بلیات سے حفاظت کے لیے استعاذہ کی جو دعوات اور اللہ تعالیٰ کے دریائے رحمت میں تلاطم برپا کر دینے والے توبہ و استغفار اور درود و سلام کے جو کلمات آپ نے تعلیم و تلقین فرمائے ــــــ غور کرنے اور سمجھنے والوں کے لیے اُن میں سے ہر ایک بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک عرفانی معجزہ ہے۔

اس سلسلہ کی حدیثوں کو حدیث شریف کے وسیع ذخیرہ سے چُن کے اُردو زبان میں اُن کی جیسی شرح معارف الحدیث کی اس جلد میں ہو گئی ہے، وہ مصنف پر اور اُردو داں طبقہ پر بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا خاص الخاص انعام ہے۔

مصنف نے دیباچہ میں اُمید ظاہر کی ہے کہ انشاء اللہ یہ کتاب میرے لیے اور اپنے اُن پڑھنے والوں کے لیے جو اُس سے وہ فائدہ اٹھائیں جس کے لیے یہ لکھی گئی ہے مغفرت اور رحمت کا وسیلہ بنے گی۔

شروع میں ہمارے ملک کے مشہور صاحب قلب و قلم فاضل، ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی (سابق صدر شعبہ فلسفہ عثمانیہ یونیورسٹی) کا ایمان افروز اور وجد انگیز مقدمہ ہے جو ایمان و روح والوں کے لیے بجائے خود ایک نعمت ہے۔

چار سو سے زیادہ صفحات۔ کتابت طباعت دیدہ زیب اور معیاری۔ کاغذ نہایت اعلیٰ۔ قیمت غیر مجلد ۶/۵۰ مجلد ریگزین ۷/۵۰

(منیجر) کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

یک دو ساعتے صحبتے با اہلِ دل

مجلس حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی مدظلہ

بارھویں مجلس

مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

یکم ذی قعدہ ۱۳۸۸ھ مطابق ۲۰ جنوری ۱۹۶۹ء کو اورنگ آباد سے بھوپال حاضری ہوئی، یہ بھوپال کے سالانہ تبلیغی اجتماع کا دوسرا دن تھا، لوگ بکثرت زیارت کے لیے حاضر ہوتے، اور کچھ دیر بیٹھ کر چلے جاتے، خانقاہ کا اندرونی و بیرونی دالان اس طرح کھچاکھچ بھرا تھا کہ حضرت تک پہونچنا بھی مشکل تھا، مولانا انعام الحسن صاحب (امیر جماعت تبلیغ) کی ملاقات کے لیے تاج المساجد جانے، اور سفر کے تکان کی وجہ سے مجلس میں حاضری و استفادہ کا اور کچھ قلم بند کرنے کی نوبت نہ آئی، اس مرتبہ راقم الحروف حضرت ہی کا مہمان تھا، اور حضرت نے ازراہِ عنایت و شفقت دولت خانہ کے اس حصہ میں جس میں مولانا عبدالشکور صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قیام رہا کرتا تھا ٹھہرایا،

۲ ذی قعدہ ۱۳۸۸ھ مطابق ۲۱ جنوری ۱۹۶۹ء کو بھی زائرین روانہ دلین و صادرین کی کثرت رہی، معمول قدیم کے مطابق اطمینان کی مجلس، اور منضبط و مسلسل گفتگو نہ ہوسکی، کتب تصوف و صوفیہ و عارفین کے کلام کے سمجھنے میں جو غلط فہمیاں، التباس اور تضاد واقع ہوا ہے، اور جس طرح لوگوں نے ان کے کلام کو مختلف محملوں پر حمل کیا ہے، اور متضاد نتائج نکالے

[illegible]ی کی توضیح فرماتے ہوئے ارشاد ہوا کہ کسی طبقہ یا گروہ کا کلام سمجھنے کے لیے اس کے اصطلاحات و محاورات کا سمجھنا بہت ضروری ہے، کلام کے سمجھنے کے لیے نہایت ضروری ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ متکلم کی مراد کیا تھی، محض الفاظ کے معنی جاننا کافی نہیں ہے، اس کا لہجہ اور انداز، اور موقعہ و محل سمجھنا بھی ضروری ہے۔ ایک شخص نے ایک خادم سے کہا "روکو، مت جانے دو" اس نے اس جملہ کے معنی یہ سمجھے کہ "روکو مت، جانے دو۔" اس نے کوئی روک ٹوک نہیں کی، اور سب لوگ چلے گئے، ان بزرگ نے اس شخص سے محاسبہ کیا کہ میں نے تو پاسبان اور چوکیدار بنا کے کھڑا کیا تھا، تم نے سب کو جانے دیا، اس نے اسی جملہ کی سند پکڑی کہ آپ نے تو خود فرمایا تھا کہ "روکو مت، جانے دو۔" اہل کلام، اور ادیب معمولی تصرف سے عبارت کو کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں، ایک صاحب کا نام محمد کالے تھا، کسی ادیب و شاعر نے اس کا کتنا عمدہ سجع بنایا،

ہر دم نام محمد کا لے

ان اصطلاحات و مقاصد کو نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگوں نے خواجہ حافظ کے کلام سے کیا کیا سمجھا، اور کس کس چیز کی سندیں لیں !

فرمایا کہ طرق و سلاسل طبائع و زمانے کے اختلاف کے مطابق وضع ہوتے رہے، جس زمانہ میں جس طرح کی طبیعتیں اور حالات تھے، اس زمانہ میں اسی کے مطابق بزرگوں نے اصلاح و تربیت کے طریقے وضع کیے، اور اسی کے مطابق ان میں تغیر و تبدل ہوتا رہا، اس کی مثال لباس کی سی ہے، سردی کا ایک لباس ہوتا ہے، گرمی کا ایک لباس، ہر موسم کے لیے ایک ہی لباس کو پکڑا نہیں جا سکتا، میں سردی میں جبہ اور دگلا پہنتا ہوں، لیکن مستقل "صاحب جبہ" نہیں ہو سکتا، لوگوں نے طرق کو مقصود بالذات سمجھ لیا اور ان میں ان کے بارے میں عصبیت و حمیت پیدا ہو گئی، ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے، بلکہ دوسرے کی تحقیر کرنے لگے،

شام کو خانقاہ میں ملاقات و زیارت کرنے والوں کی وجہ سے حضرت یہیں بیٹھ گئے اور مجلس شروع ہو گئی، بمبئی کے ایک دیندار تاجر، اور تبلیغی جماعت کے ایک ممتاز کارکن حاجی علاء الدین صاحب پالن پوری نے عرض کیا، کہ میرے ایک دوست نے چلتے وقت حضرت

[illegible] کام بند ہونے کے لیے دعا کی درخواست کی تھی اور کچھ پڑھنے کو [illegible]
[illegible] بہت کام کا تھا، اب کام ہو گیا ہے، وہ سخت پریشان ہیں، حضرت نے [illegible]
[illegible] خاص طور پر ”اللہ علی رحمۃ القادر“ کا زیادہ سے زیادہ ورد رکھنے کی
ہدایت فرمائی، اور فرمایا کہ ایسے کام ایجنٹوں اور خطوط کے ذریعہ ٹھیک نہیں ہوسکتے، تاثیر کچھ
حاصل ہے، البتہ اوراد و اذکار کے لیے جتنا اہتمام کیا جائے گا، اور طالب سے جس قدر اُن کی عظمت
و طلب صادق کا اظہار ہوگا، اسی قدر ان میں قبولیت و تاثیر پیدا ہوگی، مولانا عبدالشکور صاحب
ایک مرتبہ آگئے، واپسی پر بہت دن ٹھہرے، لکھنؤ جاکر لکھا کہ میں [illegible] کی سند لینے [illegible]
[illegible] میں نے لکھا کہ آپ تو اتنے دن یہاں مقیم رہے، فرمادیا ہوتا تو اس کی بھی تکمیل کردیتا،
جواب میں تحریر فرمایا کہ اس مقصد کے لیے مستقل سفر ہی مناسب ہے، میں اس کو ضمنی طور پر
نہیں کرنا چاہتا تھا، چنانچہ مستقل سفر فرمایا اور سند حاصل کی،

فرمایا کہ بعض لوگ کثرت سے وظائف پڑھتے ہیں، ان کا سارا وقت ذکر وظائف سے
گھرا رہتا ہے، جس بزرگ نے جو بتادیا، اور کسی کتاب میں جو کچھ دیکھ لیا اس کو بھی پڑھنا شروع
کردیا، پھر شکایت کرتے ہیں کہ وظائف میں تاثیر نہیں، میں اتنے دن سے وظائف پڑھ رہا
ہوں، میرا کام نہیں ہوا، وظائف پر اعتماد ایسے ہی ہے جیسے کسی کو اپنی مزدوری یا اپنے عمل
پر ناز ہو، اور اس پر بھروسہ کرے، پھر کریم کے کرم بے استحقاق [illegible] اور اس کے جود
و سخا پر اعتماد کہاں رہا، اپنے فقر و بے بضاعتی پر نظر ہونی چاہیے، کہ میں تو خالی ہاتھ ہوں، البتہ وہ
کریم بندہ نواز اور گداپرور ہے، اللّٰھُمَّ اِنَّ مَغْفِرَتَکَ اَوْسَعُ مِنْ ذُنُوْبِیْ وَرَحْمَتُکَ اَرْجٰی عِنْدِیْ مِنْ عَمَلِیْ[1]
یہاں ایک منشی مبارک علی صاحب تھے، ہم سے تعلق رکھتے تھے، بہت اوراد و وظائف پڑھتے
تھے، ایک دن میں دوپہر کو سو رہا تھا، پریشان ہو کر خانقاہ میں آئے، کہا کہ جگادیجیے، میں
بہت پریشان ہوں، میں اٹھ کر آیا تو معذرت کرنے لگے کہ تکلیف دی، میں نے کہا کہ اگر یہ
ذرا سی تکلیف ہوئی بھی ہو تو آپ کے احسانات تو بہت ہیں، ان کے مقابلہ میں یہ کوئی تکلیف

---

[1] اے اللہ تیری مغفرت میرے گناہوں سے زیادہ وسیع ہے اور مجھے اپنے اعمال سے زیادہ تیری رحمت کی امید ہے۔

نہیں سکتے، لگے کہ اب برداشت نہیں ہوتا، جو لوگ میرے ممنونِ احسان و پروردہ تھے، اب مجھ سے کترانے اور آنکھیں چرانے لگے، میں نے کہا سب وظائف چھوڑ دیجیے" اور اللہ کے کرم پر تکیہ کیجیے، انھوں نے ایسے ہی کیا، میں دہلی گیا ہوا تھا، ان کا خط آیا کہ اللہ نے بڑا فضل فرمایا، میری پریشانی دور ہو گئی۔

فرمایا کہ لوگوں کو نئی نئی دعاؤں، اور سریانی و عبرانی زبان کے وظائف کا شوق ہوتا ہے، ایک صاحب نے مجھ سے دعائے سیفی کی فرمائش کی، میں نے کہا کہ مجھے تو قرآن کی سورتیں اور دعائیں آتی ہیں، دعائے سیفی سے میں ناواقف نہ تھا، یہ سریانی زبان کی ایک دعا ہے، میں جب نوجوانی میں حیدرآباد میں تھا تو مجھے اس کے سیکھنے کا شوق ہوا، حیدرآباد میں ایک بزرگ ہلال علی شاہ صاحب تھے وہ پرانے پل سے آگے کاغذی گوڑہ میں رہتے تھے، میں اپنے ایک دوست کے ساتھ وہاں پہونچا، معلوم ہوا کہ حضرت شہر گئے ہوئے ہیں، بہت دور سے آیا تھا، ان کے انتظار میں وہیں بیٹھ گیا، وہاں عرس کی تیاریاں ہو رہی تھیں، کمانیں لگ رہی تھیں، کچھ دیر کے بعد حضرت تشریف لائے، خدام پر بہت ناراض ہوئے، کہ تم بہت ناسمجھ اور بے سلیقہ ہو، تمھیں کوئی ڈھنگ نہیں، یہ کیا لگا رہے ہو، یہ کس طرح بنا رہے ہو؟ بہت دیر تک ان پر غصہ و عتاب فرماتے رہے، پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے کہ کیوں کھڑے ہو؟ ہم لوگ گھبرائے کہ اب ہماری شامت آئی، عرض کیا کہ دعائے سیفی سیکھنے اور اس کی اجازت حاصل کرنے کے لیے آئے ہیں، بہت ناراض ہوئے، اور کہا کہ جس نے تم کو یہ راستہ بتایا اس کو لیٹا کر پانچ جوتے مارو، یہ کوئی مذاق ہے، جب کسی کو خلافت دی جاتی ہے تو اس وقت اس دعا کی اجازت دی جاتی ہے، ہم اپنا سا منھ لے کر چلے آئے، اور ہم نے کہا کہ سورہ اخلاص، سورہ کوثر جیسی عظیم سورتیں تو بلا خلافت کے مل جاتی ہیں۔ اور یہ دعائے سریانی بغیر خلافت کے نہیں ملتی۔

فرمایا کہ کتب تصوف و مکتوبات شریف وغیرہ میں جو بڑے بڑے مراقبات آئے ہیں، غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب قرآن شریف کی آیات میں موجود ہیں، اسی طرح ادعیہ ماثورہ اور اذکار مسنونہ میں تفکر کرنے، اور ان کو شعور و استحضار کے ساتھ پڑھنے سے وہ سب مقاصد حاصل ہوتے ہیں جو ان مراقبات سے مقصود ہیں، ایک سوتے وقت

کہ اس دعا ہی کے الفاظ و معانی پر غور کیجیے، جس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو تلقین کی[1] کیسی جامع مراقبات دعا ہے اور اس سے تسلیم و رضا، توکل و اعتماد اور کیسی فنائیت حاصل ہوتی ہے۔ "اَللّٰھم انّی اسلمت وجھی الیك و فوضت أمری الیك والجأت ظھری الیك رغبة و رھبة الیك لاملجا ولا منجأ منك الا الیك آمنت بکتابك الذی انزلت و نبیك الذی أرسلت"[2]

فرمایا کہ قاعدہ ہے کہ آدمی جتنا بلندی کی طرف جاتا ہے، سفلی اجزا اور غیر ضروری اور بوجھل اشیا کو نیچے چھوڑ جاتا ہے، میں نے ماسٹر بدیع الحسن صاحب، اور ریاضی و طبعیات کے استادوں سے چاند کی طرف جانے والے راکٹ کا پورا حال پوچھا، اور اس کی تفصیلات معلوم کیں، معلوم ہوا کہ راکٹ اپنے بہت سے حصوں کو نیچے گراتا ہوا گیا، اور جب وہ چاند کے مدار میں داخل ہوا تو اس کا صرف ضروری اور مناسب حصہ رہ گیا، اسی طرح صوفیہ کرام نے اپنے مراقبات و روحانی عروج میں عالم علوی کی سیریں کی ہیں، وہ بھی اس پرواز میں اپنے کثیف و ثقیل اجزا کو پیچھے چھوڑ دیتے تھے، اور صرف اپنی لطافت روح اور قوت عروج سے اس عالم میں پہنچتے تھے، اور ملکوت السموات کی سیر کرتے تھے، اس سیر میں بعض اوقات وہ چاند کو اپنے سے اتنا نیچا دیکھتے تھے جتنا اس زمین پر رہنے والے اس کو اپنے سے اونچا دیکھ رہے ہیں، شیخ اکبر حضرت مجدد وغیرہ نے اپنے ان عروجات و سیر آفاقی کے منازل کو لکھا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الوضو کے آخر میں یہ روایت موجود ہے۔

[2] اے اللہ میں نے اپنے کو تیرا فرمانبردار بنا دیا، اور اپنا معاملہ بس تیرے سپرد کر دیا، اور تجھ ہی کو اپنا پشت پناہ بنا لیا، تیری نظر کرم کے شوق اور امید میں تیرے غضب اور عذاب سے ڈرتے ہوئے، تیرے سوا کوئی جائے پناہ نہیں اور کوئی نجات کی صورت نہیں۔ میں ایمان لایا تیری نازل فرمائی ہوئی کتاب پر اور تیرے بھیجے ہوئے رسول پاک پر۔

تیرھویں مجلس

۳ ذی قعدہ ۱۳۸۸ھ مطابق ۲۲ جنوری ۱۹۶۹ء وقت صبح ½۹ بجے (چہار شنبہ)

آج حضرت کی طبیعت کچھ مضمحل تھی، کمر میں کئی روز سے درد تھا، آج اس میں غالباً کچھ زیادتی ہوگئی، اشراق پڑھ کر خلاف معمول لیٹ گئے، اور آنکھ لگ گئی، مولانا انعام الحسن صاحب چند رفقاء و خدام کے ساتھ ملنے آئے، یہ معلوم کر کے کہ حضرت آرام فرما رہے ہیں، راقم سطور کے پاس اندر مہمان خانہ میں آگئے، کچھ دیر کے بعد جلسہ میں شرکت کرنے والے مہمانوں اور خانقاہ میں آنے والوں کا ہجوم ہوگیا، اندر کا دالان بھر گیا، باہر بھی فرش کا انتظام کرنا پڑا، حضرت بیدار ہوئے اور مولانا کے میرے پاس تشریف رکھنے کا علم ہوا، تو بجائے باہر خانقاہ میں جانے کے، اندر ہی تشریف لے آئے، اور دالان کے کنارہ جہاں جوتے اتارے جاتے ہیں، اس کے پاس ہی بیٹھ گئے، حاضرین نے صدر مجلس میں تشریف رکھنے کے لیے عرض کیا، تو فرمایا کہ مجھے یہیں راحت ہے، بے تکلفی بڑی راحت کی چیز ہے، میں بے تکلفی کو بہت پسند کرتا ہوں، آدمی کو چاہیے کہ جیسی ضرورت ہو، اور ساتھی کو جب خدمت و راحت کی ضرورت ہو پہونچائے، میرے ساتھ حیدرآباد سے ایک لڑکا چلا آیا تھا، وہ میرے ہی پاس رہتا تھا، ایک دن اس کو تکلیف تھی، میں اس کی کمر دبانے لگا، منشی حلیم الدین صاحب بڑے زور سے چونکے، اور کہا کہ میں یہ خدمت انجام دوں گا، گویا ان کو حضرت قدوۃ السالکین کا یہ کام کرنا پسند نہ آیا، میں نے کہا کہ یہ مجھے آرام پہونچاتا ہے۔ اگر میں اس کو آرام پہونچا دوں تو کیا حرج ہے؟ اسلام خصوصیات کو مٹاتا ہے،

مولانا انعام الحسن صاحب اور ان کے بعض رفقاء نے یورپ میں تبلیغی اثرات، جماعتوں کی نقل و حرکت اور مساجد کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہونے کا ذکر کیا، یہ بھی تذکرہ فرمایا کہ جماعت کے لوگوں نے پیرس میں ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کی، اس مرتبہ رمضان مبارک میں وہاں تراویح ہوئی، ساٹھ ستر آدمی تراویح میں شریک ہوتے تھے۔ اخیر عشرہ میں ایک صاحب نے اعتکاف بھی کیا، خط میں تھا کہ پیرس کی تاریخ میں شاید یہ پہلا اعتکاف ہے، حضرت نے ان واقعات پر بڑی مسرت کا اظہار کیا، اور

فرمایا خدا کی شان ہے کہ کفر و ظلمت کے مرکزوں میں یہ تبدیلیاں ہو رہی ہیں، اور اسلام و ایمان کے مرکزوں میں، اور بزرگوں کے خاندانوں میں جہاں پشتوں سے دینداری، اور بزرگی چلی آرہی تھی اللہ تعالیٰ، دین سے بے رغبتی بلکہ دین کی تحقیر اور شعائر اسلام سے وحشت، اور ان کے ساتھ تمسخر کے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں، ؏ چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی، فرمایا کہ ہم تو اسی وقت سے معتقد ہیں، جب نظام الدین کی یہ مسجد بہت مختصر، اور کچی پکی تھی، اور کچھ معذور دو چار آدمی یہاں وہاں پڑے رہتے تھے، یہیں تو یہ باغ اس کا وقت لہلہاتا نظر آتا تھا، میں ایک مرتبہ نظام الدین زیارت کے لیے گیا، زیارت سے فارغ ہو کر جانے لگا، تو کسی نے کہا کہ ایک چھوٹی سی مسجد اور ہے وہاں ایک چھوٹا سا مدرسہ، اور ایک بزرگ رہتے ہیں، وہاں بھی چلیے، میں حاضر ہوا، اور ان بزرگ (مولانا الیاسؒ) کو دریافت کیا، کہا گیا کہ وہ اس وقت مسجد کے باہر گئے ہوئے ہیں، ظہر کی نماز کے وقت ملیں گے، میں ٹھہر گیا، ظہر کی نماز کا وقت آیا، وہ تشریف لائے، میں نے ان کے پیچھے نماز پڑھی یا تو اپنے والد صاحب کے پیچھے (ایسے اطمینان کی) نماز پڑھی تھی، یا ان کے پیچھے، پھر میں نے مولانا یوسف صاحب کا دور بھی دیکھا، ایک دن میں نے ان سے کہا کہ میں نے آپ کو اس وقت دیکھا تھا کہ جب آپ صفوة المصادر پڑھتے تھے، بڑی سادگی سے بولے کہ اب بھی تو وہی پڑھا ہوا ہے۔

محمد رفیق صاحب کانپوری نے جو حضرت سے ملے ہوئے بیٹھے تھے، پوچھا کہ حضرت مزاج کیسے ہیں؟ فرمایا کہ الحمد اللہ بہت اچھے ہیں، اور اچھے ہی رہتے ہیں، ہاں جس دن قرآن مجید نہ پڑھوں، اس دن مزاج ٹھیک نہیں رہتا" ومن یعش عن ذکر الرحمٰن نقیض له شیطانا فهو له قرین[۱] مزاج کا اس پر سب انحصار ہے۔

ایک بزرگ نے (مکاشفہ میں) دیکھا کہ ایک بھڑ ان کے بائیں مونڈھے پر بیٹھا ہوا ہے، اس کا ڈنک ان کے قلب پر ہے، اور وہ موت کا خیال ان کے دل سے ہٹاتا رہتا ہے، موت کے خیال اور آخرت کے یقین سے عمل صالح کی فکر، اور زاد راہ کا اہتمام لازماً پیدا ہوتا ہے قرآن شریف میں آتا ہے کہ "فمن کان یرجو لقاء ربه فلیعمل عملاً صالحاً ولا یشرك"

---

[۱] اور جو غافل ہے خداوند رحمٰن کی یاد سے اس پر ہم مقرر کر دیتے ہیں، ایک شیطان پھر وہ اس کے ساتھ لگا رہتا ہے ۱۲

بعبادۃ ربہ احداً *۔ لوہے کا گولہ یا گیند ڈھلوان کی طرف خود بخود جائے گا، اس کو دھکا دینے یا لڑھکانے کی ضرورت نہیں، حضرت عمرؓ کی انگوٹھی پر نقش تھا "کفیٰ بالموت واعظاً"

ڈاکیہ کے تھیلے میں پندرہ ۱۵ ہزار کی رقم ہے، اس کا ایک بے تکلف دوست پندرہ ۱۵ روپے مانگتا ہے، وہ نہیں دے سکتا حالانکہ اس کے پاس ۱۵ نہیں، پندرہ ۱۵ ہزار روپے ہیں، کیوں؟ اس لیے کہ اسکو معلوم ہے کہ اس کو ڈاکخانہ میں پائی پائی کا حساب دینا ہے، وہ غنی بھی ہو، مفلس بھی، مختار بھی ہے، مجبور بھی، یہی اس انسان کا حال ہے جس کو آخرت کا کھٹکا لگا ہوا ہے، وہ بھی ڈاکیہ کی طرح غنی بھی ہے، قلاش بھی، آزاد بھی ہے، غلام بھی، مختار بھی ہے، مجبور بھی، اپنے اختیار سے کام لے سکتا ہے، اور اپنی ملک میں آزادانہ تصرف بھی کر سکتا ہے، مگر آخرت کے حساب وکتاب کا خوف لگا رہتا ہے،

فرمایا کہ موت کے وقت بعض لوگوں کو بڑا اضطراب ہوتا ہے، یہ گھبراہٹ کیسی؟ اسی وقت کے لیے تو ساری کوشش اور تیاری ہوتی ہے، ایک شخص روئی دھنکواتا ہے، صاف کرتا ہے، پھر رزائی بناتا ہے، اب جب سونے اور سردی کا وقت آیا، تو رزائی سے گھبراہٹ کیوں؟ آرام اٹھانے کا تو اب وقت آیا ہے، اب رزائی کی قدر آئے گی، میرا وقت جتنا قریب آتا جا رہا ہے، فرحت بڑھتی جا رہی ہے، ایک نوجوان میرے پاس آتا جاتا تھا، احتضار کے وقت میں اسے دیکھنے گیا، بولا اماں مجھے پکڑ لیے، میں چلا، یہ اماں کو آواز دینے کا وقت تھوڑے ہی ہے، ایک سن رسیدہ بزرگ بہت بیمار تھے، میں دیکھنے گیا، کہنے لگے کہ ایسی دنیا دیکھ رہا ہوں، جس میں نہ دن ہے نہ رات، میں سمجھ گیا کہ دوسرا عالم شروع ہو گیا ہے، ایسے وقت میں کلمہ پڑھنے کو کہا جائے تو اعزّا برا مانتے ہیں کہ بدشگونی کر رہا ہے، میں نے کہا کہ آپ کے دل پر گھبراہٹ معلوم ہوتی ہے؟ کہنے لگے ہاں! میں نے کہا کہ اس کا علاج ہے، گھبراہٹ دور ہو جائے گی، آپ کلمہ پڑھیے۔

فرمایا قرآن مجید میں ایسی چوٹیں ہیں، اور ایسے کوڑے ہیں کہ پہاڑ بھی پاش پاش ہو جائیں، انسان تو انسان جنوں نے کہا کہ "انا سمعنا قرآناً عجباً" جنوں کی طاقت سب جانتے ہیں، اس پر آپ نے واقعہ سنایا کہ حضرت شیخ محمد غوث گوالیاری ابتدائی دور میں زبردست عامل تھے بہت سے

---

* جسے امید ہو اپنے رب سے ملنے کی وہ نیک اعمال کرے اور اپنے رب کی عبادت اور بندگی میں کسی کو شریک نہ کرے ۱۲

جنوں کو تابع کر رکھا تھا، وہ متوکل تھے، کبھی فرماتے کہ اس شہر میں نماز پڑھنا چاہتا ہوں، دم کے دم میں وہاں پہونچا دیتے، کتنے جنوں کو انھوں نے جلا کر راکھ کر دیا، کتنوں کو درخت سے لٹکا کر مارا، ایک ایسے ہی جن کو انھوں نے جلا دیا تھا، اس کا ایک بیٹا تھا، اس کی ماں نے اس سے کہا، کہ اگر تو اپنے باپ کا بیٹا ہے، تو اپنے باپ کا انتقام لے کر دکھا، وہ ملک مغرب میں جہاں جنوں کے عملوں، اور سحر وغیرہ کا بڑا رواج تھا، اس فن کو سیکھنے گیا، اور بڑے بڑے عملیات حاصل کیے تھے، واپس آیا تو ماں نے کہا کہ نہیں، ابھی خامی ہے، پھر جا، پھر سیکھ کر کے آیا، پھر ماں نے واپس کیا، تیسری مرتبہ سیکھ کر آیا، ماں نے کہا کہ اب ٹھیک ہے، اپنا کام کر، محلہ میں ایک عورت پر اس کا تسلط ہوا، حضرت شیخ محمد غوث کو اطلاع کی گئی، پیغام بھیجا کہ جان کی اماں چاہتا ہو تو چھوڑ کر چلا جا، اس نے کہا کہ میں تو حضرت کی قدمبوسی کے لیے حاضر ہوا ہوں، انھوں نے فرمایا کہ اگر جاتا نہیں تو میں خود آتا ہوں، کہا کہ مجھے تو حضرت ہی سے ملاقات کا اشتیاق ہے، وہ تشریف لائے، عمل کیا، مگر کچھ اثر نہیں ہوا، وہ خود انھیں کے پیچھے پڑ گیا، آخر میں وہ سمجھ گئے کہ زبردست ہے، فرمایا کہ ایک چلّہ کی مہلت دے (تاکہ میں اپنے عملیات تازہ کر لوں) اس نے کہا تین چلّوں کی مہلت ہے، مہلت ختم ہونے پر ان کو اندازہ ہوا کہ ان کا اس سے بس نہیں چلتا، آخر میں انھوں نے شکست قبول کر لی، اس نے کہا کہ درخت میں الٹا لٹکا کر ماروں گا، آپ تڑپ تڑپ کر جان دیں گے، وہ زندگی سے مایوس ہوئے، اگلے دن صبح کی نماز انھوں نے ایک مسجد میں پڑھی، وہاں ایک گمنام درویش کس مپرسی میں پڑے رہتے تھے، کبھی انھوں نے اُن کی طرف التفات نہیں کیا تھا، دل میں آیا کہ اب دنیا سے رخصت ہو رہا ہوں، ان کو بھی سلام کر لوں، سلام کیا اور کہا کہ اب ملاقات نہ ہوگی، فرمایا، کیوں؟ کہا کہ یہ (جن) نہیں مانتا، ان درویش نے اس کو مخاطب کر کے کہا کہ اپنی ماں سے کہدینا کہ تمہاری بات پوری ہو گئی، اب ان کی جان صدقہ کر دے، اس کا اجر آخرت میں ملے گا، اس نے جواب دیا کہ ماں تابعدار ہیں، حضرت کا حکم سر آنکھوں پر، ان کی جان بچ گئی، انھوں نے دیکھا کہ اخلاص سے اللہ کا نام لینا کیا اثر رکھتا ہے، جو کام زبردست عملیات نہ کر سکے، وہ چند سیدھے سادے لفظوں نے کر دیا، اس سے وہ سارا مشغلہ چھوڑ کر فقر و درویشی کی طرف رجوع ہوئے اور شیخ کامل

جن گئے)

فرمایا کہ طالبین و سالکین کی تجلیات و مقامات پر نظر رہتی ہے، اپنے معاصی اور کمزوریوں پر نظر نہیں رہتی، اگر معصیت پر نظر ہو تو سلوک تمام ہو جائے، مجھے بعض بھولے بھالے طالبین اپنے مقامات کی اطلاع دیتے رہتے ہیں، کہ میں فلاں اسم کا مراقبہ کر رہا ہوں، میں فلاں لطیفہ میں مشغول ہوں، مجھے ہنسی آتی ہے، فرمایا کہ احکام شریعت کو نظر انداز کرنے، اور ان کو پس پشت ڈالنے سے لوگ نہیں گھبراتے، میں مسجد کے محراب میں کھڑا ہو کر کچھ بیان کر رہا ہوں، ایک بچہ مجھے ٹوک دیتا ہے، کہ آپ کے پیچھے طاق پر قرآن و حدیث کی کتابیں رکھی ہوئی ہیں، قرآن و حدیث کو پیٹھ ہو رہی ہے، میں اس کو مان لیتا ہوں، اور قرآن و حدیث کا ادب کرتا ہوں، لیکن حکم شرعی کی مخالفت کرنے والوں، اور خدا و رسول کو نظر انداز کرنے والوں سے کہا جائے کہ کیا یہ قرآن و حدیث کی طرف پشت کرنے سے کچھ کم ہے؟ کیا یہ اہانت اور بے ادبی نہیں ہے؟ تو اس کا کچھ جواب نہیں۔

آج شام کو خلاف معمول بعد مغرب ہی مجلس شروع ہو گئی، فرمایا کہ تقابل سے حقیقت کھلتی ہے، اور نعمت کی قدر ہوتی ہے، بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیبت میں سامری کے بہلانے پھسلانے سے جب بچھڑے کی پوجا کی تو ان کے لیے توبہ کا طریقہ یہ تجویز ہوا کہ جو گوسالہ پرستی سے محفوظ رہے، وہ ان کو قتل کریں جو اس میں ملوث ہوئے، لیکن امت محمدیہ صلعم کے لیے گناہ سے توبہ کا طریقہ، یہی توبہ اور استغفار ہے، اب کسی کو اگر بنی اسرائیل کے ساتھ خدا کے اس معاملہ کا علم نہیں، تو اس کو توبہ و استغفار کے اس اسلامی طریقہ کی قدر کیا آئے گی؟ اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی کو نسخہ لکھ کر دیدیا گیا، اور کہہ دیا گیا کہ جڑی بوٹیاں چھال اور پتیاں، جنگلوں اور پہاڑ کے دامنوں سے تلاش کر کر کے لاؤ، پھر ان کو کوٹو چھانو، جوش دو، اور پیو، اور ایک شخص کو بنی بنائی معجون دیدی گئی، اور کہدیا گیا کہ استعمال کرو، اس معجون کی خاصیت یہ ہے کہ اس کو کھا کر کوئی آدمی (ہمیشہ کے لیے) مرتا نہیں، فنائے ابدی اور موت حقیقی اس پر حرام ہے، "لایذوقون فیھا الموت" اس معجون کا استعمال کرنے والے موت کے ذائقہ سے بھی آشنا نہیں ہوں گے، البتہ معجون کی تھوڑی سی کڑواہٹ، اور بدمزگی (نفس کی گرانی اور عادات کی مخالفت) گوارہ کرنا پڑے گی، کہ اس سے مفر نہیں "الا الموتۃ الاولیٰ" یہ نوش دارو، اور آب حیات استعمال

کرکے، عالم برزخ میں کچھ دن رہنا پڑے گا، پھر بقائے دوام ہے، استعمال کرنے کے اوقات بتائے گئے کہ کچھ طلوع آفتاب سے پہلے استعمال کر لیا کرو، تھوڑی سی زوال آفتاب کے بعد، ایک خوراک عصر کو، ایک مغرب کو، ایک عشا کو، (نماز کے پانچ اوقات) نور الصباح میں[1] رہنے کی قدر جب آئے گی، جب آدمی کچھ دن جھونپڑے میں رہا ہو، برسات کی رات ہو، جھڑی لگی ہو، چھپر اِدھر سے ٹپکا تو کھٹیا اُدھر سے گئے، اُدھر ٹپکا تو اِدھر گھسیٹ لائے، اور جب سب طرف سے ٹپکنے لگا تو گدڑی لپیٹ کر بیٹھ گئے اور رات آنکھوں میں کاٹ دی، اب اسی غریب آدمی کو جب امیروں کے محل میں رہنا نصیب ہوگا، تب اس نعمت کی قدر آئے گی، اُمم سابقہ کے احکام و شرائع سے تقابل کرکے دیکھا جائے گا، تو معلوم ہوگا کہ اللہ نے احکام شریعت کی شکل میں کیا نعمت عطا فرمائی ہے اور کن کن زحمتوں اور مشقتوں سے بچایا ہے، اونٹ جب پہاڑ کے نیچے آتا ہے تو بلی کا بچہ نظر آتا ہے۔

فرمایا کہ لوگوں کے لیے عبادات و نوافل بھی سہل ہیں، لیکن شریعت کے احکام کا احترام، جنت کی عظمت، اور دوزخ سے جو وحشت اور دہشت ہونی چاہیے، وہ بعض اوقات نہیں ہوتی، ایک صاحب اعتکاف میں بیٹھے ہوئے تھے، خود بھی نیک تھے، اور ان کے والد بھی بہت نیک تھے، پاجامہ ٹخنے سے نیچے رہتا تھا، میں نے کہا کہ آپ ماشاء اللہ نماز روزہ کے پابند ہیں، اعتکاف میں بھی بیٹھ رہے ہیں، پائچوں کو ٹخنوں سے اونچا رکھنا چاہیے یہ خلاف شریعت امر ہے، بے ساختہ جواب دیا کہ ہاں مجھے معلوم ہے کہ اس کے لیے دوزخ ہے، اللہ اکبر! دوزخ ایسی معمولی چیز ہے، دوزخ کی حقیقت ان کو معلوم ہے، قرآن و حدیث میں اس سے کتنا ڈرایا گیا ہے، اس کے کیسے ہولناک مناظر بیان کیے گئے ہیں، اور اس کا کیسا ہیبت ناک نقشہ کھینچا گیا ہے۔ مومن کو اس سے کیسی وحشت ہونی چاہیے۔

میں اکثر اس نقطہ پر چونک جاتا ہوں، کہ نماز پڑھ لی، قرآن شریف پڑھ لیا، وعظ سُن لیا گویا فراغت ہو گئی، حالانکہ فراغت نہیں ہوئی، کام شروع ہوا ہے، ذمہ داری

---

[1] احمد آباد بھوپال میں علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال کی کوٹھی۔

عائد ہوتی ہے، بعض لوگ وعظ سُن لینے ہی کو مقصود سمجھنے لگتے ہیں، حالانکہ وعظ مقصود نہیں ہے، وعظ پر عمل، اور وعظ سے زندگی میں تغیر پیدا ہونا، اور دینی ترقی مقصود ہے، مثلاً روغن بادام کا استعمال، اور لذیذ کھانا مقصود نہیں، ان کے فوائد مقصود ہیں، مقصود یہ ہے کہ غذا جزو بدن بنے، اور خون صالح پیدا ہو۔

قاعدہ اور تجربہ ہے کہ جو چیز روح سے جتنی زیادہ متعلق اور ذات سے اس کی نسبت جتنی قوی ہوتی ہے، اتنی ہی محبوب ہوتی ہے، بالذات محبوب اپنی ذات ہی ہے، جو چیز جتنی روح سے دور ہوتی جائے گی، اتنی ہی کردہ و مبغوض ہوتی جائے گی، دیکھیے جیتا ناخن کوئی نہیں کٹوتا، اس کے کٹنے سے کتنی تکلیف ہوتی ہے، لیکن جب ناخن بڑھ جاتا ہے، اور ان کا روح سے اتصال ختم ہو جاتا ہے، تو ان سے کتنی وحشت ہونے لگتی ہے، اور آدمی اُن کو کتنی جلد اپنے سے جدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

فرمایا کہ ہارون رشید کے پاس کچھ ڈاکو لائے گئے، جو سزائے موت کے مستحق تھے، انھوں نے کہا کہ امیر المومنین ہم پر دو عذاب جمع نہ کیجئے، ایک موت کا عذاب اور ایک بھوک کا عذاب، خلیفہ نے ان کے لیے کھانا منگوایا ہے اور ان کو کھلایا، انھوں نے کہا کہ امیر المومنین اب آپ کا ہم پر بس نہیں چل سکتا، ہم آپ کے مہمان ہو گئے، ہارون رشید نے یہ سُن کر کہا کہ انھوں نے مجھے بے بس لاجواب کر دیا، قرآن شریف میں آتا ہے۔ "تتنزل علیهم الملائكة أن لا تخافوا ولا تحزنوا وأبشروا بالجنة التي كنتم توعدون نحن اولياءكم في الحياة الدنيا وفي الآخرة ولكم فيها ما تشتهي انفسكم ولكم فيها ما تدّعون نزلاً من غفور رحيم" [1] یہ کتنی بڑی بشارت اور کیسی نوید جانفزا ہے۔

---

[1] ان بندوں پر نازل ہوتے ہیں فرشتے، اللہ کی طرف سے یہ پیغام لیکر کہ نہ ڈرو اور نہ غم کھاؤ، اس جنت کی بشارت وجس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، ہم تمہارے رفیق ہیں۔ دنیا اور آخرت میں اور جنت میں تمہارے لیے وہ سب ہو جیسے تمہارے جی چاہیں گے اور جو تم مانگو گے، مہمانی ہوگی غفور و رحیم پروردگار کی طرف سے۔ ۱۲

المیہ فلسطین

پس منظر اور مستقبل

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ

ترجمہ از مولوی سید محمد الحسنی مدیر "البعث" و "تعمیر حیات"

(پیش نظر مضمون دراصل مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ایک نئی کتاب "مأساۃ العرب ... النکبۃ وما بعدھا" (المیہ فلسطین، پس منظر اور مستقبل) کا مقدمہ ہے۔ یہ کتاب (جو انکے اس سلسلہ کے مختلف مضامین اور تقاریر کا مجموعہ ہے) عن قریب بیروت سے شائع ہونے والی ہے۔ اس مقدمہ کی نوعیت محض رسمی پیش لفظ کی نہیں ہے بلکہ یہ بجائے خود ایک مستقل مضمون ہے جس میں متعلقہ مسئلہ کی اصل نوعیت اور اساس پوری طرح واضح ہو گئی ہے۔ اسی لیے اس کا ترجمہ قارئین الفرقان کے لیے پیش کیا جا رہا ہے)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہر اس شخص کی نظر میں جو اس کائنات میں خدا کے جاری کردہ قوانین فطرت اور سنت اللہ سے واقف ہے اور اس کی ابدی اور لافانی کتاب قرآن مجید میں غور اور تدبر کا عادی اور تاریخ عالم سے باخبر ہے، یہ قومی سانحے اور تاریخی حوادث جو دنیا کے مختلف ملکوں میں اور مختلف قوموں کے ساتھ پیش آتے رہتے ہیں محض اتفاقات یا اچانک اور بے سبب واقعات کہلانے کے مستحق نہیں بلکہ یہ ان واقعات و حوادث، غفلتوں اور تازیانوں کے طویل سلسلہ

کا قدرتی اور حتمی نتیجہ ہیں۔ جن کو بر وقت سمجھنے اور اُن سے ٹھیک ٹھیک نتائج اخذ کرنے کی توفیق اللہ تعالیٰ کے اُن ہی بندوں کو ملتی ہے جو کسی درجہ میں مومنانہ فراست کے حامل ہوتے ہیں اور فہم صحیح کی دولت سے محروم نہیں ہوتے اور یہ وہ لوگ ہیں جنکی صفت اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس طرح بیان فرمائی ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ — اس میں صاحب فراست بندوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔

یہ حوادث و مصائب زیادہ تر اُن عوامل کا نتیجہ ہیں جو نفسیاتی اور اندرونی طور پر قوم و معاشرہ کی زندگی میں برابر اپنا عمل کرتے رہتے ہیں۔ ان عوامل و اسباب کے مزاج و انداز اور انکے پہلوؤں کو دیکھ کر ہر سلیم الطبع آدمی اس بات کی پیشین گوئی کر سکتا ہے کہ اس قوم اور معاشرہ کا یہ انجام ہونے والا ہے۔ اس کے لیے نہ اُس کو کسی وحی و الہام کی ضرورت ہے، نہ کسی غیر معمولی ذہانت اور باریک بینی کی۔ وہ محض ان عوامل کو اپنے پیش نظر رکھ کر اُس کے انجام کو اسی طرح بتا سکتا ہے جس طرح وہ شخص جو بارش کے اوقات و علامات جانتا ہے۔ اُس کے آثار دیکھ کر بارش کی پیشنگوئی کر سکتا ہے بلکہ اُس کا وقت بھی متعین کر دیتا ہے۔ حالانکہ اُس کی معلومات صرف موسم کے تغیرات سے باخبری ملک کی آب و ہوا کے صحیح علم اور اپنے مسلسل تجربوں پر مبنی ہوتی ہیں یا جس طرح قدیم زمانہ میں عرب کے بدو اپنے تجربہ کی مدد سے بارش اور آندھی کے اوقات بتا دیا کرتے تھے یا آج کی جدید رصدگاہوں کے ماہرین فلکیات و موسمیات پہلے سے اُس کی خبر دے دیتے ہیں۔

پانچویں صدی ہجری میں بیت المقدس پر صلیبیوں کا تسلط اور اس کے بعد ساتویں صدی ہجری میں عالم اسلام پر تاتاریوں کی یورش اور بغداد کی پامالی محض بے سر پیر کے واقعات نہیں تھے جن کو صرف تقدیر کی گردش اور قسمت کی خرابی اور اتفاق زمانہ کہہ کر اپنا پیچھا چھڑا لیا جائے ــــ یہ دونوں واقعات دراصل اس طویل سلسلہ اسباب کا نتیجہ تھے جن میں اخلاقی امراض حد سے بڑھی ہوئی بے اعتدالی و کج روی، مجرمانہ افعال و حرکات، مسلسل مغالطے اور خود فریبیاں اور ایسے حالات کی موجودگی شامل ہے جن میں کسی زمانہ اور کسی جگہ بھی باقی رہنے کی صلاحیت نہیں اور سب سے بڑھ کر زندگی کا وہ طرز جو خدا و رسول کو

ناپسند ہے اور جو دینِ صحیح، اور عقلِ سلیم کسی اعتبار سے بھی جائز نہیں۔

اگر ہم تاریخ و تراجم، سیر و سوانح اور شعر و ادب کے اُس ذخیرہ پر نظر ڈالیں جس میں اس عہد کے معاشرہ کی عکاسی اور اُس کے رجحانات و میلانات کی سچی تصویر موجود ہے، تاریخ کی ان کتابوں کا مطالعہ کریں جن میں ہر سنہ کے اہم واقعات قلمبند ہیں یا صرف سقوطِ بغداد سے قبل اور سقوط کے بعد کی تاریخ دیکھ لیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ تاتاریوں کی تباہ کاری اور بغداد کی تباہی (نعوذ باللہ) قدرت کا کوئی اندھا بہرا فیصلہ نہیں تھا بلکہ خدائے عزیز و علیم کی حکمت و اندازہ کا نتیجہ اور تقاضا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ چند سطریں ہمارے لیے کافی ہیں جو ابوالحسن خزرجی نے بغداد پر تاتاریوں کے قبضہ سے پہلے اہلِ بغداد کی حالت بیان کرتے ہوئے قلمبند کی ہیں۔

"اُنھیں صرف اپنی جائدادیں بنانے اور آمدنی بڑھانے کی فکر تھی، ملک کے اجتماعی مصالح اور مفادِ عامہ سے ان کو کچھ دلچسپی نہ تھی وہ اُن دُنیاوی امور میں مشغول تھے جن کا کوئی جواز نہیں، حکام کا ظلم بہت بڑھ چکا تھا اور وہ صرف استحصال و استغلال میں لگے ہوئے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ حکومت کفر سے تو چل سکتی ہے لیکن ظلم کے ساتھ زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہ سکتی۔" [1]

دسویں صدی کے ایک مشہور عالم و مؤرخ مفتی قطب الدین نہروالی مستعصم کے عہد میں اہلِ بغداد کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"بزم و گرم بستروں میں آسودہ بغداد کے کنارے چین کی بانسری بجانے والے، آبِ رواں اور صحنِ گلشن کے عادی دوست احباب کی محفلیں گرم اور دسترخوان میووں اور مشروبات سے پُر انھوں نے نہ کبھی حرب و ضرب سے واسطہ رکھا نہ جنگ کی تلخی سے اُن کے کام و دہن آشنا ہوئے۔" [2]

ذرا ۱۹۴۸ء سے لے کر ۱۹۶۷ء تک کے درمیانی وقفہ میں عالمِ عربی پر نظر ڈالیے

---

[1] العسجد المسبوک [2] الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام (ورق ۲)

آپ کو کیا نظر آئے گا؟ عرب ملکوں کا سیاسی عدم استحکام، قوت فیصلہ کا فقدان، مغربی ملکوں کی ذہنی غلامی و مرعوبیت، ان کے سربراہوں، حکمرانوں اور لیڈروں کی اخلاقی کمزوریاں، اُن کی راحت طلبی، عیش کوشی اور لذت پرستی۔ خاص طور پر مصر (جو عالم عربی کا امام اور فکری، ادبی، علمی اور دینی تحریکوں کا قائد ہے) کے ادبا رو اہل قلم[1] کی دینی بنیادوں اور قدروں پر تیشہ زنی، اخلاقی و اجتماعی قدروں کی پامالی، تاریخی مسلمات و حقائق کا انکار اور صالح معاشرہ اور پاکیزہ کردار کی بنیادوں کو جڑ سے ہلا دینے اور ایسی فکری انارکی و لاقانونیت پھیلانے کے لیے (جس میں معروف و منکر اور حق و باطل سب ایک ہو جائیں) ادب و قلم کی ساری قوتوں کو صف آرا کر دینا، موقع پرستی، ابن الوقتی، لذت پرستی، علاقائی عصبیت، فرعونیت، مغرورگی اور ایک ایسے ادب کا فروغ جس کو قرآن مجید میں "زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا" (خوش نما اور چکنی چپڑی باتیں جو صرف دھوکا ہیں) کہا گیا ہے — عقائد میں شکوک و شبہات، اخلاق و رحجانات میں حد سے بڑھی ہوئی بے راہ روی، اذواق و طبائع میں انتہا درجہ کی کج روی اور بے اعتدالی، دلوں میں بزدلی اور پست ہمتی، ارادہ و عمل میں انفعالیت اور جذباتیت، اور نازک سے نازک وقت اور سخت سے سخت گھڑی میں بھی لہو و لعب اور عیش و طرب کی گرم بازاری، علما و اہل دین کا حق بات کہنے اور تنقید و احتساب سے گریز، جھوٹے اور مصنوعی معیاروں کے سامنے اُن کی سپر اندازی اور معیار زندگی کو بلند کرنے، اپنے اہل و عیال اور اپنے گھرانے کو خوشحال بنانے اور جائز و ناجائز طریقہ سے اُن کے ہر مطالبہ اور فرمائش کو پوری کرنے کے لیے ان کی بے ضمیری، عوام و محنت کش طبقہ کا لہو و لعب گانے باجے (ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سینما) اور ہر اُس چیز سے والہانہ اور روز افزوں عشق جس سے باصرہ اور سامعہ لطف اندوز ہوں یا جس کے تصور ہی سے تمتع حاصل ہوتا ہو۔ اور اس کے بعد اُن تمام طبقوں کا (اپنی سطح اور معیار تعلیم کے اختلاف کے باوجود)

---

[1] اس سلسلہ میں مسلمانوں میں سے ڈاکٹر طٰہٰ حسین، محمد حسین ہیکل، احمد لطفی السید، اور عیسائی اہل قلم میں سے سلامہ موسیٰ وغیرہ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑا نقصان ڈاکٹر طٰہٰ حسین سے پہونچا،

ایک واحد نقطہ پر اجتماع یعنی زندگی سے عشق اور موت سے گھبراہٹ اور فرار۔ ہر قسم کے اقدام، جرأت اور برداشت اور صحیح فیصلہ سے محرومی و معذوری۔

جس شخص کے سامنے یہ حقائق اور ذاتی مشاہدات ہوتے وثوق اور جزم کے ساتھ یہ فیصلہ کر سکتا تھا کہ یہ قومیں دشمن کا پہلا وار بھی برداشت نہیں کر سکتیں اور ایک معمولی صدمہ بھی ان کے لیے ضرب کاری ثابت ہو سکتا ہے اور اُن کے لیے اپنے دین، اپنی عزت، اپنے مقدس مقامات اور اپنے ملّی وجود کو برقرار رکھنا بہت مشکل ہے۔

یہ وہ حقیقت تھی جو اللہ کے اُن بہت سے بندوں کے زبان و قلم پر بے ساختہ جاری ہو گئی جن کو تدبر قرآن، سنت اللہ کے علم اور تاریخ عالم سے واقفیت کا کچھ حصہ نصیب تھا اور انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ پہلے ہی ان حالات کے اس حتمی اور یقینی انجام کی پیشین گوئی کر دی جو اب ایک واقعہ اور المیہ بن کر ہمارے سامنے ہے۔ یہ کوئی کشف و الہام یا پھر کسی بڑی غیر معمولی ذہانت کی نہیں بلکہ حالات کے مطالعہ سے صحیح نتیجہ نکالنے اور اسباب سے مسببات، مبادی و مقدمات سے نتائج و ثمرات تک پہنچنے کی ایک عام فطری بات ہے جس کی صلاحیت ہر سلیم الطبع انسان میں موجود ہے۔

۵ جون ۱۹۶۷ء کی ہزیمت بھی اسی فساد کا نقطۂ عروج تھا جس کی طرف ابھی ہم نے اشارہ کیا ہے اور جس نے اب بہت سی آنکھوں سے پردہ اٹھا دیا ہے۔ پورا عالم اسلام اُس پر بےچین و سوگوار ہے۔ بہت سے اہل قلم و اہل نظر اور اسلام و عالم اسلام کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ان عوامل و اسباب پر پوری بحث کر چکے ہیں جنھوں نے مسلمانوں کو یہ روز بد دکھایا ہے۔ اس پر اتنی بڑی تعداد میں کتابیں شائع ہو چکی ہیں کہ ایک پورا کتب خانہ تیار ہو گیا ہے اور اُس کا پورے طور پر احاطہ و جائزہ بھی دشوار ہے۔

مصنف کتاب نے اس المیہ کے وقوع سے کئی سال قبل اس موضوع پر کچھ لکھا اور کہا تھا اور اس کی زبان و قلم پر بعض ایسے حقائق جاری ہوئے تھے جو بعد میں امر واقعہ بن کر سامنے آئے۔ یہ درحقیقت کوئی الجھا ہوا پیچیدہ اور مبہم مسئلہ نہیں ہے، اس کے لیے صرف قرآن مجید سے کسی درجہ کی مناسبت، قوانین فطرت اور سنت اللہ سے کسی قدر

واقفیت اور اس منطقہ اور علاقے کے حالات سے باخبری شرط ہے جس پر دفاع کی سب سے بڑی اور براہ راست ذمہ داری تھی۔

جب یہ المیہ پیش آیا تو قدرتی طور پر مصنف کے بحث و نظر کا موضوع بنا اور اس سلسلہ میں متعدد مضامین اُس کے قلم سے نکلے اور عالم عربی کے متعدد اہم مقامات اور مواقع پر اُس کو اظہار خیال کا موقع ملا۔ ان تمام تحریروں و تقریروں میں مرکزی نقطہ قرآن مجید کی روشنی، سنت اللہ اور قوانین فطرت اور اقوام عالم کے تاریخی تجربات اور اسباب و مسببات کا باہمی ربط ہے۔

مصنف نے اس میں اس کی کوشش ہے کہ جن حالات سے اس وقت یہ عرب اقوام دوچار ہیں، ان کی کوئی مبالغہ آمیز مصنوعی اور خیالی تصویر سامنے نہ آئے بلکہ ان کے حقیقی امراض اور اصل کمزور پہلوؤں پر انگلی رکھ دی جائے اور ان کا موثر اور کارگر علاج بتایا جائے۔

یہ تحریریں اور تقریریں مختلف مواقعوں پر کی گئیں لیکن ایک وحدت ان سب کو ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہے اور وہ ہے ناکامی کے حقیقی اسباب کی تلاش، اور صراحت اور صفائی کے ساتھ اس سے آگاہی جس میں نہ ابہام ہے نہ الجھاؤ، نہ مداہنت نہ نفاق ـــــ آخر میں "فتح بالآخر اسلام کے حلقہ بگوش عربوں کی ہے۔" کے عنوان سے ایک نئے مضمون کا اضافہ کیا جارہا ہے جس سے یہ کتاب دل شکستگی اور مایوسی پیدا کرنے کے بجائے زندگی اور اُمید کا ایک نیا پیام دیتی ہے۔

مواقیت احرام کا مسئلہ

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم

(۲)

اس مقالے کی پہلی قسط میں مواقیتِ احرام کا مفصل تعارف کرا کے اس کے متعلق ضروری احکام بیان کئے گئے تھے، اور اس مسئلے پر مفصل بحث کی گئی تھی۔ کہ محاذاتِ میقات کس طرح معلوم کی جائے۔ نیز یہ مسئلہ زیر بحث آیا تھا کہ پاکستان و ہندوستان سے بحری جہاز میں جانے والے حجاج جدہ سے احرام باندھ سکتے ہیں یا نہیں؟ اور چونکہ برصغیر کے حجاج کے لئے یلملم کو میقات قرار دیا گیا ہے، اس لئے اس بات کی تحقیق کی گئی تھی کہ مکہ مکرمہ سے یلملم کا فاصلہ کتنا ہے؟ اور اس سلسلے میں مختلف اقوال ذکر کئے گئے تھے۔ اور اس پر پہلی قسط ختم ہو گئی تھی لیکن اس کے بعد کی چند سطریں جو اسی بحث سے متعلق ہیں، غلطی سے پچھلی اشاعت میں شامل نہ ہو سکیں، وہ یہ ہیں!

"مگر میلوں کے اس اختلاف کے باوجود اس پر سب فقہا متفق نظر آتے ہیں کہ اس فاصلہ کو باعتبار مراحل کے دو مرحلے ہی قرار دیا ہے اور مسافتِ مواقیت میں میلوں کے جزوی فرق کو نظر انداز کیا ہے، اس لئے مکہ مکرمہ سے یلملم، قرن، ذات عرق اور جدہ سب کی مسافتیں چونکہ مرحلتین مانی گئی ہیں تو ان سب کو بحکم مساوی قرار دیا گیا۔"

زیر نظر قسط میں اس کے بعد میقات جدہ کے متعلق علماء کے اختلاف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

میقاتِ جدّہ کے متعلق علماء کا اختلاف

تحفہ شرح منہاج ابن حجر مکی رح کے حوالہ سے جو بات اوپر لکھی گئی ہے کہ جدّہ کی مسافت بھی یلملم کی مسافت کے مساوی ہے، اس لئے جدّہ سے احرام باندھنا صحیح ہے۔ اسی کتاب کے حاشیہ میں شیخ عبد الحمید شروانی نزیل مکہ مکرمہ نے اس وقت کے علماء کا اختلاف بھی نقل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ علامہ شبلی مفتی مکہ اور فقیہ احمد بلحاج اور ابو زیاد مینی وغیرہ علماء نے اسی پر فتویٰ دیا ہے جو تحفہ میں لکھا ہے یعنی جدّہ سے احرام باندھنے کو درست و جائز قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے بالمقابل یمن کے بعض علماء عبداللہ بن عمر بامخرم محمد بن ابی بکر اشخر، شیخ عبد الرؤف کا اختلاف بھی نقل کیا ہے۔ ان حضرات کا قول یہ ہے کہ جدّہ کی مسافت مکہ مکرمہ تک بہ نسبت مسافت یلملم کے کم ہے اس لئے حجاج کو چاہیئے کہ ساحل جدّہ میں اترنے سے پہلے جس جگہ جہاز ساحل جدہ اور حرم کی طرف رُخ موڑتا ہے وہاں سے احرام باندھ لیں ساحل جدّہ تک مؤخر نہ کریں، ان کے الفاظ بحوالہ وفائی یہ ہیں۔

عبارة الوفائی فلہ ان یؤخر احرامہ من محاذاة یلملم الیٰ راس العَلَم المعروف قبل مرسیٰ جدہ وھو حال توجہ السفینة الیٰ جھة الحرم ولیس لہ ان یؤخر الیٰ جدّہ لانھا اقرب من یلملم بنحو الربع وقولھم ان جدہ ویلملم مرحلتان مرادھم ان کلا لا ینقص عن مرحلتین وان تفاوتت المسافتان کما حققہ من سلک الطریق الخ (ص۴۲ ج۴)

علماء عصر کی مجلس میں اس مسئلہ پر بحث

دارالعلوم کراچی، مدرسہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی، مدرسہ اشرف المدارس کراچی کے اہل علم وفتویٰ نے عرصہ سے ایک مجلس کی تشکیل کی ہوئی ہے جس کی غرض ایسے ہی جدید و قدیم مسائل پر بحث کر کے کوئی جہت متعین کرنا ہے جس کا کوئی صریح حکم قرآن و سنت وائمہ فقہا کے کلام میں موجود نہیں اور علماء عصر کی رائیں ان میں مختلف ہیں۔ اب تک اس مجلس میں بہت سے اہم مسائل پر بحث ہو کر متفقہ رائے سے احکام مع تفصیل دلائل لکھ دیئے گئے جو مستقل رسالوں کی صورت میں ہیں۔ اور

ان شاء اللہ تعالیٰ عنقریب ان کی اشاعت کا انتظام کیا جائے گا۔

یہ مسئلہ بھی مجلس میں زیر بحث آیا اور متعدد مجالس میں بحث و تمحیص کے باوجود سب کا اتفاق کسی جانب نہیں ہو سکا۔ کچھ رائیں مختلف رہیں۔ چونکہ ایسا اختلاف کوئی نئی چیز نہیں ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے مگر آج کل اس طرح کے اختلاف کو عموماً ایک افتراق بنالیا جاتا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس مختلف فیہ مسئلہ میں جن حضرات نے اختلاف کیا ہے ان کی رائے مع ان کے دلائل کے لکھ دی جائے۔ تاکہ لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ علماء کا اختلاف کس طرح ہوا کرتا ہے اور اختلاف علماء کے وقت عوام کے لئے طریقہ کار کیا ہے۔

حضرت علامہ مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کی رائے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۞ الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔

رسالہ الیواقیت فی احکام المواقیت مصنفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دامت برکاتہم و زیدت حسناتہم کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا اور کچھ حصہ حضرت مصنف سے زبانی سنا۔ اور بحری جہاز مسافروں کے لئے جدہ سے جواز احرام کا مسئلہ ہماری مجلس فقہی کے متعدد مجالس میں زیر بحث آیا اور کافی غور و خوض ہوا۔ اور تحفۃ المحتاج شرح المنہاج کی عبارت اور مخدوم ہاشمی سندھی وغیرہ کی عبارات و آراء پر بھی غور ہوا۔ اور بہت عرصہ پہلے انفرادی طور پر بھی بارہا غور کیا کبھی انشراح صدر نہیں ہوا کہ جدہ سے احرام کی جواز کی صورت درست ہو سکتی ہے، جو کچھ فہم قاصر میں آیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

سرزمین حرم یا مکہ معظمہ میں آنے والوں کے لئے جو دنیا کے کسی گوشے سے آئیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدود مقرر فرمادی ہیں بلا احرام ان سے تجاوز کرنا جائز نہیں، بیت اللہ الحرام کے شمال سے آنے والوں کے لئے ذی الحلیفہ ہے۔ مغرب سے آنے والوں کے لئے جحفہ ہے (جدید نام رابغ) جنوب سے آنے والوں کے لئے یمن کی سرزمین پر جبل یلملم ہے (جدید نام جبل سعدیہ) جنوب مشرق سے آنے والوں کے لئے

قرن المنازل ہے اور شمال مشرق سے آنے والوں کے لئے ذات عرق ہے (جدید تام
مقام عتیق) اب یا تو انہی مقامات پر گذر ہوگا، تو انہی مقامات سے احرام باندھنا
ہوگا یا ان سے فاصلے سے گذرنا ہوگا تو دائیں یا بائیں یہ مقامات واقع ہوں گے۔
ان کی محاذات و مسافت سے احرام باندھنا ہوگا۔

اگر محاذات کی جگہ متعین نہ ہوسکے اور علم یا ظن غالب سے تعین ممکن نہ ہو
تو اس وقت ایسے مقام سے احرام باندھنا ہوگا جس کا فاصلہ کم از کم دو مرحلہ عرفیہ
یا تین مراحل شرعیہ ہوں کیونکہ قریب ترین مواقیت کا فاصلہ اتنا ہی ہے۔ ظاہر ہے
کہ میقات یا محاذات میقات سے تجاوز جائز ہونے کی صرف ایک ہی صورت ہے
کہ محاذات میقات مجہول ہو۔ نیز جدہ تمام فقہاء حنفیہ کی تصریحات کے مطابق داخل
میقات ہے اب جو شخص بحری سفر کر رہا ہو محاذات میقات سے بلا احرام گذرے
گا اور داخل میقات کے مقام پر پہنچے گا اس پر تجاوز عن المیقات بلا احرام کا
حکم لگے گا۔ رہا یہ کہ محاذات کا علم صحیح طریقہ سے ممکن نہیں یہ بات صحیح نہیں۔ آجکل
کے آلات نقشہ جات اور جہاز رانوں کے معلومات کے پیش نظر یہ محض خیالِ خام
ہے۔ نیز [illegible] پاکستان سے جو جہاز جاتے ہیں جہاز ران تمام مسلمان ہوتے ہیں
اطلاع دینے والے کافر کا سوال بھی ختم ہو جاتا ہے۔

شیخ ابن حجر ہیثمی مکی کا یہ فرمانا کہ جب تجاوز یمنۃً و یسرۃً یعنی دائیں
بائیں ایسے حال میں ہو کہ مسافر کا رخ مکہ کے سمت میں نہ ہو اور جب رخ مکہ کی طرف
ہو اس وقت محاذات میقات سے احرام باندھنا ہوگا قابل اطمینان نہیں ہے
جب مسافر کا قصد مکہ ہی ہے اور آگے چل کر صحیح تعین محاذات مشکل ہو پھر متعین
محاذات کو چھوڑنا غیر معقول ہے جبکہ میقات سے اور محاذات میقات سے احرام
باندھنا زیادہ بہتر ہو۔ اور اسی وجہ سے ابن حجر مکی کے چند شارحین نے ان کی
رائے کی مخالفت کی ہے اگرچہ مدار خلاف کچھ اور ہے صرف اتنی بات تجاوز عن المیقات
کے لئے کہ مسافت جدہ و یلملم برابر ہے جدہ سے احرام باندھنے کے لئے کافی نہیں۔

یہ تو صرف اسی وقت حکم ہے کہ محاذات میقات کا تعین نہ ہو سکے، بہر حال جو کچھ ابن حجر ہیثمی نے فرمایا ہے وہ میرے سمجھ سے بالاتر ہے اور تعجب ہے کہ موصوف نے دعویٰ کی تائید میں کوئی فقہی یا حدیثی دلیل پیش نہیں فرمائی اس لئے موصوف کا دعویٰ بلا دلیل پر اتنی بڑی بنیاد قائم کرنا صحیح نہیں اور میرے نزدیک فقہی مسائل یہی ہے کہ بحری مسافر کو یلملم کی محاذات ہی سے احرام باندھنا ضروری ہے ورنہ دم لازم آئے گا۔ اور توبہ بھی کرنا پڑے گا۔

مولانا مفتی رشید احمد صاحب مدرسہ اشرف المدارس کی رائے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سبحانك لاعلم لنا الا ما علمتنا انك انت العليم الحكيم۔

بندہ نے مسئلہ محاذات میقات پر قدیماً وحدیثاً۔ اجتماعاً وانفراداً جب بھی غور کیا تو ہر دفعہ یہی نتیجہ نکلا کہ محاذات بصورت دائرہ لی جائے گی یعنی مکہ مکرمہ سے جس مقام کا فاصلہ میلوں کے اعتبار سے میقات کے فاصلے سے برابر ہوگا وہ مقام محاذی میقات کہلائے گا۔ اس نظریہ پر مختصراً چند دلائل عرض کرتا ہوں۔

(۱) محاذات میقات کے اصل معنی یہ ہیں کہ مکہ مکرمہ کی طرف جاتے ہوئے میقات کے دائیں بائیں جانب برابر ہو جائے۔ کما فی التحفۃ "ای مسامتہ بان کان علی یمینہ او یسارہ" اور ظاہر ہے کہ یہ معنی اس صورت میں متعین ہو سکتے ہیں کہ مسافت کی مساوات میلوں کے اعتبار سے لی جائے البتہ میقات سے بہت دور سے گذر ہو تو دونوں میں تفاوت ہوگا۔

حضرت فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول۔ فانظروا حذوها من طریقکم سے بھی ظاہر ہے کہ اصل اعتبار میقات کے دائیں یا بائیں جانب سے مسافت کا ہے جو کہ مساوات بُعد بحسب الامیال کو مستلزم ہے الا یہ کہ

میقات سے بہت دور سے گذر ہو۔ بلکہ من طریقکم کا لفظ بتلا رہا ہے کہ مسافت
انسان کی بجائے محاذاۃ مقام یعنی مساواۃ مسافت کا اعتبار کیا جائے گا۔ اور
مسافت کی صحیح مساواۃ مراحل کے ترک کے سوا سے نہیں ہو سکتی۔

(۲) وان لم یعلموا المحاذاۃ فعلی مرحلتین من مکۃ کجدۃ
المحروسۃ من طرف البحر (ارشاد الساری)

اس سے ثابت ہوا کہ محاذاۃ میں مساواۃ مسافت کا اعتبار میلوں سے
کیا جائے گا نہ کہ مراحل سے۔ کیونکہ اکثر مواقیت مرحلتین پر ہیں۔ پس اگر محاذات
میں بُعد بحساب مراحل لیا جائے تو عبارت مذکور کا حاصل یہ نکلے گا۔ وان
لم یعلم بعد المرحلتین فعلی مرحلتین، وھو بین البطلان۔

(۳) عبارۃ الوفائی۔ فلہ ان یؤخر احرامہ من محاذاۃ یلملم
الی راس العلم المعروف قبیل مرسی جدۃ وھو حال توجہ
السفینۃ الی جہۃ الحرم ولیس لہ ان یؤخر الی جدۃ لانہا
اقرب من یلملم بنحو الربع وقولھم ان جدۃ ویلملم مرحلتان
مرادھم انہا لا تنقص عن مرحلتین وان تفاوتت المسافتان
کما حققہ من سلک الطریقین وھم عدد کادوا ان یتواتروا
الخ (حاشیہ شروانی علی تحفہ) اس سے معلوم ہوا کہ جن حضرات نے مرحلتین
کا اعتبار کرتے ہوئے جدہ کو یلملم سے محاذی قرار دیا ہے۔ ان کا بھی یہ مقصد
نہیں کہ میلوں کا فرق غیر معتبر ہے بلکہ ان کے نظریہ کی بنیاد اس پہ ہے کہ انہوں نے
مرحلتین کے اطلاق سے دونوں کی مسافت کو مساوی سمجھ لیا لہذا اس پر تنبیہ کی
گئی کہ دونوں کی مسافت مساوی نہیں بلکہ یلملم ابعد ہے۔

(۴) قال الشروانی الامر الاول وھو ان مبنی المواقیت علی
التقریب کلام التحفۃ والنہایۃ ویلزم صریح خلافہ (حاشیہ شروانی)
حضرات فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ مختلفۃ المسافت مواقیت کو دو مرحلے لکھتے ہیں

اس پر کوئی دلیل نہیں کہ محاذاۃ میں میلوں کا فرق غیر معتبر ہے۔ اس سے تو صرف
اتنا ثابت ہوتا ہے کہ مسافت کو شمار کرتے وقت مراحل کی کسور کو چھوڑ دیا جاتا ہے
اس میں کوئی مراحل کی خصوصیت نہیں بلکہ ہر حساب میں ترک کسور کی عام عادت تھی
اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان مواقیت کی مسافت کو برابر
قرار دیا ہے ورنہ قرن المنازل کو آخر المواقیت قرار دینے کے کیا معنی ؟ ڈھائی یا
پونے تین مراحل کو بحذف کسر دو مرحلہ تو کہا جا سکتا ہے۔ مگر دو اور پونے تین مراحل
کی مسافت کو برابر کہنا معقول نہیں جیسے دو ہزار اور پونے تین ہزار کو برابر نہیں کہا
جا سکتا۔ یہ امر ویسے بھی بدیہی ہے اور مسلم ہے کہ مساواۃ باہم بالکل برابری کو کہا
جاتا ہے۔ البتہ اتنا قلیل فرق کہ جس کا حساب مشکل ہو عرفاً ہدر ہوتا ہے چونکہ احکام
شرعیہ کا مدار یُسر پر ہے لہذا مسافت کی مساواۃ معلوم کرنے میں فرلانگ وغیرہ کا
حساب لگانا تو ضروری نہیں بلکہ ایک آدھ میل کا فرق بھی نظر انداز کیا جا سکتا ہے مگر
میلوں کا حساب تو سہل ہے ہاں اگر کہیں میلوں کا حساب بھی مشکل ہو تو اسے بھی ہدر کیا
جا سکتا ہے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرن المنازل کی محاذاۃ میں ذات عرق کی
تعیین اسی طرح فرمائی تھی۔ بعض حضرات کا جدہ اور یلملم کی مسافت کو برابر کہنا بھی
اسی پر مبنی ہے۔

آگے یہ بحث رہ جاتی ہے کہ یلملم اور جدہ میں کسی کی مسافت زیادہ نہیں ہے
سو جدید تحقیقات کے علاوہ متقدمین نے بھی یلملم کی مسافت زیادہ ہونے کی تصریح
فرمائی ہے۔ وان لم یعلم المحاذاۃ فعلی مرحلتین من مکۃ کجدۃ
اور حضرت تھانوی رح اور حضرت سہارنپوری قدس سرہما کے فتاویٰ بھی اسی پر مبنی
ہیں کہ یلملم کی محاذاۃ جدہ پہنچنے سے قبل ہو جاتی ہے۔ اگر کسی نے دونوں کو برابر کہا ہے
تو دوسرے حضرات نے اسے عدم العلم پر مبنی قرار دیا ہے۔ یلملم کی ابعدیت قول الاکثر
اور احوط ہونے کے علاوہ ارجح بھی ہے۔ اس لئے کہ قول مساواۃ تو اندازاً بھی کہا
جا سکتا ہے اور حکم تفاوت خصوصاً مقدار زیادہ کی تعیین اور دوسرے پر عدم علم

کا حکم (کما فی حاشیۃ الشروانی) بعد کامل تحقیق کے نہیں لگایا جا سکتا بلکہ قولہ
ذلک حققہ من سلک الطریقین ووجد ذلک ذو آن یتواترا۔
میں اس کی تصریح ہے کہ یہ فیصلہ جم غفیر نے کامل تحقیق کے بعد کیا ہے۔ شروانی نے
وفائی اور عبد الرؤف تلمیذ شارح رحمہ جو مقدار زیادہ کی تعیین نقل فرمائی ہے
تحقیقات جدیدہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ محاذاۃ یلملم کا علم ہوتے ہوئے (جو اس زمانہ میں مشکل نہیں)
جدّہ تک تجاوز بدون احرام ناجائز ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

رشید احمد عفی عنہ، از اشرف المدارس ناظم آباد کراچی
۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۵ھ

مذکورہ بالا دونوں بزرگوں کے علمی اور عملی کمالات مجد پایہ کاب ضعیف کے لئے قابل فخر ہیں۔ زادہم اللہ تعالیٰ علماً نافعاً وعملاً متقبلاً زیادات لاانتہا ہی۔

لیکن جن وجوہ کی بنا پر ان حضرات نے بحری مسافروں کے لئے جدہ سے احرام باندھنے کو ناجائز موجبِ دم قرار دیا ہے ان پر احقر کا قلب منشرح نہیں۔ احقر نے جہاں تک غور و فکر کیا۔ ترجیح اسی کی معلوم ہوئی کہ بحری مسافروں کے لئے جدہ تک احرام کو مؤخر کرنا جدہ سے باندھنا نہ کوئی گناہ ہے نہ اس سے دم لازم آتا ہے۔

اس کی تفصیلی وجوہ کا بیان پہلے ہو چکا ہے اجمالاً پھر اختصار کے ساتھ یہ ہے کہ۔

(۱) یلملم کی محاذات سے جو تجاوز بحر میں ہوتا ہے وہ تجاوز آفاق کے اندر رہے حل یا حرم کی طرف نہیں ہے۔ اس کو موجب دم قرار دینا سمجھ میں نہیں آتا جن لوگوں کا راستہ یلملم سے مکہ معظمہ کی طرف براہِ راست جانے کا تھا یا اب ہے وہ اگر یلملم کی محاذات سے جانب مکہ مکرمہ تجاوز کریں تو بیشک دم واجب ہوگا، لیکن آج کل بحری جہاز کے مسافر سمندر میں یلملم سے تقریباً بیس میل کے فاصلے سے آفاق کے اندر سفر کرتے ہیں ان کا یہ سفر تجاوز عن المیقات یا عن فات المیقات نہیں کہلا سکتا۔

(۲) جدہ کو فقہاء کا داخلِ میقات کہنا بھی اس کے منافی نہیں کہ جدہ سے احرام باندھنے

کو جائز قرار دیا جائے کیونکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ جتنے بھی مواقیت ہیں وہ سب اجزاء حل ہوتے ہیں۔ باہر سے بقصد مکہ مکرمہ آنے والا یہاں سے احرام باندھ سکتا ہے اور یہاں کا یا اس کے قرب وجوار کا رہنے والا حِلّی کہلاتا ہے اس کے لئے دخول مکہ بلا احرام جائز ہے اسی لئے فقہاء نے ضرورت کے مواقع کے لئے یہ حیلہ لکھا ہے کہ جو شخص باہر سے بقصد جدّہ جدّہ میں داخل ہو اس پر احرام لازم نہیں۔ پھر جدّہ میں مقیم ہو کر اگر وہ مکہ مکرمہ میں بلا قصد حج و عمرہ جانا چاہے تو اس وقت بھی اس پر احرام کی پابندی نہیں۔

(۳) بحری جہاز یلملم کی محاذات سے آگے جو جدّہ کی طرف سفر کرتا ہے وہ تمام سفر آفاق میں ہے جب جہاز بڑے سمندر سے ساحل جدّہ کا رخ کرتا ہے اس وقت یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اب محاذات میقات کس جگہ ہوگی اس کے متعلق عام فقہاء کا یہ ارشاد ہے کہ حقیقی محاذات کا علم ہونا مشکل ہے اس لئے اقرب مواقیت کی مسافت کا اعتبار کر لیا جائے یعنی جس جگہ سے مکہ مکرمہ کا فاصلہ دو مرحلہ ہو وہاں سے احرام باندھنا ضروری ہوگا۔ اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ جدّہ سے مکہ مکرمہ کا فاصلہ دو مرحلہ ہے۔ اسی لئے شیخ ابن حجر مکیؒ، مُلّا علی قاری۔ مخدوم ہاشم سندھی و ملا اخوند جان وغیرہ اکابر علماء نے جدّہ کو بحکم میقات قرار دیا۔

رہا یہ معاملہ کہ آج کل حقیقی محاذات کا علم کچھ دشوار نہیں کیونکہ فاصلوں کی پیمائش اور زاویوں کی تحقیق کے ایسے جدید آلات موجود ہیں جن کی وجہ سے حقیقی محاذات معلوم کرنے کو مشکل کہنا بے معنی ہے اس میں قابل نظر یہ بات ہے کہ بلا شبہ پیمائش کے آلات و ذرائع تو اس زمانے میں بہت موجود ہیں سیاروں کے فاصلے اور زاویے ان سے صحیح لگائے جا سکتے ہیں۔ زمین کی مسافتوں کا تو کہنا کیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ مبدأ و منتہیٰ کا تعین تو آلات سے نہیں روایات سے ہوگا۔ منتہیٰ تو متعین ہے کہ بیت اللہ ہے لیکن مبدأ یعنی میقات جس کی محاذات دیکھنا ہو وہ کیا ہے اس کا عرض و طول کتنا ہے اس کے کس گوشہ سے محاذات دیکھی جائے گی یہ کام تو جدید آلات کا نہیں۔ اس میں تو قدیم فقہاء کا قول ہی مستند ہو سکتا ہے۔ تحفہ شرح منہاج کے حواشی سے یہ بات اوپر لکھی جا چکی ہے کہ یلملم جس کی محاذات کا یہاں اعتبار کرنا زیر بحث ہے وہ حسب تصریح فقہاء سعدیہ کے بالمقابل پہاڑ ہے اور یہ پہاڑ دو میں ایک پہاڑ ہے

مکہ مکرمہ کی مسافت دو مرحلہ سے بھی زائد ہے اور دوسرے پہاڑ سے مسافت لی جائے تو دو مرحلے یا اس سے بھی کچھ کم ہے۔

فتح الباری۔ عمدۃ القاری اور تمام کتب معتبرہ میں بحوالہ ابن حزم یلملم سے جو مسافت مکہ مکرمہ کی بیان کی گئی ہے وہی قابل اعتماد ہے۔ آج کل کے نئے پیمائش کرنے والوں میں کسی نے تو خود مقصد یہی کہ یلملم قرار دے کر وہاں سے مسافت لی ہے کسی نے کسی دوسری جگہ سے ان کے آلات اور پیمائش کے حسابات کتنے ہی صحیح ہوں مگر مبدأ کے تعین میں ان کا قول بمقابلہ علماء سابقین کے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اور ان حضرات کا اس پر اتفاق ہے کہ یلملم کی محاذات بھی مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ ہے اور جدہ کی مسافت بھی۔ اب رہا میلوں کا فرق سو احکام شرعیہ کا مدار کسی جگہ بھی اس طرح کی تدقیقات پر نہیں ہے۔ مواقیت کے مسائل واحکام پر نظر کرنے سے یہ بات بہت واضح ہو جاتی ہے کہ اس معاملہ میں اتنی تدقیق کا اعتبار نہیں کیا۔ یہ سطور اتفاق سے ایسے حال میں لکھ رہا ہوں جبکہ ایک شدید مرض کی وجہ سے اٹھنے بیٹھنے پر قدرت نہیں لیٹے ہوئے لکھی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ آراء مختلف مع وجوہ کے علماء کے سامنے آجائیں تاکہ ان میں غور کر کے وہ کوئی فیصلہ فرما دیں۔

عوام کے لئے

ایسے حالات میں کہ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف رائے ہے احتیاط اسی میں ہے کہ بحری جہاز میں یلملم ہی سے احرام باندھ لیں۔ یا ساحل جدہ پر اترنے سے پہلے احرام باندھ لیں کیونکہ حسب تصریح فقہاء محل اختلاف میں احتیاط کا پہلو اختیار کرنا بہتر ہے تاکہ اپنی عبادت کے جواز میں کسی کا اختلاف نہ رہے اس کے علاوہ احرام کو میقات سے پہلے باندھنا سب ہی کے نزدیک افضل ہے بلکہ بعض روایات حدیث میں اپنے گھر سے ہی احرام باندھ کر چلنے کی فضیلت آئی ہے شرط یہ ہے کہ ممنوعات احرام میں مبتلا ہونے کا خطرہ نہ ہو اور جس کو یہ خطرہ ہو کہ محظورات احرام سے بچنا اس تمام عرصہ میں اس کے لئے مشکل ہوگا اس کے لئے آخری حد تک مؤخر کرنا بہتر ہے ایسے شخص کو آخری حد میں اتنی احتیاط کر لینا چاہئے کہ اس کا احرام علماء کے اختلاف سے

(باقی صفحہ پر)

تفسیر تدبر قرآن (جلد اول)

از مولانا امین احسن اصلاحی

اردو کے تفسیری کتب خانے میں تابناک اضافہ۔ یہ تفسیر مولانا اصلاحی کے چالیس سالہ تدبر قرآن کا نتیجہ ہے۔ قرآن پاک کی تفہیم کے بارے میں اس کو بجا طور پر اس دور کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔

آفسٹ کی طباعت بڑا کتابی سائز ... ۹۰۰ صفحات نہایت حسین اور مضبوط جلد، قیمت -/۳۰

تفسیر ماجدی (جلد اول)

از مولانا عبدالماجد دریا بادی

مشتمل بر سورۂ فاتحہ و بقرہ و آل عمران، نیا اڈیشن مکمل نظر ثانی اور بکثرت اضافوں کے ساتھ۔

ضخامت ... صفحات، بڑا سائز، مضبوط جلد قیمت -/۱۶

قصص القرآن

(از مولانا حفظ الرحمن مرحوم)

امم سابقہ کے سلسلے میں قرآن کے بیانات پر تاریخ و حدیث اور علوم عمرانی کی مدد سے تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے اور ان واقعات کے ہر ہر پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اپنے موضوع پر پورا ایک کتب خانہ ہے۔ قیمت مکمل چار جلد غیر مجلد -/۲۶

درس قرآنی (مکمل سات جلدوں میں)

گھر بیٹھے قرآن سمجھئے اور سمجھائیے

نہایت سادہ انداز میں قرآن کی تعلیم کو پیش کرنے والا ایک قابل قدر سلسلہ، اس کے ذریعہ ہر گھر میں درس قرآنی جاری کیا جا سکتا ہے۔ عوامی افادیت کی غرض سے ایک ایک صفحہ کے سبق کی شکل میں مرتب کیا گیا ہے ہر منزل کی الگ الگ جلد قیمت مکمل سیٹ -/۲۰

مسند حمیدی (عربی) مکمل ۲ جلد -/۱۸

حجۃ اللہ البالغہ (مترجم)

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی اس کتاب کا موضوع اگرچہ اسرار شریعت کا بیان ہے لیکن اس کے مطالعہ سے احادیث نبوی کی روح کو سمجھنے کا ایک خاص دروازہ کھل جاتا ہے۔ قیمت کامل دو جلد -/۲۰

ازالۃ الخفا کامل (اردو)

حضرت شاہ صاحبؒ کی بے نظیر اور معرکۃ الآرا کتاب کا اردو ترجمہ دو ضخیم جلدوں میں قیمت مجلد -/۳۰

مشارق الانوار۔ بخاری و مسلم کی قولی احادیث کا مجموعہ ...... قیمت مجلد -/۱۰

حصن حصین۔ (اردو ترجمہ مع عربی متن) حضور پر نورؐ سے منقول دعاؤں کا مجموعہ۔ قیمت مجلد مع گرد پوش ... -/۱۵

عجالۂ نافعہ شرح فوائد جامعہ

یہ کتاب فن حدیث پر حضرت شاہ عبدالعزیز محدثؒ کی بے نظیر تصنیف ہے۔ اس شرح نے اس کی افادیت میں بیحد اضافہ کر دیا ہے۔ قیمت مجلد مع گرد پوش -/۱۵

محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے

(مولانا تقی الدین ندوی مظاہری)

ائمہ اربعہ اور اصحاب صحاح ستہ کا تذکرہ اور تدوین حدیث کی تاریخ، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مقدمہ سے مزین .... قیمت ۴/۵۰

زاد سفر۔ از امۃ اللہ تسنیم، امام نووی کی کتاب ریاض الصالحین کا اردو ترجمہ مکمل ہو چکا ہے

قیمت مجلد ..... -/۵۰

زبدۃ البخاری (اردو) بخاری شریف کا مکمل خلاصہ ..... قیمت -/۱۲

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

روضۂ اقدس پر عرض سلام کے بعد طلب شفاعت کے بارہ میں ایک سوال کا جواب

محمد منظور نعمانی

ایک مخلص عنایت فرما نے لندن سے لکھا ہے
"..... اس وقت میرے پیش نظر آپ کی کتاب "آسان حج" ہے۔ اس کی مندرجہ ذیل عبارت میرے لیے خلش کا سبب بنی ہے۔

"اس کے بعد حضور سے اپنے لیے اور اپنے والدین کے لیے دعا اور شفاعت کی درخواست کیجیے اور جن لوگوں کے آپ پر احسانات ہوں یا جنھوں نے آپ سے کہہ دیا ہو اور آپ نے اُن سے وعدہ کرلیا ہو اُن کیلئے بھی دُعا اور شفاعت کی درخواست کیجیے۔"

"اس کے بعد تقریباً ایک ہاتھ داہنی جانب ہٹ کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے چہرۂ مبارک کے سامنے آجائیے اور اُن کی خدمت میں سلام عرض کیجیے اور کہیے "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا خَلِيْفَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ" پھر ایک ہاتھ داہنی جانب ہٹ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے آجائیے اور ان کی خدمت میں سلام عرض کیجیے۔ "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ"۔ ص ۱۱۲-۱۱۱

مجھے جہاں تک معلوم ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اگر دور سے درود بھیجا

جائے تو وہ آپ تک پہونچایا جاتا ہے۔ لیکن اگر قریب سے بھیجا جائے تو وہ آپ سنتے ہیں۔ لیکن پھر یہ دُعا کی درخواست اور شفاعت کی درخواست وغیرہ کی بات کچھ حد سے تجاوز معلوم ہوتی ہے۔ قبرستان میں "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا اَهْلَ الْقُبُوْرِ" تو معلوم، لیکن پھر یہ انفرادی خطاب یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ وغیرہ کی کیا گنجائش۔
تائید میں احادیث اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا عمل چاہیئے۔
اُمید ہے کہ آپ زحمت فرما کر جواب عنایت فرمائیں گے۔ والسّلام

چونکہ سوال ایک چھپی ہوئی کتاب سے متعلق تھا، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اُس کا جواب الفرقان میں بھی شائع کر دیا جائے۔ ملحوظ رہے کہ جواب چونکہ خط ہی کی صورت میں لکھا گیا ہے اس لیے اس میں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ جن بعض احادیث کی طرف خط میں اشارہ کیا گیا ہے وہ یہاں فٹ نوٹ میں درج کر دی گئی ہیں۔

مخلص مکرم! سلام و رحمت۔

"آسان حج" جیسا کہ اس کے دیباچہ میں ظاہر کر دیا گیا ہے، میری کتاب "آپ حج کیسے کریں" کا آسان خلاصہ ہے۔ یہ دونوں کتابیں عام اُردو خواں عازمین حج کے لیے لکھی گئی ہیں۔ جو عموماً حنفی المسلک ہوتے ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں مناسک حج اور زیارت کے آداب وغیرہ کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بنیادی طور پر دسویں صدی ہجری کے مشہور مستند عالم اور فقیہ و محدث مُلّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی شرح مناسک سے ماخوذ ہے جو فقہ حنفی کے مطابق مناسک کے موضوع پر مستند ترین کتابوں میں مانی جاتی ہے۔ اور جو بعد کے دور میں لکھی جانے والی مناسک کی اکثر کتابوں کا ماخذ ہے ـــــ اس میں پہلے زیارت کا طریقہ اور آداب لکھے ہیں، اس کے بعد ایک نہایت ایمان افروز طویل سلام لکھا ہے جو دُعا و استغفار کی آیات پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں۔

ثمّ یطلب الشفاعة فیقولُ یا رسول الله أسئلك الشفاعة، ثمّ یتأخر إلی صوب یمینه قدر ذراع فیسلّم علی خلیفة رسول الله صلّی الله علیه وآله وسلّم أبی بکرن الصّدیق رضی الله عنه فیقولُ السّلامُ علیك یا خلیفة رسول الله .... ثمّ یتأخر إلی یمینه قدر ذراع فیسلم علی خلیفة رسول الله صلّی الله علیه وسلم عمر بن الخطاب رضی الله عنه فیقول السلام علیك یا امیر المومنین عمر الفاروقؓ

پھر آپ سے شفاعت کی درخواست کرے اور عرض کرے، اے اللہ کے رسول! میں آپ سے شفاعت کا سائل ہوں۔ پھر قریباً ایک ہاتھ اپنے داہنی جانب ہٹ کے خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سلام عرض کرے اور کہے "اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا خَلِیْفَةَ رَسُوْلِ اللهِ" اس کے بعد پھر قریباً ایک ہاتھ اپنے داہنی جانب ہٹ کر خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں سلام عرض کرے اور کہے اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا أَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ عُمَرَ الْفَارُوْقَ .... الخ

(ارشاد الساری الی مناسک الملا علی قاری ص ۳۳۹ ـ ملخصاً من المتن للشیخ العلامہ رحمتہ اللہ السندیؒ)

اس کے بعد عرض کرتا ہوں کہ جہاں تک میرے علم میں ہے علماء شریعت کی اکثریت زیارت کے موقع پر صلوٰۃ وسلام عرض کرنے کے ساتھ اس طرح شفاعت کی درخواست کو صحیح اور درست جانتی ہے۔ مناسک کی بہت سی دوسری کتابوں میں بھی زیارت کے بیان میں یہی لکھا ہے۔ اور ان حضرات کے اس موقف کی بنیاد ان چند حقائق پر ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ کے اذن سے شفاعت اور دوسروں کے لیے دعا و استغفار کا حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بلاشبہ ثابت ہے اور اسی بنا پر آپ کی حیات میں

آپ سے شفاعت اور دعا و استغفار کی استدعا کی جا سکتی تھی ___ اس میں غالباً کسی کو بھی کلام نہ ہوگا۔

(۲) دلائل شرعیہ سے ثابت ہے اور اسی لیے جمہور امت کا مسلک ہے کہ قبر مبارک میں آپؐ کو ایک خاص قسم کی حیات حاصل ہے (اگرچہ اس حیات کی نوعیت میں علماء کی رائیں مختلف ہیں۔ لیکن اس بنیادی بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ایک خاص نوعیت کی حیات جو شہداء کی حیات سے بھی اعلیٰ قسم کی ہے، قبر مبارک میں آپ کو حاصل ہے) اور اس حیات کے آثار میں سے یہ بھی ہے کہ آپ ان لوگوں کا سلام بنفس نفیس سنتے ہیں جو روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر سلام عرض کرتے ہیں اور ان کے سلام کا جواب بھی دیتے ہیں جیسا کہ احادیث سے معلوم ہوا ہے[۱] (اور خود آپ نے بھی لکھا ہے) ___ اور یہ بھی اسی خاص نوعیت کی حیات کا نتیجہ ہے کہ آپ کا جسم مبارک جوں کا توں محفوظ ہے، اور سب پیغمبروں کا یہی حال ہے جیسا کہ احادیث صحیحہ سے معلوم ہو چکا ہے[۲]۔

(۳) مزید برآں یہ بھی احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آپ کی امت کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں، نیک اعمال پر آپ اللہ کا شکر ادا کرتے

---

[۱] "من صلّی علیّ عند قبری سمعتہ ومن صلّی علیّ نائیاً ابلغتہ"۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔ مشکوٰۃ المصابیح

بلکہ قبر پر سلام کرنے والے کا سلام سننا اور اس کا جواب دینا تو عام مومنین کے لیے بھی ثابت ہے۔ "ما من احد یمر بقبر اخیہ المومن کان یعرفہ فی الدنیا فیسلم علیہ الاعرفہ ورد علیہ السلام۔

(رواہ ابن عبد البر وصححہ ابو محمد عبد الحق زرقانی صفحہ ۳۳۲ ج ۵)

[۲]۔ عن اوس بن اوس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان من افضل ایامکم یوم الجمعۃ فاکثروا علیّ من الصلوٰۃ فیہ فان صلوٰتکم معروضۃ علیّ قال فقالوا یا رسول اللہ وکیف تعرض صلوٰتنا علیک وقد ارمت؟ (قال یقولون بلیت) قال ان اللہ حرم علی الارض اجساد الانبیاء۔

(رواہ ابو داؤد والنسائی وابن ماجہ)

ہیں کہ اس نے آپ کے امتیوں کو اعمالِ صالحہ کی توفیق دی اور جب ان کی بداعمالیاں سامنے آتی ہیں تو آپ اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے معافی اور مغفرت کی استدعا کرتے ہیں۔[1]

جب مندرجۂ بالا یہ تینوں باتیں دلائلِ شرعیہ اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں تو روضۂ اقدس پر صلوٰۃ و سلام عرض کرنے کے ساتھ آپ سے شفاعت یا دُعا و استغفار کی استدعا کرنے میں کوئی اشکال نہیں رہتا، جس طرح حیاتِ دُنیا میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کے لیے آپ سے استدعا کی جا سکتی تھی، اسی طرح قبری اور برزخی حیات کے اس دوسرے دور میں بھی روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر آپ سے یہ استدعا اور درخواست کی جا سکتی ہے ـــــ جب روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر عرض کرنے والوں کی بات آپ سُن لیتے ہیں (یعنی اللہ تعالیٰ آپ کو سُنوا دیتا ہے) اور آپ کو شفاعت اور دعاء استغفار کا حق بھی باذن اللہ حاصل ہے تو پھر وہاں حاضر ہونے والوں کے لیے اس طرح کی استدعا اور درخواست کرنا بالکل صحیح ہے ـــــ یہ دعویٰ کرنا کہ آپ صرف سلام سنتے ہیں اس کے سوا کچھ نہیں سُن سکتے ناقابلِ فہم بات ہے اور اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

رہی یہ بات کہ روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر اس طرح شفاعت یا دُعا کی آپ سے درخواست کرنا صحابۂ کرام سے ثابت نہیں ہے ـــــ مجھے تسلیم ہے (اور یہ واقعہ ہے کہ جو بعض حکایتیں اس سلسلہ میں بعض کتابوں میں نقل کی گئی ہیں ان کی کوئی قابلِ اعتماد سند نہیں ہے) ـــــ لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ ایسے بہت سے اعمال ہیں جن کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے فضائل بیان فرمائے ہیں اور ان کی بڑی ترغیب دی ہے۔ لیکن کہیں ذکر نہیں ملتا کہ وہ صحابہ کرام کے معمولات میں تھے ـــــ مثال کے طور پر

---

[1] عن ابن مسعود قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حیاتی خیر لکم ومماتی خیر لکم تعرض علیّ اعمالکم فما کان من حسن حمدت اللہ علیہ وما کان من سیئ استغفرت اللہ لکم ـــــ رواہ البزار بسند جید۔ زرقانی شرح مواہب لدنیہ جلد ۵ صفحہ ۳۳۶

صلوٰۃ وسلام ہی کو لے لیجئے، قرآن مجید میں اس کا حکم دیا گیا ہے اور بڑے مؤثر اور غیر معمولی انداز میں یہ حکم دیا گیا ہے، سورۂ احزاب میں ارشاد فرمایا گیا ہے: اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔

—— پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کے بڑے غیر معمولی فضائل و برکات بیان فرمائے جو احادیث کے ذخیرہ میں محفوظ ہیں، لیکن اگر کوئی یہ معلوم کرنا چاہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ حضرت فاروق اعظمؓ اور دوسرے اکابر صحابہ کا اس بارہ میں کیا معمول تھا تو وہ معلوم نہ کر سکے گا —— اسی طرح جہاں تک میرا مطالعہ ہے صف اول کے صحابۂ کرام میں سے کسی ایک سے بھی ثابت نہیں کہ انھوں نے کبھی قبر مبارک پر حاضر ہو کر سلام عرض کیا ہو۔ صرف ایک صحابی حضرت عبداللہ بن عمر کے متعلق پتہ چلتا ہے اور وہ بھی صرف اتنا کہ جب کبھی وہ سفر سے مدینۂ طیبہ واپس آتے تو مسجد نبویؐ میں حاضر ہوتے اور اس کے بعد قبر مبارک پر حاضر ہو کر عرض کرتے۔

"اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ، اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا اَبَا بَکْرٍ، اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا اَبَتَاہُ"[۵]

اس سادہ اور مختصر سلام سے زیادہ، خود عبداللہ بن عمر سے اور کسی بھی صحابی سے کسی ضعیف روایت میں بھی منقول نہیں ہے۔

تو اگر یہ اصول مان لیا جائے کہ دلائلِ شرعیہ سے ثابت ہونے کے بعد کوئی عمل اسی صورت میں صحیح اور قابلِ عمل ہوگا جب صحابۂ کرام سے اس کا عملی ثبوت مل جائے تو بہت سے ایسے اعمال کو غیر صحیح اور ناقابلِ عمل ماننا پڑے گا جن کا اعمالِ خیر میں سے ہونا اُمت میں برابر مسلّم رہا ہے —— صحابۂ کرام سے اس طرح کے بہت سے اعمال کے منقول نہ ہونے کی متعدد توجیہیں کی جا سکتی ہیں اور مصنفین نے اپنی تصانیف میں بیان کی ہیں لیکن میں یہاں ان کا بیان کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔

---

۵ زرقانی شرح مواہب لدنیہ ص ۳۰۹ ج ۸

آخر میں یہ بھی عرض کرتا ہوں کہ زیارت کے موقع پر صلوٰۃ وسلام عرض کرنے کے ساتھ شفاعت یا دعا و استغفار کی استدعا کرنے کا یہ مسئلہ جس کے بارہ میں آپ کا اصل سوال ہے اور جس کا میں نے جواب دیا ہے یہ علماء امت کے اختلافی مسائل میں سے ہے، میں نے اُن بزرگوں کے مسلک کی ترجمانی اور وضاحت کی ہے جو اس کو صحیح سمجھتے ہیں ــــ لیکن اُمت کے اکابر علماء میں سے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور ان کے ہمخیال حضرات کی رائے اس کے خلاف ہے وہ اس کو صحیح نہیں سمجھتے۔
ایسے مسائل میں کسی طرف بھی تشدد کی گنجائش نہیں صرف ترجیح دی جاسکتی ہے ــــ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ۝

آپ نے حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی خدمت میں انفرادی طور پر اور خصوصی خطاب کے ساتھ سلام عرض کرنے کے بارے میں اپنے خلجان کا ذکر کیا ہے۔ امید ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے اوپر جو نقل کیا گیا ہے اس کے مطالعہ کے بعد یہ خلجان نہیں رہے گا۔

آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ کے اخلاص نامہ کی وجہ سے اس مسئلہ کی وضاحت کا موقع پیدا ہو گیا۔ والسلام

[illegible] نکل جائے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ نسأل ان یھدینا لما اختلف فیہ الی الحق باذنہ وھو ولی التوفیق والسداد والصواب وبہ نستعین ولا حول ولا قوۃ الا بہ

(البلاغ کراچی سے شکریہ کے ساتھ)

الفرقان کی ملکیت و دیگر تفصیلات سے متعلق اعلان

(مطابق فارم ۴ دیکھیے قاعدہ ۸)

مقام اشاعت	لکھنؤ
وقفہ اشاعت	ماہانہ
پرنٹر کا نام	محمد منظور نعمانی
پرنٹر کی قومیت	ہندوستانی
پرنٹر کا پتہ	کچہری روڈ لکھنؤ
پبلشر کا نام	محمد منظور نعمانی
پبلشر کی قومیت	ہندوستانی
پبلشر کا پتہ	کچہری روڈ لکھنؤ
ایڈیٹر کا نام	محمد منظور نعمانی
ایڈیٹر کی قومیت	ہندوستانی
ایڈیٹر کا پتہ	کچہری روڈ لکھنؤ
مالک کا نام و پتہ	محمد منظور نعمانی۔ کچہری روڈ لکھنؤ

میں محمد منظور نعمانی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین میں بالکل صحیح ہیں۔

(دستخط) محمد منظور نعمانی

یکم مارچ ۱۹۶۹ء

اکبر کا دینِ الٰہی اور اُس کا پس منظر

پروفیسر محمد اسلم

علماء و مشائخ کی صحبت میں رہ کر اکبر اپنے ابتدائی دورِ حکومت میں ایک راسخ العقیدہ مسلمان بن گیا تھا۔ ان ایام میں رواداری نام کو بھی نہ پائی جاتی تھی، بلکہ اس کا مذہبی تعصب اس انتہا کو پہونچا ہوا تھا کہ ۹۷۷ ہجری میں جب حسین خاں والیٔ کشمیر کا سفیر میر یعقوب بن بابا علی اہما کے دربار میں حاضر ہوا تو اکبر نے اسے شیعہ ہونے کے جرم میں قتل کروا دیا۔[۱] اکبر کے مصاحب علماء بھی اسی کی طرح متعصب سُنّی تھے۔ مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطانپوری مہدویوں کو جو سزائیں دیا کرتے تھے، اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اکبر کے صدر الصدور شیخ عبدالنبی بھی غیر سنیوں کے معاملہ میں بڑے متعصب واقع ہوئے تھے۔ ان کے خلاف بھی میر حبش کو "رفض" کے جرم میں قتل کروانے کا ثبوت مل گیا ہے۔[۲]

اکبر کو اولیائے کرام کے ساتھ جو عقیدت تھی وہ اسے اپنی والدہ کی جانب سے ودیعت ہوئی تھی۔ اس کی والدہ حمیدہ بانو بیگم مشہور صوفی اور شاعر شیخ احمد جام زندہ پیل کی اولاد سے تھی۔ اسی لیے اکبر کی سرشت میں بزرگوں کے لیے عقیدت کے جذبات تھے۔ کئی بار وہ پاکپتن میں حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے مزار پر خراجِ عقیدت پیش کرنے کی غرض سے حاضر ہوا۔[۳] دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر بھی وہ اکثر جایا کرتا تھا۔[۴] جب خان زماں نے

---

[۱] تاریخ محمدی، ورق ۵۰ ب، بسبب رفض بفرمان اکبر بادشاہ کشتہ شد۔ نیز بدایونی، جلد ۲، ص ۲۵۵
[۲] روضۃ الطاہرین، ورق ۱۴۵ ب [۳] اکبر دی گریٹ مغل، ص ۴۴

۱۵۶۴ء میں اکبر کے خلاف بغاوت کی تو اس کے مقابلہ پر نکلنے سے پہلے اکبر دہلی کے تمام اولیاء اللہ کے مزارات پر بغرض دعا حاضر ہوا۔ اس کے عہد میں شیخ نظام نارنولی ابھی حیات تھے اور بہت دُور دُور تک ان کے زہد و اتقا کا شہرہ پھیلا ہوا تھا۔ ایک بار اکبر بھی اجمیر جاتے ہوئے ان کی خدمت میں حاضر ہوا[۶]۔ ۱۵۷۰ء میں اکبر ہمیں اجمیر میں سید حسین خنگ سوار کے مزار پر فاتحہ خوانی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس واقعہ کے پانچ سال بعد ہم اُسے ہانسی میں حضرت قطب جمال کے مزار پر جبینِ نیاز جھکائے ہوئے دیکھتے ہیں[۷]۔ یہ صوفیائے کرام کے ساتھ عقیدت کا ہی نتیجہ تھا کہ اُس نے فتح پور سیکری میں شیخ سلیم چشتیؒ کے قرب میں نیا دارالحکومت تعمیر کیا تھا۔

مولانا عبد اللہ سلطان پوری اس عہد کے ایک جید عالم تھے[۸] اور شیر شاہ نے اپنے عہدِ حکومت میں ان کی علمیت سے متاثر ہو کر انھیں صدر الاسلام کا خطاب دیا تھا[۹]۔ شیر شاہ کا بیٹا سلیم شاہ انھیں اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا کرتا تھا[۱۰]۔ ہمایوں نے جب دوبارہ دہلی پر قبضہ کیا تو انھیں شیخ الاسلام کا خطاب دیا۔ بیرم خاں نے اکبر کے ابتدائی دورِ حکومت میں ان کا ایک لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا[۱۱]۔

مولانا عبد اللہ بڑے راسخ العقیدہ بزرگ تھے اور شیخ الاسلام کی حیثیت سے رفعِ بدعت اور ترویجِ شریعت کے لیے کوشاں رہتے تھے[۱۲]۔ اکبر نے بھی انھیں ان کے منصب پر برقرار رکھا۔

شیخ طاہر پٹنی اس عہد کے بڑے نامور محدث تھے اور مخدوم الملک کی طرح وہ بھی رفعِ بدعت اور ترویجِ شریعت کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ جب ان کی قوم نے مہدوی فرقہ کے عقائد اپنائے تو شیخ طاہر نے اپنے سر سے دستار اتار لی اور یہ عہد کیا کہ جب تک وہ ان کا زورِ ...

---

۵ اکبرنامہ جلد ۲۔ ص ۲۲۷ — ۶ ایضاً، ص ۲۳۲

۷ تذکرۃ الامرا، ورق ۱۱۱۲ الف — ۸ مآثر الامراء، جلد ۳، ص ۲۵۲

۹ شعر العجم جلد ۳، ص ۴۰ — ۱۰ ایضاً

۱۱ بدایونی، جلد ۳ ص ۷۰ — ۱۲ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۰۳ —

پہنچ جائے اس وقت تک وہ اپنے سر پر دستار نہیں باندھیں گے۔ جب ۹۸۰ ہجری میں اکبر نے گجرات فتح کیا تو ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ اس موقع پر اکبر نے "نصرت دین متین بر وفق ارادۂ شما بر ذمہ معدلت من لازم است" کہتے ہوئے ان کے سر پر اپنے ہاتھ سے دستار باندھی۔[12]

سید محمد میر عدل کا بھی اکبر پر بڑا اثر تھا۔ عبدالقادر بدایونی رقمطراز ہے کہ وہ فرائض کی انجام دہی میں کسی کی پرواہ نہیں کیا کرتے تھے۔ عوام تو عوام خود بادشاہ بھی ان سے گھبراتا تھا۔[13] ایک بار جب حاجی ابراہیم سرہندی نے یہ فتویٰ دیا کہ مردوں کے لیے سرخ لباس پہننا جائز ہے تو میر عدل نے بادشاہ کی موجودگی میں حاجی کو برا بھلا کہا اور عصا لے کر اسے مارنے پر آمادہ ہوگئے۔[14] جب اکبر راہ راست سے بھٹکا اور اس نے علماء سے کہا کہ وہ جواز متعہ پر مزید تحقیق کریں تو اس نے مصلحتاً میر عدل کو آگرہ سے بھکر تبدیل کر دیا۔[15]

مذہب کے ساتھ اکبر کی دلبستگی اور علوم اسلامیہ کے ساتھ لگاؤ نے اسے فتح پور سیکری میں عبادت خانہ بنانے پر آمادہ کیا۔[16] جب یہ عمارت بن کر تیار ہوئی تو ہر جمعہ کی نماز کے بعد علماء وہاں جمع ہونے لگے۔[17] اکبر خود رات کے وقت اکثر وہاں جا بیٹھتا اور یاھو اور یاھادی کا ورد شروع کر دیتا۔ صبح سویرے وہ ایک پتھر کی سل پر بیٹھ کر مراقبہ کیا کرتا تھا۔[18]

عبادت خانہ کی تعمیر سے اکبر کا مقصد قال اللہ اور قال الرسول کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اس لیے اس نے علماء اور مشائخ کو وہاں آکر اپنے مواعظ حسنہ سے مستفیض کرنے کی درخواست کی۔[19] اسی سلسلے میں شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کے صاحبزادے کو دعوت خصوصی بھیج کر فتح پور سیکری بلایا گیا اور ان کے لیے ایک نشست مخصوص کر دی گئی۔[20]

---

۱۲ آثار الکرام، جلد ۲، ص ۱۹۵　۱۳ بدایونی، جلد ۲، ص ۲۱۰،
۱۴ ایضاً، ص ۲۱۰، ۲۱۱　۱۵ ایضاً، ۲۱۰　۱۶ بدایونی جلد ۲، ص ۱۹۸
۱۷ ایضاً، ص ۲۰۱　۱۸ ایضاً ص ۲۰۰　۱۹ ایضاً ص ۲۰۰
۲۰ ایضاً ص ۲۰۱

بدقسمتی سے بعض جاہ پسند علما مخصوص نشستوں کے لیے جھگڑنے لگے کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ اسے بادشاہ کے قریب جگہ ملے۔ بادشاہ نے ان کے جھگڑے ختم کرنے کی غرض سے یہ حکم دیا کہ امرا مشرق کی جانب بچھی ہوئی مسندوں پر بیٹھا کریں اور سادات عظام مغرب کی جانب۔ اسی طرح علمائے کرام جنوب کی جانب بچھی ہوئی مسندوں پر بیٹھیں، اور مشائخ کرام شمال کی جانب[21]

جب مذہبی مباحثے شروع ہوئے تو علما مختلف مسائل میں ایک دوسرے سے جھگڑنے لگے اور بات بڑھتے بڑھتے گالی گلوچ تک جا پہنچی[22] اکبر نے ان حرکات پر خفگی کا اظہار کرتے ہوئے بدایونی سے کہا کہ جو عالم اس مجلس میں بے ہودہ پن کا مظاہرہ کرے اُسے وہاں سے اٹھا دے[23]

مولانا عبداللہ سلطان پوری کو تنگ کرنے کی غرض سے عبادت خانہ میں مدعو کیا گیا۔ علما انھیں خواہ مخواہ مختلف مسائل میں اُلجھانے لگے۔ حاجی ابراہیم سرہندی اُن کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ اکبر نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ ابوالفضل جو اُن دنوں نوعمر ہی تھا وہ بھی مولانا کے منہ آنے لگا۔ اکبر نے اس کا بھی حوصلہ بڑھایا[24] جب حاجی ابراہیم سرہندی زیادہ ہی منہ زور ہوا تو اکبر نے بدایونی کو آگے بڑھایا، اور اس نے حاجی کے منہ میں لگام دی۔ بدایونی کے مناظرے دیکھ کر اکبر اکثر اپنے مصاحبوں سے کہا کرتا تھا کہ یہ نوجوان عبداللہ سلطانپوری کا سر پھوڑے گا[25]

ان مذہبی مباحثوں میں شاید اتنی ناخوشگواری پیدا نہ ہوتی۔ اگر اکبر ابوالفضل، حاجی ابراہیم اور بدایونی جیسے منہ زور عالموں کی پیٹھ نہ ٹھونکتا۔ اس لیے عبادت خانہ میں پیدا ہونے والی تمام بدمزگی کی ذمہ داری براہ راست اکبر پر عاید ہوتی ہے۔

ان ہی مباحثوں میں ایک بار خان جہاں نے مولانا عبداللہ سلطانپوری سے پوچھ لیا کہ کیا ان پر ابھی حج فرض ہوا ہے یا نہیں؟ مولانا نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے تمام

21۔ ایضاً، ص ۲۰۲ — 22۔ بدایونی، جلد ۲، ص ۲۰۲

23۔ ایضاً — 24۔ ایضاً

25۔ ایضاً، ص ۲۰۳

حاضرین کو بتایا کہ اس زمانے میں دو وجوہات کی بنا پر فریضۂ حج ساقط ہو چکا ہے۔

اول یہ کہ جو شخص سمندر کے راستے جدہ روانہ ہونا چاہے اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ پرتگیزوں سے پاسپورٹ حاصل کرے۔ چونکہ اس پاسپورٹ پر صلیب کے نشان کے علاوہ حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی تصاویر بھی ہوتی ہیں۔ اس لیے کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اس طرح کی دستاویزات اپنے پاس رکھے۔

ثانیاً یہ کہ اگر کوئی شخص سمندر کی بجائے خشکی کے راستے حجاز جانا چاہے تو اس کے لیے ایران سے گزرنے کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں۔ ایران پر چونکہ شیعوں کا قبضہ ہے۔ اس وجہ سے کسی سُنّی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ "ملحدوں" کے ملک میں سفر کرے۔"

ان دو صورتوں کے علاوہ اور کسی طریقے سے حجاز پہونچنا ممکن نہیں۔ اس لیے فریضۂ حج ساقط ہو چکا ہے[۲۶] زکوٰۃ کی ادائیگی سے بچنے کے لیے بھی اسی طرح کے حیلۂ بیہودے کام نکالا گیا[۲۷] علماء کی نجی زندگی اور ان کے کرتوت دیکھ کر بادشاہ کا ان پر سے اعتماد اُٹھ گیا۔ مولانا عبداللہ سے گلو خلاصی کرانے کی غرض سے انھیں جبراً مکہ مکرمہ بھیج دیا گیا[۲۸] کچھ عرصہ گزرنے کے بعد مولانا بلا اجازت ہندوستان چلے آئے لیکن آگرہ پہونچنے سے پہلے ہی احمد آباد میں انتقال ہو گیا۔ بادشاہ نے جاسوسوں کی اطلاع پر ان کے "آبائی قبرستان" کو کھدوایا تو ان "قبروں" سے تین کروڑ روپے کی مالیت کی طلائی اینٹیں برآمد ہوئیں[۲۹] ان کا زکوٰۃ کی ادائیگی سے بچنے کا عذر اور حج پر نہ جانے کا بہانہ اور اسی طرح کے حیلہ ہائے بیہودہ پڑھ کر دَور حاضر کے بعض مؤرخوں کو مولانا عبداللہ پر شائیلاک کا گمان گزرتا ہے[۳۰]

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے پوتے شیخ عبدالنبی صدر الصدور اپنے دَور کے بہترین محدث مانے جاتے تھے۔ آپ نے حجاز میں اس دَور کے جید علماء سے تعلیم حاصل کی تھی[۳۱] ہر

---

۲۶ ؎ ایضاً۔ ص ۲۰۳، ۲۷ ؎ دبستان مذاہب، ص ۲۶۳؛ ۲۸ ؎ بدایونی، جلد ۲، ص ۲۰۲

۲۹ ؎ ایضاً، ۲۰۴   ۲۹ ؎ ایضاً، ص ۳۰۳۔ ۳۰ ؎ منتخب اللباب، جلد اوّل، ص ۲۴۰

۳۰ ؎ ریلجس پالیسی آف اکبر۔ ورق ۸۴   ۳۱ ؎ روضۃ الطاہرین، ورق ۸۵ ب

تا کس ان کا دل وجان سے احترام کرتا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ اکبر خود ان کے گھر جا کر درس حدیث میں شریک ہوا کرتا تھا[۳۱] اکبر نے ایک بار اپنے ہاتھوں سے ان کے جوتے سیدھے کیے، اور شاہزادہ سلیم کو سماعت حدیث کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا حکم دیا[۳۲] انھوں نے بھی ادائیگی زکوٰۃ سے بچنے کا ایک حیلہ تلاش کر لیا تھا۔ اکبر نے انھیں بھی جبراً حج پر روانہ کر دیا۔ لیکن آپ بھی مولانا عبداللہ سلطانپوری کے پیچھے پیچھے ہندوستان چلے آئے۔ جب اکبر سے ملاقات ہوئی تو جن ہاتھوں سے وہ آپ کے جوتے سیدھے کیا کرتا تھا ان ہی ہاتھوں سے اس نے آپ کے منہ پر ایک گھونسہ رسید کیا[۳۴] اکبر کے حکم سے آپ کو زندان میں ڈالدیا گیا جہاں ابو الفضل نے طرح طرح کی اذیتیں دے کر انھیں مروا ڈالا۔

مولانا عبداللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنبی کو ٹھکانے لگا کر اکبر علماء کے اثر سے نکل گیا۔ اور پھر من مانی کارروائیاں کرنے لگا[۳۵] حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خیال میں مولانا عبداللہ سلطانپوری شیخ عبدالنبی حاجی ابراہیم سرہندی، تاج العارفین تاج الدین، شیخ مبارک اور اس کے بیٹے جیسے علماء بادشاہ کو گمراہی کے راستے پر ڈالنے کے ذمہ دار ہیں آپ ایک مکتوب میں رقمطراز ہیں[۳۶]

"والحق دریں زمان ہر سستی و داہنتی کہ در امور شرعیہ واقع شدہ است وہر فتوری کہ در ترویج ملت و دین ظاہر گشتہ است ہمہ از شومیٔ علماء سوست، و فساد نیات ایشان۔"

ان کے شرعی حیلے اور طلب جاہ خود ان کے لیے اور ان کی وجہ سے اسلام کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ انھیں "لصوص دین" کے لقب سے یاد کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں[۳۷]

"معلوم شریف است کہ در قرن سابق ہر فسادیکہ پیدا شد از شومیٔ علماء سو بظہور آمدہ .....

علمائے سو لصوص دین اند۔ مطلب ایشان حب جاہ و ریاست و منزلت نزد خلق است۔"

---

[۳۱] بدایونی، جلد ۲، ص ۲۰۴   [۳۲] ایضاً

[۳۴] ایضاً۔ ص ۳۱۱   [۳۵] مراۃ جہان نما، ورق ۱۲۸ ب

[۳۶] مکتوبات امام ربانی، جلد اول، مکتوب نمبر ۳۳   [۳۷] ایضاً

آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ علمائے سوء کے اختلافات نے امت کو ایک مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ اصل الفاظ یہ ہیں:[۳۸]

"در قرن سابق اختلاف علماء عالم را در بلا انداخت۔"

علما کے زوال کے بعد بادشاہ صوفیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اس زمانے میں ہندوستان روحانی طور پر دیوالیہ ہو چکا تھا اور پورے ہندوستان میں ایسا بزرگ کوئی نہ تھا جو عوام کی راہ نمائی کر سکتا۔ اور جو صوفی ان دنوں میں حیات تھے وہ وحدۃ الوجود کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اور ان کا بیش تر وقت سُکر کے عالم میں گزرتا تھا۔ بدایونی رقمطراز ہے کہ قاضی امان اللہ پانی پتی کے بھتیجے شیخ تاج الدین بادشاہ کے سامنے قرآن کی تفسیر وحدت الوجود کے رنگ میں کیا کرتے تھے۔[۳۹] خود شیخ امان اللہ شیخ محی الدین اکبر ابن عربی کے بے حد مداح تھے اور وہ ہمیشہ وحدۃ الوجود کے موضوع پر ہی درس دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اس موضوع پر کئی کتابیں بھی لکھی تھیں۔[۴۰] ہندوستان میں صوفیا کے حلقوں میں ان کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔

اسی طرح شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ بھی اپنے عہد میں وحدت الوجودی صوفیوں کے سرخیل تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے اپنی مسجد میں اسی موضوع پر درس دیا۔ جب ان کا درس ختم ہوا، تو ان کے بیٹوں نے نظریات قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر شیخ عبد القدوس بڑے ناراض ہوئے اور ناراضگی کے عالم میں آپ نے یہ فرمایا کہ وہ ایسے شہر میں رہنے کے لیے تیار نہیں جہاں کے باشندے وحدۃ الوجود پر ایمان نہ رکھتے ہوں۔[۴۱] ان کے فرزند شیخ رکن الدین رقم طراز ہیں کہ اس واقعہ کے بعد شیخ بزرگؒ نے اپنے بیٹوں کی اقتدا میں نماز پڑھنا ترک کر دی اور جب اُن سے اس کا سبب پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ میرا دین اور ہے، اور ان کا دین اور ہے۔[۴۲]

---

[۳۸] ایضاً، مکتوب نمبر ۵۳، [۳۹] بدایونی۔ جلد دوم۔ ص
[۴۰] اخبار الاخیار، ورق ۱۸۰ ب [۴۱] لطائف قدوسی، ص ۵۹، [۴۲] ایضاً ص ۴۰

ایک بار شیخ عبدالقدوسؒ کے جلیل القدر مرید شیخ جلال الدین تھانیسریؒ ان سے ملنے آئے،
جب آپ نے انھیں دُور سے آتے دیکھا تو فرمایا: "ہمانجا باش و بگو کہ چہ دین داری و چہ مشرب داری"
جب انھوں نے بتایا کہ ان کا بھی وہی دین اور مشرب ہے جو شیخ کا ہے تو آپ نے آگے بڑھ کر ان کا
استقبال کیا اور ان سے گلے ملے۔

ان امثال سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس دَور کے تمام صوفیا وحدۃ الوجود کے
رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے اور اٹھتے بیٹھتے اسی نظریہ کا پرچار کرتے تھے۔ ہر چند شیخ عبدالقدوس
کا انتقال اکبر کی تخت نشینی سے کئی سال پہلے ہوچکا تھا۔ لیکن ہندوستان کی فضا میں ان
کے درس کی صدائے بازگشت ہنوز گونج رہی تھی۔

ڈاکٹر یوسف حسین رقم طراز ہیں کہ اکبر کے زمانے میں وحدۃ الوجود کا نظریہ
اسلامی ہندوستان میں عام ہوچکا تھا اور صوفیائے کرام پر صحو کے بجائے سکر غالب
آگیا تھا[۴۴] اکبر کے دین الٰہی کا اس نظریہ سے قریبی تعلق تھا[۴۵] ڈاکٹر تاراچند فرماتے ہیں کہ اس
نظریہ سے یہ بات اکبر پر عیاں ہوچکی تھی کہ خدا کی پرستش کے بہت سے طریقے ہیں اور یہ کہ تمام مذاہب
مبنی بر صداقت ہیں اور جب تمام موجودات مظاہر الٰہی ہیں تو پھر جھگڑے اور تصادم کی صورت
میں بھی خدا ہی کی پوجا ہوگی[۴۶] اس عقیدے کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ دیگر مذاہب کے ماننے والوں
کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم ہوجائیں گے! اور انسان میں برداشت کا مادہ پیدا ہوجائیگا[۴۷]۔

ہم یہ بتا چکے ہیں کہ ہندوستان اُس عہد میں روحانی طور پر دیوالیہ ہوچکا تھا اور اس
وقت کوئی مردِ خدا اس قابل نہ تھا کہ وہ عوام کی روحانی رہنمائی کرسکتا۔ شیخ عبدالقدوس
گنگوہیؒ اور شیخ سماءالدین سہروردیؒ عوام الناس میں زیادہ مقبول نہ ہوسکے۔ تاریخ شاہی
مخزن افغانی کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ صحو پر سکر غالب آچکا تھا اور ملک

---

[۴۳] ایضاً

[۴۴] گلمپسز آف دی مڈیول انڈین کلچر، ص ۵۰

[۴۵] ایضاً

[۴۶] دی انفلوئنس آف اسلام آن انڈین کلچر، ص ۴۷

[۴۷] ایضاً

میں مجاذیب کی بھرمار تھی نعمت اللہ ہروی نے ایسے بے شمار مجاذیب کا ذکر کیا ہے جو اس عہد میں موجود تھے۔ ان میں سے میاں قاسم خلیل، شیخ علی سرمست، شیخ حمزہ، شیخ جمال کاکر، علی مجذوب، شاہ محمد، شیخ منگی، شیخ ونکتر دانی اور شیخ عارف قابل ذکر ہیں[۴۸] مفتی معود لاہوری نے بھی شیخ حسین لاہوری کا شمار ان ہی مجاذیب میں کیا ہے[۴۹] ان کے علاوہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار کے خاتمہ پر ان جیسے بے شمار مجاذیب کا ذکر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ہوش مند صوفیوں کا فقدان تھا اور ملک میں جا بجا مجاذیب پھیلے ہوئے تھے جو شریعت کی قید سے آزاد تھے۔ ان کی آزاد مشربی اور خلاف شریعت حرکات دیکھ کر عوام بھی آزاد مشرب اور بے شرع ہو رہے تھے۔ نیز ان مجاذیب کی اکثریت عشق مجازی میں پھنسی ہوئی تھی۔ تاریخ شاہی کے مصنف نے ان کی بے شمار عشقیہ داستانیں مزے لے لے کر بیان کی ہیں۔

اکبر کے ایک ہم عصر بزرگ، اخوند درویزہ اپنی مشہور تصنیف ارشاد الطالبین میں اس عہد کے سجادہ نشینوں کے متعلق تحریر فرماتے ہیں "خصوصاً درین زمانۂ فساد کہ اکثر آدم صورت و شیطان سیرت بر سجادہ پدر و پدر کلاں خود نشستہ اند۔"[۵۰] ایسے ہی پیشہ ور صوفیوں نے اس عہد میں عوام کے اخلاق کو بگاڑنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ایک جگہ حضرت مجدد الف ثانی ان کے متعلق لکھتے ہیں: "و اکثر جہلائے صوفی نمائے ایں زمانہ حکم علماء سوء دارند، فساد ایں ہا نیز فساد متعدی است[۵۱]"

اخوند درویزہ نے اپنی ایک دوسری تصنیف تذکرۃ الابرار و الاشرار میں ایسے بے شمار صوفیوں کا ذکر کیا ہے جو پہلے خود گمراہ ہوئے اور پھر دوسروں کو بھی خوب گمراہ کیا۔ ان "اشرار" میں سے ایک "شریر" پیر طیب نامی افغان تھا جو مسئلہ آواگون کا پرچار کیا کرتا تھا[۵۲] اسی طرح ایک

---

[۴۸] مخزن افغانی مورق ۱۹۴ ب، ۲۰۰، ۲۰۱ الف، ۲۰۴، ۲۰۷ الف، ۲۱۹ ب۔

[۴۹] خزینۃ الاصفیاء۔ جلد اول، ص ۱۳۱ [۵۰] ارشاد الطالبین، ص ۲۹۹

[۵۱] مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب نمبر ۴۷ [۵۲] تذکرۃ الابرار و الاشرار، ص ۱۶۲

نام نہاد پیر [illegible] قیامت کا منکر تھا۔[53] ایک اور "فرقہ" الیاس افغان برہمنوں کی طرح زنار پہنا کرتا تھا۔[54] اسی طرح محمد ضیا، نامی ایک افغان مسئلہ تناسخ پر ایمان رکھتا تھا اور "اباحت" کا پرچار کیا کرتا تھا۔[55] اسی عہد میں ولی نامی ایک افغان پیر نے مسئلہ تناسخ کا پرچار کر کے بے شمار لوگوں کو گمراہ کر دیا۔ اخوند درویزہ فرماتے ہیں کہ اول اول اس نے نبوت کا دعویٰ بھی کیا تھا لیکن بعد ازاں وہ خدائی کا دعویٰ کرنے لگا تھا۔[56] جس طرح خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے اسی دیکھا دیکھی غرغشتی قبیلہ کے ایک افغان کریم داد نے بھی ایسے ہی دعوے کر کے کافی لوگوں کو غلط راستہ پر ڈال دیا۔[57]

ٹھیک اسی زمانے میں پیر پہلوان نامی ایک شخص خراسان سے آکر چکزرہ کے قریب آباد ہوا۔ اس نے افغانوں میں "علی پرستی" شروع کروا دی۔ علاوہ ازیں اس نے نماز پنجگانہ اور ماہ رمضان کے روزے منسوخ کر کے اپنے مریدوں کے لیے شراب اور زنا کو حلال کر دیا۔[58] اسی طرح محمد زئی قبیلہ کے ایک فرد، شیخ یوسف نے طریقہ اباحیہ اپنایا۔[59] ۱۰۱۹ ہجری میں مراد نامی ایک شخص نے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔[60] اس سے قبل محمود نامی ایک ایرانی نبوت کا دعویٰ کر چکا تھا۔[61] مندرانام افغان قبیلہ کے بہت سے لوگوں نے قطب اور غوث ہونے کے دعوے کیے۔ ان میں سے ملا میرو نامی ایک "قطب" یہ کہا کرتا تھا کہ عرش کے اوپر ایک فرش ہے اور اس پر ایک بہت بڑا پتھر دھرا ہوا ہے، اس پتھر کے اوپر ایک بڑا خیمہ تنا ہوا ہے جس کے ستر ہزار دروازے ہیں۔ اس خیمہ کے اندر ایک تخت رکھا ہوا ہے۔ جس پر خدا بیٹھتا ہے۔ اور یہ ایک راز ہے جسے علماء نہیں جانتے۔[62]

ان "اشرار" میں غالباً سب سے زیادہ "فرقہ" پیر روشن تھا، جسے مغلیہ عہد کے

---

[53] ایضاً ص ۱۷۰ [54] ایضاً۔ ص ۱۶۵ [55] ایضاً ص ۱۷۱

[56] ایضاً، ص ۱۶۳ [57] ایضاً، ص ۱۶۴ [58] ایضاً ص ۱۶۲

[59] ایضاً، ص ۱۷۱ [60] تاریخ الفی، ورق ۴۰۴ ب

[61] ایضاً [62] تذکرۃ الابرار والاشرار ص ۱۶۸،

مورخ پیر تاریک کے نام سے یاد کرتے ہیں: وہ مشرقی پنجاب کے مشہور شہر جالندھر میں افغانوں کے آخری دورِ حکومت میں پیدا ہوا۔ مغلوں کے ابتدائی ایام حکومت میں وہ اپنی ماں کے ساتھ آزاد علاقے میں چلا گیا لیکن ہوش سنبھالتے ہی حصولِ تعلیم کے لیے وہ دوبارہ ہندوستان آیا۔ اس زمانے میں کالنجر میں ملا سلیمان نامی ایک اسمٰعیلی کے درس کا بڑا شہرہ تھا۔[64] پیر روشن نے اس کے مدرسے میں داخلہ لیا اور اسمٰعیلی استاد کی صحبت میں رہ کر عجیب و غریب عقاید اپنا لیے۔ تعلیم سے فراغت پاتے ہی پیر روشن آزاد علاقے کی طرف لوٹ گیا۔[65] محسن فانی کے قول کے مطابق اس نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ نبی ہے اور اس پر وحی نازل ہوتی ہے۔[66] علاوہ ازیں پیر روشن کے خیال میں نماز میں قبلہ کی طرف رُخ کرنا ضروری نہ تھا۔[67] اسی طرح اس نے غسلِ جنابت بھی منسوخ کر دیا۔[68] اخوند درویزہ کے بیان کے مطابق "این ملعون بر عقیدۂ مذہب تناسخ رفتہ بود۔"[69] اس کے علاوہ پیر روشن "دُزدی و رہزنی را پیشہ گرفتہ نفرا و مسافران را می کشتہ خون ہائے ایشاں و مالہائے ایشاں را حلال می داشت۔"[70] اس کے افغان ساتھیوں کو اس کی تعلیمات میں فائدے ہی فائدے نظر آئے اور اُن کی اکثریت اس کی طرف دار ہو گئی۔ اس نے اپنے ماننے والوں کی "ہدایت" کے لیے خیر البیان نامی ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ اخوند صاحب اس کتاب کو اپنی تحریروں میں "شر البیان" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ آپ نے اپنی تحریروں میں پیر روشن اور اس کی تحریک کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیے ہیں۔

تذکرۃ الابرار والاشرار اور مخزن اسلام اخوند درویزہ کی مشہور تصانیف ہیں اور ان میں آپ نے اپنے عہد کے تمام ملحدوں کے نظریات کی تکذیب کرتے ہوئے مسلمانوں کو ان کی صحبت سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ آپ ہی وہ بزرگ ہیں جنھوں نے آزاد قبائل میں فتنۂ ارتداد اور الحاد کو بڑھنے سے روکا۔ مخزن اسلام میں آپ تحریر فرماتے ہیں: "یقین می باشد کہ اگر فقیر را درمیان نمی بود از افغانان یوسف زئی کسے مسلمان نمی ماند۔"[71] آپ کے بعد آپ کے خلف الرشید نور محمد

---

[63] ۱۔ ایضاً، ص ۴۲۔ ۲۔ دی سپرٹ آف اسلام، ص ۳۴۲، ۳۴۴

[64] ۱۔ دی فیوڈز آف دی افغانز ان جالندھر ڈسٹرکٹ، ص ۴۲ [65] دبستان مذاہب، ص ۲۴۸، ۲۵۰

[66] ایضاً [67] ایضاً، ۲۵۰، [68] [69] تذکرۃ الابرار والاشرار، ورق ۱۲۵ ب، [70] ایضاً [71] مخزن اسلام ورق ۲ الف

ہے آپ کا مشن جاری رکھا۔ ان کی روحانی تربیت خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ نے کی لیکن انہیں
خرقۂ خلافت شیخ آدم نبوریؒ نے عطا فرمایا تھا۔

یہ تھی سولھویں صدی کے اختتام پر ہندوستان کی مذہبی فضا جس میں اکبر دینِ اسلام
سے برگشتہ ہوا اور اس نے دین الٰہی کی بنیاد رکھی میرے خیال میں ہندوستان کی یہ فضا
اکبر کے لیے سازگار تھی اور اس نے بھی دوسروں کی دیکھا دیکھی ایک نئے دین کی طرح ڈالی۔

جن دنوں اکبر علماء سے بیزار ہوا ان ہی ایام میں بدقسمتی سے ایک ایسا واقعہ پیش آیا
کہ اس نے صورتِ حال کو بد سے بدتر بنا دیا۔ بدایونی رقم طراز ہے کہ متھرا کے قاضی عبدالرحیم
نے تعمیرِ مسجد کے لیے سامان جمع کیا لیکن ایک چالاک برہمن نے راتوں رات وہ سامان اٹھا کر
مندر کی تعمیر میں لگا دیا۔ جب مسلمانوں نے اس سے بازپرس کی تو وہ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی
شان میں گستاخیاں کرنے لگا۔ قاضی صاحب نے صدر الصدور ملا عبدالنبی کی عدالت میں
برہمن کے خلاف مقدمہ دائر کیا۔ صدر الصدور نے برہمن کے نام عدالت میں حاضر ہونے کا
سمن جاری کیا لیکن اس نے تعمیلِ سمن سے صاف انکار کر دیا۔ اکبر نے موقع کی نزاکت محسوس
کرتے ہوئے بیربل اور ابوالفضل کو متھرا بھیجا اور وہ برہمن کو سمجھا بجھا کر دربار میں لے گئے۔

اکبر نے ابوالفضل کو اس واقعہ کی چھان بین پر مامور کیا۔ ابوالفضل کی تحقیق کے بعد
برہمن مجرم قرار پایا[۱] علما اس شاتمِ رسولؐ کو پھانسی دینے پر تلے ہوئے تھے۔ اتفاق سے
وہ نابکار اکبر کی بیوی جودھا بائی کا پروہت تھا۔ اور بیوی کے زیرِ اثر اکبر اسے بچانا چاہتا
تھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ صدر الصدور کے اختیارات میں مخل ہونا بھی پسند نہ کرتا
تھا۔ لہٰذا اس نے یہ معاملہ ملا عبدالنبی پر چھوڑ دیا اور انھوں نے بھی بادشاہ کی ناراضگی کی
پرواہ نہ کرتے ہوئے اس برہمن کو تختۂ دار پر لٹکا دیا۔ اس پر اکبر ملا عبدالنبی سے بہت
برہم ہوا۔ ایک طرف تو "دخترانِ راجہائے ہند" نے اس کے کان بھرے کہ اس نے ملاؤں
کو اتنا سر پر چڑھا لیا ہے کہ وہ اُن کی مرضی کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ دوسری طرف ملا

[۱] بدایونی، جلد ۳۔ ص ۸۰

جہاں مخدوم الملک کے کسی مخالف نے موقع پاتے ہی بادشاہ کے حضور میں یہ سوال اٹھایا کہ گو ملا صاحب امام اعظم ابو حنیفہؒ کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن وہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ ان کے جد امجد کے نزدیک شاتمِ رسولؐ سزائے موت پانے کا مستحق نہیں[۵۱]۔ اس پر بادشاہ مزید بگڑا۔

اتفاق سے ان ہی دنوں بادشاہ کی سال گرہ کی تقریب منعقد ہوئی۔ اس موقع پر شیخ مبارک ناگوری بادشاہ کی خدمت میں تہنیت پیش کرنے کی غرض سے دربار میں حاضر ہوا۔ اس نے بادشاہ کو مغموم پا کر اس کا سبب دریافت کیا تو بادشاہ نے اُسے برہمن کے قتل کے واقعہ سے آگاہ کیا۔ اس پر شیخ مبارک نے بادشاہ کو بتایا کہ وہ چونکہ خود امام عادل ہے اس لیے وہ علما کے فتاویٰ کا محتاج نہیں بلکہ وہ خود مجتہد ہے اور مذہبی امور میں اس کا فیصلہ قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بات سنتے ہی بادشاہ نے شیخ مبارک سے کہا کہ وہ اسے علماء کے چنگل سے چھڑانے کی کوئی تدبیر سوچے۔ اس پر شیخ مبارک نے ایک محضر تیار کیا اور اس پر تمام علماء کے دستخط کروا لیے۔ اس محضر کی رُو سے اکبر کو امام عادل قرار دیا گیا اور مذہبی امور میں اس کا فیصلہ حرفِ آخر قرار دیا گیا[۵۲]۔

جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے 'محضر نامہ' کی تیاری سے پہلے ہی اکبر کے خود غرض مصاحبوں نے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ وہ خلفائے راشدین کی طرح مذہبی امور کا بھی سربراہ ہے اس لیے اسے جمعہ کے روز ان کی تقلید کرتے ہوئے خطبہ بھی دینا چاہیے۔ چنانچہ یکم جمادی الاول ۹۸۷ ہجری کو اکبر فتح پور سیکری کی مسجد میں خطبہ دینے کی غرض سے منبر پر چڑھ گیا[۵۵]۔ بدایونی رقم طراز ہے کہ منبر پر چڑھتے ہی بادشاہ پر کپکپی طاری ہو گئی اور وہ فیضی کے دو تین اشعار پڑھ کر منبر سے اُتر آیا[۵۶]۔

شیخ مبارک جس نے محضر نامہ کی رُو سے اکبر کو امام عادل بنا کر لامحدود اختیارات کا مالک بنا دیا تھا، بڑا چالاک عالم تھا۔ اکثر لوگ اُسے شیعہ سمجھتے تھے[۵۷] اور یہ حقیقت

---

[۵۲] ایضاً، ص ۳۔ [۵۳] مآثر رحیمی، جلد اول، ص ۸۶۶-۸۶۷

[۵۴] زبدۃ التواریخ، ورق ۲۰۲ الف [۵۵] فیضی سرہندی، اکبرنامہ، ورق ۹۳ب [۵۶] بدایونی جلد دوم، ص ۲۶۸، [۵۷] اے لٹریری ہسٹری آف پرشیا، جلد ۴، ص ۱۰۔

ہے کہ اس کے آباؤ اجداد یمن کے رہنے والے تھے جو زیدی اور سلیمانی شیعوں کا مرکز تھا۔ شیخ مبارک کا مورث اعلیٰ یمن سے سندھ آ کر ریل نامی ایک قصبہ میں آباد ہوا۔ سندھ اور گجرات اس زمانے میں اسمٰعیلی شیعوں کی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز تھے۔ اس کے آباؤ اجداد مدت تک اس ماحول میں آباد رہے۔ شیخ مبارک کا والد شیخ خضر ریل کی سکونت ترک کر کے ناگور میں جا بسا اور وہیں شیخ مبارک پیدا ہوا۔[38]

پٹھانوں کے آخری ایام حکومت میں جب راجستھان میں راجپوتوں نے سر اٹھایا اور ان کا راہنما رانا سانگا ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنے کے خواب دیکھنے لگا تو راجپوتوں نے راجستھان کی مسلم بستیوں پر حملے شروع کر دیے۔ ان حالات میں شیخ مبارک ناگور سے احمد آباد چلا گیا۔ جو مدتوں سے اسمٰعیلی اور بوہرہ مبلغوں کی سرگرمیوں کا مرکز چلا آ رہا تھا۔[39] کچھ عرصہ بعد وہ آگرہ چلا گیا اور وہاں ایک مدرسہ میں درس و تدریس میں مشغول ہو گیا۔[40] جن دنوں مہدوی تحریک نے زور پکڑا اور مہدوی معتوب ہوئے ان ایام میں بھی اس کی دوستی مہدوی راہنما شیخ علائی کے ساتھ قائم رہی۔ اس پر لوگ اسے بھی مہدویوں میں شمار کرنے لگے۔ اکبر کے ابتدائی دورِ حکومت تک مہدویوں کی پکڑ دھکڑ جاری تھی اور ملا عبداللہ سلطان پوری اور ملا عبدالنبی انھیں چن چن کر قتل کروا رہے تھے۔ اس زمانے میں ان کی توجہ شیخ مبارک پر بھی مبذول ہوئی لیکن وہ پولیس کے پہونچنے سے پہلے ہی اپنے خاندان سمیت کہیں روپوش ہو گیا۔[41]

اکبر کے زمانے میں جب صوفی مقرب بارگاہِ سلطانی ہوئے تو شیخ مبارک نقشبندی سلسلہ کا درویش مشہور ہوا۔[42] ابو الفضل نے بھی ایک موقعہ پر اسے نقشبندی لکھا ہے۔[43]

---

[38] آثر الامرا، جلد ۲، ص ۵۰۴ [39] ایضاً [40] ایضاً

[41] دی ہسٹری آف انڈیا، ص ۵۲۱ [42] آثر الامراء، جلد ۲، ۵۰۵

[43] آئین اکبری، جلد ۲، ص ۲۶۰

اس کے کچھ عرصہ بعد وہ نقشبندیوں سے قطع تعلق کرکے درویشوں کے ہمدانیہ سلسلے سے منسلک ہو گیا۔ لیکن جب دربار میں شیعہ اثر و رسوخ بڑھا تو شیخ کے لباس اور اطوار کو دیکھ کر لوگ اسے بھی شیعہ سمجھنے لگے[۵۵]۔ بدایونی کے قول کے مطابق اس کی شیعوں کے ساتھ رشتہ داری بھی تھی اور اس کا ایک داماد خداداد خاں بڑا متعصب شیعہ تھا[۵۶]۔ تاریخ پنجاب کے مصنف نے شاہ نے شیخ مبارک کا شمار "ملاحدہ" میں کیا ہے[۵۷]۔ سر وولزلی ہیگ رقم طراز ہے کہ شیخ مبارک مختلف ادوار میں سُنّی، شیعہ، صوفی اور مہدوی کے علاوہ اور خدا جانے کیا کیا رہ چکا تھا[۵۸]۔ میری ناقص رائے میں شیخ مبارک آزاد خیال اور وسیع المشرب عالم تھا اس لیے وہ مختلف مکاتب فکر کے علما سے بڑی آزادی سے ملتا جلتا تھا۔ کبھی کبھی میرے ذہن میں یہ بات بھی آتی ہے کہ اس کے آبا و اجداد یمنی النسل شیعہ تھے اور وہ خود بھی شیعہ ماحول میں بڑھا پلا تھا۔ اس لیے حاکم وقت کا مزاج دیکھ کر وہ تقیہ کر لیتا تھا اس کا ایک ناقابلِ تردید ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ عبادت خانہ کے مباحثوں میں اپنے مخالفین پر ہمیشہ شیعہ اور اسمٰعیلی ہتھیاروں سے حملے کیا کرتا تھا۔

اکبر کے دادا بابر کے عہد میں ترکی کے سلطان سلیم کو چونکہ دنیائے اسلام نے خلیفہ تسلیم کر لیا تھا۔ اور دنیا بھر کے سُنّی اُسے نبی اکرمؐ کا جانشین مان چکے تھے۔ اس لیے ایک خلیفہ کی موجودگی میں اکبر نے لیے دعوائے خلافت کرنا آسان نہ تھا۔ اس لیے شیخ مبارک نے اپنی چالاکی سے اُسے "امام عادل" بنا دیا۔ اور یہ بات یاد رہے کہ خلیفہ کی موجودگی میں شیعہ حضرات کے عقیدہ کے مطابق امام ہو سکتا ہے۔ جیسے شیخین کے زمانے میں حضرت علیؓ باقاعدہ امام تھے۔

اس زمانے میں سیدھے سادے سُنیوں کے لیے یہ معمولی لقب کی حیثیت رکھتا ہوگا لیکن اصل میں لقب کی حیثیت اس سے کہیں زیادہ تھی۔ غیر عرب قوموں نے خصوصاً ایرانیوں نے، اپنے حاکموں کو بعض خدائی صفات سے متصف کرکے انھیں خدائی حقوق (DIVINE RIGHTS) دے رکھے تھے۔ اکبر کو امام عادل اور امام زمان بنانے میں شیخ

---

[۵۴] مآثرالامرا، جلد ۲، ص ۵۰۵ [۵۵] ایضاً [۵۶] بدایونی، جلد ۲، ص ۲۷۲

[۵۷] تاریخ پنجاب، ورق ۱۳۱ الف [۵۸] دی کیمبرج ہسٹری آف پرشیا، جلد ۴، ص ۱۸

مبارک کا یہی مقصد تھا[89]

جب اکبر کے حکم سے مہا بھارت کا فارسی میں ترجمہ ہوا تو ابوالفضل نے اس کا دیباچہ لکھا تھا۔ اس دیباچہ کو بغور پڑھ کر یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ شیخ مبارک اور اس کے بیٹوں کا اکبر کو امام عادل بنانے سے کیا مقصد تھا۔ دراصل وہ اکبر کو فاطمی امام کے سے اختیارات دلوانا چاہتے تھے[90] ابوالفضل نے اس دیباچہ میں اکبر کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: "آن سلطان عادل برہان کامل دین قاطع خدا دانی حجت ساطع رحمت رحمانی قافلہ سالار راہ تحقیقی و مجازی۔"[91] اس کے علاوہ وہ اکبر کو "ہادی علی الاطلاق و مہدی باستحقاق" "خلیفۃ اللہ" کے القابات سے بھی یاد کرتا ہے[92] شاید اسی "باریک تر ز مو نکتہ" کو سمجھتے ہوئے بدایونی، ابوالفضل کے متعلق لکھتا ہے: "آتش در جہان انداختہ و چراغ صباحیاں کہ چراغ گرفتن در روز روشن داشت روشن گردانیدہ۔"[93]

بدایونی کی اس عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابوالفضل حسن ابن صباح کی مشعل لے کر دربار میں آیا اور اس نے پورے جہان کو آگ لگا دی۔ مشعل صباحیان سے بدایونی اسمٰعیلی ترکیبیں مراد لیتا ہے۔ غالباً ابوالفضل کی اسی چالاکی اور ہوشیاری کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا بھانجا عبدالصمد اس کے متعلق لکھتا ہے: "شیخ ابوالفضل وزیر خاقان ہوش رُبائے زمانہ زمانیان۔"[94]

ڈاکٹر احمد بشیر صاحب اپنے تحقیقی مقالہ میں یہ تحریر فرماتے ہیں کہ عبادت خانہ کے مباحثوں میں ابوالفضل کا انداز بحث اور اکبر کو مہدی بنانے کا نظریہ عملی طور پر اسمٰعیلی ہیں۔ اس نے اکبر کو جو لامحدود مذہبی اختیارات دیے ہیں اور اُسے علم لدنی کا حامل بتاتے ہوئے اس کے ساتھ جو معجزات منسوب کیے ہیں وہ اکبر کو اسمٰعیلی امام کا ہم پلہ بنا دیتے ہیں۔[95]

---

[89] لٹریری ہسٹری آف پرشیا، جلد ۱، ص ۱۸۰ [90] مہابھارت، ورق ۴ الف تا ۱۴ ب
[91] ایضاً، ورق ۴ الف [92] ایضاً [93] بدایونی، جلد ۲، ص ۱۹۸
[94] مکاتبات علامی، ورق ۲ الف [95] ریلجس پالیسی آف اکبر، ورق ۹۵، ۹۶

ڈاکٹر احمد بشیر صاحب، شیخ مبارک اور اس کے فرزندوں کی اکبر کو امام عادل بنانے کی چال کو سمجھ گئے ہیں۔ اسی روشنی میں اگر ہم ابوالفضل کی اکبر کے متعلق تمام تحریروں کو جمع کریں تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ابوالفضل واقعی اکبر کو شیعہ یا اسمٰعیلی امام کی جملہ صفات سے متصف کر رہا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ابوالفضل رقم طراز ہے کہ اکبر کی پیدائش سے پہلے اس کی ماں کو حضرت مریم کی طرح بشاراتِ غیبی، بشاراتِ قدسی ہوا کرتے تھے[96] گویا وہ اکبر کو شیعہ یا اسمٰعیلی امام کی طرح مادر زاد ولی دکھانا چاہتا ہے۔ ایک موقع پر بدایونی رقم طراز ہے کہ اکبر کے بعض معتقد اسے "صاحبِ زمان" کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے[97] اور یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ لقب صرف شیعہ یا اسمٰعیلی امام یا مہدی کیلیے ہی استعمال ہو سکتا ہے۔ ایک دوسرے موقع پر ابوالفضل لکھتا ہے کہ اکبر اپنے عہدِ طفولیت میں آغوشِ مادر میں مسیح وار باتیں کیا کرتا تھا[98] اسی طرح جب اس کے چچا کامران میرزا نے ہمایوں کی قلعۂ بالاحصار پر گولہ باری کے دوران اکبر کو قلعہ کی فصیل پر بٹھا دیا تو اس کا بچ نکلنا ایک بڑا معجزہ تھا[99] ابوالفضل کے ایک ہم عصر مورخ عباس شروانی نے تو یہ کہہ کر خوشامد کی حد ہی کر دی ہے کہ اکبر پر وحی نازل ہوا کرتی تھی[100] یہ سب باتیں اکبر کو شیعہ یا اسمٰعیلی امام کی طرح مادر زاد ولی ثابت کرنے کے لیے گھڑی گئی ہیں۔

ایک بار جب اکبر پنجاب میں نندنہ کے نواح میں شکار میں مصروف تھا تو ایک درخت کے نیچے اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی[101] اس نے فوراً شکار سے ہاتھ کھینچ لیا اپنا سر منڈوا دیا غرباء و مساکین میں نقد و جنس تقسیم کیے اور اس مقام پر ایک عمارت بنانے اور اس کے گرد باغ لگانے کا حکم دیا[102] بدایونی لکھتا ہے کہ اس واقعہ کی خبر آناً فاناً پورے ملک میں پھیل گئی اور لوگ اس کے متعلق چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ بس پھر کیا تھا جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں تھیں[103] مولانا مناظر احسن مرحوم کا یہ خیال تھا کہ اکبر نے یہ قصہ سنا ہوا تھا کہ مہاتما بدھ کو ایک درخت

---

[96] اکبرنامہ۔ جلد اول، ص ١١ تا ١٧ [97] بدایونی، جلد ٢، ص ٢٦٠

[98] اکبرنامہ جلد اول، ص ١٨٧ [99] ایضاً، ص ٢٦٦ [100] تاریخ شیر شاہی، ورق ٢ الف

[101] بدایونی جلد ٢، ص ٢٥٢ [102] ایضاً، ص ٢٥٤ [103] ایضاً

نہیں گیان حاصل ہوا تھا' اکبر نے بدھ کی نقالی کی تھی[103]

مشہور شیعی مؤرخ سید امیر علی لکھتے ہیں کہ اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ شیعوں کے بعض فرقے مثلاً نعمانیہ' خطابیہ اور اسحاقیہ تناسخ پر یقین رکھتے تھے[104] ہمارا ایک ہمعصر اسمٰعیلی مؤرخ علی محمد جان محمد چنارا اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ اسمٰعیلیوں کے بعض فرقے نہ صرف یہ کہ تناسخ کے قائل ہیں بلکہ وہ فاطمی خلیفہ حاکم کو خدا کا اوتار بھی مانتے ہیں[105] حاکم کے عہد میں مصر کے یہودی' عیسائی اور قبطی اُسے "یا ذَبَّنا" کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ اسی طرح دروزکا فرقہ کے پیرو بھی تناسخ کے قائل ہیں[106]

جن دنوں اکبر دین اسلام سے برگشتہ ہوا۔ ان ہی ایام میں مسلمانوں کی بدقسمتی سے دکن کا ایک برہمن ہاون نام مشرف بہ اسلام ہوا' اس نے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے فارسی تراجم بادشاہ کی خدمت میں پیش کیے۔ وہ اکثر بعض دقیق مسائل کی تشریح بھی بادشاہ کے حضور میں کیا کرتا تھا۔ اس نے ہندوؤں کے عقاید کو مسلمانوں کے عقاید کے ساتھ ملا کر ایک معجون مرکب تیار کیا۔ بدایونی کے خیال کے مطابق ہاون نے بادشاہ کے عقاید بگاڑنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا[107]

اکبر تناسخ پر یقین کامل رکھتا تھا[108] اور ابوالفضل بادشاہ کے حکم سے امرا کو تناسخ کا مسئلہ سمجھایا کرتا تھا[109] بدایونی اور دوسرے سبھی مؤرخ اس پر متفق ہیں کہ بادشاہ اکثر رات کے وقت تنہائی میں دیبی نامی برہمن سے ملا کرتا تھا' یہ وہی شخص تھا جس نے بادشاہ کو آفتاب اور کواکب پرستی کی تعلیم دی تھی[110] اسی طرح ایک اور برہمن پرکھوتم نام بھی بادشاہ کا منظور نظر تھا۔ اور بقول بدایونی اسی کے زیر اثر بادشاہ تناسخ کا قائل ہوا تھا[111]

---

[103] تذکرہ مجدد الف ثانی' ص ۵۲ — [104] دی اسپرٹ آف اسلام' ص ۳۴۳

[105] نور المبین حبل اللہ المتین' ص ۲۹۸ — [106] ایضاً' ص ۲۹۹'

[107] بدایونی' جلد ۲' ص ۲۱۲ — [108] ایضاً' ص ۳۰۰ مراۃ جہاں نما' ورق ۱۴۸ الف'

آئین اکبری جلد ۲' ص ۲۳۹' اور کنیشل کان فرنس پیپرز ص ۴۰' [110] بدایونی جلد ۲' ص ۳۰۰'

[111] ایضاً' ص ۲۵۷' ز ز اخبار محبت' ورق ۱۰۹ الف [112] بدایونی' جلد ۲' ص ۲۵۸۔

ان برہمنوں اور ہندو دیویوں کے زیر اثر اکبر نے ہندوؤں کی بہت سی رسومات اپنالی تھیں۔ اس کے محل میں راکھی، دسہرہ، دیوالی، بسنت اور جنم اشٹمی کے تہوار بڑے تزک و احتشام سے منائے جاتے تھے۔ وہ بھی کبھی کبھی ہندوؤں کی طرح اپنے ماتھے پر تلک بھی لگا لیتا تھا۔[113] ان وجوہات کی بنا پر ہندو اسے "اپنا" ہی سمجھتے اور جگت گورو کہہ کر اسے مخاطب کیا کرتے تھے[114] بقول بدایونی 'ہندوؤں میں ایک ایسا طبقہ بھی پیدا ہو چکا تھا جو اسے رام اور کرشن کا اوتار سمجھتا تھا۔[115] ہندوؤں کو مزید خوش کرنے کے لیے اس نے جزیہ معاف کر دیا اور ان کو بھی مسلمانوں کے مساوی حقوق دے دیے۔"[116]

کرم چند نامی ایک جینی عالم مہاراجہ بیکانیر کا وزیر تھا۔ اس نے کسی وجہ سے مہاراجہ کی ملازمت سے استعفا دے دیا اور اکبر کی ملازمت اختیار کر لی۔ اس نے جے چند سوری نامی ایک جینی عالم سے اکبر کا تعارف کروایا۔[117] اس کے ساتھ نشست و برخاست کا اکبر پر یہ اثر ہوا کہ اس نے پیاز اور گوشت کھانا چھوڑ دیا۔[118] اس کے علاوہ اس نے مختلف ایام میں لوگوں کو جانور ذبح کرنے سے منع کر دیا۔

عام ہندوؤں کی طرح بادشاہ بھی بدھ کے روز گائے کے درشن کرنا سعادت جانتا تھا۔ اس کے علاوہ مختلف ہندو تہواروں پر بھی وہ گائے کی زیارت سے مشرف ہوا کرتا تھا۔[119]

ایک بار گجرات میں سورت کے قریب اس کی ملاقات مشہور پارسی موبد دستور جی مہر جی رانا سے ہوئی۔ اکبر نے اسے اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی۔[120] چنانچہ وہ ۱۵۷۸ء میں فتح پور سیکری پہنچا اور عبادت خانہ کے مباحثوں میں سرگرم حصہ لینے لگا۔ اس کے زیر اثر اکبر آفتاب پرستی کے علاوہ آگ کی تعظیم بھی کرنے لگا اور اس چیز نے بہت سے لوگوں

---

۱۱۳ دی مغل ایمپائر، ص ۱۷۵ — ۱۱۴ مغل ایڈمنسٹریشن، ص ۱۵۰۔

۱۱۵ بدایونی جلد ۲، ص ۳۲۶ — ۱۱۶ بدایونی، جلد ۲، ص ۳۲۶

۱۱۷ دی ریلیجس پالیسی آف دی مغل ایمپررز، ص ۲۳ — ۱۱۸ ایضاً، ص ۲۲

۱۱۹ بدایونی جلد ۲، ص ۲۶۱ — ۱۲۰ ایضاً۔ ۱۹۳ — ۱۲۱ سٹڈیز ان مڈیول انڈین ہسٹری، ص ۲۲۲

میں شبہ میں ڈال دیا کہ وہ پارسی مذہب اختیار کر چکا ہے۔[121] اس کے علاوہ اس نے یہ حکم دیا کہ شام کے وقت جب دربار میں چراغ جلائے جائیں تو سب درباری احتراماً کھڑے ہو جایا کریں۔[122] اکبر کی ان حرکات کو دیکھتے ہوئے شیخ عبدالحق محدث دہلوی یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ اگر کوئی شخص کلمہ پڑھنے کے بعد نبی اکرم کے اسوۂ حسنہ کے خلاف کام کرے یا کسی بت کے آگے جھکے یا زنّار باندھے وہ یقیناً کافر ہے۔[123] امام الہند شاہ ولی اللہ اکبر کے متعلق رقمطراز ہیں کہ وہ ملحد ہو چکا تھا اور اس نے زندیقوں جیسے طور طریقے اپنا لیے تھے۔[124]

ڈوجیرک لکھتا ہے کہ اکبر نے گوا کے پرتگیز حکام سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ اس کے دربار میں چند عیسائی مبلغ بھیجیں۔ اس کی درخواست منظور ہوئی اور گوا سے چند ریڈ دہن پادری فتح پور سیکری روانہ کیے گئے جو ۱۸ فروری ۱۵۸۰ کو دربار میں حاضر ہوئے۔[125]

ایک بار اکبر کو کسی نے بتایا کہ پرتگیزوں نے توراۃ اور انجیل کا فارسی ترجمہ کر لیا ہے۔ یہ سنتے ہی اس نے سید مظفر کو گوا روانہ کیا تاکہ وہ "دانایانِ فرنگ" سے یہ تراجم لے آئے۔[126] اس کے علاوہ اس نے گوا کے پادریوں سے یہ التماس کی تھی کہ وہ اس کے ساتھ باقاعدہ خط و کتابت جاری رکھیں۔ بادشاہ کی درخواست پر ۱۵۸۰، ۱۵۹۰، اور ۱۵۹۵ میں پادریوں کے تین وفد دربار میں بھیجے گئے جہاں ان کا خیر مقدم کیا گیا اور بادشاہ نے بڑے ذوق و شوق سے ان کی باتیں سنیں۔ بادشاہ کے اس رویہ سے پادریوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ عنقریب ہی عیسائی ہو جائے گا۔[127]

ڈوجیرک کی کتاب "اکبر اینڈ دی جیسوائٹس" کے دیباچہ میں پین صاحب رقمطراز ہیں

---

[121] دی کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، جلد ۴، ص ۱۲۱

[122] آئینِ اکبری، جلد ۲، ص ۴۴، ۱۱ دی کورٹ مینرز آف دی گریٹ مغلز، ص ۱۹

[123] اشعۃ اللمعات، ص ۲۶ ۱ [124] انفاس العارفین، صفحہ ۱۵۴

[125] اکبر اینڈ دی جیسوائٹس، ص ۱۷، ۱۸ [126] مکاتباتِ علامی، ورق ۱۱ ب

[127] دی مغلز اینڈ دی پرتگیز، ص ۵۹، ۶۰

کہ پادریوں کے جو وفد اکبر کی خدمت میں روانہ کیے گئے ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ اسے عیسائی بنا کر اس کی سلطنت میں تعلیماتِ انجیل کی داغ بیل ڈالیں۔[۱۲۸] یہ عیسائی پادری اپنے ساتھ قرآن حکیم کا فارسی ترجمہ اس غرض سے لے گئے کہ وہ بادشاہ کے سامنے "قرآن کی اغلاط" اس کی غلط بیانیوں اور اختلافی مسائل" کی تردید کرسکیں۔[۱۲۹] یہ پادری اکبر کو "قانون اسلام کے رطب و یابس" سے آگاہ کرنے کے علاوہ یہ بھی بتایا کرتے تھے کہ محمد مصطفیٰ کا دیا ہوا قانون "جھوٹ کا پلندہ" ہے۔[۱۳۰] انھوں نے بادشاہ سے یہ بھی درخواست کی تھی کہ وہ اپنی مملکت میں قرآن کے درس و تدریس پر پابندی لگا دے کیونکہ وہ "اغلاط سے بھرا پڑا ہے"۔[۱۳۱]

قرآن حکیم کے متعلق ابوالفضل بھی کم و بیش ایسے ہی خیالات رکھتا تھا۔ جہانگیر نے ایک موقع پر یہ کہا تھا کہ اس نے یہ بات میرے والد کے ذہن نشین کرا دی تھی کہ قرآن وحی الٰہی نہیں بلکہ یہ حضورؐ کی تصنیف ہے۔[۱۳۲] ابوالفضل کے والد شیخ مبارک کے بھی قرآن کے متعلق قریب قریب ایسے ہی خیالات تھے۔ بدایونی لکھتا ہے کہ ایک بار شیخ مبارک نے اکبر کے سامنے بیربل سے کہا تھا کہ جس طرح ہندوؤں کی کتابوں میں ردّ و بدل ہوا ہے ایسے ہی ہمارے قرآن میں بھی کئی بار تحریف ہو چکی ہے۔ اور اب اگر سچ پوچھو تو اس پر سے میرا یقین اٹھ چکا ہے۔[۱۳۳] میری ناقص رائے میں باپ بیٹے کے قرآن کے متعلق شبہات ہی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ وہ سنّی نہیں تھے ـــــ اور اگر یہ بات صاف ہو جائے تو پھر اکبر کو امام عادل بنانے کا منصوبہ بآسانی سمجھ میں آ جائے گا۔

اکبر نے پرتگیزوں اور آرمینیوں کو اپنی مملکت میں گرجے بنانے کی اجازت دے کر اسلامی قانون توڑ ڈالا۔ جب آگرہ میں پہلا گرجا تعمیر ہوا تو اکبر بنفس نفیس وہاں پہنچا اور عیسائیوں کے ساتھ عبادت میں شریک ہوا۔ اس نے اپنی پگڑی اتار کر رکھ لی اور گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر دعا مانگی۔[۱۳۴] ایک زمانہ تھا کہ وہ شہزادہ سلیم کو ملّا عبدالنبی کے گھر سماعت حدیث کے

---

۱۲۸ اکبر اینڈ دی جیسوائٹس، ص ۴۴ ۱۲۹ اکبر اینڈ دی جیسوائٹس، ص ۲۱، ۱۳۰ ایضاً ص ۱۶

۱۳۱ ایضاً، ص ۲۲، ۲۴ ۱۳۲ مآثر الامراء، جلد ۲، ص ۲۱۷ ۱۳۳ بدایونی، جلد ۲، ص ۳۱۲

۱۳۴ اکبر اینڈ دی جیسوائٹس، ص ۲۵۔

کیا کرتا تھا اور اب یہ دن بھی آئے کہ اس نے شہزادہ مراد کو حکم دیا کہ وہ پادریوں سے انجیل کی تعلیم حاصل کرے[۱۳۴] ابو الفضل کے نام یہ فرمان جاری ہوا کہ وہ اکبر کی خاطر انجیل کا فارسی ترجمہ کرے[۱۳۵] بدایونی اس کا عینی شاہد ہے کہ اکبر کے پاس حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی تصاویر تھیں اور اس نے عیسائیوں کے بعض طریقے بھی اپنا لیے تھے[۱۳۶]

بعض خود غرضوں نے اکبر کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ اسلام کی میعاد صرف ہزار سال ہے[۱۳۸] یہ نظریہ "عقیدۂ الفی" کے نام سے مشہور ہوا۔ اکبر کے حکم سے ...۱ ہجری میں یادگاری سکے ڈھالے گئے اور اس موقع پر اس نے تاریخ الفی کے نام سے ایک تاریخ مرتب کرنے کا کام ملا نظام الدین احمد کو سونپا۔ عقیدۂ الفی کا بڑے زور شور سے پروپیگنڈہ کیا گیا اور یہ بات عوام کے ذہن نشین کرائی گئی کہ دورِ اسلام اب ختم ہو گیا ہے اور اب ایک نئے دین کی ضرورت ہے۔ بدایونی لکھتا ہے کہ یار لوگ عقیدۂ الفی کی تائید میں ناصر خسرو کے کلام سے ایک رباعی بھی تلاش کر لائے تھے۔ اور اُسے جا بجا گنگناتے پھرتے تھے۔

در نہصد و تسعین دو قراں می بینم
وز مہدی و دجال نشاں می بینم
یا ملک بدل گردد یا گردد زمین
سرّے کہ نہان است عیاں می بینم

اکبر عقیدۂ الفی کا قائل تھا۔ چنانچہ اس نے دورِ اسلام "ختم ہونے" کے بعد اس کی جگہ دینِ الٰہی رائج کرنے کا عزم کر لیا۔ اکبر سے پہلے بھی مامون الرشید کی مذہب میں دلچسپی نے معتزلی مذہب کو سرکاری مذہب قرار دے کر راسخ العقیدہ مسلمانوں کو ابتلا میں ڈال دیا تھا[۱۳۹] اکبر کی مذہب میں دلچسپی نے بھی راسخ العقیدہ مسلمانوں کو ابتلا میں ڈال دیا اور اس بار احمد ابن حنبلؒ کی طرح امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کو ایک بار پھر دینِ حق کے غلبہ کے لیے جدوجہد کرنی پڑی۔ (جاری)

---

[۱۳۴] اکبر اینڈ دی جیسوائٹس ص ۲۵!! بدایونی جلد ۲، ص ۲۶۰ [۱۳۵] بدایونی جلد ۲، ص ۲۶۰
[۱۳۶] ایضاً ۳۰۲ [۱۳۸] دبستان مذاہب، ص ۲۶۰ [۱۳۹] ہسٹری آف دی عربز، ص ۴۲۹

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟
تالیف — مولانا محمد منظور نعمانی
بلاشبہ قرآن مجید کی دعوت و تعلیم پوری انسانیت کے لئے آب حیات ہے،
لیکن ہماری دنیا اس سے ناآشنا ہے۔ یہاں تک کہ اسکو "کلام الٰہی" ماننے والی
اُمت کی غالب اکثریت بھی اس سے بیگانہ ہے
یہ کتاب
اسی صورت حال کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے۔
یہ قرآنی دعوت اور اسکی اہم تعلیمات کا ایک جامع خلاصہ ہے۔
جسمیں ۴۰ عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور روح پرور تشریحات کیساتھ جمع کیا گیا ہے
خاص طور پر قرآن کی دعوت توحید کا بیان اس کتاب کا شاہکار ہے۔
یہ بالکل ایک نئے طرز کی کتاب ہے، جو قرآن کی دعوت سے روشناسی کے ساتھ ساتھ
قرآن کے اعجاز بیان کا بھی لذت شناس کرتی ہے۔
نہایت اعلیٰ کتابت و طباعت، عمدہ کاغذ، ۴۰۲ صفحات، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۲/-
کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

Price Rs. 5/-

Regd. No. L-353
Monthly 'ALFURQAN' Lucknow
VOL. 36 NO. 9-10 MARCH, 1969

ROLEX | رولکس

OMEGA | اومیگا

WEST END | ویسٹ اینڈ

CITIZEN | سٹی زن

SARGENT | سارجنٹ

FAVRE-LEUBA | فیورلوبا

ROAMER | رومر
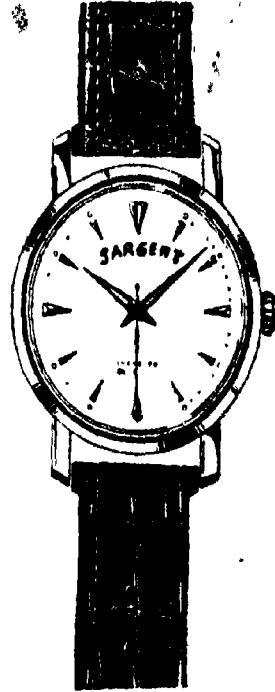
حج وزیارت کے لئے جب خدا
آپ کو لائے اور گھڑی کی ضرورت
محسوس ہو تو **باک محل** کے
کسی بھی شوروم میں تشریف لاکر ہر
قسم کی گھڑیاں نئے ڈیزائنوں
میں بارعایت خرید فرمائیں۔ اپنے آنیوالے دوست احباب کو پتہ نوٹ کروادیں